سالگرہ نمبر

چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ

ڈر ڈائجسٹ

کراچی

اکتوبر 2015

قرآن کی باتیں

☆ اوران پیغمبروں کے بعدانہیں کے قدموں پرہم نے عیسیٰ ابن مریم کوبھیجا جواپنے سے پہلے کی کتاب تورات کی تصدیق کرتے تھے اوران کوانجیل عنایت کی جس میں ہدایت اورنور ہےاورتورات کی جواس سے پہلی کتاب ہے ،تصدیق کرتی ہےاور پرہیزگاروں کوراہ بتاتی اورنصیحت کرتی ہے۔(سورۃ مائدہ 5 آیت 46)

☆ توایک روز قارون بڑی آرائش اور ٹھاٹھ سے اپنی قوم کے سامنے نکلا جولوگ دنیا کی زندگی کے طالب تھے کہنے لگے کہ جیسامال ومتاع قارون کوملاہے کاش ایساہی ہمیں بھی ملے۔وہ توبڑاہی صاحب نصیب ہےاورجن لوگوں کوعلم دیاگیاتھا،وہ کہنے لگے کہ تم پرافسوس مومنوں اورنیکوکاروں کے لئے جوثواب اللہ کے ہاں تیار ہے وہ کہیں بہتر ہےاوروہ صرف صبرکرنے والوں ہی کو ملے گا۔(سورۃ قصص 28 آیت 79 سے 80)

☆ اورجس دن وہ سب جن وانس کوجمع کرے گا اورفرمائے گا کہ اے گروہ جنات تم نے انسانوں سے بہت فائدے حاصل کئے۔توجوانسانوں میں ان کے دوستدار ہوں گے وہ کہیں گے کہ رب ہم ایک دوسرے سے فائدہ حاصل کرتے رہے۔اورآخراس وقت کوپہنچ گئے جوتونے ہمارے لئے مقررکیاتھا۔اللہ فرمائے گا اب تمہاراٹھکانہ دوزخ ہے ہمیشہ اس میں جلتے رہوگے مگرجواللہ چاہے بے شک تمہارارب دانااورخبردار ہے۔(سورۃ انعام 6 آیت 128)

☆ اے گروہ جن وانس اگرتمہیں قدرت ہوکہ آسمان اورزمین کے کناروں سے نکل جاؤتونکل جاؤاورزور کے سوا توتم نکل سکتے ہی نہیں۔(سورۃ رحمٰن 55 آیت 33)

☆ وہ بادلوں سے زمین پرمینہ برساتاہے،جس کے ذریعے ہرقسم کے اعلیٰ زوج اگتے ہیں۔(سورۃ لقمان 31 آیت 10)

☆ وہ اللہ بہت بلند ہے جس نے زمین کی نباتات اورخودان کے یعنی انسانوں کےاورجن چیزوں کی ان کوخبرنہیں سب کے ازواج بنائے۔(سورۃ یٰسین 36 آیت 36)

☆ اورجولوگ تم سے لڑتے ہیں تم بھی اللہ کی راہ میں ان سے لڑومگرزیادتی نہ کرنا کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کودوست نہیں رکھتا۔(سورۃ بقرہ 2 آیت 190)

☆ دیکھوجب جان گلے تک پہنچ جائےاورلوگ کہنے لگیں اس وقت کون جھاڑ پھونک کرنے والاہےاوراس جان بلب نے سمجھا کہ اب سب سے جدائی ہےاورپنڈلی سے پنڈلی لپٹ جائے اس دن تجھ کواپنے رب کی طرف چلناہے۔(سورۃ قیامہ 75 آیت 26 سے 30)

(کتاب کانام''قرآن مجید کے روشن موتی''بشکریہ شمع بک ایجنسی کراچی)

چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ کراچی

جلد نمبر 17 شمارہ نمبر 01 اکتوبر 2015ء

ای میل ایڈریس: Dardigest01@gmail.com

قیمت -/60 روپے

سالانہ قیمت -/1080 روپے

سالگرہ مبارک

ایڈیٹر و پبلشر آصف علی نے سٹی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ نورانی آرکیڈ نیو اردو بازار کراچی: 32744391

خطوط

انعم شہزادی گجرات سے، ڈر کی بزم گلستان سے منسلک تمام جملہ قارئین، اسٹاف اور احباب نظر وفکر و دانش کو سلام پیش کرتی ہوں، ادبی دنیا میں جرائد کا کردار ڈھکا چھپا نہیں، جو قلم کے شہ سوار اپنی کہنہ مشق تحریروں سے عوام الناس کو محظوظ کرتے تھے۔ وقت اور حالات کی گردش نے انہیں مٹی کے ڈھیر کے سپرد کردیا۔ متاخرین قلم کار جب چاہ کر بھی ان جیسا لکھنے سے قاصر ہوگئے تو انہوں نے پرانی کہانیاں جو متقدمین کی تھیں محض اپنے نام کی سرفرازی کے لئے کچھ ردوبدل کرکے بھیجنا شروع کردیں۔ ان کی ناپسندیدہ کوشش نے لوگوں کو رسائل سے دوری اختیار کرنے پر مجبور کردیا۔ پاکستان میں اس وقت سینکڑوں ناول شائع ہورہے ہیں اس لئے ان میں مکمل اور بے عیب رسالے کا انتخاب انتہائی مشکل امر تھا۔ مگر میں بے حد مشکور ہوں شاہین گروپ والوں کی، جن کی بدولت میری یہ مشکل حل ہوئی اور ڈر ڈائجسٹ جیسے معیاری جریدے سے تعارف ہوا، جس پر میں ایک بار پھر ان کا شکریہ ادا کرتی ہوں، یہ سچ ہے کہ شمارہ میں شائع ہونے کے لئے آل پاکستان سے سینکڑوں کہانیاں آتی ہیں جن میں معیاری کہانیوں کی سلیکشن بہت مشکل امر ہے میں داد دیتی ہوں محترم ایڈیٹر صاحب کی اس کوشش کو کہ وہ ہر ماہ دلچسپ اور منفرد کہانیاں شائع کرتے ہیں۔ پیا سحر آف گجرات ہمارے شہر کا نام روشن کررہی ہیں ویلڈن، گڈ اسٹوری، عطیہ زاہرہ بہت اچھا لکھتی ہیں، شگفتہ ارم درانی کہانی لائیں، طاہرہ آصف ویلڈن، ساحل دعا کہاں غائب...... ؟ مدثر بخاری اینڈ ضرغام محمود بھی بہت اچھا لکھتے ہیں۔ قسط وار میں پڑھتی نہیں ان سے معذرت شاہین گروپ قارئین کو ڈھیروں سلام دعائیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو خوش وخرم رکھے۔ آمین۔

☆☆ انعم صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، اور اس کے لئے بہت بہت شکریہ کہ آپ کو ڈر ڈائجسٹ اور اس میں شائع کہانیاں اچھی لگیں اور ہماری دعا ہے کہ شاہین گروپ ترقی کرے اور اس کے تمام ممبرز خوش وخرم رہیں اور ترقی کی منازل طے کرتے رہیں۔ امید ہے خلوص نامہ ہر ماہ بھیج کر شکریہ کا موقع دیں گی۔ Thanks۔

ایس حبیب خان کراچی سے، السلام علیکم! دل خوشی سے معمور ہے اور از حد مسرت کے ساتھ میں اپنے پسندیدہ رسالے ''ڈر'' کو دلی مبارکباد پیش کررہی ہوں کہ اس نے اپنی عمر کے، اپنی کامیابی کے، اپنی ترقی کے پندرہ سال مکمل کرلئے، ساتھ اپنے معیار کو خوب سے خوب تر کیا اور پندرہ سالوں میں اس نے کامیابیوں کی پندرہ کروڑ سیڑھیاں طے کیں، دعا ہے کہ اس کی بلندیاں یونہی آسمان کو چھوتی رہیں، مسرت کا احساس اس وقت دوچند ہوجاتا ہے کہ جب میری اور ڈر کی سالگرہ اکتوبر میں ایک ساتھ ہوتی ہے۔ ڈر کے سفر میں بہت سے رائٹرز بھی شامل ہیں۔ جن کی خوب صورت تحریروں نے ہمیشہ ڈر کی خوبصورتی میں اضافہ کیا ہے۔ ان سب کو بھی مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ ڈر کے ساتھ میں اپنے ارض پاک کے لئے بھی دعا کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ اسے ہمیشہ قائم ودائم رکھے اور اسے اندرونی وبیرونی دشمنوں سے محفوظ رکھے۔ (آمین)

☆☆ ایس حبیب صاحبہ: ادارہ ڈر ڈائجسٹ کی طرف سے آپ کو سالگرہ بہت بہت مبارک اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی تمام جائز خوشیوں کو دوچند بلکہ آٹھ چند کردے، ارسال کردہ کہانی اگلے ماہ ضرور شائع ہوگی، کہانی کمپوز ہوچکی ہے، امید ہے معذرت کو قبول کریں گی۔

سنبل ماہین راولپنڈی سے، السلام علیکم! پیارے ڈائجسٹ کو بہت بہت سالگرہ مبارک ہو، اللہ تعالیٰ ڈر ڈائجسٹ کو بے شمار ترقی دے، اس کے بعد ان تمام قارئین کا بے حد شکریہ جن کو میری کہانی پسند آئی اور ان سب سے معذرت جن کو کہانی میں کمی محسوس ہوئی۔ ڈر ڈائجسٹ کا انتظار بڑی شدت سے رہتا ہے اور ڈر ڈائجسٹ ہاتھ میں آتے ہی دل پرسکون ہوجاتا ہے۔ اب اگلے ماہ تک کے لئے خدا حافظ۔

☆☆ سنبل صاحبہ: نئی کہانی موصول ہوچکی ہے اس کے لئے شکریہ، کوشش اور زیادہ کوشش والے ہی کامیاب ہوتے ہیں، اگر آپ اسی طرح لگن سے لکھتی رہیں تو یقیناً آپ بھی کامیاب رائٹر بن جائیں گی۔

ماہی راجپوت حیدرآباد سے، ڈر کی پررونق بزم کے تمام ریڈرز، رائٹرز اینڈ اسٹاف کو سلام، امید کرتی ہوں کہ ڈر کی بزم سے منسلک تمام احباب خیروخیریت سے ہوں گے، میرا نام ماہی راجپوت ہے، تعلیم بی اے، اسکول میں جاب کرتی ہوں۔ میری فیملی میں

صرف میری پیاری امی جان ہیں۔ باقی بھائی جان اور ابو اللہ میاں جی کے پاس ہیں اللہ ان کو اپنی جوار رحمت میں جگہ فرمائیں۔ میری تنہائی کے ساتھی ڈائجسٹ ہیں۔ بالخصوص ڈر ڈائجسٹ ہے جس کی میں جنون کی حد تک دیوانی ہوں، ڈر کے لئے میرے کیا جذبات ہیں بیان کرنے سے قاصر ہوں...... مجھے بھی لکھنے کا انتہا درجہ کا شوق ہے میرے پاس کوئی وسیلہ نہیں کہ اپنے جذبات کی کیفیت سے آشنا کرا سکوں۔ مگر شاہین گروپ کی انتہائی مشکور ہوں جنہوں نے میری خزاں رسا زندگی میں بہار بھر دی۔ مجھے دکھ سکھ بانٹنے کے لئے جیسے ایک فیملی مل گئی ہو۔ میں بہت زیادہ مشہور ہوں شاہین والوں کی بالخصوص میں انعم شہزادی گجرات صاحبہ کی کہ جن کے توسط سے ڈر کو اپنے جذبات سے آگاہ کر رہی ہوں۔ اور آپی مصباح کریم میواتی کی بھی مشکور ہوں۔ میرے سب سے فیورٹ رائٹر اے وحید صاحب اور ایم اے راحت صاحب ہیں۔ ایس امتیاز احمد بھی بہت اچھا لکھتے ہیں۔ خالد شاہان صاحب بھی اپنی قابلیت کا لوہا منوا رہے ہیں۔

☆ ☆ ماہی صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں ویلکم، شاہین گروپ واقعی اپنے ممبر کا خیال رکھتے ہیں ادارہ ڈر ڈائجسٹ شاہین گروپ کا شکریہ ادا کرتا ہے اور سب کی خوشیوں کے لئے دعا گو ہے۔

بلقیس خان پشاور سے، ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ میں چند ماہ سے ہمارا نام آنا دیوانے کا خواب ہی ہوا ہے، میں تو بہت زیادہ مصروف ہو گئی ہوں، مگر اپنی مصروفیت میں اپنے پیارے ڈر کو کبھی نہیں بھولی اور نہ بھول سکتی ہوں۔ بشرط آپ بھی ہمیں یاد رکھئے گا۔ ستمبر کا شمارہ پیارے ٹائٹل کے ساتھ خوشگواریت کے ساتھ دکھائی دیا، خطوط میں تمام دوستوں کو سلام!! قسط وار تحریروں میں رولو کا اے وحید کی اچھی تحریر ہے۔ زندہ صدیاں بھی ٹھیک جا رہی ہے۔ ایم الیاس صاحب آپ کی بیماری کا سن کر دل بے چین واضطراب سے بھر گیا۔ اللہ سے آپ کی صحت کاملہ کے لئے خصوصی اور دل سے دعائیں مانگی ہیں۔

☆ ☆ بلقیس صاحبہ: دل برداشتہ نہ ہوں، طویل کہانیاں لائن میں لگ جاتی ہیں، چھوٹی کہانیاں ارسال کریں جیسے کہ عثمان غنی ارسال کر رہے ہیں۔

نشاء شہزادی بہاولپور سے، السلام علیکم! یہ میرا ڈر ڈائجسٹ میں پہلا خط ہے، میں ڈر کئی ماہ سے پڑھتی آ رہی ہوں، مجھے ڈر ڈائجسٹ سے متعرف کرانے والے میرے کزن اور بھائی خالد شاہان ہیں۔ اور بھائی ندیم عباس میواتی، سب سے پہلے میں نے قرآن کی باتیں پڑھیں بہت اچھی لگیں اس کے بعد خطوط کی محفل میں گئی...... تو بہت مزہ آیا۔ سب سے پہلے پسندیدہ رائٹر کی ناگ بھون پڑھی۔ بہت اچھی لگی، اس کے بعد احسان سحر کی سائنسی حادثہ پڑھی جو کہ بہت اچھی لگی۔ باقی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں۔ زندگی رہی تو اگلے ماہ ضرور ملاقات ہوگی، اللہ حافظ۔

☆ ☆ نشاء صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، چلئے جی ہماری دعا ہے کہ آپ تمام کزنز خوش وخرم رہیں اور ڈر ڈائجسٹ میں لکھتے رہیں۔ آپ کو ڈر ڈائجسٹ اچھا لگا اس کے لئے اور پھر آئندہ بھی خط لکھنے کے لئے ڈھیروں شکریہ۔

وثیقہ زہرہ سمندری سے، السلام علیکم! ڈر کے تمام اسٹاف اور پڑھنے لکھنے والوں کو سلام، طویل عرصہ بعد ڈر ڈائجسٹ میں شرکت کر رہی ہوں۔ ٹائٹل ہمیشہ کی طرح زبردست تھا اور میرے خیال سے یہ پاکستان کا واحد ڈائجسٹ ہے جو اپنی خوفناک کہانیوں کی وجہ سے مقبول ہے۔ سب سے پہلے قرآن کی باتیں پڑھیں جو ہمیشہ کی طرح راہ حق کی دعوت دیتی اچھی لگیں، خطوط سب نے ہی بہت اچھے لکھے تھے۔ این اے کاوش کی درندہ سبق دیتی اچھی لگی۔ رولو کا ہمیشہ کی طرح فرسٹ رہی، واقعات بدلتے رہنے کی وجہ سے بور نہیں ہونے دیتی، ایس امتیاز اور شہزادہ جاندزیب کی کہانی اچھی لگی۔ پڑھ کر مزہ آ گیا، ناگ بھون، زندہ صدیاں ابھی پڑھی نہیں، تبصرہ اگلے ماہ، عشق ناگن کی آخری قسط زبردست رہی۔

☆ ☆ وثیقہ صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں ایک مرتبہ پھر خوش آمدید، امید واثق ہے کہ آپ آئندہ ہر ماہ ڈر ڈائجسٹ میں شامل ہو کر شکریہ کا موقع ضرور دیں گی۔

فلک زاہد لاہور سے، ماہ ستمبر کا ڈر ملا سرورق اس دفعہ ڈر کے مطابق تھا، سب سے پہلے قرآن کی باتوں سے دل کو منور کیا، پھر خطوط میں گئے تو اپنا خط دیکھ کر خوشی ہوئی۔ پھر قارئین کے تبصرے پڑھ کر مزہ آ گیا، میری کہانی پسند کرنے کا بے حد شکریہ آپ سب کا، کہانیوں میں اس ماہ ہمیشہ کی طرح ایس امتیاز صاحب کی کہانی ''آسیب'' زبردست رہی۔ ضرغام محمود صاحب اس ماہ غائب تھے ان کی کمی شدت سے محسوس ہوئی، ''ہوائی مخلوق'' شکیل نیازی صاحب کی نمبرون تحریر تھی۔ اس کے علاوہ عطیہ زاہرہ صاحبہ کی ''مجسمہ'' کچھ

کچھ بہتر رہی۔ ''مار گنج'' طاہرہ آصف کی پہلی بار کسی تحریر نے متاثر کیا، شاباش جبکہ ''ناگ بھون'' خالد شاہان کی لاجواب تحریر تھی، اپنی نئی کہانی بھیج رہی ہوں۔ یقین ہے آپ کو پسند آئے گی اب اجازت چاہتی ہوں۔ اللہ حافظ۔

☆☆ فلک صاحبہ: خط لکھنے کہانیوں کی تعریف اور نئی کہانی ارسال کرنے کے لئے ویری ویری تھینکس، امید ہے اگلے ماہ بھی نوازش نامہ بھیجنا بھولیں گی نہیں۔ Thanks۔

محمد علی چغتائی خیر پور ٹامیوالی سے، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، احوال آنکہ خاکسار گزشتہ ایک سال سے ڈر ڈائجسٹ کا خاموش قاری ہوں۔ متعدد بار جی میں آیا کہ اس رسالہ کی توصیف وتعریف حوالہ مکتوب الیہ ارسال خدمت کروں، مگر اندیشہ نظر اندازی کے سبب دل کی دل میں رکھ کر خاموش رہ گیا۔ جب سے شوق مطالعہ ہوا تب سے اندازاً 2000 سے متفرق زائد کتاب ہائے موضوعات سے علم وعرفان کشید کر چکا ہوں لیکن بلا مبالغہ رقم طراز ہوں کہ ڈر ڈائجسٹ منفرد نوعیت کا ماہنامہ ہے جو اہل ذوق بالخصوص خوفناک کہانیوں کے دلدادہ قارئین کی صحیح معنوں میں تشفی و دل بستگی کر رہا ہے۔ دریں بناء خط لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ ایک عاجزانہ صلاح پیش خدمت حضور کرنا مقصود تھی جو مصنف حضرات بلاشبہ اپنی خوبصورت تحاریر صفحہ قرطاس پر لاتے ہیں اگر ان کی تصاویر بھی ان کی تحاریر کے ساتھ چسپاں ہوں تو کہانی پڑھنے کا لطف دوبالا ہو جائے، مصنف حضرات سے اجازت کا خواستگار ہوں کہ اگر میں ان کی تصانیف کو احاطہ تنقید میں لاؤں تو مزاج پر گراں نہ گزرے گا۔ رسالہ ہذا میں یوں تو سبھی داستانیں موتی مالا کے مانند ہیں۔ لیکن رولوکا کو اگر دور حاضر کی الف لیلٰی سے تشبیہ دی جائے تو کوئی امر مانع نہ ہوگا ہر داستان اپنی جگہ مکمل اور کمال کی منظر کشی کی حامل ہوتی ہے، استدعا ہے کہ اسے کم از کم آئندہ دس سالوں تک محیط کیا جائے۔ آخر میں اس دعا کے ساتھ اجازت چاہوں گا کہ خدائے بزرگ وبرتر اس رسالہ کو مدتوں قائم ودائم رکھے۔ آمین۔

☆☆ محمد علی صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، آپ نے جو کچھ بھی لکھا بہت خوب لکھا اور اب قوی امید ہے کہ آپ ہماری خوشی کے لئے آئندہ بھی خلوص نامہ ارسال کرتے رہیں گے۔ کامیاب رائٹر حضرات تنقید سے اپنی اصلاح کرتے ہیں، آپ بصد شوق اپنی پسند کا اظہار کر سکتے ہیں، آئندہ بھی خلوص نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔

ریاض حسین قمر منگلا ڈیم سے، مدیر محترم سلامت الفت امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے، ماہ ستمبر کا ڈر ڈائجسٹ باصرہ نواز ہوا، ٹائٹل سے ہی اس کی سج دھج واضح ہوگئی، قرآن کی باتیں تو شمارہ کی جان ہوتی ہیں، آپ کا اداریہ پڑھ کر مجھے ایک پرانی کہاوت یاد آ گئی، کہتے ہیں کہ ایک بادشاہ بھیس بدل کر نکلا راستے میں ایک اناروں کا باغ پڑتا تھا، بادشاہ وہاں رکا اور مالی سے ایک گلاس انار کا جوس مانگا اس نے بادشاہ کے سامنے ایک انار نچوڑا تو گلاس رس سے بھر گیا۔ بادشاہ نے سوچا اتنے قیمتی اناروں کا باغ اور اس پر ٹیکس نہیں لگا ہوا میں دربار میں بیٹھتے ہی اس پر ٹیکس لگانے کے احکامات جاری کروں گا۔ پھر اس کا دل ایک گلاس اور پینے کو چاہا تو اس نے مالی سے فرمائش کر دی مالی نے بادشاہ کے سامنے تین انار نچوڑے مگر گلاس نہیں بھرا بادشاہ نے وجہ پوچھی تو مالی نے دست بستہ عرض کیا کہ مجھے لگتا ہے میرے بادشاہ کی نیت میں فطور آ گیا ہے اس لئے پھلوں میں رس سوکھ گیا ہے وہ تو ایک بادشاہ کی نیت میں فطور آیا اور پھلوں میں رس سوکھ گیا۔ ہمارے وطن عزیز میں تو بے شمار ایسے ہیں جن کی نیت میں فطور آیا ہوا ہے۔ ویسے بھی عملوں کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ ایک گاڑی کے پیچھے بڑی خوب صورت بات لکھی ہوئی تھی کہ ''نئیں وسدے گھر بدنیتاں دے'' یعنی بدنیت لوگوں کے گھر کبھی آباد نہیں ہوتے، یہ پیارا وطن بھی تو ہمارا گھر ہی ہے بھلا کیسے آباد ہو، جو کچھ یہاں ہو رہا ہے، اس کے لئے تو ڈر ڈائجسٹ جیسا پورا شمارہ درکار ہے۔ زیر نظر شمارہ ہر لحاظ سے پرفیکٹ ہے، اس کی ترقی کے لئے دن رات دعا کرتا ہوں، رب ذوالجلال آپ کی بے لوث کوششوں کو ہمیشہ ثمر بار فرمائے۔ ''آمین۔''

☆☆ ریاض صاحب: آپ کی باتیں حقیقت پر مبنی ہیں، کاش کہ ہمارے ملک کے ارباب اختیار کے ساتھ ساتھ ہر شخص اپنے منصب کا احساس کرتے ہوئے اپنی نیت اور سوچ کو بدل ڈالے تو ہمارا ملک خوشیوں کا گہوارہ بن جائے۔ کاش کہ ہم تمام پاکستانیوں کے دل میں بیٹھ جائے کہ ایک نہ ایک دن ہمیں اپنے عمل کا حساب دینا ہے، اس وقت کیا ہوگا، خیر آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ ضرور بھیجئے گا۔ Thanks۔

طارق محمود کامرہ کلاں اٹک سے، 21 اگست کو ستمبر کا ڈر ملا جس کا مجھے واقعی شدت سے انتظار رہتا ہے، قرآن کی باتیں

مشعل راہ لیکن ان کے لئے جو کہ ان کو سمجھ کر ان پر عمل بھی کریں اس کے بعد خطوط کی محفل میں خالد صاحب کا اداریہ پڑھا ہم عام عوام کے دل پر ایسے تجزیے ادارے نصیحت ایک اثر ڈالتی ہے پتا نہیں وہ وقت کب آئے گا جب ایسی باتیں ارباب اختیار کے دل پر اثر کریں گی اور وہ ان تمام مسائل کو ذاتی مسائل سمجھ کر حل کرنے کی کوشش کریں گے۔ خطوط کی محفل میں کچھ تعریفیں کچھ تنقید پڑھتے ہوئے آگے بڑھے اور سب سے پہلی کہانی این اے کاوش کی درندہ پڑھی پہلی ہی کہانی سطر سطر رونگٹے کھڑی کرتی سسپنس سے بھرپور تھی، دیگر کہانیاں بھی زبردست تھیں۔ اس دفعہ قوس قزح کے رنگ بہت اچھے لگے۔ ڈر کی ترقی کے لئے شب و روز دعا گو ہوں۔

☆☆ طارق صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ، خوش ہوجایئے خونی موبائل شامل اشاعت ہے، اور ہاں آئندہ ماہ بھی کہانی و نوازش نامہ بھیجنا بھول نہ جایئے گا مت۔

ایس امتیاز احمد کراچی سے، السلام علیکم! امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا! ماہ رواں کا ''ڈر ڈائجسٹ'' سامنے ہے۔ دلفریب ٹائٹل کے ساتھ تمام تر سلسلے خوب رہے۔ کافی نئے لکھنے والے ''ڈر'' کی محفل میں آرہے ہیں۔ ''ڈر'' کا کلیکشن بہت عمدہ ہو رہا ہے۔ ڈر کی محفل کا جواب نہیں۔ ہمارے آرٹیکلز لگانے کا شکریہ۔ میٹرز آپ کے پاس ہیں۔ پلیز دیکھئے گا۔! مزید Ad میٹر میں، موت کے منہ میں ترجمہ، غزل، مراسلہ ارسال خدمت ہیں۔ پلیز قریبی اشاعت میں جگہ دیں، آپ کو اور دیگر اسٹاف اور ڈر ڈائجسٹ کے تمام خوب صورت لکھنے والے رائٹرز اور تمام خوب صورت پڑھنے والے و یورز کو دعا سلام، پلیز اپنا خیال رکھئے گا۔!

☆☆ امتیاز صاحب: خلوص بھرے چاہت کے لئے ویری ویری تھینکس، تجزیہ میں کنجوسی ٹھیک نہیں، اللہ آپ کو خوش و خرم رکھے۔ آمین۔

قیصر جمیل پروانہ ماموں کانجن سے، ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ ستمبر 2015ء کا شمارہ 23 کو فیصل آباد سے ملا، سب سے پہلے خالد شاہان کی اسٹوری پڑھی بہت ہی اچھی لگی اور باقی تمام اسٹوریاں بہت ہی اچھی تھیں، 30 مئی کو میرے والد محمد جمیل پروانہ انتقال کر گئے تھے وہ دن میرے لئے قیامت سے کم نہ تھا، قارئین کرام نے کافی دکھ کا اظہار کیا۔ سب کا شکر گزار ہوں، جنہوں نے ہمارے غم کو اپنا سمجھا، پہلے سے میری کئی کہانیاں آپ کے پاس ہیں۔ اور ایک کہانی ظلم کے نام سے بھیج رہا ہوں، پلیز پلیز مجھے مایوس مت کرنا۔

☆☆ قیصر صاحب: پلیز گھبرائیں نہیں، آپ کی کہانی بھی ضرور شائع ہوگی، امید ہے اگلے ماہ شامل اشاعت ہو، مگر ہر ماہ تجزیہ ضرور بھیج دیا کریں۔

محمد ابو ہریرہ بلوچ بہاول نگر سے، ڈر کی بزم گلستان سے منسلک تمام چہکتے قارئین جملہ اسٹاف اور قلمکاروں کو سلام۔ ستمبر کے پرچے کا جس قدر شدت سے انتظار تھا خدا ہی جانتا ہے کہ شاید میری ادبی کاوش ڈر کے اوراق کی زینت بنے، مگر شمارہ ہاتھ میں آتے ہی ساری خوشی کافور ہوگئی، یہ سچ ہے کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے پر اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انتظار موت سے بھی زیادہ سخت ہے، مارچ 2015ء کے شمارے میں آپ نے میری کاوش کو شائع کر کے میری ہمت کو مزید ہوا دی۔ اور میں نے کہانی ارسال کردی۔ ستمبر کا شمارہ میرے سامنے ہے۔ ٹائٹل زبردست رہا، قرآن کی باتیں معلومات افروز تھیں، میری دعا ہے کہ ڈر ڈائجسٹ مزید ترقی کرے۔

☆☆ ابو ہریرہ صاحب: آپ کی پہلی کہانی شائع ہوئی، آپ نے اندازہ لگایا ہوگا کہ کہانی کس قدر اصلاح طلب تھی، محترم یہ ضروری تو نہیں کہ ہر کہانی سلیکٹ ہوجائے جبکہ لکھتے لکھتے آدمی لکھاری بنتا ہے، ایک کہانی ارسال کر کے بیٹھ رہنا کیا یہ دانشمندی ہے، امید ہے غور کرتے ہوئے دوسری کہانی ارسال کریں گے۔ Thank۔

ساحل ابڑو ڈیرہ اللہ یار بلوچستان سے، ماہ ستمبر کا تازہ شمارہ ڈر ڈائجسٹ، آپ کی محبتوں اور شفقتوں سے ادبی خوشیاں بکھیرتے ہوئے ہم غریبوں کے غریب خانے پر پہنچا، بہت بڑی خوشی ہوئی، بہت بہت شکریہ، شمارے میں موجود تمام تحریریں زبردست تھیں۔ ایک غزل ڈر کی سالگرہ کے لئے اور آزاد نظم بھیج رہا ہوں، قریبی اشاعت میں جگہ دے کر شکریہ کا موقع دیں گے۔ والسلام۔

☆☆ ساحل صاحب: آپ کا خلوص نامہ پڑھ کر دلی خوشی ہوئی، آپ کو ڈر ہر ماہ لیٹ ملتا ہے یہ بھی شکر کریں کہ مل جاتا ہے ورنہ اپنے پیارے وطن میں تو بہت کچھ نہیں ملتا، مثلاً سکھ چین، دعائیں کرتے رہیں ایک نہ ایک دن ہمارا ملک بھی خوشیوں کا گہوارہ بن جائے گا، خط ضرور بھیجا کریں۔

ایم نادر شاہ شجاع آباد سے۔السلام علیکم! ڈر کے تمام اسٹاف ،لکھاری اور قاری کو میرا پیار و محبت بھرا سلام۔ایڈیٹر صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ جو میرا خط شائع کیا،اس امید سے خط لکھ رہا ہوں کہ یہ خط بھی شائع کیا جائے گا،سب سے پہلے میں ان دوستوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے مجھے یاد رکھا۔ مہر شاہد رفیق سہو قاسم رحمان.....ابو ہریرہ بلوچ،تو دوستو کیا حال ہے آپ کا......؟؟؟ ستمبر کا خوب صورت شمارہ میرے ہاتھ میں ہے۔ٹائٹل بہت زبردست ہے۔سب سے پہلے قرآن کی باتیں پڑھیں، جسے پڑھ کر دلی سکون محسوس ہوا،اس کے بعد خطوط کی محفل میں جو خالد علی صاحب نے لکھا......وہ بہت اچھا لکھا۔کہانیوں پر سرسری نظر دوڑائی،تمام کہانیاں تعریف کے قابل ہیں،مگر رولو کا سب سے اچھی ہے۔میری خوشی ہے کہ شاہین گروپ والے ڈر ڈائجسٹ میں بھرپور شرکت کریں۔پلیز جلدی حاضری دیں۔ہاں تو ایڈیٹر صاحب آپ کے کہنے پر میں نے اسٹوری لکھ لی ہے۔بہت جلد آپ کو موصول ہو جائے گی۔پلیز بتانا کہ میری اسٹوری کب شائع ہوگی۔

☆☆ نادر صاحب: بہت بہت شکریہ کہ آپ نے کہانی لکھ لی،جلد از جلد ارسال کردیں۔عین نوازش ہوگی۔

ملک این اے کاوش سلانوالی سے۔السلام علیکم! تمام دوستوں کا از حد مشکور ہوں جو وقتاً فوقتاً تعریف و تنقید کے ذریعے میری حوصلہ افزائی کرتے رہتے ہیں۔بندہ ناچیز میں کہاں اتنی جسارت کہ پہلی سیڑھی پر قدم رکھے اور منزل کو پالے۔پندرہ سال کے طویل عرصے میں گزشتہ دو سال سے جو پذیرائی ڈر ڈائجسٹ کی طرف سے مل رہی ہے۔اس کے لیے ادارے کا از حد مشکور ہوں۔آپ لوگوں کی پزیرائی کی بدولت ہی اتنی محنت کررہا ہوں۔اور ہمہ وقت کوشش یہی ہوتی ہے کہ پہلے سے کچھ بہتر لکھوں۔جو نہ صرف قارئین کے دل کو بھائے بلکہ ادارہ ہذا بھی سراہے۔ستمبر کے شمارے میں لکھی گئی ہر کہانی اپنی نوعیت کی انوکھی،دلچسپ اور قابل داد کہانی ہے۔ ادارے کا بہت مشکور ہوں کہ پذیرائی کی انتہا کرتے ہوئے میری کہانی کو پہلے نمبر پر شائع کیا گیا ہے۔ڈر ڈائجسٹ کا ستمبر کا شمارہ قابل تعریف ہے۔تمام رائٹرز کی کہانیاں بہت پسند آئیں۔عشق ناگن اپنی انتہا کو پہنچی لیکن اس کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔رولو کا ایک بے مثال کہانی ہے جس کی ہر قسط اپنے ساتھ ایسا قیمتی مواد لے کے آتی ہے کہ دل خوش ہو جاتا ہے۔تمام دوستوں سے اپیل ہے کہ اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں۔

☆☆ کاوش صاحب: انسان کی کارکردگی اسے اعلیٰ مقام عطا کرتی ہے کوشش اور زیادہ کوشش سے ہی کامیابی قدم چومتی ہے ڈر ڈائجسٹ کی یہی تو خوبی ہے کہ ہر کسی کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اگر تحریر میں جان ہو تو،کہانی کے علاوہ دیگر تحریر آپ بصد شوق ارسال کریں آئندہ آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔Thanks

مریم مرتضٰی اسلام آباد سے۔السلام علیکم! ڈر ڈائجسٹ کا تازہ شمارہ ابھی مکمل طور پر نہیں پڑھا۔جتنا پڑھا بہترین تھا۔ایس امتیاز احمد کی تحریروں کا فریب،اور عطیہ زاہرہ کی نشانات ماضی بہت پسند آئیں۔میں ڈر کافی عرصے سے پڑھ رہی ہوں لیکن خطوط کی محفل میں صرف ایک بار ہی شرکت کی تھی۔میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ میں کیا کسی انگلش کہانی کا ترجمہ مصنف کے اصل نام سے بھیج سکتی ہوں یا نہیں،ہمارے لکھاریوں کا Vampire کے بارے میں Concept تھوڑا غلط ہے۔تو میں اسی Topic پر ایک تحریر Send کرنا چاہتی تھی۔

☆☆ مریم صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم اس کے لئے بہت بہت شکریہ کے ڈر ڈائجسٹ کی کہانیاں آپ کو اچھی لگتی ہیں۔ آپ انگلش کہانی کا ترجمہ اصل مصنف کے نام سے بھیج دیں۔ترجمہ میں اپنا نام ڈال دیجئے گا۔شکریہ

طاہر عباس شجاع آباد سے۔السلام علیکم! امید ہے تمام قارئین رائٹرز اور ڈر ڈائجسٹ کا پورا اسٹاف خیریت سے ہوگا۔سب سے پہلے ایڈیٹر صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے میرا خط شائع کیا۔اب اسٹوری کا انتظار ہے۔دیکھتے ہیں کب شائع ہوگی۔اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف ناگ بھون،انگارے،درندہ،خطرناک سائے،فرسٹ نمبر پر ہیں۔ہوائی مخلوق،اندھیری رات،مار گنج، سائنسی حادثہ،قاتل تصویر،اور خطرناک سائے دوسرے نمبر پر ہیں۔جب کہ پر ہول سناٹا،آسیب،تصویر کا قیدی موت کا نقشہ،تیسرے نمبر پر ہیں،عشق ناگن کی آخری قسط بہت پسند آئی۔

☆☆ طاہر صاحب: کیا یہ اچھا نہیں ہوتا کہ آپ ایک دو کہانیاں اور ارسال کردیں۔ایک کہانی بھیج کر خاموش بیٹھ جانا یہ بھی ٹھیک نہیں۔آپ کی کہانی کا آئندہ ماہ بھی شدت سے انتظار رہے گا۔

محسن عزیز حلیم کوٹھا کلاں سے۔السلام علیکم! ڈر سے منسلک تمام قارئین اسٹاف اور رائٹرز کو دلی سلام امید ہے کہ سب خیر وعافیت سے ہوں گے۔ ستمبر کا شمارہ میرے ہاتھوں میں تمام خوفنا کی اور دلکشی کے ساتھ۔ So Said میں تو ہر ماہ وقت پر خط ارسال کرتا ہوں پر شامل اشاعت نہیں ہوتا But میں آپ سے بالکل بھی ناراض نہیں ہوں خط شائع نہیں ہوا اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم آپ سے تعلق ختم کر دیں۔ Never قرآن کی باتیں ہمیشہ کی طرح بہت اچھی تھیں خطوط کی محفل میں عامر زمان عامر، ملک ناز، ظہور احمد صائم سلطان باقر علی کے خطوط پسند آئے۔ کہانیوں میں ناگ بھون مارگنج پہلے نمبر پر رہیں۔ انگارے پہلی قسط تو ٹھیک تھی خیر آگے پتہ چلے گا۔ باقی سب کہانیاں اپنی اپنی جگہ ٹھیک تھیں۔ ایم الیاس کے لئے دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں صحت کامل عطا فرمائیں ایک کہانی ارسال کی تھی نوک پلک سنوار کر قریبی شمارے میں جگہ دیجئے گا۔ اب مجھے اجازت دیجئے ڈر کے لئے شب وروز دعا گو ہوں۔

☆☆ محسن صاحب: بقول آپ کے ایک کہانی ارسال کی تھی تو محترم ایک نہیں بلکہ کئی کہانی ارسال کر دیں۔ تاکہ کوئی تو شائع ہو، نئے رائٹروں کے لئے یہ ضروری ہے کہ زیادہ کوشش کرتے ہیں۔ امید ہے سمجھ گئے ہوں۔ اگلے ماہ بھی نوازش نامہ ضرور بھیجئے گا۔

مزمل خان دریا خان سے، السلام علیکم! ماہ ستمبر کا ڈر ڈائجسٹ بڑے انتظار کے بعد ملا سارے رائٹر حضرات دل کھول کر محنت کر رہے ہیں۔ میں ایک خاموش قاری ہوں اور کافی عرصہ سے ڈر کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ محمد خالد شاہان ایک اچھے لکھاری ہیں۔ اللہ ان کے قلم میں اور زور ڈالے خالد شاہان کی کہانیاں پڑھ کر دل جھوم کا اٹھتا ہے۔ ایڈیٹر صاحب سے گزارش ہے کہ ہر ماہ خالد شاہان کی کہانی ضرور شائع کریں۔ ہم سب ڈر کا مطالعہ بڑے شوق سے کرتے ہیں۔

☆☆ مزمل صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید۔ آپ کی خوشی کے لئے اس ماہ بھی خالد شاہان کی کہانی شامل اشاعت ہے۔ آئندہ ماہ بھی خط لکھتا بھولئے گا مت۔ شکریہ

ضرغام محمود کراچی سے، امید ہے مزاج گرامی بخیریت ہوں گے۔ آپ کا محبت نامہ بشکل ڈر ڈائجسٹ موصول ہوا۔ جب ستمبر 2015ء کا شمارہ موصول ہوا تو میں ہسپتال کے بستر پر لیٹا تھا۔ اصل میں مجھے ٹائیفائیڈ ہو گیا تھا ٹائیفائیڈ ہونا کوئی بڑی بات نہیں ہے مگر ٹائیفائیڈ صاحب کی خاطر مدارت میں ہم سے کوئی کمی رہ گئی۔ جس کی وجہ سے ٹائیفیڈ صاحب کو غصہ آ گیا اور وہ شدید بگڑ گئے۔ اور ان کا سارا غصہ ہمارے جسم ناتواں پر گرا لہٰذا ہسپتال تک آنا پڑا ڈاکٹر صاحب مسیحا بن کر آئے ورنہ ہم تو سوچ رہے تھے ہمارے دائیں پیر کے تکورے پر جو تل ہے (تکوے پر تل سفر کی نشانی ہوتا ہے) اس کا مقصد شائد اب پورا ہو جائے گا مگر ڈاکٹر صاحب ہمارے سفر کی راہ میں دیوار بن گئے ورنہ ہم نے تو سامان باندھ لیا تھا ویسے بھی ہماری مرضی سے تو یہاں کچھ ہوتا نہیں ہے جو ہم فکر کریں۔ ''لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے، خوشی اپنی آئے نہ اپنی خوشی چلے'' سو یہ خط آپ کو ہسپتال کے بستر پر لیٹ کر لکھ رہا ہوں۔ موجودہ شمارے میں سلسلے وار کہانیاں اپنی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ عمدگی سے آگے بڑھ رہی ہیں۔

☆☆ ضرغام صاحب: ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو جلد از جلد کلی صحت عطا کرے اور زندگی کی تمام جائز خوشیوں سے نوازے، ویسے اسپتال کے بستر بھی نرم وگداز ہوتا ہے اور خدمتگار کا تو نہ پوچھئے۔ خیر جلد ملاقات کے لئے دعا گو ہوں۔ اللہ حافظ

اکبر غوری بھکر سے، السلام علیکم! سب سے پہلے ڈر کی پوری ٹیم کو السلام علیکم! میں نے پہلی بار ایک لمبے سفر پر ڈبے میں موجود ایک مسافر سے ڈر ڈرائجسٹ مانگا اور اس کا مطالعہ کیا اور سفر کا پتہ ہی نہیں چلا اس میں خالد شاہان کی کہانی پڑھی جو کہ بہت ایڈوانچر اور خوف ناک تھی دل کرتا تھا کہ ساری کہانی یعنی پورا ڈرائجسٹ اس کی کہانیوں سے مکمل ہوتا میں فرسٹ ٹائم خط لکھ رہا ہوں اس امید پر کہ میرا خط بھی شائع ہوگا۔

☆☆ اکبر صاحب: ڈرڈائجسٹ میں ویلکم، امید ہے آپ آئندہ بھی ڈر ڈائجسٹ میں نوازش نامہ بھیجنا بھولیں گے نہیں۔ خالد شاہان کی خاطر۔

اسداللہ بھٹی بھکر سے، السلام علیکم! ڈرڈائجسٹ کو پڑھتے پڑھتے لکھنے کا جنون پیدا ہو گیا ہے۔ ستمبر کا شمارہ جلد مل گیا۔ کہانیوں میں خالد شاہان کا ناگ بھون، رولو کا اے وحید کا، زندہ صدیاں ایم راحت کا، عشق ناگن ایم الیاس کی، یہ سب کہانیاں اچھی تھیں۔ خالد شاہان کی کہانی پڑھ کر دل جھومنے لگا۔ خالد شاہان بہت اچھے رائٹر ہیں میری دلی خواہش ہے کہ خالد شاہان کی کہانی شائع کی جائے۔

☆☆ اسداللہ صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف اور آئندہ ماہ بھی ڈر ڈرائجسٹ کو یاد رکھنے کے لئے ڈھیروں شکریہ اللہ کرے آپ کی خواہش جلد پوری ہو۔

عبدالقدیر خان گڈوالہ روڈ بھکر سے، السلام علیکم! ڈر کی پوری ٹیم کو میری طرف سے سلام قبول ہو، ستمبر کا ڈر ڈائجسٹ بہت جلد مل گیا سب کہانیاں اچھی تھیں۔ خاص طور پر بھائی خالد شاہان کی ناگ بھون، اے وحید کا رولو کا، عشق ناگن اور زندہ صدیاں یہ سب کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ خالد شاہان سے میری گزارش ہے کہ وہ اپنی قسط وار کہانی شائع کرائیں۔ میں ڈر کا ایک خاموش قاری ہوں اور ڈر کو پڑھتے پڑھتے لکھنے کا جنون بھی سوار ہوگیا ہے اب ہر ماہ خط کے ساتھ حاضر ہوتا رہوں گا۔ والسلام

☆☆ عبدالقدیر صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی پسندیدگی کے لئے شکریہ، آپ کے خط کا آئندہ ہر ماہ شدت سے انتظار رہے گا۔

محمد اسلم جاوید فیصل آباد سے، السلام علیکم! خیر و عافیت اور نیک دعاؤں کے ساتھ حاضر ہوں اس بار ڈر ڈائجسٹ ذرا لیٹ ہوگیا کافی دنوں سے مصروفیات سے وقت نکال کے دوبارہ شہر جانا نصیب ہوا اور بک اسٹال پر ماہ ستمبر کے پرچے سے ملاقات ہوگئی بڑی شوخ نگاہوں سے ہماری طرف دیکھا ہم بھی آخر کار مسکرا دیئے۔ سرورق ماہ ستمبر کے حوالے سے بہت ہی خوبصورت حسین رنگوں سے مزین تھا۔ خط اور غزل شائع کرنے کا شکریہ! آپ کا خلوص اور محبت ہی آپ کو خط تحریر کرنے پر مائل ہوتی ہے ویسے ڈر ڈائجسٹ کے تمام سلسلے اپنی اپنی جگہ پر انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ ہیں یہ ایک معیاری پرچہ ہے جس کا مقررہ تاریخ پر ہمیں بڑی بے تابی سے انتظار ہوتا ہے غزلیں خوب تھیں تمام کہانیاں اپنی اپنی جگہ پر اچھی تھیں تمام قلمکاروں کو میری جانب سے مبارک ہو، ڈر کی ترقی کے لئے شب و روز دعا گو ہوں۔

☆☆ اسلم صاحب: آپ کا خلوص بھرا خط پڑھ کر دلی سکون ملتا ہے آپ کی محبت ڈر ڈائجسٹ سے واقعی قابل دید ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو خوش و خرم اور اپنے فضل و کرم سے نوازے۔

شرف الدین جیلانی ٹنڈوالہ یار سے، السلام علیکم! امید ہے مزاج بہ خیریت ہوں گے جس طرح آپ نے چاندرات کو رسالہ قارئین تک پہنچایا آپ کی ذہانت کی قدر نہ کرنا زیادتی ہوگی بہت شکریہ۔ شریک حیات کی وفات کے بعد پہلا تہوار احباب مہمانوں کی یلغار نے پہلی مرتبہ بے تحاشہ رسالے کو سینے سے لگائے روتے دیکھا تو حیران ہوکر خود رسالے میں آپ کی مہربانی سے میرے منتخب اشعار اور غزل پڑھ کر خود بھی رونے لگے میں آپ کو دعائیں دیتا رہا موقع مناسب سے اشعار غزل شائع کر کے میرا دل جیت لیا بہت شکریہ۔ تیرے بغیر عید میں وہ رونقیں کہاں بے کار سا ہے میرے لئے عید کا سماں......

☆☆ شرف الدین صاحب: شاعر نے کیا ہے کہ دنیا ہے سکھ سے خالی دکھ چار سو بھرا ہے غم کے سوا یہاں پر سوچو تو کیا دھرا ہے بہرحال زندگی تو گزارنی ہے ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش و خرم رکھے دنیا کی ریت ہے کہ اوروں کے لئے بھی غم جھیلنا پڑتا ہے آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ ضرور بھیجئے گا۔

اسد اللہ بھٹی بھکر سے، السلام علیکم! میں ڈر کا پرانا قاری ہوں اور باقاعدگی سے اسے پڑھتا ہوں، ستمبر کے شمارے میں خالد شاہان کی کہانی ناگ بھون بہت اچھی لگی۔ اے وحید کے قلم سے شاہکار کہانی رولو کا پڑھ کر دل جھومنے لگا۔ امید ہے اسی طرح کی کہانیاں شائع کرتے رہیں گے۔ یہ میرا پہلا خط ہے، خط شائع ہوگیا تو کہانیاں بھی بھیجتا رہوں گا۔

☆☆ اسد اللہ صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف اور آئندہ بھی خط بھیجنے کے لئے شکریہ قبول کریں، اب آپ ہر ماہ خالد شاہان کی کہانی ڈر میں پڑھنا نہ بھولئے گا۔

عثمان غنی پشاور سے، السلام علیکم! کچھ عرصے سے ڈر سے کیا دور ہوا، آپ نے تو بھلا ہی دیا۔ آپ سب خوش و خرم رہیں اور ہنستے مسکراتے رہیں۔ ڈر ڈائجسٹ ستمبر 2015 کا شمارہ ملا، ٹائٹل ڈر کے عین مطابق تھا۔ کہانیوں میں اپنی کہانی خوفناک انجام دیکھ کر دلی مسرت ہوئی۔ ہم تو سمجھ بیٹھے تھے آپ نے بھلا دیا ہے۔ ہم نے بھی دلبرداشتہ ہوکر لکھنا چھوڑ ہی دیا تھا، مگر یہ کہانی ہمارے لئے انرجی ڈوز کی طرح تھی۔ اس کہانی کو دیکھ کر سالگرہ نمبر کے لئے پوری کہانی خط، غزل، نظم ہر چیز لاکھ ڈالی اور بڑی محنت سے لکھی ہیں۔ قسط وار تحریروں میں رولو کا اچھی جا رہی ہے۔ زندہ صدیاں پل پل بدلتی کہانی ہے۔ اللہ پاک سے دعا خصوصی ہے کہ جلد سے جلد ایم الیاس صاحب کو صحت کاملہ عطا فرمائیں۔ آمین۔

☆☆ عثمان صاحب: ڈر ڈائجسٹ کسی کا بھی دل نہیں توڑتا، ہر کسی کی تحریر چھوٹی بڑی شائع ہوتی ہے، دل برداشتہ نہ ہوا کریں، پھر ملیں گے اللہ حافظ، کہانی شامل اشاعت ہے۔

میر اعوان گل ڈھوک سے، السلام علیکم! امید ہے سب خیریت سے ہوں گے۔ اللہ پورے ڈرڈائجسٹ کے لکھنے اور پڑھنے والوں کو سلامت رکھے۔ کہانیوں کی اگست کا شمارہ 28 جولائی کو مل گیا تھا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے خوفناک انجام، پیارے بھائی عثمان غنی کی پڑھی جو کہ بہت مزے کی تھی، اس کے بعد نشانات ماضی سیدہ عطیہ زاہرہ کی کہانی اچھی لگی۔ شہزادہ جانذیب کی کہانی بھی ویری گڈ تھی، عشق ناگن کی آخری قسط زبردست تھی۔ زندہ صدیاں اور رولو کا قسط وار بہت اچھی جارہی ہے۔ باقی کہانیاں بھی ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ میری دعا ہے کہ ڈرڈائجسٹ خوب ترقی کرے۔

☆☆ میر اعوان صاحب: ڈرڈائجسٹ میں ویلکم، آپ بصد شوق کہانی بھیج سکتے ہیں، اگر اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی اور ہاں اگلے ماہ بھی نوازش نامہ بھیجنا بھول نہ جائیں۔

محمد خالد شاہان صادق آباد سے، السلام علیکم! ایڈیٹر صاحب، امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ ماہ ستمبر کا فریش رسالہ سامنے ہے۔ جس میں قرآن کی باتیں پڑھ کر سکون مل گیا۔ اور قارئین کے خطوط ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ خطوط کی محفل اور ماہنامہ ڈرڈائجسٹ ایک خاندان کی طرح ہے۔ جس میں چار چار ہے ہیں تو دس نئے آرہے ہیں اور ان قارئین کا میں تہہ دل سے مشکور ہوں جنہوں نے میری کہانی کو سراہا۔ ایم الیاس اور ایس امتیاز احمد صاحب کے تہہ دل سے دعا گو ہوں کہ اللہ ان کو صحت یابی اور لمبی عمر عطا فرمائے۔ آمین۔ کہانیوں میں آسیب، عشق ناگن، زندہ صدیاں، درندہ، سائنسی حادثہ، انگارے، مجسمہ اچھی تحریریں ہیں اور رولو کا کافی بہترین جارہی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر کہانیاں بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ آئندہ بھی میری کوشش ہوگی کہ خوب سے خوب تر کہانیاں لکھوں، ڈر کی ترقی کے لئے شب و روز دعا گو ہوں۔

☆☆ خالد صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ۔ خوش ہوجائیں۔ خون آشام شامل اشاعت ہے۔

مدثر بخاری شہر سلطان سے، محترم ایڈیٹر صاحب آداب عرض، ستمبر کا ڈرڈائجسٹ موسم بارش میں ملا، بھیگا ہوا رومانٹک سا...... ٹائٹل بھی رومانٹک تھا...... خطوط بھی اچھے تھے۔ ان تمام کرم فرماؤں کا شکریہ جنہوں نے میری تحریر خونی سفر کو پسند کیا، کوشش ہوگی کہ اس سے زیادہ اچھی تحریر لکھوں۔ کہانیوں میں مارگنج اچھی لگی، درندہ کا جواب نہیں، کاوش بھائی کی بہترین کاوش، سائنسی حادثہ خوب تھا۔ احسان سحر نے خوب سحر پھونکا۔ مجسمہ عطیہ زاہرہ نے تیار کیا، اور خوب سنوار کے پیش کیا۔ آسیب کا احوال سنایا ایس امتیاز احمد نے، جو اپنی مثال آپ تھا اور ڈر کو 17 ویں سالگرہ مبارک ہو۔ وقت گزرتے پتہ ہی نہ چلا اور مجھے یاد ہے۔ کل ہی کی بات لگتی ہے جب ڈر سے میری وابستگی ہوئی تھی، فروری 2011......! 2013 تک میں تعلیمی مصروفیات میں رہا اور پھر اب تک جتنا ڈر نے تعاون کیا، وہ ناقابل بیان ہے۔ میری کوشش ہوگی کہ ڈر کے لئے اچھی اچھی اور بہترین تحریریں لکھوں، دل سے لکھتا ہوں، مگر کبھی کبھی ٹاپک سے ہٹ بھی جاتا ہوں، جو نامناسب ہے۔ مگر آگے آپ کو شکایت نہیں ملے گی۔ نرم گرم اسٹوریز کے لئے معذرت......! بلاعنوان حاضر ہے...... پڑھ کر بتایئے گا۔

☆☆ مدثر صاحب: فرشتہ اجل شامل اشاعت ہے۔ نئی کہانی جلد از جلد بھیج دیں۔ اس کے لئے ڈھیروں شکریہ قبول کریں۔

رانا حبیب الرحمن سینٹرل جیل لاہور سے، محترم آپ کا خط ملا، کچھ تلخ بھری باتیں ہیں کچھ زہر سے جملے، پھر بھی میں خوش ہوں کہ چلو کچھ تو لکھا ہے۔ جناب جب بورڈ کے امتحانات ہوتے ہیں تو سینکڑوں بلکہ لاکھوں طلبہ وطالبات امتحان دیتے ہیں، ان سب میں صرف ایک ٹاپ کرتا ہے، اور دیگر پاس اور پھر کچھ فیل بھی ہوجاتے ہیں جبکہ ہر طالب علم یہی کہتا ہے کہ میں نے تو تمام سوالات بالکل ٹھیک ٹھیک حل کئے تھے، مگر میں فیل کیسے ہوگیا، بالکل یہی مسئلہ کہانی لکھنے میں بھی ہے۔ اصلاح طلب کہانیاں التوا کا شکار ہوکر پڑی رہ جاتی ہیں۔ یہ یاد رکھیں کہ لکھتے لکھتے آدمی لکھاری بن جاتا ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ میرے پاس کئی کہانیاں لکھی پڑھی ہیں۔ اگر کہیں کہیں تو میں وہ کہانیاں کسی اور کو بھیج دیتا ہوں۔ تو جناب آپ بصد شوق وہ کہانیاں کسی اور کو بھیج دیں۔ ویسے آپ اپنے لکھے ہوئے جملوں پر ٹھنڈے دل سے غور کیجئے گا۔ اور اسی وجہ سے آپ کا خط شائع نہیں کیا جارہا کہ آپ کے جملے پڑھ کر دیگر لوگ...... خیر جیسے ہی وقت ملا تو اصلاح کرکے آپ کی کہانی شائع کردی جائے گی، فی الحال نئی کہانی نہ بھیجیں۔ دیگر تحریریں آپ کی شائع ہوتی رہتی ہیں اور ہاں ہر تحریر الگ الگ کاغذ پر لکھ کر ارسال کیا کریں۔ Thanks۔

☆☆

نحوست زدہ

عمران قریشی۔کوئٹہ

کمرے میں زور آور شخص فرش پر لیٹا اور پھر پلک جھپکتے ہی اس کی ران سے گوشت کا ایک بڑا سا لوتھرا اتار لیا گیا مگر اس شخص کو ذرا بھی درد کا احساس نہ ہوا اور حقیقت سامنے آنے پر قرب و جوار دہل کر رہ گیا۔

اکثر اوقات انسان سوچتا کیا ہے اور ہو کیا جاتا ہے، حقیقت کہانی میں پنہاں ہے

آپ نے کتابوں اور رسالوں میں بہت سے دہشت ناک اور خوف ناک واقعات کے متعلق پڑھا ہوگا۔ یہ واقعہ ان سب سے لرزہ خیز اور رونگٹے کھڑے کردینے والا ثابت ہوگا۔ اس دہشت ناک واقعہ نے مجھے جسمانی اور ذہنی طور پر معذور کرکے رکھ دیا۔ میری الٹی ٹانگ واقعہ کی نذر ہوگئی۔ اور سیدھی پر گوشت تقریباً مفقود ہے۔ لیکن اب نمودار ہونے لگا ہے۔ واقعہ کے کافی عرصہ گزرنے کے بعد بھی میں نے اپنے چاہنے والوں سے کنارہ کشی کئے رکھی۔ بعدازاں بادصبا کے جھونکے کی مانند ثریا جان میری زندگی میں داخل ہوئی۔ اور میں نے دوبارہ زندگی میں دلچسپی لینی شروع کردی۔ آپ یقین کریں گے کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود آج بھی میں کسی بھی جانور کا گوشت کھانے کے قابل نہیں ہوں اور کچھ نہیں لیکن مجھے ایسا کرنے سے گھن محسوس ہوتی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ بہت سے قارئین واقعہ پڑھنے کے بعد اس پر یقین کرنے سے انکاری ہوجائیں گے۔ اس صورت میں اگر آپ ایران کے شہر مشہد آسکتے ہیں تو آکر مجھ سے بالمشافہ ملاقات کرسکتے ہیں۔ بہت سی باتیں آپ کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیں گی۔ ثریا کی بدولت میرے چہرے پر کچھ رونق اور جاذبیت نمودار ہونے لگی ہے لیکن اگر آپ مجھ سے گزشتہ سال ملاقات کرتے۔ تب آپ کو ایسا معلوم ہوتا جیسے آپ کسی مردے سے ملاقات کررہے ہوں۔ ثریا آنکھوں سے محروم ایک ایسی دوشیزہ ہے جس کے چہرے پر خوبصورتی برائے نام ہے لیکن سیرت کے لحاظ سے وہ دنیا کی خوبصورت ترین عورت کہلائی جاسکتی ہے۔ تحریر کی جانب آیئے۔

میرا نام نصیر ہے۔ ذریعہ معاش ان دنوں جن کے متعلق تحریر کرنے لگا ہوں ہیروئن کی اسمگلنگ تھا۔ بیس کلو پر مشتمل اس ہیروئن کو غیر ملک اسمگل کرنا مقصود تھا۔ کوئی بھی ایسا کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ ایسے ناممکن حالات میں، میں نے ہیروئن اسمگل کرنے کی حامی بھرلی۔ میرے مطالبات نہایت محدود اور جاندار تھے۔ مجھے صرف ایک عدد حاملہ عورت۔ اس کی نگہداشت کرنے والی نرس اور میڈیکل کٹ کی مکمل ضرورت تھی۔ میرے چہرے پر اگر نفیس شیشوں والی گول عینک لگادی جائے تو مجھے ڈاکٹر ماننے سے کوئی بھی انکاری نہیں کرسکتا۔ میڈیکل کٹ ایک ایسے بھاری بریف کیس پر مشتمل تھا جس کے نچلے خفیہ خانوں میں ہیروئن باآسانی چھپائی جاسکتی تھی۔ میرے ان مطالبات کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے نرس کی صورت میں ساشا کا سانچے میں ڈھلا ہوا وجود دستیاب ہوا۔

میرے خدا...... جب بھی میں اس کے تباہ کن سراپے کے متعلق سوچتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ خدا نے مکمل فرصت کے دوران اس کے وجود کو تراشا تھا۔ وہ ہر زاویے سے مکمل تھی۔ حاملہ عورت کا نام سائرہ تھا۔ وہ ڈلیوری کے لئے غیر ملک جارہی تھی۔ بات قابل یقین نہیں تھی۔ لیکن یہ مکمل منتظم اعلیٰ ممبران کا مرہون منت تھا۔ مجھے جعلی ڈاکٹر کی ڈگری بھی عنایت کی گئی تھی یوں ہمارے سفر کا آغاز پیراڈائز سی جہاز کے ذریعے ہوا۔ بندرعباس نامی بندرگاہ پر چیکنگ کا طریقہ فرسودہ اور بے کار ترین تھا۔ سائرہ کی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں بغیر کسی روک ٹوک کے جہاز میں سوار ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ میرا اور ساشا کا کمرہ یکجا تھا۔ لیکن سائرہ کے لئے علیحدہ کیبن کا انتظام کیا گیا تھا۔ وہ ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔

جس کا کمپنی کے اعلیٰ ممبران کے ساتھ کسی قسم کا بھی تعلق نہیں تھا۔ لیکن اس کا زچگی کے ساتھ واسطہ پہلی دفعہ پڑ رہا تھا۔ اس لئے دوران سفر ڈاکٹر اور نرس کا انتظام صرف اس لئے کردیا گیا تھا کہ راستے میں کسی بھی قسم کی پیچیدگی پر قابو پایا جاسکے۔ جہاز کی روانگی کے فوراً بعد میں نے میڈیکل کٹ پر نظر ثانی کی۔ اس میں زچگی کے دوران استعمال کی جانے والی ہر قسم کی ادویات کے علاوہ مختلف قسم کے انجکشنوں کی نہایت کثیر تعداد بھی موجود تھی۔ جن کی موجودگی میری عقل وفہم سے بالاتر تھی۔

لیکن ساشا کی موجودگی مجھے اپنے آپ سے بے پرواہ کردینے کے لئے کافی تھی۔ میں اس رومان پرور شام کو کبھی بھی بھلا نہیں پاؤں گا۔ جب نم اور سرد ہواؤں کے جھونکوں کے درمیان میں نے شراب کے نشے میں دھت ساشا کے ہاتھوں کو تھامتے ہوئے اس کے حسن اور خوبصورتی کی بے اختیار تعریف کی۔ ساشا کے چہرے پر ایسی کیفیت نمایاں ہونے لگی جیسے طوفانی بارش کے بعد قوس وقزاح کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔ چند لمحے کی پس وپیش کے بعد اس نے میرے کاندھے پر سر رکھ دیا۔ اور میں نے شعور سے بیگانہ ہونے کے بعد نہایت بے سری آواز میں فارسی کے اس گیت کا الاپ شروع کردیا۔ جس میں محبوب کے حسن کی نہایت تفصیل وترتیب کے ساتھ تعریف کی گئی تھی۔

جہاز کے مسافر ہم دونوں کے گرد جمع ہونے لگے۔ وہ حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ میری طرف دیکھتے تھے۔ ان میں زیادہ تر میرے پیشہ ورانے رتبے سے واقفیت رکھتے تھے اور جو نہیں رکھتے تھے انہیں دوسروں کی بدولت جانکاری حاصل ہورہی تھی وہ ایک دوسرے سے سرگوشی کے عالم میں دریافت کررہے تھے کہ ”کیا ایک معتبر ڈاکٹر اس قسم کی گھٹیا حرکت کا مرتکب ہوسکتا ہے؟“ ایک نرس کے ساتھ معشوقانہ رویہ رکھنا کچھ خاص بات نہیں تھی۔ لیکن اس کا سرعام اظہار کرنا نہایت معیوب ترین بات سمجھی جاتی تھی۔ مجھے ان باتوں کی قطعاً پرواہ نہیں تھی۔

جہاز میں موجود مختصر عملہ، اعلیٰ ممبران کا خرید کردہ تھا۔ شاید ان میں چند جاسوس بھی موجود تھے۔ جو مجھ پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ اور پل بھر کی خبر اعلیٰ ممبران تک پہنچانے کا باعث تھے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں ساشا کی قربت میں محظوظ ہونے کے لئے مطمئن تھا۔ میرا بے سرا گیت ابھی ختم بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ کسی منچلے نوجوان نے جیبی ریڈیو پر گانا لگادیا۔“ میں نے بے خودی کے عالم میں ساشا کے دونوں ہاتھوں کو تھاما اور لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ بے ہنگم اور بے ڈھنگے انداز میں ناچنا شروع کردیا۔ مسافروں نے تالیاں بجانی شروع کردیں ساشا ناچنا نہیں چاہتی تھی لیکن میرے مجبور کرنے پر مضحکہ خیز انداز میں ناچنے لگی۔

ابھی ہمارا یہ ناچ گانا بام عروج پر نہیں پہنچنے پایا تھا کہ گرج دار آواز کے ساتھ قریبی سمندر کی پٹی پر بجلی گری۔ ماحول میں یکلخت خاموشی طاری ہوئی۔ صرف گانے کی دھن سنائی دے رہی تھی۔ اس کے فوراً بعد بونداباندی کا آغاز ہوگیا جو دھیرے دھیرے موسلادھار بارش میں بدلنے لگا۔ مسافروں نے بوکھلا کر اپنے اپنے کمروں کا رخ کیا میں نے بھی ساشا کا ہاتھ تھاما اور جہاز کے ریسورنٹ کی طرف چلا آیا۔

مجھے بڑے گوشت سے مزین بھنی ہوئی چانپوں سے نہایت دلی لگاؤ ہے۔ آپ یقین کریں گے کہ خوشی یا پھر افسردگی کے عالم میں چھوٹے بچھڑے کا گوشت تین چار کلو تک نہایت رغبت کے عالم میں کھا سکتا ہوں۔ اس رات سرشاری کا بھوت میرے سر پر سوار تھا میں نے دو کلو سے زیادہ گوشت باآسانی پیٹ میں منتقل کرلیا اس کے بعد مجھے ہلنا جلنا بھی دشوار محسوس ہونے لگا شراب کے دو تین پیگ حلق میں انڈیلنے کے بعد طبیعت کچھ بحال ہوئی تب میں ساشا کے ہمراہ اپنے کیبن میں چلا آیا۔

کمرے میں داخل ہونے کے بعد میں نے لائٹ آن کی پھر دیوار کے ساتھ نصب پلنگ پر ڈھیر ہوگیا۔

ساشا نے میری جانب بغور دیکھتے رہنے کے بعد اپنے جسم پر موجود نیم ترکپڑوں کو اتارنا شروع کردیا۔ میں کن انکھیوں سے اس کی نقل وحرکت کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ چند لمحات کے دوران ہی وہ عریاں حالت میں میرے پلنگ کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کا دودھیا جسم نہایت قیامت خیز منظر پیش کررہا تھا۔ مجھے سینے میں اپنا سانس اٹکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

کبھی پھول سے ابھر کر کبھی چاندنی میں ڈھل کر
اس کا حسن چھیڑ رہا تھا مجھے رخ بدل بدل کر

اور پھر میں نے بے اختیار پلنگ سے اٹھتے ہوئے اس کے سنگ مرمر کی مانند سفید جسم کو عقاب کی مانند جھپٹ کر آغوش میں بھرلیا۔ اس نے احتجاج کرنے کی قطعی کوشش نہیں کی۔ میں اس خمار آلود رات کو تمام زندگی فراموش نہیں کرپاؤں گا۔ وقت کو جیسے پر لگ گئے، کب رات گہری ہوئی اور کب صبح ہوئی مجھے کچھ معلوم نہیں ہوسکا۔

صبح صادق کے قریب میری آنکھ کھلی ساشا میری آغوش میں بے سدھ لیٹی ہوئی تھی۔ میرا جسم رات کی نیند پوری نہ ہونے کی بدولت ٹوٹ رہا تھا بستر سے نیچے اترنے کا دل نہیں کررہا تھا اس لئے میں نے کروٹ بدلنے کے بعد دوبارہ آنکھیں بند کرلیں باہر گرج چمک کے ساتھ موسلا دھار بارش ہورہی تھی شاید موسم کے تیور خطرناک صورت اختیار کرچکے تھے۔ مجھے نیند کے عالم میں جہاز کے عملے کی بھاگ دوڑ کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

بارہ بجے کے قریب زوردار دھماکے سے میری آنکھ یکلخت کھل گئی۔ ساشا بھی آنکھیں کھولے تفہیمی نگاہوں کے ساتھ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ ماحول دوبارہ دھماکے کی آواز سے گونجا۔ جہاز کے کمرے میں زلزلے کے اثرات نمودار ہوئے۔ اور میں ساشا کے جسم کے اوپر سے ہوتا ہوا دھماکے کے ساتھ جہاز کے فرش پر جا گرا۔ میرا سر سامنے موجود دوسرے پلنگ کے پائے کے ساتھ ٹکرایا۔ مجھے کمرہ لٹو کی مانند گھومتا ہوا دکھائی دیا۔ حواس معطل ہونے لگے۔

کمرے کے باہر سے چیخ وپکار کی آوازیں آنے لگیں اس کے فوراً بعد کمرے میں سمندر کا نمکین پانی بھرنے لگا۔ اس یخ بستہ پانی نے میرے گم ہوتے ہوئے حواسوں کو بحال کرکے رکھ دیا میں نے ساشا کی طرف دیکھا وہ حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ کمرے میں تیزی کے ساتھ بھرتے ہوئے پانی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''مجھے تیرنا نہیں آتا۔'' مجھے اس کی پریشانی سے بھرپور آواز سنائی دی۔

اس کے ساتھ ہی مجھے اپنی کمر کی جانب سرد اور سخت کسی چیز کے ٹکرانے کا احساس ہوا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کوشش کی۔ لیکن مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ وہ چیز کمر کے گرد چکر لگا کر خود ہی سامنے آگئی۔ وہ میڈیکل کٹ پر مشتمل بریف کیس تھا۔ جس کے خفیہ خانوں میں بیس کلو ہیروئن پوشیدہ تھی۔ میں نے جسم پر موجود بنیان کو اتارا اور اسے پھاڑنے کے بعد رسی کی صورت دیتے ہوئے اس رسی سے بریف کیس کو کمر کے ساتھ اچھی طرح باندھ لیا۔ پھر کھڑے ہوتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھنے کی کوشش کی۔ ابھی میں دروازے کے قریب پہنچنے بھی نہیں پایا تھا کہ دھماکے کے ساتھ دروازہ میرے اوپر آگرا۔ سر پر لگنے والی چوٹ کی بدولت مجھے اپنے دماغ میں پھلجھڑیاں چھوٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اور میں بے ہوش ہوتا چلا گیا۔ آخری احساس ساشا کے چیخنے چلانے کا تھا۔ جو مدہم ہوتے ہوتے ختم ہوگیا۔

دوبارہ آنکھ کھلنے پر میں نے اپنے آپ کو ویران

جزیرے کے ساحل پر بے سدھ پڑے ہوئے پایا۔

میرے اردگرد دوانسانوں کے وجود گیلی ریت پر موجود تھے۔ سورج مغرب کی جانب ڈوب رہا تھا۔ اور پرندوں کے شور سے کان پڑتی آواز بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔ میں نے اٹھتے ہوئے اردگرد کے ماحول پر نظر ثانی شروع کی۔ ساحل سے ہٹ کر درختوں کا لامتناہی سلسلہ دور تک جاتا ہوا دکھائی دیا۔ آبادی کا نام ونشان موجود نہیں تھا۔ ساشا کے متعلق دماغ میں خیال ابھرا۔ اور میں نے ریت پر لیٹے ہوئے دونوں انسانوں کے وجود کا جائزہ لینا شروع کیا ان میں سے ایک وجود جہاز کے ادھیڑ عمر کپتان کا تھا۔ اور دوسرا وجود حاملہ عورت سائرہ کا تھا لیکن ساشا وہاں موجود نہیں تھی میں نے پریشان نگاہوں کے ساتھ اردگرد نظر دوڑائی۔

ساحل ان دونوں کے علاوہ کسی اور کے وجود سے مستثنیٰ تھا۔ میں نے مایوس بھری نگاہوں کے ساتھ درختوں سے بھرے ہوئے جنگل کی طرف دیکھا وور درختوں کے جھنڈ کے درمیان میں مجھے ہلکا سا دھواں اٹھتا دکھائی دیا تو میں نے بے اختیار دھوئیں کی جانب قدم بڑھانا شروع کردیئے۔ ساحل سے کچھ آگے درختوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی دھواں بھی دکھائی دینا بند ہوگیا۔ میں نے تیزی کے ساتھ قدم آگے بڑھانے شروع کردیئے۔ درختوں پر مشتمل جنگل نہایت گھنا اور چھدرا تھا۔ وہاں پگڈنڈی موجود نہیں تھی۔ جس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ جزیرے پر انسانی آبادی موجود نہیں تھی۔

جنگل کے درمیان میں انسانوں کے علاوہ جانوروں کی موجودگی کے نشانات بھی مفقود تھے۔ تھوڑا آگے جانے کے بعد درختوں کا سلسلہ یکلخت ختم ہوگیا۔ اور میرے بالکل سامنے چھوٹے سے سرسبز خطہ زمین سے چند قدم آگے لکڑی پر مشتمل دو کمروں کا مکان دکھائی دیا۔ کمروں کے سامنے سالخوردہ برآمدہ بنا ہوا تھا اور برآمدے کے آگے خود رو جھاڑیوں کا ایک جنگل پروان چڑھتا دکھائی دیا۔ میں نے دونوں ہاتھ منہ کے پاس لے جاتے ہوئے چلا کر کہا۔

''کیا یہاں کوئی موجود ہے؟'' جواب میں خاموشی طاری رہی۔

میں نے چند لمحے کے انتظار کے بعد سرسبز خطہ زمین کو عبور کرکے برآمدے میں قدم رکھ دیا۔ دونوں کمروں کے دروازے چوپٹ کھلے ہوئے تھے۔ اور وہاں انسانوں کی موجودگی کے نشانات موجود نہیں تھے۔ میں نے پہلے کمرے میں قدم رکھا۔ کمرہ دھول اور گرد سے اٹا ہوا تھا۔ دروازے کے ساتھ ہی کھڑکی بنی تھی۔ اور اس کے ساتھ لکڑی سے بنا ہوا ایک پلنگ پڑا تھا۔ ایک سائیڈ پر چھوٹا دروازہ کچن کا تھا۔ جس میں آتش دان کے علاوہ مختصر کھانے کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ یہ وہ کل اثاثہ تھا جو کمرے کے مختصر فرنیچر کا اختیار رکھتا تھا۔ دوسرے کمرے کی حالت پہلے سے مختلف نہیں تھی۔ لیکن وہاں کچن موجود نہیں تھا مجھے اپنے پیچھے کسی کے چلانے کی آواز سنائی دی۔

''یہاں کوئی ہے؟ میرے ساتھ مریض موجود ہے؟''

میں نے چونکتے ہوئے کمرے کے دروازے سے باہر نگاہ دوڑائی۔ جہاز کا کپتان سائرہ کے ہمراہ مجھے اپنی جانب آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ سائرہ کو سہارا دیئے ہوئے تھا۔ میں نے چلاتے ہوئے جواب دیا۔

''بے خوف وخطر آگے چلے آؤ۔ میں یہاں موجود ہوں۔'' درختوں کے گھنے سلسلے سے باہر نکل کر ان دونوں نے سرسبز خطہ زمین پر قدم رکھا۔ پھر دھیرے دھیرے چلتے ہوئے لکڑی کے کیبن کی طرف چلے آئے۔

جہاز کے کپتان کا نام شاہ صبان تھا۔ اس کا جسم فربہی مائل بھدا اور گوشت سے بھرپور تھا۔ شرٹ کے درمیان سے توند نمودار ہوتی دکھائی دیتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں پر موٹے شیشوں والا چشمہ لگا ہوا تھا۔ مجھے پکا یقین تھا کہ وہ گروہ کے اعلیٰ ممبران کا خاص بندہ تھا۔ اس نے کمرے میں قدم رکھتے ہی مکان کے رہائشیوں کے متعلق دریافت کیا۔ میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''یہاں کوئی بھی موجود نہیں ہے، دونوں کمرے خالی پڑے ہیں۔''

سورج غروب ہوچکا تھا۔ اور چاروں جانب

اندھیرے کی چادر تننے لگی تھی سائرہ کو کھڑے رہنے میں دشواری پیش آرہی تھی، شاہ صبان نے اسے گرد آلود لکڑی کے پلنگ پر لٹا دیا۔ اور میں نے آگے بڑھ کر کمرے کے دروازے کو بند کرنے کے بعد کنڈی لگا دی۔ جہاز کا کپتان شاہ صبان بولا۔

''تمہارے جسم پر بندھا ہوا یہ بریف کیس کیسا ہے؟ کیا اس میں کھانے پینے سے متعلق کچھ سامان موجود ہے؟'' میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''نہیں...... اس کے باوجود بھی یہ کافی قیمتی ہے۔ سائرہ کی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس میں مختلف قسم کی ادویات موجود ہیں۔ تم جانتے ہو۔ کہ میں اس کا فیملی ڈاکٹر ہوں۔''

کپتان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے پریشان لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

نہ جانے یہ مکان کس کا ہے اور وہ اس وقت کہاں ہے؟ مجھے اچھی طرح یاد ہے میں نے ساحل پر سے دھواں اٹھتے ہوئے بہ خوبی دیکھا تھا۔'' کپتان بولا۔

''وہ جو کوئی بھی ہے۔ خود ہی سامنے آجائے گا اب تو یہ سوچنا ضروری ہے کہ سخت لکڑی پر مشتمل تختے پر سویا کیسے جائے۔''

میں نے جواب دیا۔

''مجبوری میں پھانسی کے تختے پر بھی نیند آجاتی ہے۔ یہ تو صرف لکڑی کے تختے پر مشتمل فرش ہے۔

کپتان بولا۔'' سائرہ کی معیت میں یہاں سونا مناسب نہیں ہوگا۔ ہمارے لئے ساتھ والا کمرہ بہتر رہے گا۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور کپتان کے ہمراہ دوسرے کمرے میں چلا آیا۔

رات گزری دوسرے دن مطلع صاف ہوگیا دھوپ کی بدولت ماحول خوشگوار ہونے لگا۔ سائرہ کی طبیعت پہلے سے بہتر تھی۔ میں نے اور کپتان نے ساحل سمندر کا رخ کیا کہ شاید کچھ قابل استعمال سامان دستیاب ہوجائے۔ بحری جہاز کی تباہی کے بعد وہاں بہت کچھ موجود ہونا چاہئے تھا اور تھا بھی...... لکڑی کے تختوں کے علاوہ وہاں بیئر کے دو ڈبے ایک چھوٹا مٹی کے تیل سے چلنے والا اسٹوپ اور چند کپڑوں کے جوڑے دستیاب ہوئے میری پینٹ کی جیب میں لائٹر محفوظ تھا۔ ساحل سے ملنے والی یہ چیزیں ہمارے لئے نہایت مفید ثابت ہوسکتی تھیں کیبن کی جانب رخ کرتے ہوئے میری نگاہ نے دوبارہ دھوئیں کی پتلی لکیر کو اوپر اٹھتے ہوئے دیکھا زاویہ نگاہ اسی جانب اشارہ کررہی تھی جہاں لکڑی کا کیبن موجود تھا۔ میں نے کپتان سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''جزیرے پر ہمارے علاوہ بھی کوئی موجود ہے، لیکن نہ جانے کیوں سامنے آنے سے گریزاں ہے۔''

کپتان بولا۔'' کل شام، وقت کی کمی کی بدولت ہم تمام جزیرے کا چکر نہیں لگا پائے۔ ہوسکتا ہے کہ جزیرے کے پچھلی جانب آبادی موجود ہو۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا پھر بیئر کے ڈبے اور اسٹوپ کو کیبن میں چھوڑنے کے بعد جزیرے کا جائزہ لینے کے لئے پچھلی طرف چل دیئے۔ اس طرف مختصر پہاڑی علاقہ موجود تھا۔ جس میں صاف اور میٹھے پانی کا چشمہ بہتا تھا پاس ہی کیلے اور شکر قندی کی مختصر فصل موجود تھی۔ اور فصل کے قریب ہی ہمیں انسانی فضلے کے متعدد اثرات ملے۔ جس سے ہمارے اس احساس کو تقویت ملی کہ ہم جزیرے پر اکیلے نہیں تھے۔ ان مختصر پہاڑیوں کے بعد دوبارہ سمندر کی حدود شروع ہوگئی۔ اور ہم ناکام و نامراد واپس کیبن کی طرف چلے آئے۔ کیبن سے آگے آبادی موجود نہیں تھی وہ جو کوئی بھی شخص تھا ہمارے کیبن میں ہی رہائش پذیر تھا۔ میرے ہاتھ میں موجود واٹر پروف گھڑی صبح کے دس بجے کا اعلان کررہی تھی ہم تینوں نے گزشتہ رات سے کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ جزیرے کے معائنہ کے دوران میں نے وہاں چند ایسی جھاڑیاں لگی ہوئی دیکھیں تھیں جو اکثر لمبے سفر کے اوقات میں...... میں اور میرے دوست چائے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ ان کا ذائقہ سونف کی جھاڑیوں سے ملتا جلتا تھا۔ لیکن حیرت انگیز طور پر ان کی تاثیر فائدہ بخش تھی۔

میں نے کیبن کی طرف آتے ہوئے جھاڑیوں کی

بہت سی پتیاں ہمراہ لے لیں چند شکر قندیاں جو ابھی تک
پکی تھیں البتہ کیلے پک چکے تھے انہیں ہاتھوں میں اٹھا کر
کیبن میں چلے آئے۔ اسٹوپ میں اچھا خاصا ایندھن
موجود تھا۔ شکر قندیوں کو ابالنے کے بعد ہم نے سونف والی
جھاڑیوں پر مشتمل چائے تیار کی اور کیلے و شکر قندیوں کا
لذیذ ناشتہ کرنے کے بعد کیبن کا تفصیلی جائزہ لینا شروع
کیا۔ کوئی تو تھا جو ہمارے ہمراہ کیبن کے اندر موجود تھا۔
کچن میں یا پھر نیچے کہیں تہہ خانے میں......

میں نے اور کپتان نے تمام کیبن چھان مارا۔
لیکن اسے تلاش نہیں کر پائے۔ کیبن کے چھت پر پانی کی
ٹنکی بنی ہوئی تھی۔ اس میں چشمے کا پانی بھرا ہوا تھا یہی پانی
نیچے پائپ لائن کی صورت میں جاتا تھا۔ لیکن کچن کے
علاوہ وہاں باتھ روم کا انتظام موجود نہیں تھا۔ دوپہر اور رات
کے کھانے میں ہم نے شکر قندی اور کیلے بھی کھائے۔
درمیان کا تمام دن خفیہ جگہ کی تلاش کرنے میں گزر گیا۔
رات کی شروعات میں گرج چمک کے ساتھ بارش ہوئی۔
لیکن بارہ بجے کے بعد بند ہوگئی۔

صبح سرد کہر آلود تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں
دیتا تھا۔ اسی صبح سے پراسرار سلسلے کا باقاعدہ آغاز ہوا۔
سائرہ کی طبیعت تمام رات خراب رہی۔ وہ ہولے ہولے
کراہتی تھی۔ میرے خیال کے مطابق اسے کیلے اور
شکر قندی موافق نہیں آئی تھی۔ صبح کے قریب اس نے
باقاعدہ چیخنا چلانا شروع کر دیا۔

میں نے ہڑبڑا کر اٹھتے ہوئے فرش پر لیٹے ہوئے
کپتان کے بے سدھ جسم پر نگاہ دوڑائی۔ اور میرا منہ حیرت
کے مارے کھلتا چلا گیا۔ وہ کیبن کے فرش پر لیٹا ہوا تھا۔
میں کھڑکی کے ساتھ رکھے ہوئے پلنگ پر سو رہا تھا۔ کپتان
کے اردگرد کا فرش خون سے سرخ ہو رہا تھا اس کی پینٹ
قریب ہی پڑی ہوئی تھی اور موٹی صحت مند رانوں کا کافی
زیادہ گوشت کسی نے ماہر قصائی کی مانند کاٹ کر اتار لیا تھا۔

اس کی ران کی ہڈی تک صاف دکھائی دے رہی
تھی، میں نے حیرت کے عالم میں کمرے کا جائزہ لیا
اردگرد کسی بھی قسم کا ہتھیار یا پھر نشانات موجود نہیں تھے۔

میں نے آگے بڑھ کر کپتان کی نبض چیک کی وہ زندہ تھا
لیکن نبض بہت آہستہ چل رہی تھی، ساتھ والے کمرے
سے سائرہ کے دوبارہ چلانے کی آواز سنائی دی میں نے
ہڑبڑا کر اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور بوکھلائے ہوئے
قدموں کے ساتھ سائرہ کے کمرے کی طرف چل دیا۔ وہ
بستر پر دراز تھی اس کا چہرہ خون کی مانند سرخ ہو رہا تھا
چہرے پر تکلیف کے تاثرات بہت تھے، میں نے اسے
کندھے کے پاس سے تھامتے ہوئے جھنجھوڑ کر پوچھا۔

''کیوں چلا رہی ہو؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک
ہے ناں۔'' اس نے بمشکل تمام آنکھیں کھولتے ہوئے
جواب دیا۔

''پیٹ میں آریاں چل رہی ہیں تکلیف کی
بدولت میں تمام رات سو نہیں سکی۔ مجھ پر مہربانی کرو۔
اور مجھے بے ہوشی کا انجکشن لگا دو۔ وہ تمہارے بریف کیس
میں موجود ہے۔''

میں نے سر کو اثبات میں ہلایا اور بریف کیس لینے
کے لئے ساتھ والے کمرے کی طرف چلا آیا کمرے کے
درمیان میں کپتان بے ہوش لیٹا ہوا تھا بریف کیس پلنگ
کے ایک سائیڈ پر پڑا تھا۔ میں نے عجلت کے عالم میں
بریف کیس کو کھولا۔ اور بے ہوشی والے انجکشن کی تلاش
میں اندر نگاہ دوڑائی وہ ایک جانب موجود تھا۔ میں نے محلول
کو سرنج کے اندر بھرا اور واپس سائرہ کے کمرے کی طرف
چل دیا۔ سائرہ تکلیف کی شدت سے پلنگ سے نیچے لکڑی
کے فرش پر گرنے کے بعد لوٹ پوٹ ہو رہی تھی، مجھے
کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھنے کے بعد اس نے
بے اختیار اپنا سیدھا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے
بڑی رگ کو تلاش کرنے کے بعد انجکشن اس کی رگ
میں انجیکٹ کر دیا۔ وہ جس کرب میں مبتلا تھی اس کی نسبت
اسے سوئی کی خفیف تکلیف کا احساس رتی برابر بھی نہ ہو سکا،
میں نے تنقیدی نگاہوں کے ساتھ اس کے چہرے کا جائزہ
لینا شروع کر دیا جو خون کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا اس
کے دانت ہونٹوں میں پیوست تھے۔ اور آنکھیں تکلیف
کی شدت سے بند تھیں پھر آہستہ آہستہ دانت اور بھنچے

ہوئے ہونٹ معمول پر آنے لگے۔ چہرے کے عضلات ڈھیلے پڑنے لگے۔ چیخنے چلانے کا سلسلہ بھی کم ہونے لگا۔ اوراس نے ہاتھ پاؤں چلانے بند کردیئے۔

میں نے طویل سانس لیتے ہوئے اسے زمین سے اٹھا کر پلنگ پر لٹادیا۔ چندلحوں کے دوران وہ ہوش وحواس سے بیگانہ ہوتی چلی گئی۔ نوجوانی کے دنوں میں کمپاؤنڈری کی ٹریننگ کام آئی۔ اور میں سرکودونوں ہاتھوں میں تھام کرزمین پر اکڑوں بیٹھ گیا مجھے زیادہ دیر بیٹھنے کا موقع میسر نہیں آسکا ساتھ والے کمرے میں کپتان کے چیخنے چلانے کی آواز سنائی دی۔ وہ ہوش میں آ گیا تھا میں اٹھ کر ساتھ والے کمرے کی طرف چل دیا حیرت انگیز طور پر وہ زمین سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا تھا جس کیفیت سے اس کا جسم ہمکنار تھا اسے مدنظر رکھتے ہوئے اس کے یوں کھڑے ہوجانے کی امید دکھائی نہیں دیتی تھی لیکن وہ ایسے کھڑا تھا جیسے اس کے جسم پر زخم موجود نہ ہو۔ اس کے چہرے پر حیرت اور خوف کے تاثرات ثبت تھے اور وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کراپنی زخمی ٹانگ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے کمرے میں داخل ہوتے دیکھنے کے بعد ہراساں لہجے میں بولا۔

''یہ سب کیسے ہوا؟ کیا تم نے ایسا کیا ہے؟ مجھے تم سے ایسی توقع نہیں تھی۔''

میں نے پریشان لہجے میں جواب دیا۔

''میں تمہارے زخموں سے مکمل طور پر لاتعلق ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ تمہارے جسم پر کیونکر نمودار ہوئے۔ لیکن مجھے ایسا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

کپتان بولا۔''زخم نہایت گہرے ہیں۔ لیکن حیرت انگیز طور پر مجھے درد محسوس نہیں ہورہا۔ لیکن زخم والی ٹانگ سن ہے۔ شاید اسے بے حس کرنے کے لئے انتہائی طاقتور انجکشن کی ڈوز استعمال کی گئی ہے مہربانی کر کے مجھے کھانے کے لئے کچھ دو۔ مجھے کمزوری محسوس ہورہی ہے۔''

میں نے اسے لکڑی کے پلنگ پر بیٹھنے کے لئے کہا اور شکرقندیاں لانے کے لئے چشمے کی طرف چل پڑا۔ درختوں سے چند کیلے اتارنے کے بعد جب میں نے زمین میں مدفن شکرقندیاں باہر نکالنے میں مصروف تھا تب مجھے نہ جانے کیوں احساس ہوا جیسے مجھے کوئی دیکھ رہا ہو۔ میں نے یکدم کھڑے ہوتے ہوئے پیچھے مڑکر دیکھا وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ سوائے کیلے کے ساکت درختوں کے......

میں نے سرکو جھٹکا اور اٹھ کر اپنے کیبن کی طرف چلا آیا۔ کپتان پلنگ پر بیٹھا میرا منتظر تھا۔ اور اب اس کے چہرے پر تکلیف کے تاثرات...... نمایاں ہونے لگے تھے۔ درد کی شدت سے ہونٹ بھنچنے لگے تھے۔ اور چہرہ پسینے سے تر تھا۔ میں نے حیرت بھرے لہجے میں تکلیف کی وجہ دریافت کی تب وہ رودینے والے لہجے میں بولا۔

''زخم میں ٹیس اٹھنے لگی ہے پہلے ایسا نہیں تھا لیکن اب ہے نہ جانے درد کیوں شروع ہوگیا ہے۔''

میں نے کیلے اور شکرقندیاں اس کے سامنے رکھ دیں۔ اس نے ان کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا اور درد کی شدت کو جھیلتے ہوئے دوبارہ چیخنا چلانا شروع کردیا۔ میں نے پریشان نگاہوں کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔ پھر مجبور قدموں کے ساتھ بریف کیس کی طرف چل دیا۔ اب اس کے علاوہ مزید چارہ کار باقی نہیں بچا تھا کہ میں اسے بھی بے ہوشی کا انجکشن لگادوں۔ سو میں نے ایسا ہی کیا۔ انجکشن لگانے کے کچھ دیر بعد ہی وہ خاموش ہوگیا۔

میں نے چند کیلے اور شکرقندیاں زہر مار کیں۔ اور کمرے سے باہر نکل کر درختوں کے جھنڈ کے درمیان آ بیٹھا۔ حالات پراسرار سے پراسرار ترین ہوتے چلے جارہے تھے۔ وہ جوکوئی بھی تھا میری موجودگی میں کمرے میں داخل ہوکر میرے ساتھی کے جسم سے گوشت کا لوتھڑا اتار کرلے گیا تھا۔ اور مجھے خبر نہیں ہوپائی تھی۔

وہ کیبن کے نیچے یا پھر اردگرد کہیں چھپا بیٹھا تھا۔ اسے تلاش کرنا ضروری تھا۔ کب تک میں کپتان اور سائرہ کو تکلیف کی شدت سے بچانے کے لئے بے ہوشی کے انجکشن کا سہارا لیتا رہتا۔ آخر کاران کا ذخیرہ ختم ہوہی جانا تھا۔ اس کے بعد کے متعلق سوچتے ہوئے میری روح

کپکپا اٹھی۔ اور میں اٹھ کر ساحل سمندر کی طرف چلا آیا۔ میں نے بہت سی خشک لکڑیاں جمع کیں اور انہیں آگ لگادی۔ لکڑیاں دھڑادھڑ جلنے لگیں۔

میں اس مختصر الاؤ پرنم آلود درختوں کے پتے ڈالنے لگا۔ آگ میں سے دھواں اٹھ کر آسمان کی طرف رخ کرنے لگا۔ جزیرے سے نجات کا واحد ذریعہ یہ دھواں ہی تھا شاید کوئی بھولا بھٹکا جہاز جزیرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے دھوئیں کو دیکھ کر اس جانب چلا آئے اور ہمیں واپس معزز دنیا تک لے جاسکے۔ لیکن شام تک وہاں بیٹھے رہنے کے باوجود بھی کچھ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ میں واپس کیبن کی طرف چلا آیا۔ درختوں کے جھنڈ کی طرف آتے ہوئے ایک دفعہ پھر میں نے دھواں اٹھتے ہوئے دیکھا۔ میں نے دل میں پکا تہیہ کیا کہ اگلے دن دھوئیں کا ماخذ تلاش کرنے کی ضرور کوششیں کروں گا۔ کیلے اور شکرقندیاں پلنگ کے پاس پڑی تھیں۔ لیکن اب میں ان سے بے زار ہو گیا تھا۔ میرا انہیں کھانے کا دل نہیں چاہتا تھا۔ میں نے سونف والی پتیوں سے پھیکا قہوہ تیار کیا اور حلق میں انڈیلنے کے بعد سونے کے لئے لیٹ گیا، آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک موجود نہیں تھا۔

مجھے ساشا کا تباہ کن جسم یاد آنے لگا۔

نہ جانے جہاز کی تباہی کے بعد اس پر کیا بیتی ہوگئی۔ سائرہ کے بجائے اگر وہ زندہ بچ کر جزیرے پر چلی آتی تب میرے لئے نہایت تسکین دل ودماغ کا باعث بنتی۔ میں نے آنکھیں بند کر کے گزرے ہوئے ان چند لمحات کے متعلق سوچنا شروع کر دیا۔ جو میں نے ساشا کی قربت میں بتائے تھے۔

نہ جانے یہ میرا وہم تھا یا پھر حقیقت کہ مجھے اس کے سرمئی بالوں کی مہک نتھنوں میں گھستی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کے جسم کا لمس میرے قریب موجود تھا۔ اور میں آپے سے باہر ہوتا چلا جارہا تھا۔

رات کے نہ جانے کس پہر میری آنکھ لگ گئی۔ خوابوں کی خوبصورت دنیا میں ساشا میرے ہمراہ تھی۔ اور میں حسین وادیوں میں اس کے ساتھ بھاگتا پھر رہا تھا میں اب جاگنا نہیں چاہتا تھا، خوابوں کی یہ دنیا حقیقت سے ہزار درجہ بہتر تھی۔

صبح کے قریب جب میری آنکھ کھلی تب میں نے دوبارہ اسے بند کرنے کی کوشش کی آنکھیں تو با آسانی بند ہوگئیں لیکن حواس بیدار ہوتے ہی مجھے ساتھ والے کمرے سے سائرہ کے تکلیف بھرے انداز میں چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں اور پلنگ سے نیچے اترنے کی کوشش کیں۔ تب میری نگاہ کپتان کے جسم پر پڑی۔ میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوتے چلے گئے۔ دل اچھل کر حلق سے باہر نکلنے لگا۔

کمرے کا ماحول نہایت خوف ناک ودلخراش تھا۔ کپتان زمین پر گزشتہ دن کی طرح بے سدھ پڑا تھا۔ اس کی رانوں کے پاس بچ جانے والا گوشت سیاہی مائل ہونے لگا تھا۔

اور آج کی صبح اس کے دونوں بازوں سے تمام نرم گوشت اتارلیا گیا تھا۔ کمرے کا فرش مذبح خانے کی صورت اختیار کیئے ہوئے تھا۔ مجھے اچانک متلی کا احساس ہوا۔ اور میں کمرے سے باہر کی طرف دوڑ پڑا۔ گھاس کے قطعے کے پاس پہنچ کر میں نے سب کھایا پیا وہاں اگل دیا۔ پھر نڈھال قدموں کے ساتھ واپس کمرے میں چلا آیا، فالتو کپڑوں کا ڈھیر کمرے میں موجود تھا۔ میں نے انہیں پھاڑ کر پٹیوں کی صورت دی۔ اور کپتان کے زخموں پر باندھنے لگا۔ اس کے بعد میں نے بریف کیس کھولا۔ اور اس میں سے بے ہوشی کا انجکشن باہر نکالا اور ساتھ والے کمرے کی طرف چل دیا۔

سائرہ چیختے چلاتے ہوئے مجھے پکار رہی تھی۔ اس کی حالت پچھلے دن کی نسبت زیادہ خراب تھی۔ میں نے اسے کھانے کے لئے کیلے اور شکرقندیاں دیں اس نے درد کی شدت سے مغلوب ہوکر انہیں دور پھینک دیا۔ اور سیدھا ہاتھ میری طرف بڑھاتے ہوئے مجھے انجکشن لگانے کا اشارہ کیا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس نے کل سے کچھ بھی نہیں کھایا تھا، نہ جانے اس کے

پیٹ میں پرورش پاتے ہوئے بچے کا کیا حال تھا۔ بے بسی کو محسوس کرتے ہوئے میں پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ وہاں مجھے روتا ہوا دیکھنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔

سائرہ الٹیاں کرنے لگی۔ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کی رگ تلاش کی۔ اور انجکشن کی سوئی اندر گھسا کر انجکشن کو انجکیٹ کرنے لگا۔ چند لمحوں کے دوران ہی وہ ہوش وحواس سے بیگانہ ہوگئی۔ میں نے آنکھوں سے نکلتے ہوئے آنسوؤں کو آستین کے ساتھ پونچھا۔ اور بپھرے ہوئے قدموں کے ساتھ کمرے سے باہر نکل کر برآمدے میں آ کھڑا ہوا پھر چلاتے ہوئے اس غیبی انسان سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''مجھے معلوم ہے کہ تم اردگرد کہیں موجود ہو۔ خدا کے واسطے ان دونوں کے زندہ وجود پر رحم کرو۔ کیوں انہیں تشدد کر کے ہلاک کرنے کے منتظر ہو۔ اس غیر انسانی حرکات کو ترک کر کے ہمارے حال پر چھوڑ دو۔''

جواب میں خاموشی طاری رہی اور میں نے غصے کے عالم میں مکان کی دیواروں پر ٹھوکریں رسید کرنی شروع کر دیں۔ تھوڑی دیر بعد میں بے حال ہو کر برآمدے کے لکڑی والے فرش پر گر گیا۔ ان چند لمحات کی جذباتی جدوجہد نے مجھے بے حال کر کے رکھ دیا تھا، اب مجھ میں اٹھنے کی طاقت مفقود تھی اس لئے میں زمین پر سیدھا لیٹا رہا۔

تب اچانک ہی مجھے بحری جہاز کے طاقتور وسل کی آواز سنائی دی۔ میرے جسم میں کرنٹ کی مانند حرکت پیدا ہوئی اور میں نے اٹھ کر ساحل کی طرف دوڑ لگادی درختوں کے جھنڈ سے باہر نکلنے کے بعد جب میں نے ساحل سمندر کی طرف رخ کیا تب وہاں خوب چہل پہل کے آثار موجود پائے، ساحل پر بہت بڑا اور جدید قسم کا ایک بحری جہاز لنگر انداز تھا لوگ سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے اس میں داخل ہو رہے تھے۔ جو وسل میں نے چند لمحات پہلے لکڑی کے کیبن کے فرش پر لیٹے ہوئے سنی تھی۔ وہ بحری جہاز کی روانگی کی وسل تھی۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے تمام لوگ سیڑھیاں چڑھ کر جہاز میں سوار ہو گئے۔ میں نے بے اختیار چیخ کر انہیں روکنے کی کوشش کیں لیکن شدت جذبات کی بدولت میرے منہ سے آواز نمودار نہ ہو سکی ناکام ہونے کے بعد میں نے جہاز کی طرف دوڑ لگادی۔ اندھا دھند بھاگنے کی بدولت میں نیچے پڑے ہوئے پتھر کو نہ دیکھ پایا اور اس کے ساتھ ٹکرا کر قلابازیاں کھاتے ہوئے ساحل کی ریت پر گرتا چلا گیا، جہاز کی سیڑھیاں اوپر اٹھالی گئیں ایک دفعہ پھر ماحول روانگی کی وسل کی آواز سے گونجا۔ اور جہاز نے ساحل کو چھوڑ دیا، میں نے دوبارہ چیخنے چلانے کی کوشش کی اس دفعہ میرے منہ سے ایسی آواز برآمد ہوئی جیسے ذبح ہوتے ہوئے بکرے کے منہ سے نکلتی ہے۔

جہاز کے مسافر مجھے نہیں دیکھ رہے تھے۔ ان کی نگاہوں کا مرکز میرے پیچھے موجود جزیرہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ جان بوجھ کر میرے وجود کو نظر انداز کر رہے ہوں۔ دیکھتے ہی دیکھتے جہاز جزیرے سے دور ہوتا چلا گیا۔ اور میں نے دھاڑیں مار کر رونا شروع کر دیا نہ جانے کتنی دیر میں یوں ہی روتا رہا۔ مجھے وقت کا اندازہ نہیں ہونے پایا۔ پھر میں نے اٹھتے ہوئے کپڑے جھاڑے اور کیبن کی طرف چل دیا۔ درختوں کے جھنڈ کے پاس پہنچنے کے بعد میں نے دوبارہ دور کہیں دھواں اٹھتا دیکھا۔ میرے منہ سے بے اختیار گالیاں نمودار ہونے لگیں وہ جو کوئی بھی تھا ہمارے ساتھ چوہے بلی کا کھیل کھیلنے کی کوششیں کر رہا تھا۔ میں بے اختیار بھاگتا ہوا کیبن کی طرف چلا آیا۔

آپ یقین کریں گے کہ دھواں کیبن کی چمنی سے اٹھ رہا تھا میں بھاگتے ہوئے کیبن میں داخل ہوا کپتان فرش پر بے ہوش پڑا تھا اس کے چہرے کی رنگت پیلی پڑتی جا رہی تھی اور جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا، میں نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے کچن کا رخ کیا آتش دان میں خشک لکڑیاں موجود تھیں لیکن انہیں آگ نہیں لگائی گئی تھی اس کے باوجود بھی چمنی سے دھواں اٹھ رہا تھا اس بات سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ کیبن کے نیچے تہہ خانہ موجود ہے اور وہاں کوئی پوشیدہ تھا۔

مجھے اپنے پیچھے کراہنے کی آواز سنائی دی میں نے پیچھے مڑکر دیکھا۔ کپتان اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ زیادہ خون بہہ جانے کی بدولت اس کا چہرہ ہلدی کی مانند زرد دکھائی دینے لگا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے جسم سے خون کا آخری قطرہ بھی باہر نکال لیا گیا ہو۔ کیبن کا فرش سرخ خون کی بدولت چکنا اور لال ہو رہا تھا۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے کپتان کے جسم میں جھرجھری پیدا ہوئی اور اس نے آخری ہچکی لینے کے بعد دم توڑ دیا، میری آنکھوں میں دوبارہ آنسو نمودار ہونے لگے۔ لیکن میں نے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کے ساتھ رگڑ کر انہیں بے دردی کے ساتھ پونچھ ڈالا۔ میرے دل میں شدید نفرت کا احساس ہونے لگا یہ سب اس ان دیکھے نادیدہ مجرم کا کیا دھرا تھا۔ جو کیبن کے نیچے پوشیدہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔ وہ رات کے اندھیرے میں باہر نکلتا تھا کچھ غیر فطری طریقہ کے ساتھ...... کمرے میں جیتے جاگتے وجودوں کو اس کی موجودگی کے متعلق رتی برابر بھی احساس نہیں ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ وہ زندہ وصحت مند وجود سے گوشت کا لوتھڑا اتار کر ہمراہ لے جاتا تھا۔ اور متاثرہ جسم کو بھی اس کے آنے اور جانے کی خبر نہیں ہو پاتی تھی۔

میں نے دل میں پکا تہیہ کر لیا کہ آج کی رات میں آنکھ جھپکنے کی بھی کوشش نہیں کروں گا۔ تمام رات جاگ کر اس کا انتظار کرتے ہوئے گزاروں گا۔ ساتھ والے کمرے میں سائرہ اطمینان وسکون کے ساتھ سو رہی تھی۔

رات کو میں نے کیلے اور شکرقندیاں کھانے کے بعد دو گلاس سونف کی پتیوں والے قہوے پیئے۔ چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے اور ان دیکھے وجود سے مقابلے کے لئے تیار ہو کر لکڑی کے پلنگ پر بیٹھ گیا۔

رات کا سفر دھیرے دھیرے شرع ہوا ماحول پر سکوت طاری تھا جھینگروں کے بولنے کی تیز آواز کے علاوہ کیبن میں مکمل خاموش کا راج تھا۔ بارہ بجے کے قریب مجھے کیبن کے باہر کھٹکا سنائی دیا۔ میں نے چونکتے ہوئے باہر کی طرف دیکھا وہاں ملگجا اندھیرا طاری تھا۔ کھٹکا دوبارہ سنائی دیا تو میں اٹھ کر کمرے سے باہر نکل آیا ملگجے اندھیرے کی بدولت مجھے سرسبز خطے سے آگے کچھ دکھائی نہیں دیا آسمان پر چودھویں کا چاند جگمگا رہا تھا۔ اور چاندنی کا دور دورہ تھا۔ کھٹکا دوبارہ سنائی دیا۔ اب کی دفعہ مجھے سمت کا اندازہ لگانے میں دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ آواز سائرہ کے کمرے میں سے آرہی تھی میں نے دروازے سے اندر جھانکا وہ آنکھیں کھولے مجھے دیکھ رہی تھی میں نے مسکراتے ہوئے اس سے خیریت دریافت کی۔

وہ گلے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

''مجھے پیاس محسوس ہو رہی ہے حلق سوکھ کر کانٹا ہونے لگا ہے۔ مجھے پانی چاہئے۔'' میں نے کچن میں موجود نلکے میں سے پانی باہر نکالا اور سائرہ کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ اس نے ایک ہی سانس میں پانی حلق کے اندر انڈیل لیا اور ممنونانہ نگاہوں کے ساتھ میری جانب دیکھتے ہوئے بولی۔

''میری وجہ سے تمہیں بہت پریشانی اٹھانی پڑی ہے۔ میں معذرت خواہ ہوں۔ پیٹ میں موجود درد کو کافی حد تک افاقہ حاصل ہوا ہے اور مجھے اب بھوک بھی محسوس ہو رہی ہے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے فکر انگیز لہجے میں جواب دیا۔

''میں تمہارے لئے کھانے کا بندوبست کرتا ہوں۔ تم نے جب سے جزیرے پر قدم رکھا ہے کچھ بھی نہیں کھایا ہے۔'' میں اٹھ کر ساتھ والے کمرے کی طرف چل دیا پلنگ پر چند کیلے موجود تھے۔ البتہ شکرقندیوں کا اسٹاک ختم ہو گیا تھا، میں نے کیلے اٹھائے اور ابھی دروازے کی طرف مڑنے بھی نہیں پایا تھا کہ سر میں شدید چکر آتے محسوس ہوئے۔ میں نے پلنگ کو تھامنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا اور کٹے ہوئے شہتیر کی طرح چاروں شانے چت زمین پر گرتا چلا گیا۔

نہ جانے کتنی دیر بعد مجھے ہوش آیا۔ میں وقت کا تعین نہیں کر سکا۔ حواس بحال ہونے سے چند لمحے پہلے میں نے کسی کو ہولے ہولے اپنا نام پکارتے ہوئے سنا۔ میں نے ہڑبڑا کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن پھسل کر چکنے فرش

پر کر لیا، میرے ہاتھ اور پاؤں خون سے تھڑے ہوئے تھے کپڑے برباد ہو کر رہ گئے تھے کمرے کے فرش پر خون کے علاوہ بڑی بڑی مضبوط ہڈیاں موجود تھیں ایک طرف فٹ بال کی مانند کوئی چیز دھری پڑی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے تھامنے کی کوشش کی اس گیند نما چیز کا رخ اچانک ہی میری جانب ہو گیا۔

میرے حلق سے خوف ناک چیخ بلند ہوئی اور میں نے پھرتی کے ساتھ اٹھتے ہوئے باہر کی طرف دوڑ لگا دی، کمرے سے باہر سپیدہ سحر نمودار ہو رہا تھا اور ساتھ والے کمرے سے سائرہ کی آواز سنائی دے رہی تھی، میں نے ایک جانب بیٹھ کر بے تحاشہ الٹی کر دی کچھ سکون محسوس ہوا تب میں نے سائرہ کے کمرے کا رخ کیا اندر داخل ہونے پر ایک دفعہ پھر مجھے تمام کمرہ گھومتا ہوا محسوس ہوا کمرہ خون سے تر تھا۔ اور سائرہ کی دونوں رانوں کا گوشت نہایت مہارت کے ساتھ اتار لیا گیا تھا۔ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں مجھے پکار رہی تھی۔

میں نے اپنی شرٹ کو پھرتی کے ساتھ اتارا اور اسے پھاڑنے کے بعد سائرہ کی رانوں پر پٹی کی صورت میں باندھ دیا۔ پھر کچن سے پانی لانے کے لئے بھاگ کھڑا ہوا۔ میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔

وہ جو کوئی بھی تھا اس نے ظلم کی انتہا کر دی تھی۔ اب اس کا زندہ رہنا میرے اور سائرہ کے وجود کے لئے خطرناک تھا۔ میں نے دل میں تہیہ کر لیا کہ فارغ ہونے کے فوراً بعد اس نادیدہ انسان کے خلاف عملی قدم اٹھانے کی کوشش کروں گا۔ گلاس میں پانی بھرنے کے بعد جب میں نے کمرے کا رخ کیا تب سائرہ آخری سانسیں لے رہی تھی، پھر سائرہ نے آخری ہچکی لی اور زندگی سے اس کا ناطہ ٹوٹ گیا۔

میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

خونی جزیرے پر سائرہ کی موت کے بعد میں بالکل تنہا رہ گیا تھا پھر میں نے بے اختیار کھڑے ہوتے ہوئے نادکھائی دینے والے اس جزیرے کے رہائشی کو گالیاں دینی شروع کر دیں میرے دل میں اس کے سے نفرت کا جو مقام پہلے سے موجود تھا وہ حد سے تجاوز کرنے لگا۔ اسے ختم کر دیا میرے حق میں بہتر تھا۔ ورنہ وہ گوشت کی ہوس کے لئے کپتان اور سائرہ کی طرح مجھے بھی ختم کر دیتا۔

میں کیبن سے باہر نکل آیا۔ اور اس کے اطراف کا جائزہ لینے لگا چھت سے دوبارہ دھواں اٹھنے لگا تھا میرے حساس ناک نے گوشت بھوننے کی اشتہا انگیز خوشبو کو فوراً محسوس کر لیا وہ جو کوئی بھی تھا کپتان اور سائرہ کے جسم سے حاصل کردہ گوشت کو بھوننے میں مصروف تھا۔

ہوش میں آنے کے بعد میں نے کمرے میں خون اور ہڈیوں کے علاوہ کپتان کے جسم کو مفقود پایا تھا۔ وہاں صرف فٹ بال کی مانند اس کا سر ہی باقی بچا تھا۔ اس وحشی نے جاتے جاتے سائرہ کے نرم وجود پر بھی ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کی تھی وہ لکڑی کے کیبن کے نیچے کہیں پوشیدہ تھا، دھواں اس بات کا اظہار کرتا تھا کہ اوپری کمروں کی نکاسی ہوا کے علاوہ وہاں ایک ذریعہ مزید بھی موجود تھا جس کے ذریعے نچلے کمرے میں موجود آتش دان میں لگی ہوئی آگ کا دھواں باہر نکلتا تھا۔ اس ذریعے کو مدنظر رکھتے ہوئے میں بہ آسانی اس آدم خور شخص تک پہنچ سکتا تھا۔

لیکن میرے دماغ میں اب بھوت سوار ہونے لگا تھا۔ میں اسے اور اس جزیرے کو ختم کر کے رکھ دینا چاہتا تھا۔ اور پھر میں نے اپنی اس سوچ پر عملدر آمد بھی کرنا شروع کر دیا۔

میں نے سائرہ کی لاش کو کمرے سے باہر نکالا اور اس کے زخمی وجود کو سمندر کے حوالے کر دیا اس کے بعد کیبن میں سے دوائیوں اور ہیروئن سے بھرا بریف کیس باہر نکالا اور احتیاط کے ساتھ درختوں کے جھنڈ میں رکھ دیا۔ کچھ مزید ضروریات زندگی کا سامان بھی بریف کیس کے ہمراہ تھا جس میں چاقو، پانی پینے کا گلاس اور پھٹے پرانے وہ کپڑے تھے جو مجھے ساحل سمندر سے دستیاب ہوئے تھے انہیں درختوں کے جھنڈ میں منتقل کرنے کے بعد میں نے خشک لکڑیاں اور جھاڑیاں جمع

کرنی شروع کر دیں۔ ان جھاڑیوں کا انبار میں کیبن کی چاروں دیواروں کے ساتھ جمع کر رہا تھا یہ نہایت مشقت طلب کام تھا۔ جو مجھے اکیلے کرنا پڑ رہا تھا اس کام میں ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ کا وقت لگ گیا۔

کام مکمل کرنے کے بعد میں نے مٹی کے تیل سے بھرا ہوا اسٹوپ باہر نکالا اور تیل کو خشک لکڑیوں پر چھڑکنے کے بعد لائٹر کے ذریعے آگ لگادی۔ بھک کی آواز کے ساتھ آگ تیزی کے ساتھ کیبن کا محاصرہ کرنے لگی، میں پیچھے ہٹ کر درختوں کے جھنڈ تلے آ کر کھڑا ہوگیا۔ اور تنقیدی نگاہوں کے ساتھ بھڑکتی ہوئی آگ کا جائزہ لینے لگا۔ کیبن کے تہہ خانے میں چھپا ہوا شخص کسی وقت بھی فرار ہونے کی کوشش کر سکتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد دھماکے کی آواز کے ساتھ لکڑی پر مشتمل کیبن کی دو دیواریں زمین بوس ہوگئیں چھت بھی زوردار دھماکے کے ساتھ نیچے گری۔ اس کے چند لمحات کے بعد چیخنے چلانے کی آواز سے ماحول گونجنے لگا۔ میں نے نگاہیں آگ کے شعلوں پر مرکوز کر دیں۔

مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہ یکلخت کسی ماہر بازیگر کی مانند آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں سے باہر نمودار ہوا۔ اس کا تمام جسم آگ کی لپیٹ میں تھا، باہر نکلنے کے فوراً بعد اس نے زمین پر لوٹ پھوٹ ہونا شروع کر دیا۔

میں نے اس کی مدد کرنے کی کوشش نہیں کی میرے پاس کوئی ایسا ذریعہ موجود نہیں تھا جسے میں استعمال کر کے اسے آگ کے شعلوں سے نجات دلوا سکتا۔ اگر سچ پوچھیں تو ذریعہ ہونے کے باوجود بھی میں اسے بچانے کی کوشش ہرگز نہیں کرتا۔ اس نے جس درندگی کے ساتھ کپتان اور سائرہ کو موت کے گھاٹ اتارا تھا اسے مدنظر رکھتے ہوئے اس کی مدد کرنے کو میں گناہ سے تشبیہ دیتا تھا۔

چند منٹوں کے بعد آگ بجھ گئی۔ اور اس کے ساکت وجود سے دھوئیں کی لکیر اٹھ کر ماحول کو تعفن زدہ کرنے لگی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے بچے کھچے سراپے کا معائنہ کیا۔ وہ چھوٹے قد کا بونا شخص تھا، بچے کھچے تاثرات سے ادھیڑ عمر معلوم ہوتا تھا اس کا چہرہ کرخت اور نحوست زدہ تھا مرنے سے پہلے اس نے مجھے اپنے متعلق سب کچھ بتا دیا۔ جو کہ یہ ہیں۔

وہ ایک نوآموز بونا سائنسدان تھا۔

مجھے معلوم نہیں کہ اس میں کچھ قابلیت موجود تھی یا نہیں۔

لیکن وہ اپنے آپ کو قابل فخر گردانتا تھا دنیا اسے تضحیک بھری نظروں کے ساتھ دیکھتی تھی۔ اس لئے ان کی لوگوں سے پوشیدہ رہنے کے لئے اس نے اس جزیرے کا رخ کیا۔ اوپری حصے میں رہائشی کمرے بنائے اور نچلے حصے کو مختصر لیبارٹری کی صورت دے دی۔ اس نے اپنے آٹھ کے قریب ورکروں کو مختلف سامان تجربات اور خورد و نوش کی اشیاء کی دستیابی کے لئے متعین کر دیا تھا۔ قدرت کی ستم ظریفی کہ یہ آٹھوں کام کرنے والے اس کے خادم زلزلے کی بدولت جاں بحق ہوگئے ان کی ناگہانی موت کے بعد تہذیب یافتہ دنیا سے اس کا رابطہ قطعی طور پر منقطع ہو کر رہ گیا۔ ایک ڈیڑھ سال تک بونے سائنسدان نے کیلے اور شکرقندیاں کھا کر گزارا کیا۔ اس کے بعد اسے تازہ گوشت کی اشتہا انگیز بھوک نے پریشان کرنا شروع کر دیا۔

تب ہماری بدقسمتی کہ انہی دنوں جزیرے پر ہم تینوں کا ظہور ہوا۔ اس کے پاس چند ایسی گیسز موجود تھی جن کے ذریعے کسی بھی انسان کو وقتی طور پر بے ہوش کیا جا سکتا تھا۔ انہی گیسز کی بدولت وہ ہمیں نیچے موجود مختصر لیبارٹری میں بیٹھ کر بے ہوش کر دیتا تھا پھر جسم کو سن کرنے والا انجکشن لگانے کے بعد وہ جسم سے معقول مقدار میں گوشت اتار لینے کے بعد اپنی لیبارٹری میں پوشیدہ ہو جاتا تھا وہ صرف انہی اوقات میں باہر کا رخ کرتا تھا جن اوقات میں ہم بے ہوش ہوتے تھے۔

اپنی بات ختم کرنے کے کچھ دیر بعد ہی اس نے دم توڑ دیا۔ اور میں نے اس کی لاش کو سپرد سمندر کر دیا لکڑی کے کیبن کے ملبے تلے مجھے چند بچ جانے والی قیمتی اشیاء

دستیاب ہوئیں جن میں جسم کو سن کر دینے والے انجکشن کی محدود تعداد بھی موجود تھی۔

☆......☆......☆

تحریر کا آخری اور دہشت ناک حصے کا آغاز دو مہینے گزرنے کے بعد ہوتا ہے۔

شاید میرے دوست یار مجھے مردہ قرار دینے کے بعد بھول بھال گئے تھے۔ تنہائی کا یہ عالم تھا کہ میں اکثراوقات اپنے آپ سے بات چیت کرنے لگتا تھا۔بعض اوقات مجھے ایسا بھی محسوس ہوتا تھا کہ میرے ماں باپ جزیرے کے کسی نامعلوم گوشے سے نمودار ہونے کے بعد میری جانب چلے آتے تھے پھر پریشان نگاہوں کے ساتھ میری طرف دیکھتے ہوئے مجھے سمندر میں آگے سفر کا مشورہ دیتے تھے۔

میں ایک بہترین تیراک تھا لیکن مناسب تیاری نہ ہونے کی بنا پر ایک طویل سفر تیر کر عبور کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس لئے خاموشی کے ساتھ ان کی بات چیت سننے کے بعد اسے فراموش کر دیتا تھا۔ میرے ماں باپ چند لمحے جزیرے پر میری معیت میں گزارنے کے بعد واپس چلے جاتے تھے۔ میں انہیں روکنے کی کوششیں کرتا تھا لیکن وہ یکلخت نگاہوں کے سامنے سے اوجھل ہو جاتے تھے اور میں دھاڑیں مار کر رونے لگتا تھا۔

آپ میری ذہنی کیفیت سے کچھ نہ کچھ آگاہ ہو چکے ہوں گے۔ میں تنہائی کا شکار ہو چکا تھا اور یکسانیت کا شکار علیحدہ تھا۔ شکر قندیاں اور کیلے کھانے سے میرا دل تقریباً اچاٹ ہو کر رہ گیا تھا۔

لیکن جزیرے پر اس کے علاوہ اور کچھ دستیاب نہیں تھا۔ تنہائی اور یکسانیت سے بچنے کے لئے میں نے ہیروئن کا استعمال کرنا شروع کر دیا، ان دنوں مختصر ہوش کے لمحات کے دوران مجھے گوشت کی کمی شدت کے ساتھ محسوس ہوتی تھی۔ جزیرے پر گوشت موجود نہیں تھا۔ میں نے مچھلیاں پکڑنے کی اپنی جان سے بڑھ کر کوشش کی لیکن بغیر ساز و سامان کے انہیں پکڑنا ممکن نہیں تھا۔

یہ ایسے ہی تنہائی پر مبنی چند لمحات کی بات ہے۔

نہ جانے آپ اس پر اعتبار کریں گے یا پھر نہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے۔

اس دن میرے دماغ میں ایک ایسی تدبیر نے جنم لیا جس کے متعلق تحریر کرتے ہوئے مجھے شرم محسوس ہو رہی ہے۔ شام کا وقت تھا اداسی کا یہ عالم تھا کہ اپنی مجبوری کے متعلق سوچتے ہوئے بے اختیار میں نے رونا شروع کر دیا، آہستہ آہستہ میرے رونے کی شدت میں اضافہ ہونے لگا میں نے اکڑوں بیٹھتے ہوئے اپنا سر رانوں کے درمیان گھسیڑ لیا، رانوں کا نرم گوشت میری بھوک کی شدت میں اضافے کا باعث بننے لگا۔ کچھ سوچنے کے بعد میں نے رونا ترک کر دیا۔ پھر اٹھ کر اس طرف چل دیا۔

جہاں دوائیوں اور ہیروئن سے بھرا ہوا بریف کیس موجود تھا۔ میں نے بریف کیس کو کھولا اس میں نہایت محدود مقدار میں وہ انجکشن موجود تھے جو جسم کے مختصر حصے کو سن کرنے کے لئے استعمال ہوتے تھے۔ میں نے انجکشن کو سرنج میں بھرنے کے بعد اسے اپنی ران میں لگا دیا۔ تھوڑی دیر بعد میری ران سن ہونے لگی، میں نے قریب پڑا ہوا چاقو اٹھایا اور آنکھیں بند کرنے کے بعد اپنی ران پر سے گوشت کا بڑا لوتھڑا اتار کر احتیاط کے ساتھ ایک طرف رکھ دیا۔

میرے بریف کیس میں زخم کو ٹانکے لگانے کا مختصر سامان بھی موجود تھا، میں نے اسے باہر نکالا خون رکنا بند نہیں ہوا لیکن زخم بھونڈے انداز میں ہی سہی...... بند ہو گیا۔ میں نے کپڑوں کی بہت سی دھجیوں کے درمیان میں موجود ایک دھجی کا انتخاب کیا اور زخم کو ڈیٹول کے ساتھ دھونے کے بعد اوپر پٹی لپیٹ دی۔

ران کے سن ہو جانے کی بدولت مجھے وقتی طور پر تکلیف کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن میں اچھی طرح جانتا تھا کہ انجکشن کا اثر زائل ہونے کے فوراً بعد مجھے اس ناقابل برداشت درد کا سامنا کرنا پڑتا۔ جسے برداشت کرنا ممکن نہیں تھا، اسی درد کی بدولت کپتان اور سائرہ کی موت واقع ہوئی تھی۔ مجھے اس کی رتی بھر بھی پرواہ نہیں تھی بھوک کے آگے بھلا اذیت ناک درد کی کیا حیثیت؟۔

بحر حال گوشت کا تازہ خون سے بھرپور لوتھڑا میرے سامنے پڑا تھا۔ میں نے اسے سمندر کے نمکین پانی کے ساتھ صاف کیا۔ اور آگ پر بھوننے لگا مجھے درد کی شروعات سے پہلے پیٹ بھرنا تھا۔

آپ اس مضحکہ خیز سچویشن کا تصور بہ خوبی کرسکتے ہیں۔

پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے مجھے اپنے ہی جسم کے ایک حصے کو استعمال کرنا پڑ رہا تھا مجھے، کراہیت بھی محسوس ہوئی۔ لیکن میں نے اسے نظرانداز کردیا گوشت کا لوتھڑا اتنا بڑا نہیں تھا کہ اس سے پیٹ مکمل طور پر بھر سکتا تھا۔ لیکن اتنا ضرور ہوا کہ کافی عرصے کے بعد جسم میں ٹھوس غذا کی دستیابی نے دماغ پر غنودگی طاری کرنی شروع کردی۔

میں نے ہیروئن کا انجکشن بازو میں لگایا اور درختوں کے جھنڈ کے درمیان لیٹ گیا۔ مجھے سوتے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ کسی نے مجھے جھنجھوڑ کر اٹھادیا، میں نے ہڑبڑا کر سامنے کی طرف دیکھا صبح کی ملگجی روشنی چاروں اطراف پھیل رہی تھی اس سحر انگیز ماحول کا وہ مختصر حصہ تھی۔ میں نے چلاتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

''ساشا ...... مجھے پورا یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گی۔'' میں نے بے اختیار آگے بڑھ کر اسے اپنے گلے کے ساتھ لگالیا۔ وہ تاسف بھری نگاہوں کے ساتھ میرے سراپے کا جائزہ لے رہی تھی۔ پھر اسکی مترنم آواز میرے کانوں میں مندر کی ہلکی گھنٹیوں کی مانند گونجنے لگی۔

''یہ کیا حالت بنا رکھی ہے سرتاج...... کچھ عرصہ کے لئے میں آپ سے جدا کیا ہوئی آپ نے تو زندگی سے ہی ناطہ توڑ دیا۔''

میں نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کردیا اس نے حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ میری طرف دیکھا پھر بے اختیار مجھے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا اس کے جسم کی مدہوش کردینے والی خوشبو مجھے بے خود کرنے لگی لیکن ٹانگ پر گہرے زخم میں اٹھتی ہوئی ٹیسوں نے مجھے آپے سے باہر نہیں ہونے دیا میرے منہ سے ہلکی سی سسکاری نکل گئی۔

ساشا نے چونکتے ہوئے میرے چہرے کی طرف دیکھا میں نے چہرے پر زبردستی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے ٹانگ کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔

''تمام جسم میں درد کا طوفان برپا ہے۔ ٹانگ کا یہ زخم چھوٹا سا نمونہ ہے۔''

ساشا ہکا بکا نگاہوں کے ساتھ بے ڈھنگے انداز میں زخم کی طرف دیکھنے لگی، میں نے اسے اپنے جسم سے علیحدہ کیا پھر گھاس پھوس سے ترتیب دیئے ہوئے بستر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''پیٹ...... کی آگ بجھانے کے لئے گوشت سے بہترین ذریعہ اور نہیں۔ جزیرے پر گوشت نہیں ہے لیکن اپنی کھیتی موجود ہے۔ جب چاہو اسے استعمال کرلو۔''

ساشا کے چہرے کے تغیرات میں تناؤ کی صورت پیدا ہوئی۔ اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ''آپ نے اپنا گوشت کھایا۔'' وہ ہچکیوں کے درمیان مجھ سے مخاطب تھی۔ ''میں یقین نہیں کرسکتی ہوں آپ کو ایسا کرنے کی بھلا کیا ضرورت تھی اور اگر تھی بھی...... تو جزیرے پر متعدد قسم کے جانور بھی تو پائے جاتے ہیں ان کا گوشت آپ کی بھوک کا مداوا ثابت ہوتا۔''

میں نے انکار میں سرہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''یہاں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ اس جزیرے پر میرے علاوہ اور کوئی بھی زندہ روح موجود نہیں شاید اب تم ہو۔''

ساشا دردبھرے لہجے میں بولی۔

''تو پھر آئندہ اگر آپ کو گوشت کھانے کی ضرورت محسوس ہو۔ تب میرے وجود کا تمام گوشت اور خون کا آخری قطرہ بھی آپ کی اس بھوک پر نچھاور ہوگا۔ لیکن آئندہ میں آپ کو ایسا ظلم نہیں کرنے دوں گی۔''

میں نے ممنونانہ نگاہوں کے ساتھ اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہاری غیر موجودگی میں ایسا ممکن تھا۔ لیکن اب تم آگئی ہو تو مجھے یقین ہے کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔''

ساشا نے طویل سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔''جہاز کی تباہی کے بعد مجھے لائف ٹیوب دستیاب ہوگئی تھی اس کے ذریعے تیرتے ہوئے میں ایک ایسے جزیرے تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئی جہاں پھلوں کے درختوں کی بہتات تھی ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے چشمے بہتے تھے لیکن آبادی موجود نہیں تھی کافی عرصہ وہاں گزارنے کے بعد میں نے انسانوں کی تلاش میں آگے سفر کا آغاز کیا تب مجھے اس جزیرے سے دھواں اٹھتا دکھائی دیا اور میں یہاں چلی آئی۔''

میں نے اثبات میں سرہلایا اور قریب پڑے ہوئے ٹیکوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''میرے زخم میں درد بھری ٹیسیں اٹھنے لگی ہیں مہربانی کرکے مجھے جسم کو سن کردینے والا ٹیکہ لگادو۔''

اس نے اثبات میں سرہلایا اور آگے بڑھ کر محلول کو سرنج میں بھرنے لگی پھر اس نے نہایت احتیاط کے ساتھ سرنج کی سوئی میرے دکھتے ہوئے زخم میں انجکیٹ کردی۔ مجھے سوئی چبھنے کی خفیف تکلیف کا احساس ہوا۔ اس کے بعد زخم میں اٹھتی ہوئی آگ یکلخت سرد ہونے لگی۔

میرے دماغ میں تنتے ہوئے بوجھ کا احساس کم ہونے لگا۔

دور افق پر سورج نمودار ہونے کی تیاری کررہا تھا ،وہاں کی زمین سرخی مائل تھی ٹھنڈی ہوا کے تازہ جھونکوں نے مجھے مدہوش کرنا شروع کردیا اور میں نے بے اختیار ساشا کو کھینچ کر بانہوں کے حصار میں قید کرلیا اس کے بعد میرے حواس گم ہوتے چلے گئے۔

دوپہر کے بعد میری آنکھ کھلی سورج سامنے کی طرف سفر کرنے لگا تھا میں نے کروٹ بدلتے ہوئے ساشا کے سراپے پر نگاہ دوڑانے کی کوشش کی۔ وہ وہاں موجود نہیں تھی۔ میں نے پریشانی کے عالم میں چیختے ہوئے اسے پکارنا شروع کردیا۔ پھر اٹھ کر اس کی تلاش میں تمام جزیرے پر ادھر ادھر بھاگنے لگا۔ لیکن وہ وہاں نہیں تھی، جزیرہ گزشتہ روز کی طرح خالی پڑا تھا۔ ایک دفعہ پھر مجھ پر تنہائی کا خوف مسلط ہونے لگا اور میں نے چیختے چلاتے ہوئے درختوں کو ٹھوکریں مارنی شروع کردیں۔ مجھ پر دیوانگی کا ایسا عالم طاری ہوتا چلا جارہا تھا۔ جس پر قابو پانا میرے اختیار سے باہر تھا۔ ٹینشن کی بدولت میری بھوک کی شدت میں مزید اضافہ ہونے لگا۔

میں نے قریب موجود سرنج کو اٹھایا اور اس میں جسم کو سن کرنے والا انجکشن بھرنے کے بعد اسے اپنی الٹی ٹانگ میں انجیکٹ کردیا ٹانگ سن ہونے لگی میں نے چاقو اٹھایا اور گزشتہ روز کی نسبت زیادہ بڑا گوشت کا لوتھڑا اتار کر ایک جانب رکھ دیا۔ پھر نہایت اہتمام کے ساتھ ٹانگ پر ٹانکے لگانے شروع کردیئے کل کی نسبت آج ٹانکے اچھے لگے۔ ٹانکے لگانے کے بعد میں نے زخم پر پٹی باندھ دی اور ایک ٹانگ پر اچھلتے ہوئے لکڑیاں جمع کرنی شروع کردیں تاکہ رات کے کھانے کا انتظام کیا جاسکے۔ تھوڑی دیر بعد میں خشک لکڑیاں جمع ہوگئیں۔ میں نے انہیں آگ لگائی اور گوشت کے لوتھڑے کو سمندر کے پانی سے دھونے کے بعد آگ پر بھوننے لگا۔ اس رات میں نے پیٹ بھر کر گوشت کھایا اور ہیروئن کا انجکشن لگانے کے بعد بے سدھ ہوکر زمین پر لیٹ گیا۔

دماغ سے بوجھ ہٹنے لگا اور میں ہواؤں میں اڑتے ہوئے ساشا کے ہمراہ خوبصورت وادیوں کے گرد چکر لگانے لگا اس کی ہمراہی تو ویسے بھی باعث اطمینان ہوتی تھی، ہم سفید بادلوں کے درمیان محو پرواز تھے۔ میں جس جانب رخ موڑنا چاہتا تھا موڑ لیتا تھا پرواز کا یہ عالم نہ جانے کب تک جاری وساری رہتا۔

کہ اچانک مجھے ساشا کے وجود کی مخصوص خوشبو سنگھائی دی۔ اس کے منہ سے نکلنے والی گرم سانسیں مجھے چھونے لگیں اور پسینے سے تربالوں میں اس کی مخروطی انگلیوں کا لمس محسوس ہونے لگا۔ میں نے جھٹکے کے ساتھ آنکھیں کھول دیں۔

وہ سامنے موجود تھی۔ صبح ہونے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی، میں نے بے اختیار اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس نے مجھے کاندھے کے پاس سے تھامتے ہوئے لیٹے رہنے

کا اشارہ کیا۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا وہاں سنجیدگی کے تاثرات موجود تھے۔ میں نے شکوہ بھرے لہجے میں پوچھا۔

''تم کہاں چلی گئی تھیں؟ میں نے تمہیں تمام جزیرے پر تلاش کیا۔ لیکن تم نہیں تھیں۔ یادرکھو کہ اگر اب تم نے مجھے چھوڑنے کی کوشش کی تب میں سمندر میں چھلانگ لگا کر خودکشی کرلوں گا۔''

وہ جھنجھلائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''خودکشی کرنے والوں کے ساتھ شیطان کا وجود ہوتا ہے اور جدوجہد کرکے والے کرنے ساتھ خدا کا ساتھ ہوتا ہے۔ آگے آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ آپ کو کون سا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔ میں آپ کو موت کی جانب بڑھتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔ یہ ہیروئن کا انجکشن لگانا اپنے جسم کا گوشت کھانا میرے خیال میں موت سے بھی بدتر ہے۔ کل سے آپ ایسا نہیں کریں گے اس جزیرے سے باہر نکلنا ناممکن نہیں ہے، صرف آپ کی ہمت جوان ہونی چاہئے میں نے ہیروئن کے انجکشن چھپادیئے ہیں، آپ کو کل صبح سے جدوجہد کا آغاز کرنا ہوگا۔''

میں نے بڑبڑاتے ہوئے انداز میں اس کی طرف دیکھا وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''آپ کو ایسا تو کرنا ہی ہوگا بصورت دیگر ہماری موت جدائی کا سبب ثابت ہوگی۔ یادرکھیں ہمارے ملاپ کے لئے تہذیب یافتہ دنیا تک رابطہ نہایت ضروری ہے۔''

میں نے اثبات میں سرہلایا اور پوچھا۔

''مجھے اس کے لئے کیا کرنا ہوگا۔؟''

وہ بولی۔''آپ بہترین تیراک ہیں۔ چند میلوں تک تیرتے رہنا آپ کے لئے کچھ معنی نہیں رکھتا جس جزیرے پر آپ موجود ہیں۔ یہ بحری راستے سے کچھ ہٹ کر ہے۔ لیکن یہاں سے چند میلوں کی مسافت پر کچھ ایسے جزیرے موجود ہیں۔ جہاں نا صرف زندگی کے آثار موجود ہیں بلکہ بحری بیڑوں کی آمدورفت بھی ان جزیروں پر بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔''

میں نے اثبات میں سرہلایا، وہ تمام دن ساشا کی معیت میں دلفریب اور نہایت خوشگوار گزرا میں نے رات ہونے سے پہلے ایک دفعہ زخم کو سن کرنے کے لئے انجکشن لگایا، ہیروئن کی خوراک کی ضرورت بھی محسوس ہوئی لیکن میں نے اسے نظرانداز کردیا اس کے لئے ساشا کی قربت کافی زیادہ تھی۔

صبح پیٹ بھر کر کیلوں اور شکرقندیوں کا ناشتہ کرنے کے بعد میں نے کچھ اپنے ہمراہ شرٹ میں بھی رکھ لئے اس صبح میں نے زخم کو سن کرنے والا انجکشن نہیں لگایا لیکن ساشا کو مخاطب کرتے ہوئے یہ التجا ضرور کی۔

''مجھے ہلکی مقدار میں ہیروئن کے انجکشن کی ضرورت ہے۔ میرا سفر نہایت طویل ہے۔ ایسی صورت میں یہ معاون ثابت ہوگا۔''

ساشا نے مسکراتے ہوئے مجھے اجازت دے دی، میں نے تباہ ہونے والے کیبن کے ڈھیر میں سے انجکشن اور ہیروئن باہر نکالی انہیں وہاں ساشا نے چھپایا تھا۔ میں نے مختصر مقدار میں ہیروئن جسم میں داخل کی اور روانگی کے لئے تیار ہوگیا۔

صبح کے دس بجنے والے تھے آسمان مکمل طور پر صاف تھا چمکیلی دھوپ جزیرے کا محاصرہ کئے ہوئے تھی یہ میرے لئے خوش آئند بات تھی۔ سمندر کی لہریں اعتدال کے مطابق ساحل کا رخ کررہی تھیں۔ میں نے اللہ کا نام لیتے ہوئے سمندر میں چھلانگ لگادی۔ اور ساحل کے مخالف جانب تیرنے لگا۔

سمندر کے نمکین پانی نے میرے جسم کے زخموں میں مرچیں بھر کر رکھ دیں تکلیف وقت کے ساتھ ساتھ شدت اختیار کرنے لگی۔ میں نے سفر کی طوالت اور کھل کر تیراکی کے لئے جسم کو سن کرنے والا انجکشن نہیں لگایا تھا اس لئے جزیرے سے چند گز آگے جانے کے فوراً بعد تکلیف کا یہ احساس میرے دل ودماغ پر حاوی ہونے لگا۔ لیکن میں نے چہرے سے اس کا اظہار نہیں ہونے دیا اور مستقل آگے کی طرف تیرتا رہا۔

ساشا کسی ڈولفن مچھلی کی طرح میرے اردگرد سرمستیاں کرتے ہوئے تیر رہی تھی کچھ دیر بعد جزیرہ

نگاہوں کے سامنے سے اوجھل ہوگیا، اب چاروں جانب نیلے سمندر کے علاوہ مزید کچھ موجود نہیں تھا میری ٹانگوں کے زخم سے اب خون رسنے لگا تھا کچے ٹانکے کھلنے لگے تھے۔اور سمندر کا کھارا پانی گھاؤ کو مزید نقصان پہنچانے کی کوششوں میں مصروف تھا۔

میں نے سوچا۔ ''اگر خون اسی رفتار کے ساتھ بہتا رہا تب کچھ مسافت طے کرنے کے بعد مجھ پر غشی کا عالم بھی طاری ہوسکتا ہے۔''میں نے اپنے آگے تیرتی ہوئی ساشا سے پوچھا۔

''ہمارا اگلا ٹھہراؤ کہاں ہوگا؟''

اس نے پریشان نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ کے زخموں کے ٹانکے کھل گئے ہیں۔؟''

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''شاید......لیکن میں کافی حد تک آگے بخیر وخوبی تیر سکتا ہوں۔''

ساشا نے پریشان نگاہوں کے ساتھ میرے اردگرد نگاہ دوڑائی اور دلگرفتہ لہجے میں بولی۔

''اردگرد دور دور تک زمین کا نام ونشان موجود نہیں ہے مجھے فکر لاحق ہورہی ہے کہ اگر آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تب کیا ہوگا؟''

میں نے زبردستی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''تم میرے ہمراہ ہوتو۔ مجھے یقین ہے کہ تم مجھے اتنی آسانی کے ساتھ ڈوبنے نہیں دوگی۔'' اس نے بے چارگی کے عالم میں میری طرف دیکھا لیکن کہا کچھ نہیں۔

میں نے اپنے ہاتھ پاؤں کی حرکت کو تیز کردیا۔ ایسا کرنے سے مجھے کمزوری کا احساس زیادہ ہونے لگا، خون کے نکلنے کی مقدار میں بھی زیادتی پیدا ہوگئی۔ اس لئے مجھے رفتار کو دوبارہ کم کرنا پڑا......نامناسب حالات میں جزیرے پر چند عرصے کے قیام نے ہی مجھے کمزور اور لاغر کرکے رکھ دیا تھا، عام حالات میں شاید میں تمام دن بغیر تھکے تیراکی کرسکتا تھا۔لیکن جن حالات سے میں چند دن قبل گزر چکا تھا انہیں مدنظر رکھتے ہوئے آدھا دن بھی نکالنا ممکن نہیں تھا۔لیکن میں نے نکال لیا۔

میری واٹر پروف گھڑی دن کے ڈھائی بجے کا اعلان کررہی تھی۔ سورج سر پر چمک رہا تھا اس کی تیز شعاعیں مجھے اپنے دماغ کے اندر گھستی محسوس ہورہی تھیں ٹانگوں کی تکلیف علیحدہ دردسری کا باعث بنی ہوئی تھی۔ میرا سانس دھونکنی کی مانند چل رہا تھا اور تیراکی کے لئے یہ کچھ اچھا شگون نہیں ہوتا۔

میں نے چند لمحے کے لئے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ میرے جسم کے عضلات یکلخت ڈھیلے پڑنے لگے اور مجھے نہایت سکون واطمینان کا احساس ہونے لگا۔

ساشا نے دوبارہ پریشان کن نگاہوں کے ساتھ میری طرف دیکھا میں نے شل ہوتے ہوئے ہاتھوں اور پاؤں کی حرکت کا دوبارہ آغاز کردیا لیکن اب میرے چہرے پر بے بسی ولاچاری کی ایسی کیفیت نمودار ہونے لگی تھی جسے دیکھتے ہوئے باآسانی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ میں چند لمحات مزید کوشش وجدوجہد کے سلسلے کو جاری رکھ سکوں گا۔ اس کے بعد یہی نیلگوں سمندر میری قبر کی صورت اختیار کرے گا۔

کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد ساشا نے اچانک ہی سمندر کے درمیان ڈبکی لگائی اور نگاہوں کے سامنے سے پوشیدہ ہوگئی۔ میں نے تیرنے کے سلسلے کو دوبارہ منقطع کردیا۔ کچھ دیر سانس کی بحالی کے بعد میں ایک دفعہ پھر زور وشور سے آگے کی طرف تیرنا شروع کردیا، ٹانگوں کی تکلیف برداشت سے باہر ہوتی چلی جارہی تھی۔

تقریباً پندرہ منٹ کے بعد ساشا دوبارہ سطح سمندر پر نموار ہوئی اس کے چہرے پر امید افزاء تاثرات موجود تھے۔میری جانب دیکھتے ہوئے بولی۔

''یہاں سے تھوڑے فاصلے پر ایک ویران ٹاپو موجود ہے جہاں تم وقتی طور پر سانس درست کرنے کے لئے رک سکتے ہو۔''

میں نے اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھوں کو زبردستی

کھولا ساشا نے مخالف سمت تیرنا شروع کردیا، میں نے اس کی تقلید کی لیکن اب مجھ میں ہاتھ پاؤں چلانے کی سکت ختم ہوتی جارہی تھی۔ میں نہایت بھونڈے انداز میں ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا کئی دفعہ میں نے ہاتھ پاؤں کو روک کر سانس درست کرنے کی کوشش کی پھر دوبارہ تیرنے کا آغاز کیا۔ ایسا کرنے کے بعد مجھے شدت کے ساتھ تھکاوٹ کا احساس ہونے لگتا تھا۔

ساشا حیرت انگیز طور پر کسی سمندری مچھلی کی طرح بغیر تھکے ہوئے تیرتی چلی جارہی تھی، میری ٹانگوں سے خون زیادہ باہر نکلنے لگا تھا۔ اور میری آنکھوں کے گرد دھند کا سفید پردہ تننے لگا ہاتھ پاؤں کی حرکت میں کمی واقع ہونے لگی۔ دماغ بوجھل ہوتا چلا گیا اس کے بعد میں نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیئے۔

میرا جسم پانی کے اندر ڈوبنے لگا، وہاں کی زمین پتھریلی تھی قریب ہی وہ ٹاپو موجود تھا۔ جس کے متعلق مجھے ساشا نے چند لمحے پہلے بتایا تھا کہ اچانک سمندر کی طاقتور لہر نے مجھے اٹھا کر ٹاپو پر پھینک دیا اس کے ساتھ ہی میرے ہوش حواس گم ہوتے چلے گئے۔

نہ جانے کتنے لمحات یوں ہی گزر گئے۔ میں انہیں جانچ نہیں پایا لیکن آنکھ کھلنے پر میں نے اپنے آپ کو سفید چادر والے بستر پر لیٹے ہوئے پایا۔ ڈاکٹروں کی ایک ٹیم میری نگہداشت پر متعین تھی۔ زہر پھیل جانے کی بدولت میری ایک ٹانگ کو کولہے کے پاس سے علیحدہ کردیا گیا تھا۔ اور دوسری ٹانگ کو بچانے کے لئے ڈاکٹروں کی ٹیم ایڑی چوٹی کا زور لگارہی تھی۔

میری خوش قسمتی اور ڈاکٹروں کی انتھک کوششوں کی بدولت دوسری ٹانگ کٹنے سے بچ تو گئی لیکن کافی عرصہ تک اس پر دوبارہ گوشت نہیں آسکا۔ ڈاکٹروں کی بدولت مجھے جن حالات سے آگاہی حاصل ہوئی وہ کچھ یوں تھے۔

دبئی کی جانب سفر کرتے ہوئے برطانیہ کے ایک جہاز کے عرشے پر اچانک ہی پانی میں شرابور ایک ایسی دوشیزہ نمودار ہوئی جس کا جسم نہایت متناسب اور چہرہ خوبصورت ترین تھا وہ کسی جل پری کی مانند دکھائی دیتی تھی اس نے جہاز کے سرکردہ افراد سے بات چیت کرتے ہوئے انہیں بتایا۔ ''کہ قریبی ٹاپو پر اس کا عزیز ترین دوست زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے اسے ان کی مدد کی ضرورت ہے۔''

جہاز کے عملے نے فوراً ٹاپو کا رخ کیا۔ یہ ٹاپو جہاز کے راستے سے بالکل ہٹ کر تھا، فاصلہ بھی زیادہ تھا لیکن عورت کی التجا کو مدنظر رکھتے ہوئے جہاز کے نگراں نے انکار کرنا مناسب نہیں جانا۔ اور جب وہ ٹاپو پر پہنچے تب میں واقعی زندگی سے ناامید ہوکر موت کی وادیوں میں گم ہونے والا تھا۔ بروقت امداد کی بدولت میری زندگی بچ گئی۔

لیکن حیرت انگیز طور پر میرے جہاز پر منتقلی کے دوران اس عورت کا وجود ہوا میں تحلیل ہوگیا۔

جہاز کے عملے نے اسے ٹاپو پر اور بحری جہاز کے عرشے اور تمام جگہوں پر تلاش کرنے کی نہایت کوشش کی لیکن انہیں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ وہ نہ جانے کہاں غائب ہوگئی تھی۔

بعد کی مختصر تحقیقات سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ شروع میں جو جہاز تباہی سے ہمکنار ہوا تھا اس جہاز کے تمام مسافروں کے ہمراہ ساشا بھی سمندر میں ڈوب گئی تھی۔ اور میری مدد کرنے والا وہ ہوا پر مشتمل وجود ساشا کی روح کا تھا۔

میں تمام زندگی اس کا احسان اپنے دل و دماغ پر بوجھ کی طرح محسوس کروں گا۔

آج ثریا کے اندھے وجود کی بدولت زندگی نہایت آرام و سکون کے ساتھ بسر ہورہی ہے۔ لیکن جب بھی میں اپنی اکلوتی ٹانگ کی طرف دیکھتا ہوں تب گزشتہ اندوہناک واقعہ یاد کرکے لرز کر رہ جاتا ہوں۔'' اور دماغ میں یہ الفاظ گونجنے لگتے ہیں کہ خدا تمام انسانوں کو مشکل وقت کی آزمائش سے محفوظ رکھے۔''
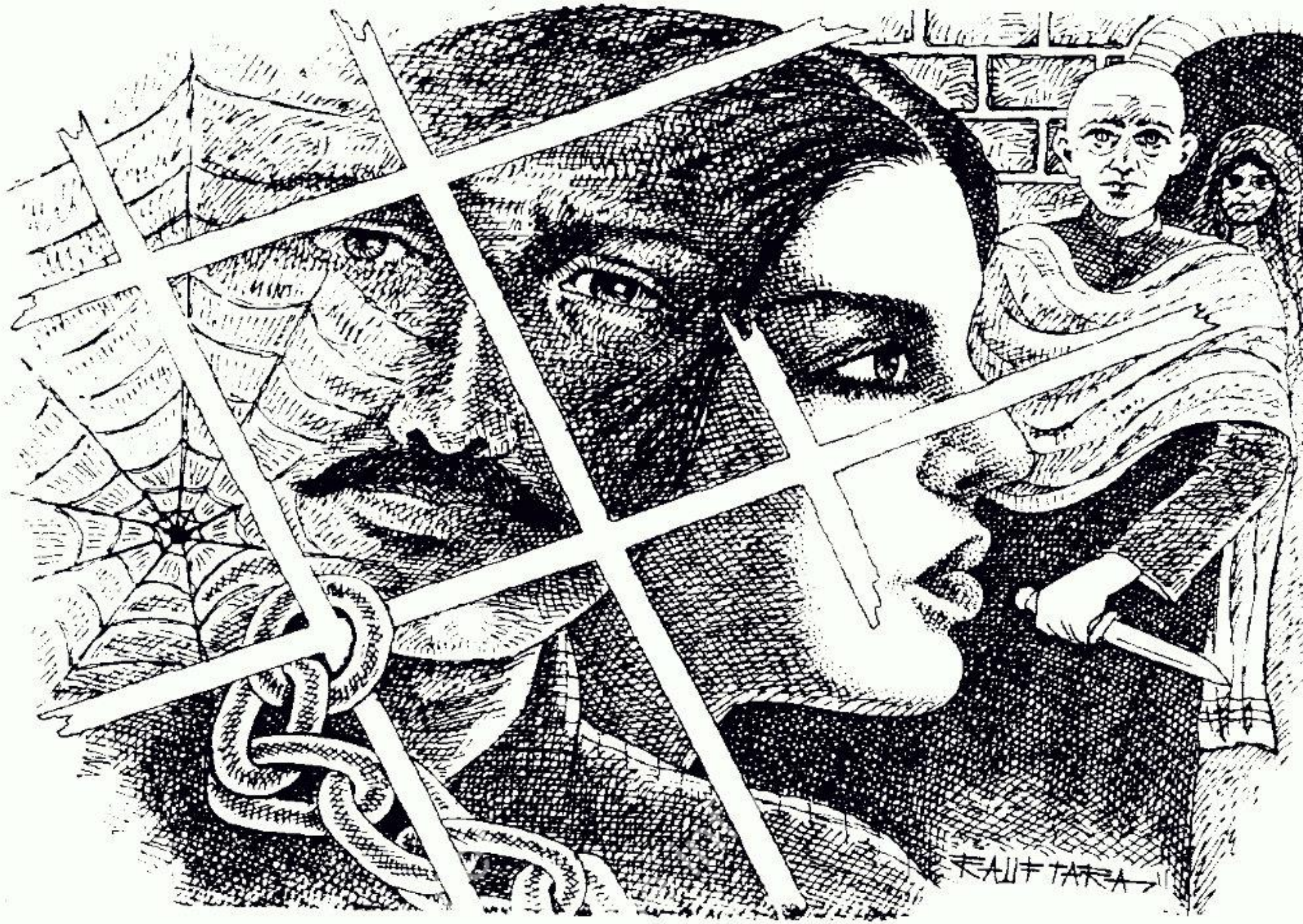
سالگرہ مبارک

ناصر محمود فرہاد۔ فیصل آباد

خوبرو حسینہ خوفزدہ انداز میں ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی اس کے سامنے کئی لڑکیوں کی تصاویر تھیں ان لڑکیوں کا جسم کئی ٹکروں میں کاٹا گیا تھا جسے دیکھ کر حسینہ کا لھو منجمد ہونے لگا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے......

دلکش دل فریب، دلنشین اور دلچسپ مگر دل شکستہ اور دل گرفتہ انوکھی کہانی

میری کار سے باہر نکلی اور گھر کے صدر دروازے کی طرف بڑھی۔ اس کے ہاتھ میں گفٹ بیگ تھا اور ہونٹوں پر مسکراہٹ۔ اس کو یقین تھا کہ رچرڈ کو اس کا تحفہ ضرور پسند آئے گا مگر وہ اس کے تاثرات دیکھنے کو بے تاب تھی اس کے ساتھ وہ یہ جاننے کے لئے بھی بے چین تھی کہ رچرڈ نے اس کے لئے کیا تحفہ تلاش کر رکھا ہے۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا وہ جو بھی ہو ظاہر ایسا ہی کرے گی کہ وہ یہی تحفہ چاہتی تھی۔ گزشتہ برسوں میں رچرڈ نے اسے کئی تحفے دیئے تھے جو اس کو پسند نہیں تھے مگر اس نے کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا کیونکہ وہ بہت اچھا مرد اور بہت اچھا خاوند تھا مگر وہ اس کے لئے عموماً اچھا تحفہ تلاش نہیں کر پاتا تھا۔

صدر دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی اس نے دیکھا کہ لان کی گھاس کو تراش خراش کی اشد

ضرورت ہے۔ گھاس ضرورت سے زیادہ ہی بڑھ گئی تھی اوراسے خطرہ تھا کہ ان کے پڑوسی انہیں کاہل اور سست الوجود سمجھتے ہوں گے۔ اگر کوئی اور موقع ہوتا تو وہ رچرڈ کو کہہ کر ابھی اس لان کو درست کروادیتی مگر آج نہیں...... آج کا دن بہت اہم تھا۔ آج ان کا دن تھا اور وہ آج کے دن اس کے ساتھ بحث نہیں کرنا چاہتی تھی خصوصاً لان جیسے فضول موضوع پر۔

جب وہ اپنے دو بیڈ روم والے گھر میں داخل ہوئی جہاں وہ اس وقت سے رہ رہے تھے جب اس کی شادی رچرڈ سے ہوئی تھی۔ بیس سال پہلے شادی والے دن رچرڈ نے اسی گھر کے دروازے پر اس کے احمریں لبوں کو چومتے ہوئے سرخ گلابوں کے ساتھ اس کا استقبال کیا تھا۔ بیس برس کے بعد آج بھی ہر سال وہ اس دن کا استقبال سرخ گلابوں سے کرتا درحقیقت گلاب میری کو پسند نہیں تھے مگر اس نے کبھی رچرڈ کا دل نہیں توڑا۔

''سالگرہ مبارک ہو۔'' وہ اسے دیکھتے ہی چلایا اور اس کے نرم گالوں کو ہونٹوں سے چھولیا۔

''تمہیں بھی سالگرہ مبارک ہو۔'' اس نے مسکراتے ہوئے سرخ گلاب رچرڈ کی طرف بڑھادیئے جو وہ اس کے لئے بازار سے لائی تھی۔

''لاؤ میں انہیں پانی میں رکھ دوں تاکہ یہ تازہ رہیں۔'' وہ پھول اس کے ہاتھ سے تھامتے ہوئے بولا اور کچن کی طرف بڑھ گیا۔

میری نے گفٹ بیگ میز پر رکھا اور کوچ پر بیٹھتے ہوئے اپنے جوتے ایک طرف اچھال دیئے۔ اس کے پاؤں بری طرح دکھ رہے تھے۔ وہ ان کو اپنے ہاتھ سے دبا کر درد کا احساس کم کرنے لگی۔ اسے سارا دن کھڑے رہ کر کام کرنا پڑتا تھا۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ یہ کام اب مشکل ہوتا جارہا تھا۔ مگر اسے یہ خوشی تھی کہ اب اسے زیادہ دن اور یہ کام نہیں کرنا پڑے گا وہ جلد ریٹائر ہونے والی تھی۔ اس نے گریجویشن مکمل کرنے کے فوراً بعد فیکٹری میں ملازمت شروع کردی تھی۔ اگرچہ تنخواہ اچھی تھی مگر جسمانی طور پر کام بہت محنت طلب تھا۔

رچرڈ کچن سے لوٹا تو اس کے ہاتھ میں اس کے لئے اس کی من پسند لیموں والی چائے کا کپ تھا۔ اس کا کپ اس کو پکڑا کر رچرڈ اس کے پہلو میں بیٹھ گیا اور بے تابی سے گفٹ بیگ کی طرف دیکھنے لگا۔ میری کو اس وقت وہ ایک جوان مرد سے زیادہ چھوٹا سا بچہ محسوس ہوا۔

''کیا تم اپنا تحفہ ابھی کھولنا چاہتے ہو؟'' اس نے شرارت بھرے لہجے میں رچرڈ سے پوچھا حالانکہ وہ جانتی تھی کہ اس کا جواب کیا ہوگا۔

''سوچ رہا ہوں۔'' اس نے اپنی بے تابی چھپانے کی ناکام کوشش کی۔

''اگر تم انتظار کرو اور بعد میں اس کو کھول لو۔'' وہ بولی حالانکہ وہ جانتی تھی کہ وہ ابھی اور یہیں اس کو کھولنے کے لئے مرا جارہا ہے۔

''نہیں میں اس کو ابھی کھولوں گا۔'' وہ بے تابی سے بولا تو میری نے وہ نیلا گفٹ بیگ اس کی طرف بڑھا دیا جس پر ایک مسکراتی بلی کی تصویر تھی۔ رچرڈ نے اسے اس کے ہاتھ سے تقریباً جھپٹ لیا۔ فوراً ہی اس کا اوپری کاغذ پھاڑا اور اس کو موڑتوڑ کر کندھے کے اوپر سے پیچھے پھینک دیا جو صوفے کے پیچھے جا گرا۔ ڈبے میں جھانکتے ہی اس کے لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔

''تمہیں کیسے پتہ چلا۔'' وہ ڈبے سے گوشت کاٹنے والے چاقو نکالتے ہوئے بولا۔ اس کی نگاہوں میں ستائش نمایاں تھی۔

''تم ہی تو پچھلے تین ماہ سے مجھے اس کے بارے میں اشارے دے رہے تھے۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ تم کیا پسند کرو گے۔''

''میں......'' وہ حیرت زدہ رہ گیا۔

''جب بھی ہم کھانا کھانے بیٹھے تم شکایت کرتے کہ گوشت اچھی طرح نہیں کٹا۔ مجھے محسوس ہوا کہ تم نئے چاقو چاہتے ہو۔''

''ان کو بھی مزید تیز کرنے کی ضرورت ہے۔'' وہ بولا۔

’’شاید.....‘‘

’’بہت شکریہ مجھے یہ بہت پسند آئے۔‘‘ وہ ایک چاقو کو ہاتھ میں تولتے ہوئے اس کا جائزہ لینے لگا۔

’’مجھے خوشی ہے کہ یہ تمہیں پسند آئے۔ میں جانتی ہوں جلد ہی ہم ان کو استعمال کرسکیں گے۔‘‘ وہ بولی۔ ’’مجھے بتادو کیا میں آج رات کے کھانے کے لئے پسندے بنادوں؟‘‘

’’میں پہلے ہی رات کے کھانے کا بندوبست کرچکا ہوں تمہیں پریشان اور فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔‘‘ وہ چاقو کی دھار پر انگلی پھیرتے ہوئے بولا۔

’’کیا مطلب؟‘‘ وہ چونک گئی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ رچرڈ کو تو پانی ابالنا بھی نہیں آتا اس کا بنایا کھانا کیسے کھایا جائے گا۔

’’میں نے رات کے ڈنر کے لئے ہوٹل سلور اسٹار میں بکنگ کروالی ہے۔‘‘

’’ہوٹل سلور اسٹار......‘‘ وہ تقریباً چلا اٹھی۔ ’’تم جانتے ہو یہ تو بہت مہنگا پڑے گا۔‘‘

’’آج خاص دن ہے جان من۔ آج سب کچھ خاص ہونا چاہئے۔ میرا نہیں خیال کہ ایک وقت ہوٹل میں کھانے سے کچھ زیدہ خرچہ ہوجائے گا۔‘‘

’’جیسے تمہاری مرضی۔‘‘

’’یہ ہوئی نا بات۔ اب تم بتاؤ تم اپنے تحفے کو ابھی دیکھنا پسند کروگی یا کھانے کے بعد ریسٹورنٹ سے واپسی پر۔‘‘

’’ہوسکتا ہے واپسی پر دیر ہوجائے لہٰذا بہتر ہے تم ابھی مجھے دکھادو۔‘‘

’’ٹھیک ہے...... آؤ میرے ساتھ۔ تمہارا تحفہ نیچے تہہ خانے میں ہے۔ تم یقیناً اسے پسند کروگی۔‘‘ وہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے صوفے سے اٹھاتے ہوئے بولا۔

رچرڈ اس کا ہاتھ تھام کر تہہ خانے کی طرف بڑھا۔ وہ دوسرے فالتو بیڈ روم کے اندر سے گزرے جو کہ اب میری کی سلائی کڑھائی کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ یہ کمرہ درحقیقت انہوں نے اپنے ہونے والے بچے کے لئے مخصوص کیا تھا مگر اس دنیا میں آنے سے پہلے ہی جب وہ بچہ چل بسا تو رچرڈ نے اس کمرے میں اس کے لئے ایک پرانی سلائی مشین رکھ دی تاکہ وہ اپنا دھیان بانٹ سکے اور غم ہلکا کرے۔ اگلے برس اس معاملے میں ان کی کوشش کا نتیجہ پھر پہلے والا ہی تھا۔ اس نتیجے نے میری اور رچرڈ کا دل توڑ دیا۔

یہ وہ وقت تھا جب میری نے فیصلہ کیا کہ اب وہ بچے کے بغیر ہی زندگی گزارے گی۔ رچرڈ نے بھی اس کا فیصلہ مان لیا۔ اگرچہ میری جانتی تھی کہ رچرڈ یہ سب اس کی محبت میں کررہا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ یہ سب اس کا اپنا قصور ہے مگر رچرڈ نے کبھی اس کو الزام اور طعنہ نہ دیا۔ جب کبھی اس موضوع پر بات ہوتی تو وہ یہ کہہ کر بات ختم کردیتا کہ ان کا والدین بننا شاید قدرت کو منظور نہیں۔ ان کی قسمت میں ہی نہیں۔ انہوں نے ایک آدھ دفعہ کسی بچے کو گود لینے کا بھی سوچا مگر پھر لمبی قانونی کارروائی سے ڈر گئے۔ رچرڈ کا خیال تھا کہ کسی کی اولاد کو اپنا کہنا مشکل کام ہے۔ ہر گزرتے سال کے ساتھ وہ اپنے پالتو جانوروں کے ساتھ ہی کو غنیمت جاننے لگے۔

دونوں تہہ خانے کی سیڑھیاں اترنے لگے تو رچرڈ نے اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ اس کے عقب میں آیا اور نرمی سے دونوں ہاتھ اس کی دونوں آنکھوں پر رکھ کر آنکھیں بند کردیں اور اس کو سہارا دے کر تہہ خانے کے ایک کونے میں لے جانے لگا۔ جب اس نے اس کی آنکھوں سے ہاتھ ہٹائے اور میری نے اپنی آنکھیں کھولیں تو وہ سالگرہ کے تحفے کو سامنے دیکھ کر تقریباً اچھل سی پڑی۔

’’اوہ رچرڈ......‘‘ وہ اچھل کر اس کے گلے سے لپٹ گی۔ اس کی خوشی دیدنی تھی۔

’’خوب...... میں خوش ہوں کہ تحفہ تمہیں پسند آیا، بے شمار میں سے ایک کو منتخب کرنا مشکل کام تھا۔ ڈرتا تھا کہیں غلطی نہ ہوجائے۔‘‘ وہ اس کا گال چومتے ہوئے بولا۔

سامنے ایک دھاتی کرسی پڑی تھی جو اس تہہ

خانے میں رچرڈ نے خود بنائی اور ویلڈ کی تھی۔ اس وقت اس کرسی پر ایک نوجوان حسین لڑکی بیٹھی تھی جس کی عمر بمشکل بیس اکیس سال ہوگی اس کے لمبے سیاہ بال تھے۔ نیلی آنکھیں، دبلا پتلا چھریرا بدن جس کا ہر خط، ہر زاویہ تراشیدہ تھا۔ میری کو یاد آ گیا اس لڑکی کا نام ٹریسی تھا اور وہ ایک مقامی شاپنگ مال میں ملازمت کرتی تھی اس نے گزشتہ سال رچرڈ کی سالگرہ پر تحفہ دینے کے لئے گالف اسٹک پسند کرنے میں میری کی مدد کی تھی۔ میری نے اسے دیکھتے ہی اس موقع کے لئے منتخب کرلیا تھا اور جب اس نے اس کے متعلق رچرڈ کو بتایا تو اسے زیادہ یقین نہیں تھا کہ وہ اسے تلاش کر پائے گا اس نے اس مال میں کام کرنے والی عورتوں کی ایک فہرست رچرڈ کو دی تھی جن میں اس کو مختلف وجوہات اور خصوصیات کی بنا پر دلچسپی تھی مگران میں ٹریسی واحد تھی جو اس کے دل میں کھب گئی تھی۔

ٹریسی کے ہاتھ اور پاؤں اس کرسی کے ساتھ مضبوطی سے بندھے ہوئے تھے اور منہ پر ٹیپ لگی تھی تاکہ وہ چیخنے سے باز رہ سکے۔ جونہی میری اس کی طرف جھکی وہ بری طرح کسمسائی۔ اس کے چہرے پر خوف کے سائے تھے۔ اس کی ایک آنکھ کے نیچے چوٹ کا سیاہ نشان تھا۔ ہونٹ کا گوشہ سوجا ہوا تھا اور خون پھوٹ پڑا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ جب رچرڈ نے اس کو اٹھایا تو اس نے کافی مزاحمت کی ہوگی۔ اس لڑکی نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر منہ پر ٹیپ لگی ہونے کی وجہ سے صرف غوں غاں کر کے اور سر ہلا کے رہ گئی۔

''یہ لڑکی بالکل مناسب ہے۔ اس سے بھی زیادہ دل کش جو تم گزشتہ سال لائے تھے۔'' میری کا لہجہ ستائشی تھا۔

''وہاں بہت تھیں ایک سے بڑھ کر ایک...... مجھے یقین نہیں تھا کہ اصل شکار کون ہے۔ بہت سوچ کر میں نے اس کو منتخب کرلیا۔''

''تمہارا انتخاب بالکل درست ہے۔ مجھے بہت خوشی ہے کہ تم اس کو لے کر آئے۔ مجھے سب سے زیادہ اسی کی خواہش تھی۔ تم نے بہت عمدہ کام کیا تمہارا شکریہ۔''

''تمہاری پسندیدگی کا شکریہ...... مگر محتاط رہنا، یہ لڑکی بلی کی طرح خطرناک ہے۔ میں شاید اس کو کار میں نہ لا پاتا۔ اس نے بری طرح مزاحمت کی جیسے۔''

''جیسے...... شیرل نے کئی سال پہلے کی تھی۔''

میری نے اس کا جملہ مکمل کر دیا۔

''بالکل ٹھیک...... آج اس دن کی بھی بیسویں سالگرہ ہے جس دن ہم نے شیرل کو مارا تھا۔ وقت کتنی جلدی گزر جاتا ہے۔''

''ہاں...... ٹھیک کہتے ہو، یوں لگتا ہے جیسے یہ کل کی بات ہو۔''

''دیر نہ کرو وقت کم ہے بس اب شروع ہو جاؤ۔ البم کے لئے اس کی کچھ تصویریں لے لو۔'' رچرڈ اپنی جیب سے ڈیجیٹل کیمرہ نکالتے ہوئے بولا۔

میری نے رچرڈ کے ہاتھ سے کیمرہ لیا اور ٹریسی کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ سامنے اس کی چند تصویریں لیں اور پھر اس کے اردگرد گھومتے ہوئے تقریباً ہر زاویے سے اس کی کئی تصاویر بنالیں۔ کام مکمل کر کے اس نے رچرڈ کے ساتھ کیمرے کی اسکرین میں تصاویر کو دیکھا اور پھر مطمئن انداز میں سر کو ہلا دیا۔ سامنے سے کھینچی گئی ایک تصویر جس میں ٹریسی کے چہرے اور آنکھوں میں خوف کے گہرے سائے لرز رہے تھے وہ ان کو بہت پسند آئی۔

''چلو اب تم اس کے قریب کھڑی ہو جاؤ میں تم دونوں کی چند تصاویر بناتا ہوں۔'' رچرڈ کیمرہ واپس تھامتے ہوئے بولا۔

''کیا میں اس کے منہ سے ٹیپ اتار دوں؟'' میری ٹریسی کے قریب پہنچتے ہوئے پوچھنے لگی۔ ''جہاں تک مجھے یاد ہے اس کے دانت بہت خوبصورت ہیں۔''

''نہ...... نہ...... میں نہیں چاہتا کہ یہ چیخے چلائے اور باہر کوئی اس کی آواز سنے۔''

میری نے مایوس ہو کر اپنا ایک ہاتھ ٹریسی کے کندھے پر رکھ دیا۔ اس کا نہیں خیال تھا کہ یہاں اس

تہہ خانے سے کوئی اس کی آواز سنے گا، مگر اس وقت وہ کوئی جھگڑا نہیں چاہتی تھی اس لئے چپ رہی۔ رچرڈ نے ٹریسی کے ساتھ اسکی کئی تصاویر بنائیں۔

''خوبصورت ...... بہت خوبصورت......

کیمرے میں تصاویر کا جائزہ لیتے ہوئے رچرڈ بول اٹھا۔'' یہ ہماری البم کو سجادے گی۔''

''کیا تم بھی ہماری البم دیکھنا پسند کروگی۔''

میری ٹریسی کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے دلبرانہ انداز میں اس سے پوچھنے لگی۔'' ہم نے ہر اس لڑکی کی تصاویر محفوظ رکھی ہیں جسے پچھلے بیس سال میں ہم نے اس تہہ خانے میں مارا اور کاٹا ہے۔''

''میں ابھی جاکر البم لاتا ہوں وہ اوپر کمرے میں پڑی ہے۔'' رچرڈ بولا۔

'' جاؤ لے آؤ۔ میرا خیال ہے ٹریسی ان کو دیکھنا پسند کرے گی۔'' میری نے جواب دیا پھر بولی۔'' آتے ہوئے اپنے نئے چاقو لیتے آنا تاکہ ہم اپنا کام مکمل کرسکیں۔''

''ٹھیک ہے میں بھی انہیں آزمانا چاہتا ہوں۔''

وہ سیڑھیاں چڑھتا ہوا بولا۔

جب میری کو یقین ہوگیا کہ رچرڈ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچ گیا ہے تو وہ ٹریسی کی طرف مڑی اور تیزی سے اس کے منہ سے ٹیپ کھینچ لی توقع کے مطابق اس نے فوراً چیخنا چاہا مگر میری نے اپنے ایک ہاتھ سے اس کا منہ دبادیا۔

''اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ کوئی تمہاری آواز نہیں سنے گا۔ اس طرح تم صرف رچرڈ کو ناراض کردوگی اور اس کا غصہ بہت برا ہے۔'' میری دھیمے لہجے میں بولی۔

کچھ لمحے توقف کے بعد اس نے ٹریسی کے منہ سے اپنا ہاتھ ہٹالیا۔ اسے امید تھی کہ اب وہ چیخنے کی کوشش نہیں کرے گی۔ خوف سے ٹریسی کے ہونٹ لرز رہے تھے میری کو اس عالم میں اس کے ہونٹ بہت خوب صورت لگ رہے تھے۔ آنسو اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے۔ میری کا جی چاہا کہ اس کو اپنے ساتھ لپٹا لے۔ دوسری لڑکیوں کی نسبت اس کو ٹریسی سے انسیت محسوس ہو رہی تھی۔ ایک لمحے کو اس کا جی چاہا کہ اس کو جانے دے مگر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس کے بعد اس کے اور رچرڈ کے ساتھ کیا ہوگا۔

''پلیز مجھے جانے دو......'' ٹریسی سسکیوں سے رونے لگی۔

''تم جانتی ہو میں ایسا نہیں کرسکتی۔'' میری نے جواب دیا۔

''قسم سے...... میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔''

''اب تو تم ایسا کہہ رہی ہو مگر باہر جاکر تمہارا ذہن بدل جائے گا۔''

''قسم سے...... میں کسی سے بھی اس کا ذکر نہیں کروں گی۔''

''کاش...... میں تمہارا یقین کرسکتی۔''

''کیوں...... تم کیوں میرے ساتھ ایسا

سبب

مارک ٹوئین کے ایک دوست نے اس سے کہا۔'' تم نے صدارتی انتخاب میں حصہ کیوں نہیں لیا؟ ہوسکتا ہے تمہیں منتخب کرلیا جاتا۔''

مارک ٹوئین نے کہا۔'' اسی وجہ سے تو میں نے حصہ نہیں لیا۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ کہیں واقعی منتخب نہ ہوجاؤں؟''

''کیوں صدر بننے میں کیا نقصان تھا؟''

''مطلب یہ...... کہ میں کبھی کوئی ایسا کام نہیں کرتا جس میں مزید ترقی کے امکانات نہ ہوں۔''

مارک ٹوئین نے سوکھے منہ سے جواب دیا۔

(عمران۔ کراچی)

کررہی ہو؟''

اس سے پہلے کہ میری کوئی جواب دیتی اس نے رچرڈ کی سیڑھیاں اترنے کی آواز سنی تو پھرتی سے ٹیپ واپس ٹریسی کے منہ پر چپکادی، اس کے آنسو پونچھ دیئے اوراس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ اس وقت تک رچرڈ وہاں آ گیا اس کے ایک ہاتھ میں البم تھی اور دوسرے میں گوشت کاٹنے والے چاقو۔

''یہ لو......''اس نے البم میری کی طرف بڑھادی۔

میری ٹریسی کی کرسی کے قریب فرش پر بیٹھ گئی اوراس کو البم میں لگی تصاویر دکھانے لگی۔ آدھی البم کو میری نے ''پہلا حصہ'' کا نام دیا تھا اس حصے میں ان لڑکیوں اور عورتوں کی تصاویر تھیں جو اسی کرسی پر بندھی بیٹھی تھیں جہاں اس وقت ٹریسی تھی۔

ٹریسی نے دیکھا ہر تصویر میں میری بھی موجود تھی۔ وہ ہر تصویر میں خوف زدہ عورت کے پہلو میں اپنے مسکراتے چہرہ سمیت موجود تھی جیسے اس نے ابھی ٹریسی کے ساتھ تصاویر بنوائی تھیں۔ عورتوں کے لباس اوران کا اسٹائل، تصویر کی کوالٹی سے علم ہورہا تھا کہ ان کا یہ مشغلہ کافی برسوں سے جاری تھا اور ٹریسی حیران تھی کہ وہ ابھی تک پکڑے کیوں نہیں گئے۔

پھر میری نے البم کا دوسرا حصہ کھولا جس کا نام میری نے ''بعد میں'' رکھا تھا۔ اس حصے کی تصویروں نے ٹریسی کو مزید خوف زدہ کردیا۔ یہ انہی عورتوں کی تصاویر تھیں جو البم کے پہلے حصے والی تصاویر میں موجود تھیں مگر اس حصے میں ان کی بے رحمانہ انداز میں قتل ہونے اورٹکڑوں میں کاٹے جانے کے بعدان کی ان تصاویر نے ٹریسی کو دہشت زدہ کردیا اس کا دماغ گھومنے لگا۔

''یہ دیکھو...... یہ شاید 86ء یا 85ء کی تصویر ہے۔'' میری نے ایک تصویر پر ہاتھ رکھ دیا۔

میری اپنی یادیں تازہ کرتی جارہی تھی۔ ہر ایک تصویر کی تفصیل بتارہی تھی اورٹریسی کی روح فنا ہوتی جارہی تھی۔

''رچرڈ نے شاید تمہیں ہماری روایت کے بارے میں نہیں بتایا۔'' وہ ٹریسی کے کندھے کو مسلتے ہوئے بولی۔ ''آج کے دن ہر برس وہ میرے لئے ایک خاص تحفہ لاتا ہے...... تمہارے جیسا اور میں اسے کوئی نہ کوئی ہتھیار تحفے میں دیتی ہوں اس چاقو جیسا۔''

''اور...... میں وہ تحفہ میری کے تحفے پر استعمال کرتا ہوں۔'' رچرڈ چاقو کو اپنے ہاتھ میں تولتے ہوئے بولا۔ ''اگر ایسی ہم آہنگی دنیا میں ہرمیاں بیوی میں ہوجائے تو بہت کم علیحدگی اور طلاق کی نوبت آئے۔''

''آج ہمارے پہلے قتل کی بیسویں سالگرہ ہے۔'' میری نے اسے بتایا۔ ''ہم نے اپنی پہلی شکار شیرل پر بھی چاقو آزمایا تھا اور آج بھی اسی کی یاد میں ایک بار پھر چاقو...... وہ بہت پیاری لڑکی تھی...... مگر تم اس سے کہیں زیادہ دلکش ہو۔''

''مگر زیادہ دیر نہیں...... یہ چاقو تو بہت عمدہ ہیں۔'' رچرڈ کا لہجہ عجیب ہوگیا۔

''لگتا ہے تمہیں اپنا تحفہ بہت پسند آیا ہے۔'' میری کا لہجہ بھی عجیب ہوگیا۔

''بہت زیادہ......اور تمہیں؟''

''میں بھی بہت خوش ہوں۔''

رچرڈ نے ٹریسی کے قریب پہنچ کر اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا میری نے بھی ایک چاقو تھاما اوراپنے سر سے بلند کیا۔

''سالگرہ مبارک ہو......میری۔''

''تمہیں بھی مبارک ہو...... رچرڈ۔''

دونوں چاقو ایک ساتھ نیچے آئے، یوں محسوس ہوا کہ وہ ایک دوسرے کے جسم میں دے ماریں گے مگر......

پھر وہ دونوں چاقو...... ایک ساتھ ...... ٹریسی کے دل میں اتر گئے۔ منہ پر لگی ٹیپ کی وجہ سے اس کی چیخ گھٹ کر رہ گئی۔

''سالگرہ مبارک ہو......''

زندہ روح

رضوان علی سومرو۔ کراچی

نوجوان نے جیسے ہی قرآنی آیات کا ورد شروع کیا تو اچانک زمین پر ایک زبردست شعلہ لپکا اور دیکھتے ہی دیکھتے سامنے موجود نادیدہ وجود کے جسم میں آگ بھڑک اٹھی اور پھر……

کیا ماورائی قوتیں بھی چاہت میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوتی ہیں، کہانی پڑھ کر دیکھیں

ہر انسان کی زندگی میں کوئی نہ کوئی ایک ایسا واقعہ ضرور ہوتا ہے جو زندگی کے پنوں پر انمٹ ہو جاتا ہے اور وہ واقعہ انسان جب تک زندہ رہتا ہے کبھی نہیں بھول پاتا۔ بعض اوقات انسان وقت اور حالات کے ہاتھوں اتنا بے بس ہو جاتا ہے کہ اپنی شخصیت پر اسے بھروسہ نہیں رہتا۔

میرا نام کلیم ہے…… دس سال قبل میڈیکل ڈاکٹر کی ڈگری ملی تھی پریکٹس شروع کردی اور مکمل ڈاکٹر تسلیم کرلیا گیا۔ ڈاکٹر بننے کے لئے ایک غریب گھرانے کے نوجوان کو کیا جدوجہد کرنی پڑتی ہے اگر اس جدوجہد کا احوال میں نے آپ کے سامنے بیان کرنا شروع کردیا تو آپ شاید کہانی پڑھنا بند کردیں لیکن عزم وحوصلہ ہر مشکل کو آسان بنا دیتا ہے۔

میرے والد صاحب باہمت تھے، تھکے نہیں

انہیں تسکین جب ہوئی جب انہوں نے میڈیکل کی ڈگری میرے ہاتھ میں دیکھی اور آرام کرنے قبر میں ہمیشہ کے لئے چلے گئے۔

ماں باپ کی موت کا صدمہ ہر اولاد کے لئے کسی پہاڑ سے کم نہیں لیکن قدرت ہر اولاد کو یہ صدمہ برداشت کرنے کی ہمت دے ہی دیتی ہے ماں تو پہلے ہی گزر چکی تھی والد کی موت نے جیسے مجھے توڑ کر رکھ دیا۔ بڑی تنگدستی کے بعد کچھ رقم پس انداز کر کے ایک درمیانے طبقے کے علاقے میں ایک جگہ کرائے پر حاصل کی اور کلینک قائم کر لیا...... درمیانے درجے کے علاقے میں کلینک قائم کرنا زیادہ مشکل کام نہیں وہاں زیادہ ڈیکوریشن کی ضرورت تو ہوتی نہیں درمیانے علاقے کے مریض 50 اور 60 والے ہوتے ہیں، درمیانے درجے کے لوگوں کا علاقہ تھا اس لئے لوگ ایک دوسرے سے بے نیاز نہ تھے جلد ہی لوگوں میں سلام دعا شروع ہوگئی آہستہ آہستہ کلینک کے میں مریضوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوگیا چوں کہ غریب لوگ تھے اس لئے میری فیس نہایت کم اور مناسب تھی۔

جس جگہ میرا کلینک آباد تھا وہاں سے تھوڑی دوری پر ایک پرانا قلعہ تھا کسی زمانے میں قلعہ انتہائی شان و شوکت سے اپنے اندر نہایت دبدبہ رکھتا ہوگا۔ لیکن اب کھنڈرات کے سوا کچھ نہ تھا۔ بستی میں قلعے کے متعلق انتہائی عجیب و غریب روایات مشہور تھیں کوئی کہتا ''اس قلعہ کے اندر ایک خفیہ مقام پر انتہائی پراسرار خزانہ دفن ہے اس خزانے کی حفاظت سانپ کر رہے ہیں جو بھی اس کے قریب جاتا ہے سانپ اسے ڈس لیتے ہیں س کے علاوہ مختلف قسم کی افواہیں اور بھی تھیں جو کہ مجھے مریضوں کی زبانی معلوم ہوتی تھیں۔

میں نے لوگوں سے بہت کچھ سنا لیکن میری اپنی داستان تو ان سے الگ تھی مجھے ترقی کرنی تھی پیسہ کمانا تھا شہر کے پوش علاقے میں اپنا کلینک قائم کرنا تھا۔ چنانچہ میں نے ان داستانوں کو ایک کان سے سنتا اور دوسرے سے اڑا دیتا۔ لوگ نہایت سادہ اور پرخلوص تھے میں رات کو دیر تک بیٹھتا تا کہ لوگوں کے دلوں میں اپنا مقام اور بھی زیادہ بنا سکوں۔

اس روز موسم نہایت ابر آلود تھا صبح سے ہلکی ہلکی بوندا باندی جو کہ وقفے وقفے سے سارا دن جاری تھی اس لئے کلینک میں مریضوں کی تعداد نہایت ہی کم تھی، پھر 5 بجتے بجتے موٹی موٹی بوندوں سے بارش شروع ہو چکی تھی اور کچھ دیر میں مزید تیز ہوگئی تھی لوگ بارش کے پیش نظر گھروں میں دبک چکے تھے صرف میں تھا جو کلینک میں بیٹھا بڑی بے چینی سے وقت کو گزرتا دیکھ رہا تھا کہ پھر بور ہو کر میں کلینک سے باہر آ گیا اور کرسی ڈال کر بیٹھ گیا بارش برستی رہی پھر اچانک رک گئی لیکن موسم ابر آلود تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد بارش پھر شروع ہوگئی اور ایسی شروع ہوئی کہ میرے گھر واپس جانے کے سارے امکانات تقریباً معدوم ہوگئے۔

بارش برستی رہی، رات کے آٹھ بجے تھے ابھی میں کلینک بند کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے ایسا لگا کہ کوئی میری طرف آ رہا ہے۔ اندھیرے میں پانی کے اندر کسی کے چلنے کی آواز سے عجیب تاثر ابھر رہا تھا۔

تھوڑی دیر میں وہ شخص میرے سامنے کھڑا تھا، اتنی بارش میں کسی اجنبی کا آنا نہایت حیرت انگیز تھا میں نے اس شخص کو غور سے دیکھا وہ ایک معمر شخص تھا۔

بارش میں اس کے کپڑے بھیگے ہوئے تھے۔

میں حیرت سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔

''ڈاکٹر صاحب...... میرا نام جابر ہے۔''

''جی کیا خدمت کروں آپ کی۔'' میں نے کہا۔

''صاحب...... میری بچی بہت بیمار ہے اسے آپ کی مدد کی ضرورت ہے ......'' جابر نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

''اوہ...... کیا بیماری ہے اسے......''

''یہ تو آپ ہی بتا سکیں گے اس کا معائنہ کرنے کے بعد۔''

’’ٹھیک ہے میں چلتا ہوں۔‘‘ میں نے اپنا بیگ تیار کیا اس کے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہوگیا۔ بارش تھم چکی تھی، ہوا بند تھی جیسے ہی میں اس شخص کے ساتھ گلی کے کونے پر پہنچا گلی کے نکڑ پر بیٹھا آوارہ کتا یکا یک بھونکنے لگا۔ اور مسلسل بھونکے ہی جارہا تھا۔ دفعتاً ایک نہایت ہی عجیب بات ہوئی جیسے ہی جابر نے کتے کی طرف دیکھا کتا یوں خاموش ہوگیا کہ جیسے کسی چلتی گاڑی کو بریک لگ گئے ہوں، کتا یک ٹک جابر کی جانب دیکھے ہی جارہا تھا۔ اچانک کتا مڑا اور دوسری جانب بھاگ گیا...... جابر کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ آگے بڑھ گیا۔

جابر میرے قدم بہ قدم چلے جارہا تھا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ جابر بستی جانے کے بجائے پرانے قلعہ کے کھنڈرات کی طرف جارہا ہے، اسی لمحے میرے ذہن میں ایک عجیب سا احساس پیدا ہوا جسے میں کوئی معنی نہ دے سکا۔

’’کیا تم بستی میں نہیں رہتے؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’نہیں...... ڈاکٹر صاحب ہم پرانے قلعے کے پاس رہتے ہیں۔‘‘ جابر نے خشک لہجے میں کہا۔

’’وہاں تو آسیب رہتے ہیں۔‘‘ میں نے شک بھرے لہجے میں کہا۔

’’آپ ڈاکٹر ہوکر ان باتوں کو مانتے ہیں...... بات یہ ہے کہ بستی والے ہمیں پسند نہیں کرتے اس لئے انہوں نے آسیب کی من گھڑت کہانی اڑائی ہے۔‘‘ جابر کے لہجے میں اداسی تھی۔

پھر میں نے جابر سے بالکل نہیں پوچھا کہ وہ بات کیا ہے جس کی وجہ سے وہ ناپسندیدہ لوگوں میں شمار ہے، میں جابر کے ساتھ چلتا رہا اب ہم دونوں کے درمیان کوئی بات چیت نہیں ہورہی تھی کافی دیر کے بعد جابر ازخود گویا ہوا۔

’’ڈاکٹر بابو...... ہم اپنی بچی سے بے حد پیار کرتے ہیں وہ بہت عرصے سے بیمار ہے بس اس کا علاج کردیں۔‘‘

’’اللہ مالک ہے...... شفا بہرحال اللہ کے اختیار میں ہے۔‘‘ ڈاکٹر تو وسیلہ ہوتا ہے۔ میں نے کہا۔

’’بالکل......‘‘ وہ سر ہلا کر بولا۔

ہلکی ہلکی بوندیں گرنا شروع ہوگئیں تھیں میں جابر کے ساتھ چلتا رہا پھر قلعہ کے آثار نظر آنا شروع ہوگئے تھے لیکن جابر قلعہ کے اندر داخل ہونے کے بجائے اس کے دائیں سمت چل پڑا دیوار کے ساتھ کچھ مکانات تھے لیکن جابر ان مکانات کے سامنے نہیں رکا بلکہ ان سے بھی آگے چل کر ایک مکان کے سامنے رک گیا۔

مکان باہر سے دیکھنے میں نہایت خستہ حال معلوم ہوتا تھا لیکن اندر داخل ہونے کے بعد یہ احساس بالکل ہی ذہن سے نکل گیا۔ صحن عبور کرکے ہم کمرے کے دروازے پر پہنچ گئے کمرے تک پہنچنے کے لئے ہمیں دالان سے گزرنا پڑا تھا، خاصا کشادہ مکان تھا۔

میں بوڑھے کے پیچھے پیچھے اس کمرے میں داخل ہوگیا جہاں مریضہ تھی۔

چھوٹا سا کمرہ تھا لیکن کھلا کشادہ ہوا کی آمدورفت میں کوئی رکاوٹ نہ تھی، کمرے کے اندر دروازے کے ساتھ بائیں سمت ایک چارپائی پر سفید چادر اوڑھے کوئی لیٹا تھا اس کے برابر درمیانی عمر کی ایک عورت بیٹھی تھی عورت کے چہرے پر فکرمندی کے تاثرات تھے۔

’’ڈاکٹر صاحب ...... کو لے آیا ہوں......‘‘ جابر نے عورت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

’’اچھا......‘‘ عورت نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ قدرے توقف کے بعد عورت پھر گویا ہوئی۔ ’’کاش! تم ڈاکٹر کو پہلے لے آتے۔‘‘

’’کیا مطلب......؟‘‘ جابر کے بجائے میں نے جواب دیا۔

’’کچھ نہیں...... ڈاکٹر صاحب یہ پاگل ہے......‘‘

’’ہاں...... میں پاگل...... ہوں۔ اور تم......‘‘ وہ جابر کی طرف انگلی اٹھا کر بولی۔

’’بکواس مت کر صابرہ...... تو اندر جا۔‘‘ جابر

نے نہایت غصے سے عورت کی طرف دیکھ کر بولا۔
جابر کی بات سن کر عورت سر جھکا کر اندر چلی گئی لیکن اس نے جن نگاہوں سے مجھے دیکھا ان میں نہایت تڑپ تھی۔
''ڈاکٹر صاحب..... آپ میری بچی کو دیکھیں۔''
''ٹھیک ہے.....'' میں ان دونوں میاں بیوی کی ذومعنی پراسرار گفتگو میں الجھا ہوا تھا اور پھر میں نے آگے بڑھ کر سونے والی کے چہرے سے چادر ہٹائی تو پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔
وہ منظر ہی اتنا تابناک تھا جیسے کہ گویا میری آنکھیں روشن ہوگئی ہوں سلگتا سا چہرا..... حددرجہ معصومیت..... بند آنکھیں جن میں چھپی ہوئی کائنات کی خوبصورتی کا احساس، خشک ہونٹ گلاب کی پنکھڑیوں کی مانند، صراحی دار گردن، بڑا ہی خوبصورت چہرہ تھا۔ ایسی خوبصورتی اور معصومیت جسے دیکھ کر جذبات میں ہیجان کے بجائے دل میں پانے کی جستجو بیٹھ جائے، اس خوبصورت اور حسن پر کسی نے خوب کہا ہے۔

یہ چراغ بے نظر ہے یہ ستارہ بے زباں ہے
اب تجھ سے ملتا جلتا کوئی دوسرا کہاں ہے

میں نے اسے یوں دیوانوں کی طرح دیکھتا رہ گیا اچانک مجھے احساس ہوا کہ اس کا باپ کیا سوچے گا دفعتاً مجھے اپنا فرض یاد آ گیا میں نے چونک کر اس کے خوبصورت اور بند پلکوں پر ہاتھ رکھا ایک لمحے کے لئے میرا ہاتھ کانپ گیا..... ایک عجب تھرتھری میرے جسم میں دوڑ گئی محبت کا احساس مجھے چھو کر گزر گیا وہ دلفریب احساس جس سے میں ناآشنا تھا۔ اس کی پلکوں کو چیر کر اس کے تنفس کا اندازہ کیا پھر اس کے بدن کا جائزہ لینے لگا۔
ایک جوان رعنائیوں اور شباب سے بھرپور جسم میرے سامنے تھا..... معائنہ سے ایک بات ظاہر ہوئی کہ تمام اعضاء ٹھیک طرح سے کام کر رہے تھے دل کی دھڑکن، خون کی روانی، لیکن جسم ٹھنڈا تھا۔
''تعجب ہے.....'' میں زیرلب بڑبڑایا۔
''جی..... آپ کچھ کہہ رہے ہیں۔'' جابر نے کہا۔
''ہاں..... یہ اتنی سرد کیوں ہیں۔ بارش سے تو آپ اور میں آئے ہیں۔'' میں نے حیرت سے کہا۔
''وہ..... جی..... میں..... مجھے..... پتہ نہیں۔''
جابر گڑبڑا گیا۔
صاف محسوس ہو رہا تھا کہ جابر میرے سوال سے گھبرا گیا..... وہ وجہ جانتا ہے۔
اسی اثناء میں لڑکی کی ماں کافی بنا کر لے آئی کافی کی ایک چسکی نے سرد ہوتے جسم میں حرارت کا ایک نیا احساس پیدا کیا تھا۔
''یہ کتنے عرصے سے بیمار ہیں۔'' میں نے لڑکی کی ماں سے پوچھا۔
''وہ..... جی..... کافی عرصہ ہوگیا۔'' وہ بیٹھتے ہوئے بولی۔
''ان کا جسم سرد ہے..... کیا یہی کیفیت رہتی ہے۔'' میں نے پوچھا۔
''وہ..... جی اس کا جسم تو.....''
''تو چپ رہ..... اندر جا.....'' جابر کی بیوی کی بات مکمل ہونے تک جابر نے بات کاٹ کر اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔
جابر کی بیوی نے اندر جاتے ہوئے نہایت معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھا میں ان نظروں کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھا جیسے وہ مجھے کچھ کہنا چاہتی ہو..... مگر کہہ نہ پا رہی ہو۔
''ڈاکٹر صاحب..... پلیز! آپ دوا دیں اور اس کی باتوں پر دھیان نہ دیں۔'' وہ بولا۔
''میرے معائنہ کے مطابق لڑکی بالکل ٹھیک تھی صرف کمزوری تھی اور جسم سرد تھا بہرحال میں نے نسخہ تیار کیا انجکشن لگایا اور وہاں سے واپس آ گیا جاتے وقت جابر نے چپکے سے میری جیب میں کچھ ڈال دیا۔
میں رات کی تاریکی میں قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھتا گیا، ذہن کے کسی گوشے میں خوف کا احساس نہ

تھا، گھر آ کر میں نے جیب ٹٹولا تو اس میں 1000 والے دو نوٹ موجود تھے یہ بڑی ہی حیرت انگیز بات تھی 2000 ہزار مجھ جیسے ایک معمولی ڈاکٹر کے لئے زیادہ تھے۔

رات میری اس قتالہ عالم، قتالہ دل کے خواب دیکھتے گزر گئی میں دیکھتا کہ وہ دلہن بنی حجلہ عروسی میں جلوہ گر ہے، پوری رات اسی طرح کے خواب میں گزر گئی کبھی نیند آتی کبھی چونک کر اٹھ جاتا۔

دوسرے دن میں کلینک پہنچا، آج اتفاقاً کوئی مریض نہیں آیا شام ہوگئی تقریباً 7 بج کر 10 منٹ ہوئے تھے کہ میں نے کلینک پر ایک برقع پوش خاتون کو دیکھا وہ کوئی مریضہ تھی جو اپنا علاج کرانے کی نیت سے آئی تھی۔

وہ سر سے پاؤں تک برقعہ میں ڈھکی ہوئی تھی ،نقاب سے صرف دو جھیل سی آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔

''کیا میں اندر آ سکتی ہوں؟'' ایک انتہائی سریلی آواز میری قوت ساعت سے ٹکرائی، آواز سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ 22-20 کے درمیان ہوگی۔

''جی ...... اندر آپ آ چکی ہیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اوہ ...... سوری ......'' وہ کلینک میں مریضوں والی جگہ پر بیٹھ گئی اسے بیٹھے ہوئے تھوڑی دیر ہوئی تھی ، میں چاہتا تھا کہ وہ جلد از جلد اپنا حال بیان کرے تاکہ میں دوا دوں۔

''جی ...... کیا بیماری ہے آپ کو ......؟'' میں نے شائستہ لہجے میں پوچھا۔

''جی ...... میں علاج نہیں کرانا چاہتی ......'' اس نے جواب دیا۔

''پھر آپ آئی کیوں ہیں؟'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میری بات کا جواب دینے کے بجائے اس نے اپنا نقاب الٹ دیا اس چاند صورت کو دیکھتے ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا، وہ ہی لڑکی تھی ، وہی صورت تھی جس سے میں محبت کر بیٹھا تھا۔

''مگر کیوں ......؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ جواب دینا ہی چاہتی تھی کہ میرا کمپاؤنڈر کمرے میں داخل ہوا۔

فیروز کے اس طرح اندر آنے پر مجھے کافی جھنجھلاہٹ ہوئی فیروز کے آتے ہی اس نے واپس نقاب پلٹ دیا۔

میں نے اسے غصے سے دیکھا اور کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ......!

''ڈاکٹر صاحب ...... ایک بوڑھا آیا ہے ضد کر رہا ہے ...... اندر آنے کی ......'' کمپاؤنڈر نے جواب دیا۔

''چلو دیکھتے ہیں ......'' میں اٹھ کر کمپاؤنڈر کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھا پھر خیال آیا کہ اس سے معذرت تو کرلوں ...... جیسے ہی واپس پلٹا ...... تو وہ وہاں نہیں تھی میری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''یہ کہاں گئی ......؟'' میں نے فیروز سے پوچھا۔

''ڈاکٹر صاحب ...... یہاں تو کوئی بھی نہ تھا ...... آپ اکیلے تھے ...... تبھی میں اندر آ گیا تھا آپ سے پوچھنے کہ بوڑھے کو اندر بھیج دوں ...... پرانے قلعہ کی روح نے آپ پر بھی اثر کر دیا شاید ......'' فیروز مسکرا کر بولا۔

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میرے خیالات اس قدر قوی ہو سکتے ہیں کہ وہ مجسم روپ میں میرے سامنے آ سکتی ہے، دل ماننے کو تیار نہ تھا مگر یہ سچ تھا؟ کیا محبت کا احساس اتنا طاقت ور ہو سکتا ہے؟ کیا وہ واقعی نہیں تھی یا میرے احساسات نے اسے پیدا کر دیا تھا؟

دفعتاً میں نے بوڑھے جابر کو اندر آتے دیکھا اس کے چہرے پر خوشی کے تاثرات تھے اور وہ بڑے ہی احترام سے میرے سامنے بیٹھ گیا۔

''کیسی طبیعت ہے اس کی؟'' میں نے پوچھا۔

''شمع کی حالت کافی بہتر ہے ...... مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کے علاج سے ٹھیک ہو جائے گی ...... ابھی میں آپ کو لینے آیا ہوں۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ چلو۔'' میں نے کہا۔
کچھ دیر بعد ہم دونوں مریضہ کے سامنے تھے جابر کی بیوی آج بھی لڑکی کے پاس موجود تھی میں نے دیکھا کہ جابر نے اسے تیز نظروں سے گھورا ہے جس سے عورت کے چہرے پر تلخی گھل گئی اور وہ اٹھ گئی۔
آج لڑکی جاگ رہی تھی اور آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی۔
''اب کیسی ہو...... مطلب کیسا محسوس کر رہی ہو۔'' میں نے کہا۔
''اچھی ہوں......'' میرے کانوں میں شرینی گھل گئی۔
میں نے جلدی جلدی اس کو چیک کیا آج اس کے جسم میں کافی حرارت موجود تھی مطلب اس کا جسم قدرے گرم تھا میں نے جلد از جلد اس کو دوا دی انجکشن لگایا اور تسلی کے کلمات بول کر بوڑھے کے ساتھ واپسی کے لئے تیار ہوگیا۔
باہر آکر جابر نے جیب میں ہاتھ ڈال کر مجھے کچھ دیا، میں نے دیکھا کہ وہ 2000 روپے تھے۔
''جابر...... تم کیا کرتے ہو......''
''کچھ نہیں...... ہم تو بس طلب گار ہیں۔'' وہ بولا۔
''کس چیز کے؟'' میں نے پوچھا۔
''ڈاکٹر اگر شمع ٹھیک ہوگئی تو میں تمہاری زندگی بنادوں گا سمجھے اور آگے سے یہ سوال مت پوچھنا۔'' اس نے خشک لہجے میں میرے سوال کو کاٹ کر کہا۔
میں ڈاکٹر تھا میرا کام مریض کو اچھی طرح دیکھنا میرا فرض تھا۔ مریض کے لواحقین کی مالی حیثیت کیا تھی کیا نہیں یہ جاننا میرا کام نہیں میرے لئے مریض کی اہمیت تھی اس کی حیثیت کی نہیں جابر کی بات سن کر دل و دماغ میں تلخی تو گھل گئی لیکن شمع کے بارے میں سوچ کر سب تلخی شرینی کی صورت میں بدل گئی سو اس کا یہ کہنا کہ وہ میری زندگی بنادے گا تو اس سے اچھی بات اور کیا ہوسکتی تھی۔
''کاش! شمع میری شریک حیات بن سکتی؟'' میں کافی دیر تک جابر اور شمع کے بارے میں سوچتا رہا۔ ''نجانے کیوں جابر اتنی حیثیت رکھنے کے باوجود اس علاقے میں رہتا ہے۔'' سوچتا رہا دماغ الجھتا رہا۔
پھر اس کی بیوی کا پر اسرار سا رویہ یاد آیا؟ لیکن کچھ سمجھ نہ آیا۔
تیسرے دن بھی جابر مجھے لینے آیا آج جب میں اس کے ساتھ گھر پہنچا تو لڑکی کی حالت کافی بہتر تھی وہ تکیہ کے سہارے ٹیک لگائے بیٹھی تھی میرے پیشے کا تقاضہ تھا کہ اپنے ہر مریض کے ساتھ بے تکلفی سے پیش آؤں، میں نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔
''کیسی ہو شمع؟'' میں نے مسکرا کر پوچھا۔
میرے منہ سے اپنا نام سن کر وہ چونک گئی۔
''آپ میرا نام کیسے جانتے ہیں......؟''
اس کی مترنم سی آواز سن کر جیسے میرے کانوں میں جلترنگ سی بج اٹھی۔
میں نے ہاتھ کی انگلی سے جابر کی طرف اشارہ کیا۔
جابر نے اثبات میں سر ہلایا۔
''آپ کا نام کیا ہے ڈاکٹر صاحب......؟'' اس نے پوچھا۔
سوال خاصا دلچسپ تھا۔ عموماً مریض ایسے سوال نہیں کیا کرتے لڑکی کے سوال میں بے تکلفی کا عنصر تھا۔
''کلیم گجر......'' میں نے مسکرا کر کہا۔
''دودھ والے ہیں آپ......'' وہ مسکرائی۔
''نہیں...... جی یہ تو ہماری ذات ہے......''
''ڈاکٹر صاحب آپ رہتے کہاں ہیں؟''
''یہاں سے کافی دور......'' میں اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔
''اور بابا آپ کو کہاں سے ملے......''
''تمہاری ہی بستی میں ایک چھوٹا سا کلینک ہے۔''
''اچھا یہ بتائیں ڈاکٹر صاحب...... میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔''
''کیوں نہیں...... پہلے سے تم کافی بہتر ہو...... ایک آدھ دن میں بالکل تندرست ہو جاؤ گی۔'' میں نے کہا۔

"ایسا کبھی نہیں ہوگا..... ڈاکٹر صاحب۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔

اس کی بات سن کر میں چونک پڑا میں نے جابراوراس کی بیوی کی طرف دیکھا ان دونوں ہی کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے جن میں ندامت اور شرمندگی مجھے محسوس ہوئی۔

"کیوں نہ ہوگا..... میرے علاج میں کوئی کمی تو نہیں..... اور مایوسی کی ضرورت نہیں ہر مرض کا علاج اللہ پاک نے پیدا کیا ہے۔"

"مگر میں ٹھیک نہیں ہونا چاہتی....." وہ سرد لہجے میں بولی۔

"کیوں....." میں ہونقوں کی طرح ان تینوں کو دیکھنے لگا۔

دفعتاً مجھے اپنے کلینک والی شام یاد آ گئی جس میں اس لڑکی نے کہا تھا کہ "میں علاج نہیں کرانا چاہتی۔" اوراس کی آمد کو میں اپنا تخیل اور وہم سمجھا تھا۔؟ "کیا شمع واقعی کلینک میں تھی؟ اگر تھی تو کہاں غائب ہوگئی تھی؟"

اب یہ دونوں میاں بیوی مجھے کچھ پراسرار سے محسوس ہونے لگے تھے۔ کیا ان دونوں نے اپنی بیٹی پر کسی قسم کا ظلم روا رکھا تھا یا پھر اسے قید کر رکھا تھا جو وہ ٹھیک نہیں ہونا چاہتی تھی ہوسکتا ہے اپنے باپ کو دیکھ کر کلینک کے پیچھے والے دروازے سے نکل گئی ہو اس وقت میں نے دھیان نہیں دیا تھا اس بات پر۔

"کیوں ٹھیک نہیں ہونا۔" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"یہ..... یہ..... ان دونوں سے پوچھو....." اس نے اپنے ماں باپ کی طرف اشارہ کرکے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

میں نے گہری سانس لی اور دونوں کی طرف دیکھا تو ان کے چہرے پر دکھ ہی دکھ تھا۔

"ایسا مت کہو..... بیٹی۔" جابر کی بیوی بولی۔

"بیٹی مت کہو....." شمع زہر خند سے بولی۔

اختیار

دیپالپور میں ایک ڈپٹی کمشنر تھے عبدالحمید۔ ایک بار وہ دورے پر کسی تحصیل میں گئے وہاں کے زمیندار نے ان کی دعوت کی۔ کھانے کے بعد ڈپٹی کمشنر نے اس سے کہا۔ "محترم! آپ کے ذمے بہت سی مال گزاری باقی ہے۔ براہ کرم جلد ادا کردیجئے گا۔"

زمیندار چونک پڑا۔ اس نے حیرانی سے کہا۔ "حضور آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں میرے ذمے تو ایک پیسہ بھی باقی نہیں ہے۔ میں سارا حساب بے باق کر چکا ہوں۔" اس نے اپنے کارندے کو بلایا اوراس سے اس بیان کی تصدیق چاہی۔ معلوم ہوا کہ ڈپٹی کمشنر کی شکایت درست ہے۔ کیونکہ کارندے نے مال گزاری کی رقم ادا کرنے کے بجائے خرد برد کرلی تھی۔ ڈپٹی کمشنر نے زمیندار سے کہا۔ "آپ ایسے بددیانت آدمی کو ملازمت سے برخاست کیوں نہیں کردیتے؟"

زمیندار نے جواب دیا۔ "حضور میں اسے ہزار مرتبہ برخاست کرچکا ہوں۔ لیکن یہ مزدور برخاست ہوتا ہی نہیں کہتا ہے کہ اللہ بخشے مجھے آپ کے والد نے ملازم رکھا تھا۔ وہی برخاست کرسکتے ہیں۔ آپ کو کوئی اختیار نہیں ہے۔"

(عرفان - کراچی)

اتنا سننا تھا کہ اس نے زخمی نظروں سے جابر کی طرف دیکھا اور چہرے پر دوپٹہ رکھ کر اندر بھاگ گئی۔
جابر پشیمانی سے سر جھکائے کھڑا تھا۔
''ڈاکٹر میں جانتی ہوں کہ میرے ماں باپ میری صحت کے کس قدر خواہش مند ہیں۔''
''نہیں...... بیٹی ایسا مت کہو ہم شرمندہ ہیں۔'' بوڑھا نرم مگر درد بھرے لہجے میں بولا۔
''نہیں ...... بابا...... تم نے اپنا بھروسہ توڑ دیا ہے...... تمہاری شرمندگی، گیا وقت واپس نہیں لاسکتی۔''
''شمع...... تم ٹھیک ہو جاؤ......'' پھر ہم بہت باتیں کریں گے میں نے اسے انجکشن لگاتے ہوئے کہا۔
جیسے میں انجکشن لگا کر ہٹا اس نے میرے کان میں کہا۔
''کل مجھے پرانے قلعہ میں ملنا۔'' جملہ نہایت آہستگی سے کہا گیا تھا۔
پرانا قلعہ آسیب زدہ مشہور تھا، کہا جاتا تھا اس میں روحیں موجود ہیں اور وہ روحیں بھٹکی ہوئی ہیں۔
اور یوں بھی میں نے پرانے قلعے کو اس کے قرب وجوار سے دیکھ لیا تھا لیکن شمع کا مجھے قلعہ کے اندر بلانا مجھے نہایت ہی عجیب لگ رہا تھا مجھے پرانے قلعہ سے منسلک تمام آسیبی روایات یاد آنے لگی تھیں انسان کتنا بھی پڑھ لکھ جائے ماڈرن ہو جائے مگر اس کے اندر چھپا خوف ضعیف الاعتقادی کبھی ختم نہیں ہوتی۔
بہر حال میں دوسرے دن 1 بجے قلعہ کے اندر پہنچ گیا قلعہ کی اندرونی حالت دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی قلعہ جتنا باہر سے شکستہ نظر آتا تھا مجھے یقین تو نہ تھا کہ شمع بھی قلعہ کے اندر آئے گی کیونکہ وہ کافی بیمار تھی بقول اس کے والدین کے وہ چل پھر بھی نہیں سکتی تھی۔
لیکن اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی شمع مجھے ایک بڑے پتھر کے سامنے کھڑی نظر آئی اس وقت وہ بالکل کوئی پری نظر آرہی تھی ابھی میں اس کے سراپے میں کھویا ہوا تھا کہ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میرے پاس آئی۔
''حیرت ہو رہی ہے...... ڈاکٹر صاحب۔''
میں نے اثبات میں سر ہلایا۔
''جابر...... جو کہ میرا باپ ہے......'' اس کے لہجے میں نفرت گھلی ہوئی تھی۔ ''بہت بے شرم انسان ہے۔''
''کیا مطلب......'' میں چونک کر بولا۔
میری بات سن کر شمع کے چہرے پر اداسی طاری ہوگئی۔
''تم سوچ رہے ہوگے ڈاکٹر میں کیسی بیٹی ہوں جو کہ اپنے باپ کو برا کہہ رہی ہوں۔'' شمع نے پھیکی مسکراہٹ سے کہا۔
''ہاں......'' میں نے سر ہلایا۔
اس کے حسین چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں رقص کرنے لگیں وہ کافی دیر تک سوچ میں ڈوبی رہی۔
''آج میں سب کچھ بتادوں گی...... میری بیماری میں ایک کہانی پوشیدہ ہے...... قلعہ کی کہانی۔'' وہ بولی۔
اس کی بات سن کر میں چونک پڑا قلعہ کی ساری آسیبی کہانیاں میرے ذہن میں گونجنے لگیں۔
''کیا مطلب......؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔
اس نے جواب دینے کے بجائے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں آتے ہی ایک سرد لہر میرے اندر دوڑ گئی ہاتھ انتہائی سرد تھا۔
''تم نے دوا نہیں لی؟'' میں نے کہا۔
وہ جواب دینے کے بجائے قلعہ کے اندرونی حصہ میں داخل ہوگئی۔
یہ بات کبھی میرے علم میں نہ تھی کہ قلعہ کے اندر بھی آبادی ہے چھوٹے چھوٹے مکانات چاروں طرف موجود تھے ان مکانوں میں کہیں کہیں چہل پہل بھی تھیں اس کے علاوہ لوگ ادھر سے ادھر گھوم پھر رہے تھے۔
یہ بات بڑی عجیب تھی کہ اس قلعہ میں رہائش آج تک کوئی آدمی میرے پاس مریض بن کر نہیں آیا تھا؟ شمع میرا ہاتھ پکڑے آگے بڑھتی جارہی تھی، ایک آدمی میرے سامنے آکر کھڑا ہوگیا اس کا چہرہ دیکھ

کر مجھے جھرجھری سی آ گئی۔

اس کا چہرہ نہایت ہی عجیب اور خوف ناک تھا گول مٹول سا چہرہ، چہرے پر گھنی داڑھی جس سے اس کے ہونٹ تک چھپ گئے تھے چہرے پر عجیب سی زردی گھنڈی ہوئی تھی ،شعلوں کی طرح دہکتی آنکھیں بڑی خوف ناک معلوم ہورہی تھیں خونخوار نظروں سے مجھے یک ٹک گھورے جارہا تھا اس کے گھورنے کا انداز انتہائی خوف ناک اور ڈراؤنا تھا۔ اسے اس طرح گھورتے دیکھ کر میں کسی سوکھے پتے کی طرح کانپنے لگا اس کے ہونٹ حرکت میں آئے وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ شمع اس کے اور میرے بیچ میں آ گئی۔

میں نے دیکھا کہ شمع کو دیکھ کر اس کے چہرے پر تحیر کے آثار نمودار ہوئے اس کا دہانہ کھلا اور پھر بند ہوگیا۔

''میرے ساتھ ہے۔'' شمع نے کہا۔

اتنا سننا تھا کہ وہ شخص سامنے سے ہٹ گیا اور شمع میرا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھ گئی۔

''یہ پاگل تھا بیوی کی موت کے صدمے نے اسے ایسا کردیا ہے، ہر اجنبی کو اپنی بیوی کا قاتل سمجھتا ہے۔'' شمع نے مسکرا کر کہا۔

نہ جانے کیوں شمع کی بات مجھے بے وزن نظر آئی۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ شمع کچھ چھپا رہی ہے۔ شمع کی شخصیت کا یہ دوسرا روپ ہے۔

نہ جانے میں کس قسم کے کھیل کا حصہ بن رہا تھا۔

وہ مجھے لے کر ایک چھوٹے سے مکان کے دروازے پر رک گئی اس نے مکان کے دروازے پر دستک دی تھوڑی دیر بعد ایک بوڑھی آواز ابھری۔

''کون ہے......؟''

''شمع......'' شمع نے جواب دیا۔

''شمع کا نام سنتے ہی دروازہ کھل گیا دروازے پر ایک بوڑھی عورت جس کی عمر کوئی 65 برس ہوگی وہ معمولی لباس میں ملبوس تھی۔

''آؤ بیٹے آؤ۔'' اس نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

''شہباز......کہاں ہے ماں جی۔''

''اپنے کمرے میں ہوگا۔ شاید سو رہا ہے۔'' بوڑھی نے کہا۔

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر ایک کمرے کے دروازے کے اندر داخل ہوگئی کمرے کے اندر کم روشنی والا بلب روشن تھا۔

کمرے کی مدھم سی ملگجی روشنی میں چارپائی پر کوئی سویا ہوا نظر آرہا تھا، شمع نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے سے چادر ہٹادی۔

وہ ایک خوبصورت سا نوجوان تھا چہرے پر بھری بھری داڑھی چہرے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہ نوجوان انتہائی ٹھوس کردار کا مالک ہے وہ نوجوان اس قدر گہری نیند میں تھا کہ چہرے سے چھادر ہٹانے کے باوجود بھی نہ اٹھا، نہ جانے کیوں اس کے چہرے پر زندگی نظر نہ آئی، تب شمع نے میری طرف دیکھا اور گہری سانس لے کر اس کے جسم سے چادر ہٹادی دوسرے لمحے حیرت سے میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

نوجوان کے دل کی جگہ پر بڑا سا سوراخ تھا جس سے خون نکل کر جم چکا تھا۔

''یہ...... سب کیا ہے......؟'' میں نے خوف سے پوچھا۔

''یہ مر چکا ہے......'' شمع نے پرسکون لہجے میں کہا۔

''م...... مگر کس نے...... مارا اسے؟'' میں نے خوف سے پوچھا۔

''جابر نے......اس غریب کو مار دیا......اور اس کی ماں سمجھتی ہے کہ یہ سو رہا ہے......اس کی سزا صرف اتنی تھی کہ یہ مجھ سے محبت کرتا تھا۔'' اس نے افسردگی سے کہا۔

جب اس نے یہ لفظ کہا تو اسی لمحے میری محبت کا محل زمین بوس ہوگیا، مجھے یوں لگا کہ جیسے مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑی ہو، وہ میرے جذبات سے بے خبر بولتی رہی اور میرا دل جیسے کسی ریت کے گھروندے کی طرح بیٹھتا چلا گیا۔

''شہباز اور میں بچپن سے ایک دوسرے سے

محبت کرتے تھے میں اس کی بچپن کی منگ تھی ہمارے ننھے ذہنوں میں یہ بات ڈال دی گئی ہم ایک دوجے کے لئے ہیں، چنانچہ ہم بڑے ہوئے تو ایک دوسرے کو دل سے چاہا۔"

شہباز کی مالی حالات ہم سے اچھی نہ تھی البتہ جابر کی شہر میں کپڑے کی دکان تھی، مجھے گھر میں پڑھانے ایک ماسٹر جی آیا کرتے تھے اسی وجہ سے میں خاصا لکھ پڑھ گئی۔

شہباز اور میری منگنی اس وقت ہوئی جب ہمارے پاس پیسہ نہ تھا پیسہ آتے ہی بابا اپنا وعدہ بھول گیا اس نے وہ رشتہ توڑ دیا اور ہمیں لے کر شہر آ گیا...... میں روتے ہوئے نہ چاہتے ہوئے وہاں سے شہر چلی آئی شہر میں جس جگہ بابا نے مکان خریدا تھا وہ انتہائی امیر و کبیر لوگوں کا محلہ تھا، بابا کی حیثیت بدل گئی لیکن میرے دل میں شہباز اسی طرح بسا تھا جیسے پہلے تھا، بابا خود دیہاتی تھا لیکن پیسے نے اسے اس کی اوقات بھلا دی تھی۔

شہر میں ایک روز میری ملاقات "بی اماں" سے ہوئی، بی اماں علم و عمل، نجوم میں ماہر تھی بی اماں سے میری ملاقات سکینہ کے توسط ہوئی سکینہ بھی اسی محلے میں صفائی اور بنگلوں میں جھاڑو دینے کا کام کرتی تھی، جب اس نے مجھے افسردہ دیکھا تو مجھے بی اماں سے ملنے کو کہا وہ جس بستی میں رہا کرتی تھی بی اماں اسی بستی میں اپنا کاروبار چلایا کرتی تھی۔

جب میں بی اماں کے ڈیرے پر پہنچی تو دیکھا کہ سائل اور عقیدت مندوں کا ایک ہجوم تھا، بی اماں کی عمر 60-65 برس کی تھی وہ سفید رنگ کے شلوار قمیض میں ملبوس تھی سر پر سرخ رنگ اسکول ربن بندھا ہوا تھا پورے کمرے میں لال رنگ کی روشنی پھیلی ہوئی تھی جو کہ زیرو پاور کے بلب سے خارج ہو رہی تھی بڑے بڑے دو بخور دانوں سے نکلتا دھواں ماحول کو پراسرار بنا رہا تھا۔ دھواں کے نیم روشنی میں بی اماں کا چہرہ کافی پراسرار ہولناک لگ رہا تھا۔

بی اماں سر جھکائے لوگوں کے مسائل سنتی پھر ہاتھ اوپر اٹھاتی تو ہاتھ سے برادے جیسی کوئی چیز جو کہ چمکیلی ہوتی سائل کے ہاتھ پر گرنے لگتی اس برادے جیسی چیز کو سائل نہایت عقیدت سے دونوں ہاتھوں میں سمیٹ کر الٹے پاؤں نکل جاتا۔

کافی دیر بعد جب میری باری آئی تو بی اماں کا جھکا ہوا سر اٹھ گیا بی اماں کی آنکھیں دیکھ کر میں کانپ اٹھی آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا تھا وہ بے حد سرخ ہو رہی تھیں بی اماں چند لمحوں تک مجھے گھورتی رہی مجھے ایسا لگا جیسے ان آنکھوں سے برقی لہریں نکل کر میرے وجود میں سما رہی ہوں۔

"چلی جا...... چلی جا...... یہاں محبت کے ماروں کی دوا نہیں ہوتی۔" وہ ہذیانی انداز میں چلائی۔

بی اماں کے اس طرح چلانے پر میں سہم گئی۔

"م...... میری مدد...... کرو...... میں شہباز کے بغیر مر جاؤں گی۔" میں نے رو دینے والے انداز میں کہا۔

"تو مر جا...... ہاہا...... ہاہا...... ہاہا۔" بی اماں دیوانوں کی طرح ہنسی اتنا سننا تھا کہ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"مت رو...... مت رو...... اور دو دن بعد آنا میرے پاس۔" بی اماں نے سخت لہجے میں کہا اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے جانے کو کہا۔

بی بی اماں نے دو دن بعد بلایا تھا، چنانچہ جب میں واپس اپنے گھر میں شہباز کو موجود پایا، شہباز جابر بابا سے کوئی بات کر رہا تھا مجھے دیکھ کر بابا چپ ہو گیا، بابا نے مجھے سختی سے اندر جانے کو کہا میں اندر تو چلی گئی لیکن میرا دل باہر تھا میں نے دیکھا کہ بابا انتہائی رعونت اور تکبر سے شہباز کو جھاڑ رہا تھا شہباز کا منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا اور آنکھوں میں بے یقینی تھی پھر میں نے شہباز کو شکستہ قدموں سے باہر جاتے دیکھا۔

شہباز کی اس قدر توہین دیکھ کر میرا دل ٹوٹ گیا چنانچہ میں نے ایک فیصلہ کر لیا۔ "میں آندھی اور طوفان کی طرح عقبی دروازے سے نکل کر سامنے پہنچی، شہباز نے

مجھے دیکھا اور بھونچکا رہ گیا میں تیزی سے اس کے گلے لگ گئی اور اس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ ثبت کردیئے۔‘‘

شہباز نے مجھے آہستہ سے ہٹایا۔ اور دھیرے سے کہا۔

’’تمہارا بابا دیکھ لے گا۔‘‘

’’دیکھنے دو......‘‘ میں نے شرگیں مسکراہٹ سے کہا۔

’’مجھے لے چلو شہباز اس دنیا سے دور جہاں محبت کے دشمن نہ ہوں۔‘‘ میں نم آنکھوں سے شہباز کی طرف دیکھ کر بولی۔

’’شمع......‘‘ اس نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے۔

’’آؤ......شہباز ...... چلیں اپنے گھر......‘‘ پرانے قلعہ میں۔‘‘

شہباز کا ہاتھ پکڑ کر ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئی، نہ جانے کب میں اور شہباز پرانے قلعہ میں پہنچے۔

’’تم کو ایسا نہیں کرنا تھا۔ ماں باپ کی عزت روندنے سے پہلے سوچنا تھا......‘‘ شہباز کی ماں بولی۔

ہم شادی کریں گے...... پھر بابا کو شادی قبول کرنا پڑے گی۔‘‘

شہباز کی ماں نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور انہوں نے نکاح کی تیاری شروع کردی۔

جیسے ہی نکاح خواں آیا میں نے دیکھا بابا جابر ہاتھ میں رائفل لئے نکاح خواں کے پیچھے پیچھے آرہا ہے۔

’’بے غیرت...... اپنے ماں باپ کی عزت کا تو پاس کرتی۔‘‘ بابا غصے سے چلایا۔

’’بابا...... میں نے محبت کی ہے...... کوئی جرم نہیں۔‘‘

’’شرم کر...... نیچ ...... آج میں تیرے عاشق کو نہیں چھوڑوں گا۔‘‘

اتنا کہہ کر بابا نے رائفل لوڈ کر کے فائر کردیا، میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا...... اندھیرا ہٹا تو میرے سامنے شہباز کی لاش تھی اور بابا مجھے گھسیٹتا ہوا واپس شہر لے آیا۔

میری محبت کا خون ہو چکا تھا میں غصے اور انتقام میں دیوانی ہو رہی تھی۔

اسی رات میں نے اپنے ماں باپ کو زہر دے دیا اور خود بھی خودکشی کرلی۔‘‘ جب سے میری روح بھٹک رہی ہے۔‘‘

’’تت......تو......تم روح......؟‘‘ میں نے شمع کی آنکھوں میں دیکھ کر ہکلاتے ہوئے کہا۔

’’ہاں میں ایک روح ...... ہوں...... جانتے ہو اس قلعہ میں موجود سارے لوگ مر چکے ہیں۔‘‘

’’کیا......!‘‘ اتنا سننا تھا کہ میرے مساموں سے ٹھنڈا پسینہ ابل پڑا۔‘‘ تو گویا لوگوں کی باتیں درست تھیں پرانے قلعے اور اس کے اعتراف میں بدروحیں ہیں؟ جابر بھی ایک بھوت تھا اور اس کی بیوی بھی؟‘‘ میں نے بھاگنے کی کوشش تو میرے قدم من من بھر کے ہوگئے میری ٹانگوں نے میرے جسم کا ساتھ دینے سے انکار کردیا۔

’’تم بھاگ نہیں سکتے...... ڈاکٹر...... کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی۔‘‘

’’شہباز کی موت کے بعد میں بی اماں سے دوبارہ ملی بی، اماں کے مشورے سے میں نے اپنے ماں باپ کو قتل کیا اور خودکشی اور میری روح آزاد ہوگئی۔

بی اماں نے مجھ سے کہا کہ‘‘ میں 100 انسانی جانوں کی قربانی دوں تو شہباز زندہ ہو جائے گا۔‘‘ اس عمل کی یہ شرط تھی کہ عامل جسم کی قید سے آزاد ہو کر یہ عمل کرے، جس جس کی میں قربانی دیتی جاؤں گی اس کی روح میری غلام بنتی جائے گی چنانچہ پہلی قربانی میں نے اپنے ماں باپ سے شروع کی اور پھر قلعہ کے سارے لوگ میرے غلام بنتے گئے اب تم آخری قربانی ہو اس کے بعد شہباز اور میں ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔‘‘ اتنا کہہ کر وہ ہذیانی انداز میں ہنسنے لگی۔

’’بابا جابر نے میرے کہنے پر تمہیں لے کر آیا تاکہ تم شکار بن سکو۔‘‘

دفعتاً پورے کمرے میں سیاہ رنگ کا دھواں پھیلنے لگا اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

تیز گھنٹیوں کی آوازوں سے جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ شمع نے چست لباس پہن رکھا ہے ہونٹوں پر انتہائی سرخ لپ اسٹک لگائی ہوئی تھی وہ بالکل شعلہ نظر آ رہی تھی۔

میں ایک چبوترے پر بندھا پڑا تھا مجھ سے تھوڑے فاصلے پر ایک دوسرے چبوترے پر شہباز کی لاش پڑی تھی، میرے بالکل سامنے بدوضع قد آدم ایک مورتی تھی جو کہ کالی تھی اس کے بالکل سامنے قدیم زمانے کے چراغ روشن تھے اگربتی کا خوشبودار دھواں پورے ہال میں پھیلا تھا اور مورتی کے سامنے ایک انتہائی بوڑھی عورت سیاہ لبادے میں ملبوس سر پر لال ربن باندھے بیٹھی تھی وہ ضرور بی اماں ہی تھی جس نے شمع کو شرک کا راستہ دکھایا تھا۔

میں غالباً کسی قربان گاہ میں تھا میں جس چبوترے پر بندھا پڑا تھا اس پر جابجا انسانی خون کے دھبے لگ چکے تھے۔

شمع دھیرے سے چلتی ہوئی میرے پاس آئی اور مسکرا کر بولی۔

''جانتے ہو ڈاکٹر آج تمہاری موت...... میرے شہباز کو زندہ کردے گی۔'' اس کے لہجے میں خوشی تھی۔

''یہ...... بالیکا مندر ہے...... جہاں دیوی کے سامنے ان کی خواہشات پوری ہوتی ہیں جو محبت میں ہار جاتے ہیں۔''

''تم نے دنیاوی محبت کے لئے ایمان کے راستے کو چھوڑ کر شرک کو چنا مگر یاد رکھنا شکست ہمیشہ باطل کی ہی ہوتی ہے۔'' میں نے کراہتے ہوئے کہا۔

شمع کچھ جواب دینا ہی چاہتی تھی کہ سنکھ کی آواز ماحول کو بالکل ہی بدل دیا، بی اماں نے سات مرتبہ سنکھ بجایا اور منتر پڑھنے لگی۔

منتر پڑھنے کا عمل کوئی آدھے گھنٹے تک جاری رہا۔

منتروں کا دور ختم ہوا تو بی اماں نے مورتی کے سامنے ہاتھ جوڑے اور آنکھیں بند کرلیں اور بولی۔

''اے بدی کی دیوی...... شیطان آلہ کار...... ظلمت کی ملکہ ہماری مدد کر اس نوجوان کو زندہ کر...... زندہ کر...... زندہ کر......'' اچانک میں نے دیکھا کہ شمع کے ہاتھ میں ایک تلوار آ گئی اور وہ تلوار لئے میری جانب بڑھ رہی ہے۔

خوف کے مارے میرا برا حال تھا میں نے آنکھیں بند کرلیں اور دل ہی دل میں حقیقی معبود اللہ کو پکارنے لگا، میری پکار رائیگاں نہ گئی جیسے کوئی مجھے کہہ رہا ہو، ''سورۃ فلق اور سورۃ الناس'' کی تلاوت کر پھر دیکھ۔

میں نے اللہ کا نام لے کر سورۃ فلق اور سورۃ الناس کی تلاوت شروع کردی کہ اچانک ایک چیخ میرے کانوں سے ٹکرائی، تو میں نے بوکھلا کر اپنی آنکھیں کھول دیں، میں نے دیکھا کہ بی اماں اور شمع کے جسموں میں آگ لگ چکی ہے اور شہباز کی لاش غائب ہے پھر میں نے ایک زوردار گڑگڑاہٹ کی آواز سنی مندر کے در و دیوار بری طرح سے ہل رہے تھے۔

میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اٹھ نہ سکا، مندر کی دیواریں گر رہی تھیں۔ مجھے زور کا چکر آیا پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا، بے ہوش ہونے سے قبل، میں نے اتنا دیکھا کہ بی اماں اور شمع کے جسم راکھ کا ڈھیر بن چکے تھے۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ایک پارک کی بینچ پر لیٹا پایا، شاید میں پاگل ہو چکا تھا مجھ پر دیوانگی طاری تھی، کئی ماہ تک یہ کیفیت طاری رہی، ہوش آیا تو چین و سکون ختم ہو چکا تھا۔

اس واقعہ کو پندرہ سال بیت چکے ہیں، اب یہ سب خواب سا لگتا ہے، شمع کی یاد اب کسک بن چکی ہے، آج میں شہر کا مایہ ناز ڈاکٹر ہوں، اس واقعہ کے بعد میں نے نماز کی پابندی شروع کردی اور یہ سمجھ لیا کہ ''فلاح صرف اللہ کی یاد میں ہے۔''

☠

پراسرار دھندلکا

ایس امتیاز احمد۔کراچی

میرے سوا کوئی بھی تمہارے قریب نہیں آسکتا کوئی بھی نہیں۔ "نوجوان نے سوچا اور اس نے اپنے کھردرے ہاتھ خوبرو حسینہ کے گلے پر جمادیئے اور اس نے حسینہ کا گلا دبانا شروع کردیا اور اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔

اگاتھا کرسٹی کا ڈرامائی انداز اور سسپنس سے بھرپور شاہکار چونکا دینے والی کہانی

یہ واقعہ سننے کے لئے آپ کو اپنا ذہن دوسری جنگ عظیم سے ذرا قبل کے زمانے میں لے جانا ہوگا۔ یہاں میں اپنے ایک نہایت قریبی دوست رابرٹ کا تعارف کراؤں گا۔ہم کئی سال اکٹھے پڑھتے رہے اور اچھے دوست ہونے کے ناطے ہمیں ایک دوسرے کے نہ صرف ذاتی مسائل بلکہ خاندانی امور سے بھی آشنائی تھی۔رابرٹ کا ایک چھوٹا بھائی ایلن اور بہن جین تھی۔ایلن سے تو کئی بار سرسری ملاقات ہوئی تھی لیکن جین سے میں کبھی نہیں مل سکا تھا۔وہ اپنے آبائی قصبہ فورٹ ٹاؤن میں رہتی تھی۔رابرٹ ہر بار چھٹیوں کے آغاز میں یہ اصرار کرتا کہ میں اس کے ساتھ فورٹ ٹاؤن چلوں۔بارہا میں نے تیاری باندھی لیکن ہر بار کوئی نہ کوئی مجبوری آن پڑتی اور مجھے رابرٹ سے معذرت کرنا پڑتی۔

یہ ذکر ہے 1939ء کے اوائل سرما کا جب رابرٹ نے گویا مجھے فورٹ ٹاؤن لے جانے کی قسم کھالی۔اس بار خوش قسمتی سے میں بھی فارغ تھا سو میں نے سامان باندھا اور رابرٹ کے ساتھ ہولیا۔

فورٹ ٹاؤن چھوٹا سا ہرا بھرا قصبہ تھا۔شہر کی پرشور اور تیز رفتار زندگی سے نکل کر یہاں پہنچا تو بے حد سکون محسوس ہوا۔رابرٹ کا حویلی نما مکان خاصا قدیم تھا۔لمبی لمبی راہداریاں، بے شمار کمرے، دالان، پائیں باغ، ناواقف آدمی کو اس حویلی کے راستے ذہن نشین کرنے کے لئے وقت درکار ہوتا۔رابرٹ کے دادا اس علاقے کے ایک معروف زمیندار تھے۔ بدقسمتی سے ان کے بعد زمینوں کا کام کوئی بھی خوش اسلوبی سے نہ سنبھال سکا اور اب رابرٹ کے پاس تقریباً یہی ایک حویلی رہ گئی تھی اور اس میں بھی نوکر چاکر ندارد۔

وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ حویلی میں آج کل مہمانوں کی ایک پوری فوج موجود ہے۔حال ہی میں جین کی منگنی ہوئی تھی۔رابرٹ نے مجھے بتایا کہ منگیتر اس سے عمر میں خاصا بڑا ہے لیکن ایک بڑا زمیندار اور علاقے کا بارسوخ آدمی ہے۔

جب ہم حویلی میں داخل ہوئے تو شام کا دھندلکا چھارہا تھا۔حویلی کی چھوٹی چھوٹی منقش برجیاں شفق کے پس منظر میں چمک رہی تھیں۔

''مجھے تو تمہاری یہ حویلی بڑی پراسرار لگ رہی ہے۔''میں نے سرسری انداز میں کہا۔

''ہاں،اس کے بارے میں بھوت پریت کی بہت سی روایات مشہور ہیں لیکن ہم تو ہنوز کسی بھوت کی ملاقات سے محروم ہیں۔'' رابرٹ مسکرایا اور مہمانوں سے تعارف کرانے سے قبل مجھے میرے کمرے میں لے آیا اور کہا کہ میں رات کے کھانے کے لئے تیار ہوجاؤں۔ میں نے اس سے درخواست کی کہ اچھا ہوگا اگر وہی مجھے کچھ دیر کے بعد کھانے کے کمرے تک لے جائے کیونکہ حویلی کی بھول بھلیوں میں کمرہ تلاش کرنا میرے لئے دشوار تھا۔میں جانے کہاں بھٹکتا پھرتا۔

رابرٹ کے جاتے ہی میں نے جلدی سے اپنا سوٹ کیس کھولا اور کپڑے تبدیل کرنے لگا۔جب میں آئینے کے سامنے کھڑا ٹائی باندھ رہا تھا تو میری نگاہ غیر ارادی طور پر پیچھے دیوار پر پڑی۔اس میں ایک دروازہ تھا جس کا عکس میں آئینے میں دیکھ رہا تھا۔جونہی میں نے ٹائی باندھی ،سرسری طور پر میری نگاہ پھر آئینے میں دروازے کے عکس پر پڑی۔ مجھے محسوس ہوا وہ آہستہ آہستہ کھل رہا ہے...... یہ عین فطری بات تھی کہ مجھے مڑکر براہ راست دروازے کو دیکھنا چاہئے تھا مگر نہ معلوم کیوں میں ساکت کھڑا آئینے میں اس کا عکس دیکھتا رہا۔

آہستہ آہستہ دروازہ پوری طرح کھل گیا۔ یہ ایک خاصے کشادہ کمرے میں کھلا اور پھر جو منظر مجھے دکھائی دیا اس نے میرے رونگٹے کھڑے کردیئے۔ کمرے میں بچھی مسہری پر ایک لڑکی پڑی تھی اور ایک مرد اس کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ یہ منظر نہایت واضح تھا اور غلط فہمی یا وہم کا شائبہ بھی امکان سے باہر تھا۔ میں لڑکی کا چہرہ واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔اس کے سنہرے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور اس کے خوبصورت چہرے پر دہشت کے آثار نمایاں تھے البتہ آدمی کی کمر چونکہ میری طرف تھی اس لئے میں اس کا چہرہ واضح طور پر نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن اس کے بائیں رخ پر زخم کا ایک نشان بڑا واضح تھا جو چہرے کو چیرتا ہوا اس کی گردن تک آگیا تھا۔

مجھے یہ تمام صورت حال بیان کرتے ہوئے تو کچھ وقت لگا ہے لیکن درحقیقت یہ سب کچھ ایک لمحے میں ہوا جیسے ہی میری یہ سکتے کی کیفیت ختم ہوئی میں فوراً مڑا تا کہ براہ راست دہشت ناک منظر دیکھ سکوں...... لیکن...... میرے پیچھے تو محض ایک دیوار تھی اور ایک قد آدم کپڑوں کی الماری اس سے لگی کھڑی تھی۔ کوئی دروازہ تھا نہ قتل کا کوئی منظر...... میں دوبارہ آئینے کی طرف مڑا لیکن اب تو وہ اسی کپڑوں کی الماری کو منعکس کررہا تھا۔

''اوہ خدایا!''میں نے اپنا سر پکڑلیا۔ پھر اسی

کیفیت میں بڑھا اور الماری دھکیلنے کو تھا کہ رابرٹ کمرے میں داخل ہوا۔ مجھے الماری سے زور آزمائی کرتے دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے لیکن اس کے کچھ کہنے سے قبل ہی میں نے سوال داغ دیا۔

''کیا اس الماری کے پیچھے کوئی دروازہ ہے؟''

''ہاں...... وہ اس کمرے سے ملحق دوسرے سونے کے کمرے میں کھلتا ہے...... مگر......''

''اس کمرے میں آج کل کون قیام پذیر ہے؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''یہ کمرہ آج کل میجر لنک اور ان کی بیگم کے استعمال میں ہے۔''

''کیا میجر لنک کی بیوی کا رنگ انتہائی سفید اور بال سنہرے ہیں؟'' میں بے حد پرجوش ہوگیا۔

''نہیں...... ان کے بال بالکل سیاہ ہیں اور رنگ بھی قدرے مدھم ہے۔'' رابرٹ نے انتہائی اکتاہٹ کے عالم میں جواب دیا اور میں نے مایوسی کے ساتھ اپنی یہ تفتیش بند کردی۔ رابرٹ نے سرسری انداز میں اس کا مقصد پوچھا تو میں بات گول کرگیا۔ دراصل اب میں خود بے یقینی کا شکار ہوگیا تھا کہ یہ منظر کہیں محض میرے تخیل کی پیداوار تو نہیں۔ شاید میں اس واقعہ کو اپنا وہم سمجھ کر فراموش کرڈالتا لیکن جب تعارف کے دوران رابرٹ نے میرے شانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ ''تم جین سے ملنے کے مشتاق تھے نا، یہ ہے میری بہن جین۔'' اسے دیکھتے ہی میں مبہوت ہوگیا۔ بالکل وہی لڑکی جسے کچھ دیر پہلے میں نے آئینے میں ہلاک ہوتے دیکھا تھا۔ سنہرے بال، رنگ دودھیا گویا سنگ مرمر سے تراشا ہوا انتہائی پرکشش بدن۔

اور پھر رابرٹ دوسری طرف مڑا۔

''اور یہ ہیں مسٹر چارلس پائن جین کے منگیتر۔'' جونہی میری نظر مسٹر چارلس پر پڑی میرا کلیجہ گویا اچھل کر حلق میں آگیا اور مساموں سے پسینہ پھوٹ پڑا۔ لمبا قد، سنولائی ہوئی رنگت اور بائیں گال پر زخم کا ایک طویل اور بڑا واضح نشان جو گردن تک آگیا تھا۔

یہ سب کچھ کیا تھا......؟ وہی لڑکی...... ہو بہو وہی لڑکی اور وہی بائیں گال پر زخم کے نشان والا آدمی جو نہایت بے رحمی سے لڑکی کا گلا گھونٹ رہا تھا اور اب یہ دونوں ایک ماہ کے اندر اندر رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے والے تھے۔

کیا مجھ پر قبل از وقت ایک انکشاف نہیں ہوا تھا...... ایک ناقابل فہم صورت حال!'' کیا واقعی شادی کے بعد جین اور چارلس اس کمرے میں ٹھہریں گے؟ اور پھر یہ منظر واقعی حقیقت کا روپ دھارلے گا؟'' یہ سوچ کر میرے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی لیکن میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ اگر میں رابرٹ یا جین کو یہ واقعہ سناتا تو کیا وہ میرا تمسخر نہ اڑاتے اور بالفرض وہ اس پر یقین کر بھی لیتے تو کیا وہ مستقبل کی اس آفت کو روک پاتے اور اگر میں یہ بات کسی کو نہ بتاؤں اور پھر واقعی چارلس یہ وحشیانہ اقدام کر گزرے تو کیا میرا ضمیر ساری زندگی مجھے ملامت نہیں کرتا رہے گا؟

غرض میں جتنے دن وہاں رہا؟ پرسکون زندگی کے لطف سے بے نیاز! اسی ادھیڑ بن میں الجھا رہا اور آخر واپسی سے ایک روز قبل میں نے یہ سب کچھ انتہائی سنجیدگی سے حرف بہ حرف جین کو سناڈالا۔

جین نے انتہائی تحمل سے یہ سب کچھ سنا۔ اس کے چہرے پر تمسخر کے آثار نمودار ہوئے نہ اس نے میری کہانی پر ایمان لانے کا اقرار کیا، لیکن اس کی آنکھوں میں ایک نہایت غیر معمولی تاثر تھا جو میں سمجھنے سے قاصر رہا۔ چلتے چلتے جب میں کسی دروغ گو کے مانند یہ دہراتا رہا کہ میں ہرگز جھوٹ نہیں بول رہا اور میں نے واقعی یہ منظر دیکھا تھا تو جین نے بہت سنجیدگی سے کہا کہ ''اسے مجھ پر اعتبار ہے، اگر میں یہ سب کچھ بیان کررہا ہوں تو میں نے یہ سب کچھ یقیناً دیکھا ہوگا۔''

فورٹ ٹاؤن سے واپسی کے بعد میں اسی شش و پنج میں تھا کہ میرا یہ اقدام اچھا تھا یا برا کہ یہ اطلاع ملی ''کہ جین نے چارلس سے منگنی توڑ دی ہے۔''

اس کے کچھ ہی دن بعد دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی اور پھر سوائے جنگ کے اور کوئی چیز گفتگو کا موضوع ہی نہ رہا۔ کئی بار محاذ سے رخصت کے دوران میری مڈبھیڑ جین سے ہوئی، لیکن ہر بار میں نے اس موضوع پر گفتگو کرنے سے احتراز کیا۔

مگر حقیقت یہ تھی کہ میں پہلی ہی نظر میں اس کی محبت میں گرفتار ہوگیا تھا اور ہنوز اس کے سحر سے نکل نہیں پایا تھا، لیکن محبت کا اظہار کرنے میں وہ واقعہ میری راہ میں رکاوٹ رہا۔ یقیناً میرے وہ واقعہ سنانے کی بنا پر جین نے چارلس سے منگنی توڑ دی تھی۔ اب اگر میں اس کے سامنے شادی کی تجویز پیش کروں تو کہیں وہ اس واقعے اور منظر کو ایک چال اور من گھڑت افسانہ نہ سمجھے۔ یہ احساس اس قدر شدید تھا کہ میں نے ہر بار اس سے یہ بات کرنے سے گریز کیا۔

پھر ایک دن محاذ پر یہ جاں سوز اطلاع ملی کہ رابرٹ دشمن کے حملے کے دوران مارا گیا۔ میرا فرض تھا کہ میں اپنے بچپن کے دوست کے آخری رسومات میں شرکت کروں۔ میں تعزیت کے لئے جین کے پاس بھی گیا۔ وہ بھائی کے غم میں چپ چاپ بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ میں دیر تک اسے دلاسے دیتا رہا۔ اس دن افسردگی کے عالم میں وہ مجھے اتنی پرکشش لگی کہ کئی بار دل چاہا اپنا مدعا اس سے کہہ ڈالوں مگر ہر بار وہی خدشہ آڑے آیا...... میں اس دعا کے ساتھ محاذ پر لوٹ آیا کہ خدا اگر مجھے جین کا قرب نہ دے تو موت دے دے کہ مجھے اس بے قراری سے تو نجات ملے۔

جین کے بغیر یہ تمام دنیا ز میرے لئے بے مقصد اور افسردہ وحزیں تھی۔ لیکن شاید دشمن کی کسی گولی پر میرا نام نہ تھا۔ بلکہ کئی بار تو میں حیرت انگیز طور پر موت کے منہ سے بال بال بچا۔ کبھی بارودی خندق صرف دس گز دور پھٹی تو کبھی گولیاں چند انچ کے فاصلے سے گزر گئیں حتیٰ کہ ایک بار تو ایک گولی میرے دائیں کان اور گال کو چھوتی ہوئی میری جیب میں رکھے سگریٹ کیس سے ٹکرائی اور دوسری طرف نکل گئی۔

جنگ ایسی چھڑی کہ رکنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ ان دنوں ایسا لگتا تھا کہ شاید تمام زندگی اس جنگ عظیم کی نذر ہو جائے گی۔ دوستوں، عزیزوں کی موتیں روزانہ کا معمول ہوگئیں۔ ایک روز اطلاع آئی کہ چارلس بائنن حملے کے دوران ہلاک ہوگیا ہے۔ اس خبر نے کسی نہ کسی حد تک صورت حال میں فرق پیدا کردیا۔

خدا خدا کرکے جنگ بند ہوئی اور کچھ عرصہ قبل جب میں چھٹی پر گھر آیا تو جین سے ملا اور تمام خدشات بالائے طاق رکھ کر وہ تمام باتیں کہہ ڈالیں جو ایک عرصہ سے میرے دل میں سلگ تو رہی تھیں مگر زبان تک پہنچنے سے محروم تھیں۔

میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب جین نے ان باتوں کو نہایت خوش دلی سے سنا گویا وہ بھی دل میں اس کی تمنا لئے بیٹھی تھی اور کہا۔ ''بھلا تم نے یہ ساری باتیں مجھ سے پہلے ہی کیوں نہ کہہ ڈالیں؟'' میرے خدشات ظاہر کرنے پر وہ مسکرائی اور کہنے لگی۔ ''اگر مجھے چارلس سے ذرا بھی محبت ہوتی، تو بھلا میں تمہارے اس بے سروپا تخیل کی وجہ سے جو تمہیں آئینے میں نظر آیا، منگنی کیوں توڑتی......؟ یقین کرو مجھے بھی پہلی ہی نظر میں تم سے محبت ہوگئی تھی اور آج تک میں صرف اور صرف تمہیں چاہتی رہی ہوں۔''

ہم دونوں مسکرا اٹھے اور فضا ایک دم خوشگوار ہوگئی۔ جنگ عظیم کے خاتمے پر ہماری شادی ہوگئی اور پھر خاصے عرصے تک کوئی قابل ذکر واقعہ رونما نہ ہوا۔ اس آئینے والے قصے کو ہم ایک دلچسپ مگر بے معنی واقعہ سمجھ کر فراموش کر چکے تھے۔

ہماری ازدواجی زندگی کی ابتدا تو نہایت خوشگوار تھی لیکن آہستہ آہستہ ہمیں ایک بڑی تلخ صورت حال کا سامنا کرنا پڑا جس کا ذمہ دار سراسر میں تھا۔ مجھے جین سے بے انتہا محبت تھی، لیکن اپنی ایک عادت جو مجھے خود شادی کے بعد معلوم ہوئی وہ شک اور حسد کی عادت تھی۔ جین اگر کسی شخص کی طرف مسکرا کر دیکھ لیتی تو میں کئی دن کڑھتا رہتا۔ وہ کسی مرد سے دو لمحے بات کر لیتی تو میری

راتوں کی نیند حرام ہو جاتی۔

شروع شروع میں جین اسے میری چاہت سمجھ کر خاموش رہی لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا میری یہ عادت اس کے لئے ناقابل برداشت ہوتی گئی۔ روز روز کے جھگڑے زندگی میں زہر گھولتے چلے گئے اور یہ شکوک وشبہات جو یکطرفہ تھے، ہمیں ایک دوسرے سے دور کرتے چلے گئے۔ رفتہ رفتہ مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ اب جین کے دل میں میرے لئے کوئی جگہ نہیں رہی۔ محبت کا جو دریا چند ماہ قبل اس کے دل میں موجزن تھا۔ اب اتر چکا تھا اور اس محبت کا قاتل یقیناً میں تھا۔

پھر ڈیرک ٹامس ہماری زندگی میں آیا۔ اس شخص میں وہ سب کچھ تھا جو مجھ میں نہیں تھا۔ خوش نما ،نہایت ذہین اور خوش گفتار اس سے ملتے ہی یکا یک میرے ذہن میں خیال آیا کہ جین کے لئے یہ شخص مجھ سے بہت بہتر ہے۔ جین نے ہر طرح سے اس کے خلاف احتجاج کیا، لیکن میرے ذہن میں یہ خیال پختہ ہوتا چلا گیا۔

میرے دل میں حسد کا جو لاوا کھولتا چلا جا رہا تھا ،ایک دن اس کی تپش جین کی برداشت سے باہر ہوگئی اور اس نے مجھ سے ،اپنے نا کردہ گناہوں کے عذاب سے علیحدگی کا فیصلہ کرلیا۔

میں جب ایک رات گھر لوٹا تو اس کا کمرہ خالی تھا۔ اور خاص روایتی انداز میں وہاں ایک الوداعی پیغام موجود تھا جس میں اس نے لکھا تھا کہ وہ مجھے چھوڑ کر جا رہی ہے ،صرف اس لئے کہ وہ یہ سب کچھ نہیں سہہ سکتی۔ وہ پہلے اپنے آبائی قصبے فورٹ ٹاؤن پہنچے گی اور پھر اس شخص کے پاس چلی جائے گی جسے وہ سب سے زیادہ چاہتی ہے اور اس شخص کو بھی اس کی ضرورت ہے اور یہ کہ مجھے اس کا یہ فیصلہ آخری فیصلہ سمجھنا چاہئے۔

شاید میرا جذبہ حسد ڈیرک ٹامس کے بارے میں اس قدر شدید نہ تھا۔ اس سے پہلے کہ جین ڈیرک سے مل سکے، مجھے کچھ کرنا تھا۔

میں اپنی کار میں جس قدر جلد فورٹ ٹاؤن پہنچ سکتا تھا،شام کا دھندلکا چھا رہا تھا۔ میں انتہائی غصے کے عالم میں حویلی میں داخل ہوا۔ سونے کا کمرہ روشن تھا اور وہاں جین کھانے کا لباس تبدیل کر کے بال سنوار رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرانی اور کسی قدر خوف کے آثار پیدا ہوئے اور وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میرے سوا کوئی بھی تمہارے قریب نہیں آ سکتا کوئی بھی نہیں۔'' میں نے اپنے کھردرے ہاتھ جین کے گلے پر جما دیئے میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں اس کا گلا گھونٹنے لگا اور پھر یکا یک میری نگاہ آئینے پر پڑی۔ میں جین کا گلا دبا رہا تھا، اس کا چہرہ دہشت زدہ اور میرے دائیں گال پر گولی کا نشان واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔

نہیں پھر میں نے اسے قتل نہیں کیا...... میں تو یہ منظر دوبارہ دیکھ کر گویا مفلوج ہو گیا اور بے حس وحرکت فرش پر گر پڑا۔ اور پھر جین نے مجھے سہارا دیا۔ ہاں جین نے خود مجھے سہارا دے کر اٹھایا اور مجھے دلا سا دیا۔

میں بے اختیار رو پڑا اور شاید ان آنسوؤں کے ساتھ ہی حسد اور شک کا وہ سیلاب بھی اتر گیا جو ہماری خوشحالی کے جزیرے کو غرقاب کرتا چلا جا رہا تھا۔ جین نے وضاحت کی کہ ''وہ شخص جس کا پیغام میں ذکر تھا اور جسے وہ سب سے زیادہ چاہتی تھی جین کے دوسرے بھائی ایلین کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ خوشگواری ہماری زندگی میں لوٹ آئی۔

آج میں اور جین ایک نہایت پرسکون ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں۔ کبھی کبھی میں تنہائی میں بیٹھا سوچتا ہوں کہ زخم کا وہ نشان جو میرے دائیں گال پر تھا، مجھے آئینے میں بائیں گال پر نظر آیا۔ یقیناً چارلس پائن کے معاملے میں مجھ سے ایک نہایت سادہ سی غلطی ہوئی کیونکہ زخم کا نشان اس کے بائیں گال پر تھا۔

رولوکا

تحریر: اے وحید

قسط نمبر: 125

وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کردیں گی

گزشتہ قسط کا خلاصہ

نسوانی چیخ اتنی فلک شگاف تھی کہ سارا مطب دہل کر رہ گیا، مطب کے سارے لوگ اس کمرے کی طرف دوڑے اور عجلت میں رولوکا اور حکیم وقار بھی اسی طرف دوڑ پڑے، جب سارے لوگ کمرے میں پہنچے تو عجیب دل دہلاتا منظر سامنے تھا، کمرے میں بستر پر موجود ایک دھان پان سی مریضہ نے ایک خدمت گار عورت کی گردن کو اپنے ہاتھ کے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا اور اس عورت کو فرش سے دو فٹ اوپر کو اٹھا رکھا تھا اور ہاتھ کے شکنجے میں جکڑی بے چاری عورت کے منہ سے کرب واذیت میں ڈوبی آواز بڑی مشکل سے نکل رہی تھی اور آنکھوں سے جیسے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ یہ دیکھ کر رولوکا آگے بڑھا اور منہ میں کچھ پڑھتے ہوئے مریضہ کی کلائی پر اپنا ہاتھ رکھا تو مریضہ نے جھٹ سے اپنے ہاتھ میں جکڑی عورت کو چھوڑ دیا۔ اور اس کے منہ سے غراہٹ بھری آواز نکلی اس کی ہمت کیسے ہوئی مجھے جگانے کی، میں اسے ماردوں گا، وہ مردانہ آواز تھی، مریضہ کے وجود پر ایک کافر جن سوار تھا، اس نے بہت کوشش کی رولوکا پر اپنا رعب جمانے کی مگر رولوکا کے آگے وہ ٹھہر نہ سکا اور بالآخر مریضہ کی جان چھوڑ دی ایک روز ایک شخص رولوکا کے پاس آیا اور اس کی حالت بہت دیگرگوں تھی، وہ گویا ہوا، محترم عامل صاحب میرا نام بہادر ہے اور میں صرف اس طرح زندہ ہوں کہ ہمارے مذہب میں خودکشی حرام ہے ورنہ میں خودکشی کرچکا ہوتا، بیس سال گزرنے کے باوجود ہر پونم کی رات میری حالت ایسی ہوجاتی ہے کہ جیسے ''جل بن ماہی'' اور پھر بہادر نے اپنی پوری روداد سنا ڈالی کہ ایک ناگن اس سے پریم کر بیٹھی تھی، دونوں کی محبت بے مثال تھی وہ ناگن انسانی شکل بھی اختیار کرلیتی تھی اور پھر ناگ دیوتا کو معلوم ہوگیا کہ ہم دونوں سہاگ رات منانے والے ہیں اس لئے ناگ دیوتا نے ہم دونوں کو اٹھوالیا اور ناگن جس کا نام شوشی تھا اسے اذیت دے کر مار ڈالا اور پوری زندگی کے لئے مجھ پر اذیت کا پہاڑ مسلط کردیا تاکہ میں اذیت سے ہر پونم کی رات تڑپتا رہوں اور میرے ساتھ ایسا ہوتا رہتا ہے، بہادر کی اذیت ناک داستان سننے کے بعد رولوکا سانپوں کے غار میں پہنچ گیا۔ اوہ خدا کی پناہ ایسے ایسے خطرناک اور خوفناک ناگ ناگنیں وہاں موجود تھے کہ اگر ایک عام آدمی دیکھ لے تو اس کا ہارٹ اٹیک ہوجائے، ناگ دیوتا نے رولوکا کو دیکھ کر بہت ہاتھ پیر مارے مگر رولوکا نے ناگ دیوتا کو قائل کردیا کہ ناگ دیوتا خود بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر ایک جیتی جاگتی حسین وخوبصورت لڑکی کو اپنی داسی بنالیتا ہے۔ اور پھر ناگ دیوتا نے اس وقت سے بہادر کی تکلیف کو ختم کردیا اور اس نے حکم دیا کہ کوئی بھی ناگ اب بہادر کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا اور رولوکا کی وجہ سے اذیت ناک تکلیف سے بہادر کی جان چھوٹ گئی، بہادر نے رولوکا کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔

(اب آگے پڑھیں)

یہ ان دنوں کی بات ہے جب رولوکا اپنے استاد سے روحانیات میں دسترس حاصل کرنے کے بعد استاد کی خدمت میں صبح وشام لگا رہتا تھا ویسے تو رولوکا کو چودہ پندرہ سال سے ہی روحانی علوم میں دلچسپی ہونے لگی تھی۔ رولوکا کی ہروقت یہ کوشش ہوتی تھی کہ استا د کے قریب وقت زیادہ گزارے کیونکہ رولوکا کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ استاد کے قریب رہنے میں زیادہ فائدہ ہے۔

جب ضرورت مند آتے اور استاد کو اپنی پریشانیوں سے آگاہ کرتے تو رولوکا دل لگا کر ضرورت

مندوں اور استاد کی باتیں سنتا اور اس وقت استاد کے بتائے ہوئے سارے کام دوڑ دوڑ کر کرتا، اس لئے کہ اسے زیادہ سے زیادہ وقت استاد کے قریب بیٹھ کر باتیں سننے کا موقع مل سکے۔

ان دنوں جتنے بھی روحانی علوم سیکھنے والے شاگرد موجود تھے ان سب میں رولوکا بہت تیز تھا، اور رولوکا استاد کی امید سے کچھ زیادہ ہی آگے تھا، رولوکا کے استاد کی حیرانی اس وقت اور زیادہ بڑھ جاتی جب استاد کو نظر آتا کہ رولوکا اپنا عمل سیکھنے کے بعد جتنا وقت بچتا وہ وقت استاد کی خدمت کرتے گزار دیتا۔

جب استاد بستر پر لیٹ جاتے تو رولوکا اپنے کام سے فارغ ہو کر استاد کے ہاتھ پیر اور سر دبانے لگتا، اور پھر ایک وقت آتا کہ استاد کی آنکھ لگ جاتی۔

اور پھر جب استاد کی آنکھ کھلتی تو استاد دیکھتے کہ رولوکا سعادت مندی سے استاد کے پیر دبا رہا ہوتا۔ تو استاد اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھتے اور رولوکا کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر کر ڈھیروں دعائیں دیتے اور پھر حکم صادر کرتے کہ ''اب تم جا کر کچھ دیر آرام کر لو۔''

استاد کی بات سن کر رولوکا استاد کے پاس سے اٹھ جاتا اور پھر اپنے بستر پر آرام کرنے کے لئے لیٹ جاتا پھر بہت تھوڑے وقت کے بعد نئے دن کا سورج طلوع ہوتا تو پھر سے رولوکا اٹھ کر اپنے معمولات کے کام میں لگ جاتا۔

اور پھر ایک وقت آیا کہ استاد نے اسے حکم دیا کہ ''اب تم اپنے قصبہ میں جاؤ اور مخلوق خدا کی خدمت میں لگ جاؤ۔ مجھ سے حاصل کردہ تربیت کو پوری زندگی کے لئے گرہ میں باندھ کر یہاں سے جانا اور اس پر ہمیشہ قائم رہنا، میری دعائیں ہر وقت تمہارے ساتھ رہیں گی اور جب میں دنیا سے کوچ کر جاؤں گا تو اس کے بعد بھی تم پر میری نظریں رہیں گی اور وقت ضرورت تم جب بھی مجھے یاد کرو گے تو میری روح تمہاری مدد کو فوراً پہنچ جائے گی۔

مگر میرے ہونہار شاگرد یہ یاد رکھنا کہ کبھی بھی دنیاوی لالچ میں نہ پڑنا کیونکہ جو لوگ دنیاوی لالچ میں پڑ جاتے ہیں وہ خود غرض بن جاتے ہیں ان کے عمل سے لوگوں کو اذیت پہنچنا شروع ہو جاتی ہے۔ اور جو لوگ دنیا کے عیش و آرام میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو ان کی عاقبت ہر حال میں خراب ہو کر رہے گی، خدا کے بندوں کی مدد کرتے رہنا، کیوں کہ دعاؤں میں بہت اثر ہے'' اور یہ بھی یاد رکھنا کہ اچھائی کا ہمیشہ اچھا اجر ملتا ہے۔''

اور پھر رولوکا اپنے استاد کی باتوں کو گرہ میں باندھ کر اپنے آبائی قصبہ میں آ گیا، اور لوگوں کی خدمت میں لگ گیا، انہی دنوں ایک عورت آئی جو کہ بہت زیادہ پریشان تھی چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں زرد چہرہ، ایسا لگتا تھا کہ جیسے کسی نے اس کے چہرے پر گاڑھی گاڑھی ہلدی مل دی ہو۔

رولوکا کے سامنے آتے ہی زار و قطار رونے لگی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اس وقت رولوکا کے قریب چار پانچ ضرورت مند بیٹھے تھے۔ اس پریشان حال عورت کو دیکھ کر رولوکا فوراً اپنی جگہ سے اٹھا اور مٹی کے گھڑے سے ایک گلاس ٹھنڈا پانی لا کر عورت کو پلایا۔

پانی پینے کے بعد عورت کے حواس کچھ بحال ہو گئے تو رولوکا بولا۔ ''محترم خاتون آپ پریشان نہ ہوں اپنی پریشانی بتائیں۔ میں اوپر والے کی مدد سے کوشش کروں گا کہ آپ کی پریشانی دور ہو جائے حوصلہ رکھیں گھبرائیں نہیں۔''

اور پھر رولوکا نے جو اس کے پاس چار پانچ لوگ بیٹھے تھے انہیں فارغ کر دیا اور جب وہ لوگ چلے گئے تو رولوکا اس عورت سے مخاطب ہوا۔

''محترم خاتون اب آپ آرام و سکون سے وہ بات بتائیں جس کی وجہ سے آپ اس قدر پریشان ہیں۔''

رولوکا کی باتیں سن کر عورت کو کافی اطمینان ہوا ، اور اس کے دل نے گواہی دی کہ ''تم صحیح جگہ پر آ گئی ہو ، اور یقیناً اس پہنچے ہوئے شخص کے توسط سے تمہاری پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔''

وہ عورت گویا ہو گئی۔ ''محترم وچ ڈاکٹر! میرا دل

گواہی دے رہا ہے کہ میں ٹھیک جگہ پر پہنچ گئی ہوں۔
میرا نام لوری ہے اور اب میں مسز نارمن ہوں، میں فرانسسکو سے آئی ہوں اور مقامی ہوٹل میں ٹھہری ہوں اور مجھے اب امید ہوگئی ہے کہ میں اپنی تمام تر اذیت ناک پریشانیوں سے چھٹکارا پالوں گی اور خوشی خوشی اپنے گھر واپس جاؤں گی دراصل ایک روح نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔
شروع شروع میں اس خواب کی ابتداء میرے اور نارمن کے کیلڈر کاٹیج میں آمد سے ہوتی ہے۔ میں خواب میں اس وحشت ناک اور منحوس مکان کو دیکھتی ہوں جو بتدریج ایک شخصیت کا روپ دھار لیتا ہے۔ اس کا عظیم الشان سامنے کا حصہ ایک چہرے میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ چہرہ مکار، دہشت خیز ضدی، جیسے ہم اس کی بھوک کا ایندھن بننے والے ہوں۔
ان خوابوں میں عموماً دیوانوں کی طرح اپنے بچاؤ کی کوشش میں، میں مصروف نظر آتی ہوں۔ تاکہ ان بلاؤں سے بچنے میں کامیاب ہوجاؤں جو ہمارے سامنے کیلڈر کاٹیج میں مقیم ہیں۔
تعجب خیز امر یہ ہے کہ عالم بیداری کے تمام واقعات وحادثات کی ابتدا بھی ایک خواب ہی سے ہوئی۔ جی ہاں ایک خواب جو میں نے کیلڈر کاٹیج میں آنے سے صرف ایک دن قبل دیکھا تھا، یہ خواب ایک تباہی کا خواب تھا جو مستقبل پر روشنی ڈالتا تھا۔ اس خوف ناک خواب میں مستقبل کی جس خوف ناک تباہی کی پیش نمائی کی گئی تھی اس کا میری طبیعت پر بہت دیر تک اثر رہا تھا اور سسکیاں لیتی ہوئی جاگی تھی۔
میرے اسی حال کو دیکھ کر نارمن نے مجھے بازوؤں میں بھینچ کر تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔ ''لوری یہ تو صرف ایک خواب تھا۔''
ہمیں یہ احساس تھا کہ وہ خواب ایک قسم کا انتباہ تھا لیکن ہم دونوں میں کوئی اس وقت خواب کی علامتوں کا تجزیہ کرنے کا اہل نہ تھا اور صبح کو میں نارمن جیسے مصور کی نئی نویلی دلہن ہونے کی خوشی میں اس خواب کو بھول گئی۔
نارمن کیلیفورنیا کا رہنے والا تھا۔ اور میرا مکان نیویارک میں تھا۔ اور یہ محض اتفاق یا نوشت تقدیر تھا کہ میں نارمن کی تصاویر کی نمائشی رپورٹ مرتب کرنے کی غرض سے کیلیفورنیا بھیجی گئی۔ یہ نارمن سے میری پہلی ملاقات تھی۔
نارمن کہتا ہے کہ اس نے مجھے دیکھتے ہی یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ مجھے اس وقت تک نیویارک واپس نہ جانے دے گا جب تک میں اس سے شادی کا وعدہ نہ کرلوں۔ چنانچہ میری انگلی میں شادی کی یاقوت جڑی انگوٹھی پہناتے ہی وہ رہائش کے لئے مناسب مکان کی تلاش کی خاطر کیلیفورنیا چلا گیا اور پھر خدا جانے کس دباؤ کے زیراثر اس نے ایک چھوٹے سے قصبے دسکا بیونا میں آبادی سے دور ایک مکان منتخب کیا اور پھر جیسے اس مکان کی جہت میں گرفتار ہوگیا۔
''لوری، میں یہاں اپنی شاہکار تصویر بناؤں گا۔'' اس نے کہا۔ ''شاہکار تصویر! میں اسے جانتا ہوں، اسے محسوس کرتا ہوں اس مکان میں ایک کمرے کو میں نے تصویر بنانے کے لئے منتخب کیا ہے۔ میں تمہیں نہیں دکھا سکتا۔ یقیناً یہ بات پاگل پن کی نوعیت رکھتی ہے لیکن مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ یہ کمرہ کسی کا انتظار کر رہا ہے۔ میرا انتظار۔''
''اور باقی کمروں کے لئے کیا کیا جائے؟'' میں نے سوال کیا۔
''سب کچھ ہوجائے گا۔'' نارمن نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ''میں تو تمہیں صرف اتنا ہی بتا سکتا ہوں کہ مکان کا ہر کمرہ پہلے سے آراستہ ہے۔ مسز نیلسن اس مکان کی صفائی اور نگہداشت کی ذمہ دار تھی اور اسے کیلڈر کاٹیج کہا جاتا ہے۔''
گلونا بیچ کی سمت کار ڈرائیور کرتے وقت مجھے اور نارمن کو ٹیلی پیتھی کے ایسے پیغامات موصول ہوئے جنہوں نے آنے والے دور کے واقعات میں خالص حصہ لیا۔ اگرچہ لنچ کا وقت نہیں ہوا تھا لیکن راستے میں ''میکسیکو ہٹ'' نامی کیفے کا بورڈ دیکھ کر مجھے میکسیکو

یاد آ گیا۔ اور میں سوچنے لگی کہ ابھی کافی عرصے تک ہمیں وہاں جانے کا موقع نہ ملے گا۔ اس وقت نارمن، مصوروں کے متعلق گفتگو کر رہا تھا جس کے لئے گلوتا پچ کا علاقہ منتخب ہو چکا تھا، وہ یکا یک خاموش ہو گیا اور کار گھما کر کیفے کے سامنے پہنچ گیا۔

''تم یہاں ٹھہرنا چاہتی تھی۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے تمہارے خیال کو محسوس کر لیا تھا۔''

لنچ سے فارغ ہو کر نارمن نے پھر ساحل کے قریب طویل سڑک پر کار ڈرائیو کرنا شروع کر دی۔ ہم نہایت مسرور اور خوش تھے۔ میں نے نارمن کو چھیڑنے کے لئے اس مکان کے متعلق باتیں پوچھیں لیکن اس نے جو کچھ بتایا وہ اس کی پراسراریت میں اور بھی اضافے کا باعث تھا۔ یکا یک مجھ پر غیر محسوس قسم کی کیفیت طاری ہوگئی اور ہم نے یہ سلسلہ گفتگو منقطع کر دیا۔ اس وقت میں بائیں جانب سمندر کو دیکھ رہی تھی۔ اور اس وقت سمندر کے افق پر وہ خوف ناک اور رنگ برنگے بادل چھائے ہوئے تھے۔ جیسے میں نے خواب میں دیکھے تھے۔

''یہ اتفاق کی بات ہے۔'' میں نے اپنے دل کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ آسمانی فضا اور بادل دونوں میں میرے خواب سے مناسبت سہی۔ لیکن ضروری نہیں کہ گھر واپس ہوتے ہوئے، میں محض اس ہیبت ناک طوفان کی وجہ سے سیر کی خوشیاں غارت کر لوں۔

میرے خیال میں ہمیں پہلی فرصت میں میکسیکو چلنا چاہئے۔ میں نے کہا میرا خیال تھا کہ میکسیکو کی مسرتیں...... میرے ذہن سے خواب کی دہشت کو دور کر دیں گی۔

''بے شک ہم کبھی نہ کبھی وہاں ضرور چلیں گے لیکن بہت سے ایسے مقامات ہیں جو میں پہلے تمہیں دکھانا چاہتا ہوں۔ مثلاً فرانس، اٹلی، جرمنی، اور اسپین وغیرہ۔''

وہ اچانک خاموش ہو گیا۔

میں نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا تو وہ زرد پڑ گیا تھا اور اس کے چہرے پر شدید کرب کے آثار تھے۔

''کیا بات ہے نارمن؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ نہیں لوری!'' اس نے غائب دماغی کے لہجے میں کہا، جیسے وہ کسی ہولناک واقعہ کی یاد میں محو ہو، پھر وہ اپنے پائپ میں تمباکو بھرنے لگا اور میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

''یہ صرف ایک احمقانہ بات تھی جس کی یاد اس وقت مجھ پر مسلط ہو گئی تھی۔ یہ دراصل اسپین کے ساحل پر پیش آنے والا ایک واقعہ تھا۔ جو مجھے یاد آ گیا۔ حالانکہ میں نے اسے آج تک یاد نہیں کیا تھا۔'' نارمن نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

یہ واقعہ مجھے اس وقت پیش آیا جب میں پیرس میں آرٹ کا طالب علم تھا۔ میں آرٹ کے دوسرے طلباء کے ساتھ اسپین کے ساحل پر چھٹیاں گزارنے گیا ہوا تھا۔ اس کے ہم سفروں میں جوان مرد بھی تھے اور عورتیں بھی اور سب کے سب عاشقانہ مزاج رکھنے کی وجہ سے ''قلندران محبت'' بنے ہوئے تھے۔ ایک خاص دشواری یہ تھی کہ ہم سب کے پاس کافی روپیہ تھا۔ لہٰذا ہر احمقانہ خواہش کی تکمیل ممکن تھی۔ یہ میری زندگی میں بڑا اہم وقت تھا۔

ایک سہ پہر ہم سب، سڑک کے کنارے ایک کیفے میں بیٹھے سرخ رنگ کا تلخ شراب پی رہے تھے اور مسلسل قہقہے لگا رہے تھے، جس کا سبب جوانی، صحت اور ہر قسم کے بے فکری کے سوا کچھ نہ تھا، اچانک چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی ایک بڑھیا آئی اور میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی میں اس کا مرکز نظر تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک گندی فقیرنی کی یہ جسارت میرے لئے تکلیف دہ تھی، اچانک اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا۔

''تم سچے اور عظیم آرٹسٹ ہو، ایک دن تمہارا دنیا میں نام روشن ہوگا۔ لیکن وہ تصویر جو تمہارے نام کو غیر فانی بنا دے گی۔ تم سے تمہاری محبوب ترین شے چھین لے، جوان آدمی خوابوں کا تعاقب نہ کرو بلکہ اور پائندہ چیز کے پیچھے پیچھے چلو، مرے ہوئے کے

عقب میں چلنے سے گریز کرو گے تو تم اس ہولناک تقدیر کے شر سے محفوظ رہو گے جو مجھے تمہاری پیشانی پر دکھائی دے رہی ہے۔‘‘

بڑھیا کے الفاظ سے سب کے جسموں میں سنسنی دوڑ گئی، پھر ایک لڑکی نے سہمے ہوئے لہجے میں اس سے پوچھا کہ ’’یہ سب کچھ ایسے کیونکر معلوم ہوا۔؟‘‘

’’میں ایک خانہ بدوش ہوں، مجھ میں یہ صلاحیت ہے کہ مجھے وہ تمام باتیں معلوم ہو جاتی ہیں جن کے متعلق میں سوچتی ہوں کہ کاش وہ مجھے معلوم نہ ہوتیں۔‘‘

’’کیا تم ہماری قسمت کا حال بتاؤ گی؟‘‘ بہت سے لڑکوں نے ہم آہنگ ہو کر اس سے کہا اور اپنے اپنے ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیئے۔ لیکن اس نے سب کے ہاتھ ہٹا کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ وہ اس قدر گندی تھی کہ مجھے گھن آنے لگی میں نے اس سے کہا کہ ’’میں ان باتوں پر یقین نہیں کرتا ہوں۔‘‘

بڑھیا نے میری بات سن کر جھرجھری لے کر کہا۔

’’اگر تم ان باتوں پر یقین کرو تو تمہارے حق میں بہت بہتر ہوگا۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ غور سے دیکھنا شروع کیا۔ اور اس انداز سے سر ہلانے لگی کہ جیسے اس نے جو کچھ میری صورت دیکھتے ہی جان لیا تھا، میرے ہاتھ سے اس کی تصدیق ہو رہی ہے۔

’’تم مصوری میں بہت کامیاب رہو گے اور دس سال کے بعد جب تمہاری تصاویر کی کسی بہت بڑے شہر میں نمائش ہوگی۔ اس موقع پر تمہیں ایک لڑکی نظر آئے گی جو تمہاری تصاویر دیکھ رہی ہوگی، اس لڑکی کے بال سرخ ہوں گے اور فوراً تمہیں خیال آئے گا کہ اس لڑکی سے تمہیں شادی کر لینی چاہئے اور وہ تم سے شادی کر لے گی۔‘‘

نارمن نے یہ کہتے ہوئے میرے بالوں کو تھپکی دی اور کہا۔

’’سرخ نہیں بلکہ سرخی مائل۔‘‘

میرے جسم میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ ’’کیا یہ محض اتفاق تھا کہ نارمن نے جب پہلے پہل مجھے دیکھا میں اس کی تصاویر ہی دیکھ رہی تھی۔‘‘ نارمن نے پھر اپنا واقعہ بیان کرنا شروع کر دیا۔

’’تم اس لڑکی سے شادی کر لو گے۔‘‘ بڑھیا نے کہا۔ ’’لیکن شادی سے قبل تم ایک مکان خرید و گے اس کے بعد انتہائی مسرتوں کا ایک مختصر دور آئے گا۔ پھر تمہیں ایک خبیث روح کی آواز آئے گی جسے تم حسن و جمال کی آواز سمجھو گے اور اس کے تعاقب میں وہاں تک جا پہنچو گے جہاں تک عام آدمی نہیں پہنچ سکتا۔‘‘ یہ کہہ کر بڑھیا نے پھر پھریری لی اسے جھرجھری سی آ گئی اور اس نے کہا۔

’’اب تصویر دھندلی ہو رہی ہے۔‘‘

’’کیوں؟‘‘ ایک لڑکی نے بڑھیا سے پوچھا۔

’’اس لئے کہ مستقبل کی ابھی پوری طرح تشکیل نہیں ہوئی ہے۔‘‘ اتنا کہہ کر بڑھیا نے چند ثانیوں کے لئے سکوت اختیار کیا۔ پھر میرے چہرے پر نظریں جما کر کہنے لگی۔

’’جب وہ سرخ بالوں والی لڑکی یعنی تمہاری بیوی ایک خوف ناک علامتی خواب دیکھ کر چیخ پڑے گی۔ اس وقت تمہیں میرے الفاظ یاد آئیں گے اور تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ تم ایک خبیث روح کے پیچھے بھاگ رہے ہو لیکن تم واپس لوٹ آؤ گے اور تم دونوں کی سلامتی کو نقصان نہ پہنچے گا۔‘‘ اس نے ایک آہ بھری اور کہنا شروع کیا۔

’’لیکن اس دوران میں تمہیں میرا یقین نہ آئے گا کیونکہ تمہیں اس وقت بھی میری بات کا یقین نہیں ہے۔ لیکن جب تم مجھ پر یقین کرو گے۔ اس وقت حالات دگرگوں ہو چکے ہوں گے۔‘‘

نارمن بڑھیا کی پیشین گوئی کا تذکرہ کر کے خاموش ہو گیا جو اس وقت تک حرف بحرف درست ثابت ہوئی تھی مجھے سناٹا آ گیا اور میں نے سمندر کے افق پر چھائے ہوئے اس ہیبت ناک اور گوناگوں رنگوں کے ابر سے آنکھیں ہٹانے کے لئے کار کے سامنے سپاٹ سڑک پر دیکھنا شروع کر دیا۔

اب میں اس پراسرار مکان کے متعلق کچھ کہنا چاہتی ہوں جو قیمت ادا کرکے خرید لینے کی بنا پر ہمارا ہو چکا تھا۔ لیکن حقیقتاً ہمارا نہ تھا۔ جس وقت پہلے پہل نارمن کے ساتھ میں اس مکان میں وارد ہوئی تو مجھے محسوس ہوا کہ اس کا ماحول طلسمی ہی نہیں بلکہ زہر آگیں بھی تھا۔ باغ میں عجیب عجیب پھول کھلے ہوئے تھے۔ جن کی مہک زہریلی محسوس ہو رہی تھی۔ اس منحوس مکان یعنی کیلڈر کا ٹیج کے پیش باغ میں قدم رکھتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ وہاں صرف وہی چیز پنپ سکتی ہے جو منحوس اور زہریلی ہو۔

''یہ تو کاٹیج نہیں معلوم ہوتی۔'' میں نے نارمن سے کہا۔ لیکن اس نے میری کیفیت اور اضطراب کا اندازہ کرتے ہوئے قہقہہ لگایا۔ مکان کے بیرونی حصے کی سفیدی، خاکستری رنگ اختیار کر چکی تھی۔ خدا جانے یہ مکان کب سے مکینوں کو ترس رہا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی میری اور نارمن کی عجیب حالت ہوگئی اور ایسا محسوس ہوا کہ اس کے اندر ہر چیز ہماری منتظر ہے۔

''اپنے گھر میں آنا مبارک ہو لوری۔'' نارمن نے برآمدے میں پہنچ کر کہا اور میرا منہ چوم لیا۔

مکان کے اندر فرنیچر کی وارنش سے لے کر عام آراستگی تک ہر چیز نگہداشت اور خبر گیری کے عمدہ قرینے کا اظہار کر رہی تھی اور ایسا محسوس نہ ہوتا تھا کہ مکان ایک دن کے لئے بھی مکینوں سے محروم رہا ہو۔

''کیا یہاں کوئی رہتا ہے؟'' میں نے نارمن سے سوال کیا۔

''شاید مسز نیلسن رہتی ہوں۔'' نارمن نے جواب دیا۔ اس کی آواز سے مسرت اور خوشی ظاہر ہو رہی تھی۔ ''میں ابھی دیکھتا ہوں۔'' نارمن یہ کہہ کر مکان کے عقب میں چلا گیا۔ یکا یک میری ریڑھ کی ہڈی میں شدید برفانی لہر دوڑ گئی۔ اور میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ کمروں کے تمام دروازے بند تھے لیکن میرے سامنے والا دروازہ ایک دم کھل گیا اور اندر سے ایک خوشبو کا تیز جھونکا آیا۔

''حماقت!'' میں نے اپنے دل میں کہا۔

میں نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنے اسکرٹ کو درست کرکے کھلے ہوئے دروازے کے اندر چلی گئی۔

یہ کمرہ ایک اچھا خاصا ہال تھا۔ ہال کے اگلے حصے کی تین اور باقی پانچ کھڑکیاں، خوبصورت ریشمی پردوں سے مزین تھیں۔ سارے ہال میں سرخ اور قیمتی قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک جانب بہت بڑا روشن دان تھا۔ کمرے میں صوفے کرسیاں اور میزیں بھی تھیں اور ایک بہت بڑی میز پر ایک درجن بچوں کے خوبصورت پتلے بنے ہوئے رکھے تھے جو ناچتے اور ساز بجاتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ بالکل میرے سامنے ایک صنوبر کی میز پر تین طبلے رکھے ہوئے تھے۔ ایک لڑکا طبلے کے ساتھ دوسرا بانسری لئے ہوئے اور ایک لڑکی پھول دار اسکرٹ پہنے ہوئے ناچتی ہوئی بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں زندہ نظر آرہی تھی۔ کمرے کے ساز و سامان کو دیکھ کر میں نے دل میں سوچا کہ بھلا ایسی نادر اشیا کی فراہمی میں کس قدر دولت اور وقت صرف ہوا ہوگا۔ بھلا ایسے آراستہ مکان کو کون چھوڑ کر جا سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ مکان معہ جملہ اشیاء کے ہم نے خرید لیا تھا لیکن دل گواہی دے رہا تھا کہ ہم اس کے مالک نہیں ہو سکتے تھے اور اس مکان کی کوئی چیز ہماری ملکیت نہیں بن سکتی۔ بچوں کے پتلوں کو دیکھ کر میں خوف سے کانپ رہی تھی۔ ان کے تبسم چہرے، آنسوؤں سے بھیگے ہوئے نظر آرہے تھے۔

وہ سچ مچ کے زندہ بچے تو تھے نہیں، پتلے اور صرف پتلے، لیکن ان میں اگر کوئی مافوق الفطرت بات نہ تھی تو مجھے خوف کیوں آرہا تھا۔

یکا یک کمرے میں سرخ روشنی پھیل گئی، میرا دل خوف سے اچھل کر حلق میں آگیا......

''ہوتائی۔ ہوتائی......'' یہ آواز بالکل صاف اور واضح سنائی دی۔ یہ آواز بالکل میرے پیچھے سے آرہی تھی۔ میں پیچھے کی طرف گھومی اور میرے دیکھتے ہی سارے کمرے میں پھیلی ہوئی روشنی سمٹ کر ایک نیلے رنگ کے جار میں سما گئی۔

کوئی یقیناً میرا جائزہ لے رہا تھا! ''لیکن، کون؟

اور کہاں سے؟'' اس کمرے میں داخل ہونے کا کوئی دوسرا دروازہ نہ تھا کھڑکیوں پر لگا ہوا کاغذ سالم تھا اور اس امر کا ثبوت پیش کر رہا تھا کہ انہیں کھولا نہیں گیا۔ یکا یک دروازہ خود بخود بند ہوگیا۔ میرے منہ سے چیخ نکلنے ہی کو تھی کہ پھر کھل گیا اور مجھے کمزور سی ہنسی آ گئی۔ سامنے نارمن کھڑا ہوا تھا۔ اس نے کمرے میں آ کر کھڑکیاں کھولیں اور سورج کی زرد روشنی سرخ قالین پر بہار دکھانے لگی۔ نارمن کی موجودگی سے میرا ذہن خوف سے خالی ہوگیا۔

''نارمن میرا خیال ہے کہ صرف اس کمرے کی دیکھ بھال کے لئے ایک درجن ملازموں کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔'' میں نے خوش مزاجی کے موڈ میں کہا۔

''نہیں لوری۔'' نارمن نے بڑی زندہ دلی سے کہا۔ ''مسز نیلسن مکان میں موجود نہ تھی۔ وہ ایک ایسے آدمی کو جانتی ہیں جو اس مکان کے قرینہ آرائش سے مانوس ہے۔ اس کے علاوہ کل صبح خود یہاں آئیں گی۔''

''اچھا میں اب وہ کمرہ دیکھنا چاہتی ہوں جس میں تم اپنی ماسٹر پیس تصویر بناؤ گے۔'' میں نے کہا اور وہ میرے قریب آیا یکا یک اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا اور اس نے جھلا کر کہا۔

''میں تمہیں کسی قیمت پر ابھی یا شاید کبھی وہ کمرہ نہیں دکھا سکتا۔''

میں حیرت سے اس کا منہ تکنے لگی۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''میں تمہیں اپنا کمرہ نہیں دکھا سکتا۔'' نارمن نے کہا۔ اس کی آواز بالکل نامانوس وہ چند لمحے قبل مجھے اپنا کمرہ دکھانے پر خوشی سے رضامند تھا لیکن اچانک تبدیلی کیسے رونما ہوگئی۔ آخر اس پر کون سی طاقت نے اپنا تسلط جما لیا؟ میں نے قریب پہنچ کر اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔ لیکن اس نے بڑی درشتی سے کہا۔

''میں اس بارے میں کوئی بات سننے کو تیار نہیں ہوں۔ یہ میرا قطعی فیصلہ ہے!'' نارمن نے اس انداز اور لہجے میں کہا۔ جیسے میں اس کے لئے قطعی اجنبی ہوں۔ میں بہت زیادہ مغموم اور برداشتہ خاطر ہو کر روتی ہوئی دوبارہ ہال میں چلی گئی نارمن بھاگ کر میرے پیچھے آیا اور میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا۔

''لوری مجھے بے حد افسوس ہے۔ وہ کمرہ صرف میرا ہے، صرف میرا۔ اس بات کا اب مجھے پورا پورا احساس ہوا ہے۔ کیا تم میرا مطلب سمجھ گئی ہو۔''

''ہاں میں سمجھ گئی ہوں۔'' میں نے کہا...... درد کی ایک لہر میرے دماغ میں اٹھی، لیکن فوراً ہی ایک اندرونی قوت نے مجھے مجبور کیا کہ میں نارمن پر اپنی تکلیف واضطراب کو ظاہر نہ ہونے دوں اور نارمن کو اس پراسرار قوت کے اشارے پر کام کرنے دوں جو اسے یکا یک اپنے فیصلوں اور میرے ساتھ اپنا رویہ تبدیل کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

''سب ٹھیک ہے نارمن۔'' میں نے مسکراتے ہوئے اور اپنی آواز کو نارمل سطح پر لاتے ہوئے کہا۔ تمہیں یہ خاص کمرہ مبارک ہو۔''

''میں جانتا تھا کہ تم معاملہ فہمی کا ثبوت دوں گی۔'' نارمن نے مجھے نہایت پرجوش انداز میں گلے لگاتے ہوئے کہا۔ ''آؤ اب پورے مکان کا جائزہ لیں۔'' یکا یک مجھے ہال میں رکھے ہوئے لڑکوں کے پتلوں کے خوف نے آ دبایا اور وقتی طور پر عقلی توجیہہ اور دل میں ''اوہ، واہمہ اور کچھ نہیں۔'' کہنے کی ہر تدبیر رائیگاں ہوئی لیکن نارمن نے اپنے مخصوص کمرے کے سلسلے میں جو رویہ اختیار کیا تھا۔ اس کے پیش نظر میں اس پر اپنا خوف اور اپنے احساسات ظاہر نہ کر سکی اور اس کے پیچھے پیچھے ہال کے اندر بالائی منزل کے زینے کے قریب پہنچی لیکن وہ زینے پر چڑھنے کے بجائے اچانک ٹھٹھک گیا۔ اور ایک ناقابل اظہار خوف کی لہر اس کے چہرے پر نمودار ہوئی لیکن فوراً میرے دل میں گہری ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوا۔ اور میں نے بڑی نرمی سے کہا۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا نارمن!''

''ہاں واقعی سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' نارمن نے...... مسکراتے ہوئے کہا۔ لیکن کیا ٹھیک ہو جائے گا،

ہم دونوں میں کوئی بھی نہ جانتا تھا۔
مجھے ناقابل اظہار طور پر اس امر کا احساس ہی نہیں بلکہ علم ہوگیا تھا کہ اس مکان میں ہم ایسے مردوں کے ساتھ مقیم ہیں جو زندہ ہیں لیکن جب تک وہ مناسب نہ سمجھیں نظر کے سامنے نہ آئیں۔ بالائی منزل کے ہال میں نو دروازے تھے۔ جو نو کمروں کے تھے، میں نے ان کے متعلق مسکراتے ہوئے نارمن سے کہا۔
''آخر ہم دو میاں بیوی ان کمروں کا کیا کریں گے۔''
''یہ سامنے والا کمرہ تو روجر کے لئے مخصوص ہوگا۔'' نارمن نے خوش طبعی کے ساتھ کہا۔
''کون روجر؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔
''یہ ہمارے پہلے بچے کا نام ہوگا!'' نارمن نے بڑی شوخی اور شرارت کے لہجے میں کہا۔
''میں اتنا بڑا کمرہ اپنے بچے کے لئے کیونکر پسند کرسکتی ہوں، خواہ اس کا نام روجر رکھو یا پینٹر۔'' میں نے بھی اسی شوخی اور طنازی سے جواب دیا۔
''اور اس کمرے میں ہم جنٹ کو رکھیں گے۔'' نارمن نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔
''نام تو صحیح لو بندہ خدا جنٹ نہیں جینیٹ! بہر حال مجھے ناموں سے کوئی دلچسپی نہیں۔'' میں نے بھی سنجیدگی سے کہا۔
''لیکن میں...... میں نے جنٹ کیوں کہا؟ یہ نام میری زبان پر کیوں آیا؟'' نارمن کی آواز پھر بدل گئی۔
اس لئے کہ جینیٹ نام کی کسی لڑکی یا عورت کا تمہارے ماضی سے تعلق ہے۔''میں نے غیر ارادی طور پر طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔ نارمن میری بات سن کر کچھ پریشان سا ہوگیا اور کہا۔
''جہاں تک مجھے یاد ہے میں جینیٹ نام کی کسی عورت سے واقف نہیں ہوں۔''
''ذرا یاد کرنے کی کوشش کرو، کوئی بھورے، سنہرے، سرخ یا کالے بالوں والی محبوبہ۔ جسے تم نے اپنی کار میں تفریح کروائی ہو۔'' میں نے طنز کو واضح کرتے ہوئے کہا۔
''لوری میرا حافظہ اتنا کمزور نہیں ہوسکتا۔ نارمن نے میرے طنز کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ جینیٹ نام کی کسی لڑکی سے میرا کوئی واسطہ نہیں رہا۔''
''آہ غریب جینیٹ تجھے کس قدر جلد بھلا دیا گیا۔ میں نے طنز میں کمی نہ کرتے ہوئے کہا۔
''آہ پیاری جینیٹ، تو میرے ماضی کے کس گوشے میں چھپی ہوئی ہے۔ تو نے تو میری بیوی کو حسد سے پاگل بنا دیا ہے۔ ظالم۔'' نارمن نے بھی طنز کا لہجہ اختیار کیا، لیکن اس کے چہرے پر بے چینی کے آثار اور زیادہ نمایاں ہوگئے۔
دوسرے دن نارمن نے شہر سے تصویر کشی کا تمام سامان لاکر اس کمرے میں رکھ دیا جو اس جینیٹ کے لئے مخصوص کیا تھا۔ اگرچہ وہ قطعی طور پر مجھے وہ کمرہ دکھانے سے معذوری ظاہر کرچکا ہے لیکن میرے دل میں یہ جاننے کی خواہش کروٹ لے رہی تھی کہ اس میں کیا ہے اور نارمن اس کے متعلق اتنا حساس کیوں ہے کہ وہ مجھے دکھ پہنچانے سے بھی گریز نہیں کرتا۔
وہ ہوٹل جہاں ہم رات کا کھانا کھاتے تھے۔ کیلڈر کاٹیج سے دس میل کے فاصلے پر تھا۔ تیسرے دن یہ بات مجھے محسوس ہوگئی کہ جیسے ہی ہم دونوں اس طلسمی مکان کی حدود سے نکل کر کہیں جاتے ہیں ہم بالکل وہی بن جاتے ہیں جو اس مکان میں آنے سے پیشتر تھے۔ یہ احساس اپنے ہوٹل جو ''بولڈر اوکس ان'' کہلاتا ہے میں پہنچ کر اور بھی شدید ہوگیا۔ ہم دونوں ایک کیبن میں تھے۔ اور ہوٹل کے ہال سے موسیقی کی ہلکی ہلکی آواز ہمارے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔
''ہم ہمیشہ اسی طرح خوش رہیں گے لوری۔'' نارمن نے جذباتیت سے بھرپور لہجے میں کہا۔ اور پھر اسی محبت اور گرم جوشی کے ماحول میں ہم دونوں نے کھانا کھایا اور پھر اپنے طلسمی مکان کی جانب مراجعت کی۔ میں اسی مکان میں رہنے پر موثر احتجاج کرسکتی تھی لیکن کوئی پراسرار قوت مجھے سب کچھ دیکھنے اور خاموش

رہنے پر مجبور کر رہی تھی۔
گھر پر پہنچنے پر جیسے ہی ہم شب خوابی کے لئے بالائی منزل کے ہال میں پہنچ کر اپنے کمرے میں جانے لگے، نارمن، جینیٹ کے کمرے کے سامنے رک کر کہا۔
''لوری کیا تم جلنے کو شب بخیر کہوگی۔'' یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔
''آپ کے محبوبہ کا نام جینیٹ تھا سرکار۔'' میں نے بڑے طنزیہ انداز میں جواب دیا۔
اس نے میری بات جیسے سنی ان سنی کر دی اور پھر ایک سحر زدہ کی طرح یہ نام دہرانے لگا...... ''جلنے جلنے...... جلنے۔'' بے شک جلنے ہی صحیح نام ہوسکتا ہے۔
مجھے پہلی مرتبہ خیال آیا کہ جینیٹ غلط نام تھا۔
دفعتاً ہال میں ایک سرد ہوا کا جھونکا آیا...... واقعی یہ آندھی تھی...... میرے بال اڑنے لگے اور سارا جسم کپکپانے لگا۔
''بڑی سرد ہوا چل رہی ہے نارمن۔'' میں نے کپکپاتے لہجے میں کہا۔
''کیا فضول باتیں کرتی ہو لوری۔ اس جگہ تو سخت گرمی ہے۔'' نارمن نے جیسے خواب سے چونک کر کہا۔
کمرے میں نارمن مجھے سوتا چھوڑ کر چلا گیا۔
مجھے رات میں کئی بار ایک خواب نظر آیا...... ایک عورت بڑی دردناک آواز میں پکار رہی تھی۔ جلنے...... جلنے۔''
میں بیدار ہوتے ہوتے بھی نیم بیداری کی حالت میں یہ آواز سن رہی تھی۔ رفتہ رفتہ میں بیدار ہوئی اور آواز دور ہوتی چلی گئی پھر ایک واضح آواز گونجی۔
''ہوتائی۔ ہو۔ تائی۔ ابھی نہیں، ابھی نہیں۔''
میرا ایک ہاتھ مسہری کے نیچے کی جانب لٹک رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ نہایت نرم اور ملائم روئیں رکھنے والا کوئی جانور میرے ہاتھ سے اپنے جسم کو مس کر رہا تھا۔ خوف سے میرا خون منجمد سا ہوگیا۔ میری چیخ حلق میں پھنس گئی اور میں ہاتھ جھٹک کر نیچے جھک کر دیکھا تو وہاں کچھ نہ تھا۔

بلی۔ مجھے معلوم ہوگیا وہ بلی تھی۔ میں خوف سے لرز گئی۔ میں ہمیشہ بلیوں سے خائف رہی ہوں۔ مگر یہ بلی اف خدا، اس کا لمس کتنا دہشت انگیز تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ کو ملا۔ لیکن اس کا لمس ہاتھ سے ذہن میں پہنچ گیا۔ شاید ہمیشہ کے لئے۔
زینے پر بلی کو تلاش کرتے ہوئے میں باورچی خانے میں پہنچ گئی، جہاں میری ملاقات مسز نیلسن سے ہوگئی اور کافی کی مہک نے میری سحر زدگی میں کچھ کمی کر دی۔ میں مسز نیلسن سے اپنا تعارف کراتے ہوئے بلی کا ذکر کیا اور پوچھا کہ اس نے تو نہیں دیکھا؟ مسز نیلسن نے بتایا کہ اس نے کوئی بلی نہیں دیکھی البتہ میرے ناشتہ کرنے کے دوران وہ بلی کو تلاش کرے گی۔
''میں کوئی چیز نہیں کھا سکتی جب تک کہ اس بلی کو اس مکان سے باہر نہ نکال دیا جائے۔'' میں نے ہسٹریا زدگی کے انداز میں اس سے معذرت خواہی کے انداز میں کہا۔ ''یہ بات اگرچہ احمقانہ تھی تاہم میں اس خوف پر قابو نہیں پاسکتی جو مجھ پر قابو پا چکا ہے۔''
تقریباً ایک گھنٹے تک میں نے اور مسز نیلسن نے گھر کا کونہ کونہ چھان مارا مگر بلی نہ نظر آئی، تو مسز نیلسن نے مجھ سے پوچھا۔
''آپ کو یقین ہے کہ آپ نے بلی کو خواب میں نہیں دیکھا، کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ نئی جگہ ہونے کی وجہ سے آپ کو وہ چیزیں خواب میں نظر آ رہی ہوں جن سے آپ ڈرتی ہوں۔''
''میں نے اس کے لمس کو محسوس کیا ہے، یہ شاید خواب میں بھی ممکن ہے اور چونکہ حقیقی بلی نہ تو گھر میں موجود ہے اور نہ اتنی جلدی غائب ہوسکتی ہے۔ اس لئے آپ کا یہ خیال درست ہوسکتا ہے کہ میں نے خواب دیکھا ہوگا۔'' میں نے جواب دیا۔
مسز نیلسن بڑی پسندیدہ صفات کی حامل تھی۔ جس کی وجہ سے اس کی شخصیت پرکشش بن گئی تھی۔ اس کے خاوند کا کئی سال پیشتر انتقال ہو چکا تھا اور اس کے بچے بڑے ہو کر ادھر ادھر چلے گئے تھے۔ اس کی آمدنی کا

واحد ذریعہ کسی خوشحال گھرانے کا کام تھا۔ جسے وہ بڑے سلیقے سے انجام دیتی رہتی تھی۔

"میں صرف روپے پیسے کے لئے کام نہیں کرتی بلکہ عرصہ دراز سے کام کرتے رہنے کی بنا پر کام میرے لئے عادت بن گیا ہے۔" مسز نیلسن نے کہا۔ "میں بیکاری میں انتہائی بے چینی محسوس کرتی ہوں، کھانا پکانا، صفائی اور گھر کی آرائشگی میرے لئے بہترین مصروفیت ہے۔"

مسز نیلسن صفائی کے لئے بالائی کمروں میں گئی تو میں نیچے کے ہال میں آ گئی۔ یہاں ایک عجیب تماشہ دیکھا، ایک پتلا ٹوٹا ہوا پڑا تھا۔ ایک چھوٹی سی آبنوسی میز پر ایک لڑکی اور ایک لڑکے کا پتلا رکھا ہوا تھا۔ ان میں سے لڑکی کا پتلا ٹوٹ گیا تھا۔ میں نے اس پتلے کے ٹکڑوں کو اٹھا کر دیکھا اور اس کی شکستگی کے مفہوم پر غور کرنے لگی۔

"لڑکی کا پتلا ٹوٹا ہے، یہ میرے لئے خطرہ کی علامت ہے۔"

میں اس خیال یا واہمے کے تحت بے چین ہوگئی اور سارا گھر مجھے اپنا دشمن اور پراسرار قوتوں سے بھرپور دکھائی دینے لگا..... یہ پتلا بلی نے توڑا ہے، میں نے سوچا اور مجھے اس طرح تنبیہ کی ہے میں نے بلی خواب میں نہیں دیکھی تھی وہ حقیقی بلی تھی اور اس وقت گھر میں موجود ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ جس وقت میں اور مسز نیلسن اس ہال میں بلی کو تلاش کر رہی تھیں، یہ پتلا سالم تھا لڑکے کا پتلا تنہا میز پر موجود تھا۔

کچھ دیر بعد مسز نیلسن بالائی کمروں کی صفائی سے فارغ ہو کر نیچے آئی اور مجھے بتایا کہ اس نے ڈونالڈ سن نام شخص کو احاطے کی صفائی کے لئے بلایا تھا۔ جو آ کر اپنے کام میں مصروف ہو چکا ہے، میں اٹھ کر باہر جانے لگی تو مسز نیلسن نے مجھے چند باتیں بتانے کی غرض سے روک لیا۔

"میں آپ کو ڈونالڈسن کے بھائی جمی کے متعلق کچھ بتانا چاہتی ہوں، کیونکہ اس وقت وہ بھی اس کے ساتھ احاطے کی صفائی کے لئے آیا ہوا ہے، وہ بڑا ضدی شخص ہے لیکن کیا کیا جائے باغبانی اس سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا۔ ویسے وہ بڑا بے ضرر آدمی ہے۔ اب یہ آپ کو طے کرنا ہے کہ آپ اسے مستقل طور پر اپنے باغ کی دیکھ بھال کے لئے مقرر کرنا پسند کرتی ہیں یا نہیں، میں ان دونوں بھائیوں سے واقف ہوں۔ انہیں یتیم ہو جانے کے بعد ان کی دادی نے پرورش کیا تھا۔ اور اسی بنا پر لوگ ان سے نہ صرف ڈرتے ہیں بلکہ انہیں سماجی اچھوت بنا دیا ہے۔"

"دادی کی وجہ سے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا مطلب؟"

"لوگوں کا خیال ہے کہ وہ زبردست جادوگرنی تھی جو اسکاٹ لینڈ کی رہنے والی تھی اور واقعہ بھی یہ ہے کہ وہ ہر وقت کاڑھے جوشاندے تیار کرتی رہتی تھی۔ عجیب عجیب جڑی بوٹیاں لاتی تھی اور ڈونالڈسن کی بجائے جمی پر بہت زیادہ مہربان تھی۔"

مسز نیلسن کی باتوں سے مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھے ڈونالڈسن کی بجائے جمی کے متعلق ہمدردانہ رویہ اختیار کرنے کا مشورہ دے رہی ہے۔

"آخر لوگ ان غریبوں کی دادی کو جادوگرنی کیوں تصور کرتے ہیں جب کہ بقول تمہارے، وہ جڑی بوٹیاں جمع کر کے ان کے عرق نکالتی تھی، ہوسکتا ہے کہ وہ پرانی وضع کی عطائی دوا ساز ہو۔" میں نے مسز نیلسن سے دریافت کیا۔

"بات صرف یہی نہیں ہے محترمہ۔" مسز نیلسن نے کہا۔ "وہ اس قدر عجیب باتیں کرتی تھی جو عقل میں نہیں آتیں۔ وہ مستقبل کا حال اس طرح بیان کر دیتی تھی، گویا آدمیوں کی تقدیریں اس کے سامنے بنائی گئی ہوں۔ ایسے بڑے لوگ جن کے نام میں نہیں بتانا چاہتی مافوق الفطرت کاموں کے لئے اس کی خدمات حاصل کر لیتے تھے۔ ان تمام باتوں پر مستزاد یہ کہ لوگ پختہ یقین رکھتے تھے کہ وہ مرجانے کے باوجود زندہ ہے۔"

"کیا تم کبھی اس کے پاس قسمت کا حال معلوم کرنے گئی ہو؟" میں نے مسز نیلسن سے اپنے ذہن میں ،اسپین کی اس خانہ بدوش بڑھیا کو ذہن میں رکھتے

ہوئے پوچھا جس نے نارمن کو دیکھ کر بہت سی پیش گوئیاں کی تھیں۔

''متعدد مرتبہ، میں اس کے پاس گئی ہوں۔'' مسز نیلسن نے جواب دیا۔ ''اور مجھے اس پر کوئی شرمندگی نہیں ہے۔ اس نے بہت سے لوگوں کے مستقبل کے متعلق جو کچھ بتایا وہ حرف بحرف صحیح ثابت ہوا۔''

مسز نیلسن کے بیان سے میرے دل میں وہی اضطراب پیدا ہوگیا۔ جو تین روز قبل اس وقت محسوس ہوا تھا جب نارمن نے تفریح کے دوران خانہ بدوش بڑھیا کی پیشن گوئی کا حال سنایا تھا۔

''اب میں باہر جاتی ہوں۔'' میں نے یکایک کہا اور باہر آگئی۔ معاً باہر آتے ہی مجھے اپنی سحرزدگی میں تخفیف محسوس ہوئی، میں نے دیکھا کہ ڈونالڈسن گھاس صاف کررہا تھا۔

''میں تم سے باغ کی دوبارہ تزئین کے سلسلے میں کچھ گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔'' میں نے ڈونالڈسن سے خود کو متعارف کراتے ہوئے پوچھا۔

''سب سے پہلے گھاس کی صفائی ضروری ہے۔'' اس نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔

''لیکن میں پہلے گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔'' میں نے مالکانہ لہجے میں کہا۔

''جب تک گھاس نہ صاف ہوجائے ہر بات فضول ہے۔'' اس نے بڑی مطلق العنانی سے کہا۔

میں نے غور سے اس کی صورت دیکھنے کے بعد سوچا کہ اگر اس کی دادی اس سے مشابہ تھی تو اس کے جادوگرنی ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا۔ وہ ایک پست قامت شخص تھا۔ جس کی ناک لمبی اور چہرہ اندر کی طرف دھنسا ہوا تھا۔ اور اس کے باقی خدوخال بھی وہی تھے جو پرانی جادوگرنیوں اور جادوگروں کے ہوتے تھے۔

''کیا آپ بالکل نئی آئی ہیں۔'' یہ آواز میرے پیچھے سے آئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو مجھے ایک دوسرا شخص نظر آیا جو ہر اعتبار سے ڈونالڈسن سے مشابہ تھا۔ میں اس شخص کو پہچان گئی۔ حالانکہ مسز نیلسن نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ یہ دونوں بھائی آپس میں حیرت انگیز مشابہت رکھتے ہیں۔

''ہاں میں نئی ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ تم جمی ہو۔''

''جی ہاں میں جمی ہوں۔'' آپ سے مسز نیلسن نے ذکر کیا ہوگا۔ اس نے میری تائید کرتے ہوئے کہا۔

میں نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا اس کی آنکھوں میں غیر انسانی کشش اور قوت جھلک رہی تھی۔ وہ قوت جو حیوان اور دیوتا دونوں کے امتزاج میں پائی جاسکتی ہے۔

''اگر تمہارا دل چاہے تو تم یہاں مستقلاً کام کرسکتے ہو۔'' میں نے جمی سے کہا۔

''بہت خوب جناب۔'' جمی نے کہا۔ ''آپ غالباً ایک بلی کی تلاش میں ہیں جسے میں نے ابھی ابھی دیکھا تھا۔''

''ہاں بلی۔'' مجھے جھرجھری سی آگئی۔ ''تم سے جس قدر جلد ممکن ہوسکے، اس بلی کو یہاں سے نکال دو۔''

''یہ......ناممکن ہے۔'' جمی نے آنکھیں بند کرکے کہا۔ ''وہ غصے سے پاگل ہوجائے گی۔ یہ بلی اس کی ہے۔ اس نے اسے جنم دیا ہے۔''

''کس کی بلی ہے؟'' میں نے گھبرا کر ڈونالڈسن کی طرف دیکھا۔ جمی آنکھیں بند کرکے کہہ رہا تھا۔

''بلی اس کی ہے جو دوسری ہے جو بہت بڑی اور طاقتور ہے۔''

''جناب یہ بہت سی ایسی چیزیں دیکھتا ہے جنہیں دوسرے نہیں دیکھ سکتے۔'' ڈونالڈسن نے مجھے پریشان دیکھ کر کہا۔ اس کی بات سن کر میں سکتے میں آگئی۔

☆......☆......☆

''ہیلو!''

میں نے پورچ میں بیٹھے ہوئے یہ لفظ سنا اور اس اجنبی ملاقاتی کی جانب دیکھا جس نے مخاطب کیا تھا۔ وہ ایک نہایت خوبصورت جوان آدمی تھا۔

''میں آپ کا پڑوسی ہوں۔'' اس نے مسکراتے

ہوئے کہا۔ وہ سامنے سرخ لکڑی کی کاٹیج، میری اقامت گاہ ہے۔ اس نے انگلی سے سامنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اس مکان میں پڑوسی کی حیثیت سے آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔“

میں نے اس کا شکریہ ادا کرکے اسے چائے نوشی کی دعوت دے دی۔

اس کا نام فرنالڈی تھا۔ وہ ماہر نفسیات اور نفسیاتی تجزیہ کار تھا اور ان دنوں دماغ اور تحت الشعور کی ناقابل تشریح قوتوں اور صلاحیتوں پر ریسرچ میں مصروف تھا۔ پہلی نظر میں مجھے محسوس ہوا جیسے میں اسے ہمیشہ سے جانتی ہوں اور اس کی متلاشی تھی۔ میں اس کے بے پناہ کشش کے سامنے بے بس ہوگئی۔ علاوہ بریں مجھے نارمن کے رویہ سے سخت صدمہ پہنچا تھا، اس کے علاوہ میں جلیٹے نامی عورت کے خلاف شدید رقابت وحسد کا جذبہ اپنے اندر محسوس کررہی تھی کیونکہ اس کا نام اور شخصیت دونوں نارمن کے لئے مجھ سے اور دنیا کی ہر چیز سے زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔ اس نے خود کو ہر لحاظ سے قابل اعتماد بنادیا بلکہ میں نے خود اپنی ذات پر اعتماد کو بحال کردیا۔ اور چند ہی دنوں تک ایک ایسی دوستی استوار ہوگئی جو آئندہ پیش آنے والے مافوق الفطرت حالات میں مجھے زندہ رکھنے کا موجب ثابت ہوئی اور آج میں سوچتی ہوں کہ اگر فرنالڈی کی دوستی میسر نہ آتی تو میرا کیا حشر ہوتا۔

دو تین ہفتے گزرنے پر ہمارے معمولات طے ہوگئے۔ ناشتے کے بعد نارمن جلیٹے کے گنبدی کمرے میں اپنا ”ماسٹر پیس“ بنانے کے لئے بند ہوجاتا اور میں احاطے اور باغ کی دیکھ بھال کے لئے باہر آجاتی۔ شام کے وقت فرنالڈی آجاتا اور موڈ کی مناسبت سے نارمن بھی گفتگو میں حصہ لیتا ورنہ ہم دونوں کو چھوڑ کر ہال میں جاکر پیانو بجانے لگتا۔ قرب وجوار کی عورتوں نے، جن میں بڑی بوڑھیاں بھی شامل تھیں ہم سے تعلقات استوار کرلئے، اس طرح ایک بڑی بوڑھی مسز فرگوسن نے مجھ سے اس مکان کی تاریخ بھی بیان کردی۔

مسز فرگوسن کے بیان کے مطابق، اس مکان کو ایک بلڈنگ کنٹریکٹر جارج کیلڈر نے بنایا تھا، مکان کی تعمیر کے دوران اس کی بیوی مالنڈا کیلڈر حاملہ اور بیمار تھی۔ مالنڈا کیلڈر مصوری سے دلچسپی رکھتی تھی۔ اور اس مکان کو جارج نے ایک ایسی تصویر کے مطابق بنوایا تھا۔ جو مالنڈا کو پسند تھی اور جارج کیلڈر نے بڑے فخر سے کہا تھا کہ ”ہمارے پہلے بچے کی ولادت اپنے ذاتی مکان میں ہوگی۔“

کمزوری اور بیماری کے باوجود مالنڈا اور جارج دونوں مسرور اور پرامید تھے مالنڈا کا خیال تھا کہ پہلے بچے کی ولادت کے بعد اس کی موت بحال ہوجائے گی۔ اسے ڈاکٹر نے بھی یقین دلایا تھا کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، عموماً پہلا بچہ تکلیف اور خرابی، صحت کا موجب بن جاتا ہے لیکن بہت جلد صحت بحال ہوجاتی ہے جب بچے کی ولادت میں ایک مہینہ رہ گیا تو گھر کو بڑے قرینے سے سجایا گیا لیکن اچانک ہی مالنڈا کیلڈر شدید درد زہ میں مبتلا ہوگئی۔ اور اسے فوراً اسپتال پہنچادیا گیا۔ جارج کیلڈر ہمہ وقت اپنی بیوی کے سرہانے موجود رہا۔ کامل اڑتیس گھنٹے شدید درد کے بعد ایک نہایت خوبصورت اور توانا بچہ پیدا ہوا لیکن وہ مردہ تھا۔

مالنڈا کی صحت درست ہوگئی لیکن مردہ بچے کی ولادت کا سانحہ اس کے ذہن پر چھا گیا۔ پہلے بچے کی پرورش گاہ کے طور پر جو کمرہ مخصوص کیا گیا تھا اس کی جانب دیکھ کر دونوں کا غم تازہ ہوجاتا تھا۔ تاہم ڈاکٹر انہیں تسلی دے کر کہتا تھا کہ ان کے یہاں اتنے بچوں کی ولادت بھی ممکن ہے کہ کمرے بھر جائیں۔ جارج اس امر سے خوش تھا کہ اس نے پوری طرح گھر کی آرائش کا اہتمام نہیں کیا تھا جس کی وجہ سے مالنڈا کے لئے مصروف رہنے کی سبیل پیدا ہوگئی تھی کچھ عرصہ میں مالنڈا دوبارہ حاملہ ہوئی۔ اور اس مرتبہ بھی درد اچانک شروع ہوا اور اسپتال میں خوبصورت لیکن مردہ بچے کی ولادت ہوئی۔

دوسرے مردہ بچے کی ولادت کے بعد سے مالنڈا کیلڈر نے بچوں کے خوب صورت پتلوں کی

فراہمی سے دلچسپی لینا شروع کر دی۔ جارج کیلڈر نے اس کے اس شوق کو پسند کرتے ہوئے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ جارج کی دولت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ مالنڈا پتلوں کے جوڑے پسند کرتی لیکن ایک مرتبہ اس نے تین پتلے خریدے اور ٹیبل پر رکھ دیئے تھے جن میں دو لڑکوں اور ایک لڑکی کا پتلا تھا۔ اس نے یہ تمام پتلے یکبارگی نہیں بلکہ کئی سالوں کی مدت میں خریدے تھے۔

اس عرصے میں مالنڈا کے چھ بچے پیدا ہوئے جن میں پانچ مردہ تھے اور ایک زندہ رہا۔ وہ آٹھ بچوں میں واحد بچہ تھا جسے دو سال کی زندگی نصیب ہوئی، اور ایک رات وہ پراسرار طور پر فوت ہوگیا، بظاہر ڈاکٹر نے اس کی موت کا سبب نمونیا کو قرار دیا، جارج اور مالنڈا دونوں نے اسے اچھی بھلی حالت میں رات پالنے میں سلایا تھا جبکہ صبح کو اسے مردہ پایا گیا۔

جارج اور مالنڈا دونو ں اس صدمے سے نڈھال ہوگئے۔ انہوں نے اس مکان کو مقفل کر کے ایک عورت کو اس کی نگہداشت پر مامور کر دیا تاکہ وہ ہفتے میں ایک بار اس کی صفائی کر دیا کرے، اور ہر چیز یہاں چھوڑ کر چلے گئے، حتیٰ کہ وہ بچوں کے پتلوں کو بھی یہیں چھوڑ گئے۔ مالنڈا ان پتلوں کو اپنے مردہ بچوں کا نعم البدل سمجھ کر تسکین پاتی تھی لیکن آخری بچے روجر کی پیدائش اور دو سال تک زندہ رہنے کی وجہ سے شاید اسے ان پتلوں سے بھی دلچسپی نہ رہی ہوگی۔

''روجر؟'' مسز فرگوسن سے مالنڈا کیلڈر کے آخری بچے کا نام سن کر مجھے جھرجھری آ گئی۔ نارمن نے یہی نام اپنے پہلے بچے کے لئے تجویز کیا تھا...... لیکن جانئے؟

''کیا مالنڈا کی کسی بچی کا نام تھا؟'' میں نے مسز فرگوسن سے سوال کیا۔

''مجھے معلوم نہیں!'' مسز فرگوسن نے اسی انداز میں کہا جیسے وہ یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

اس مرحلے پر قریب تھا کہ میں مسز فرگوسن کو اس گھر میں ہونے والے واقعات بتا دیتی۔ اور بچوں کے ان خوف ناک پتلوں کا بھی ذکر کر دیتی۔ جو مجھے خوف ناک طور پر زندہ نظر آتے تھے، لیکن میرے خیالات کا دھارا دوسری جانب مڑ گیا، اور میں سوچنے لگی کہ ''نارمن نے بھی مجھ سے اسی تعداد میں بچوں کی خواہش کا اظہار کیا تھا، بعد ازاں مجھے خیال آیا کہ ایک کمرہ کو اس نے اپنے پہلے روجر کی پرورش گاہ کے طور پر منتخب کیا تھا کہیں وہی کمرہ مالنڈا کیلڈر کے دو سال تک زندہ رہنے والے بچے راجر کی پرورش گاہ تو نہیں تھا۔'' مجھے خیال آیا کہ مسز فرگوسن اپنی عمر اور مالنڈا کیلڈر کے حالات سے مکمل طور پر باخبر ہونے کی وجہ سے میرے اس سوال کا جواب دے سکتی ہے چنانچہ میرے پوچھتے ہی اس نے میرے شبہ کو یقین میں بدل دیا۔ اس نے اسی کمرے کی جانب اشارہ کیا جسے نارمن نے اپنے متوقع پہلے بچے روجر کی پرورش گاہ کے طور پر منتخب کیا تھا۔

مسز فرگوسن کے جانے کے بعد، میری بے چینی میں اضافہ ہوگیا، اب مجھے جلتے کا عقدہ حل کرنا تھا، میں پورچ سے اٹھ کر ہال میں پہنچ گئی۔ تو یکایک بچوں کے پتلے حرکت کرتے ہوئے میرے پاس آ گئے۔ انہوں نے میرے اسکرٹ کو چھوا اور بڑی خوف ناک آنکھوں سے میری جانب دیکھ کر رقص کرنے لگے ،خوف کی شدت نے شاید میری آواز کے عضلات پر بھی قابو پالیا تھا۔ اس لئے میری چیخ نہ نکل سکی، اور اپنی تمام قوتوں کو مجتمع کر کے میں جو کچھ کر سکتی وہ یہ تھا کہ بھاگ کر ہال سے باہر آ گئی! یہاں مسز نیلسن اور جمی کی آوازوں نے کسی حد تک ماحول کو نارمل بنا دیا، لیکن میرا یہ یقین پختہ ہوگیا کہ میں ان لوگوں میں گھر چکی ہوں جو مر چکے ہیں لیکن زندہ ہیں! مجھے یہ بھی احساس ہوگیا کہ ان کا مخصوص ہدف میری ذات ہوگی۔

میں باہر سے دوبارہ خواب گاہ میں جانے کے لئے پورٹیکو میں داخل ہوگئی نارمن زینے سے اتر کر نیچے کی جانب آ رہا تھا۔ اس نے غائب دماغی سے میرا بوسہ لیا۔ اس وقت اس کے جسم سے لیونڈر کی خوشبو آ رہی تھی ،جبکہ تصویر کشی کی مصروفیت کے لحاظ سے اس کے ملبوس سے پینٹ اور تارپین کی بو آنا چاہئے تھی۔

''تم سچے آرٹسٹ نہیں ہو نارمن۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''تمہارے کپڑوں سے پینٹ اور تارپین کی جگہ لیونڈر کی مہک آرہی ہے۔''

''میں نے ابھی تصویر بنانا شروع ہی نہیں کیا لوری!'' نارمن نے تاسف کے لہجے میں کہا اور میں سناٹے میں آ گئی۔ آخر وہ تمام دن چنٹے کے کمرے میں بند ہو کر کیا کرتا رہتا ہے۔ اور تصویر کا آغاز نہ کرنے پر تو میری ذات سے اس کی بے پروائی انتہا کو پہنچ گئی ہے، خدا جانے تصویر بنانے کے دوران کیا صورت پیدا ہو۔

رات کے کھانے کی میز پر بھی نارمن بجھا بجھا سا تھا۔ تاہم فرنالڈی نے مجھ کو اس عدم توجہی کو محسوس نہ کرنے دیا غالباً میں اسے حسین نظر آنے لگی تھی۔ رات کو بمشکل تمام تقریباً بارہ بجے میری آنکھ جھپکی لیکن چند گھنٹے بعد اچانک جاگ اٹھی۔ کیلڈر کانیج کے قدیم الایام الارم نے تین بجائے۔ میں نے کروٹ لے کر دیکھا، تو نارمن غائب تھا۔ میں اٹھ بیٹھی اور مسہری سے نیچے اترنے کے لئے پاؤں لٹکائے تو اچانک جیسے کرنٹ سا لگا۔ ایک بلی نے میرے داہنے پاؤں سے اپنا پیٹ رگڑنے لگی۔ میں پہلی مرتبہ پوری قوت سے چیخی اور مسلسل کئی چیخیں میرے حلق سے نکلیں میں نے سوتے وقت کمرے میں اندھیرا کر دیا تھا۔ اچانک بلب روشن ہوا اور نارمن نے بڑھ کر مجھے گود میں اٹھالیا۔ میں نے جو کچھ دیکھا تھا اس سے بیان کرنا چاہا۔ لیکن خوف کی سسکیاں جاری رہیں۔ اور میں صرف بلی کہہ کر اس سے لپٹ گئی۔

''کیا احمقانہ بات ہے محض ایک بلی۔'' نارمن نے جھنجھلا کر کہا۔ ''آخر بلی تمہارا کیا بگاڑ سکتی ہے؟''

''میں کب کہتی ہوں کہ وہ میرا کچھ بگاڑ سکتی ہے۔'' میں نے اس کی گود میں لیٹے لیٹے کمرے میں نظر ڈال کر کہا۔ ''میں صرف یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ وہ مجھے چھوئے۔'' یہ کہتے ہی مجھے اس تصور سے ہی جھرجھری آ گئی کہ چند لمحات پہلے اس نے میرے پاؤں سے اپنا جسم مس کیا تھا، پھر میں نے نارمن سے کہا۔

''بلی یہیں کمرے میں چھپی ہوئی ہے، خدا کے لئے اسے نکال دو۔''

''بلی کمرے میں نہیں ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ اب پوری کاٹیج میں کہیں نہ ہوگی، کیونکہ تمہاری چیخوں سے ڈر کر بھاگ گئی ہوگی۔'' نارمن نے کہا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ بلی سے جتنا تم ڈرتی ہو بلی اس سے کہیں زیادہ خود تم سے ڈر گئی ہوگی۔''

''نہیں نہیں، وہ کہیں نہیں گئی، مجھے اسے نکالنے تک چین نہیں آئے گا۔'' میں نے کہا۔ ''ہمیں بہرحال اس کو ڈھونڈ کر نکال باہر کرنا ہے۔''

''لوری دراصل یہ تمہارا بلی سے غیر معمولی خوف ہے، جو تمہیں خواب میں بلی دکھاتا ہے۔'' نارمن نے میری ضد سے اکتا کر کہا۔ ''تم اس بات کو تسلیم کرلو، کہ تم بلی سے ڈرتی ہو۔ اسی لئے بلی کو خواب میں دیکھتی ہو۔''

''یہ نہ خوف تھا نہ خواب!'' میں نے بگڑ کر کہا۔ ''اگر تم کمرے میں ہوتے تو مجھے بستر سے اٹھنے کی ضرورت پیش نہ آتی اور اس طرح یہ بلی میرے پاؤں سے اپنا جسم مس نہ کرتی، آخر تم کہاں گئے تھے؟''

''کیا تم اب میری نقل و حرکت کا مواخذہ کروگی؟'' نارمن نے درشت اور ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ اس کے بعد سوال جواب کا سلسلہ ختم ہوگیا۔

صبح کے وقت مجھے رات کو نارمن کے غائب ہو جانے کا سبب معلوم ہوگیا۔ میں بلی کی تلاش میں اس کے مطالعہ کے کمرے میں چلی گئی، میز پر وہ کتاب رکھی ہوئی تھی جس کو کیلڈا کاٹیج میں آنے کے پہلے دن میں نے ہال میں ایک میز پر رکھے ہوئے دیکھا تھا، اس کے بعد سے وہ وہاں سے غائب ہوگئی تھی، اور میں نے غیر معمولی حالات کی وجہ سے اس پر غور نہ کیا تھا، لیکن اسٹڈی روم کی میز پر اسے دیکھ کر خیال آیا کہ نارمن گزشتہ شب اسی کتاب کا مطالعہ کر رہا ہوگا، مزید تجسس کے پیش نظر میں نے کتاب کو کھولا۔ یہ بہت قدیمی کتاب، جو مصری ہیرو غلیف سے بھرپور تھی اور حاشیوں میں انگریزی میں ترجمہ درج تھا، کتاب کا نام تھا ''جادو'' کتاب کا نام دیکھ کر میں نے سوچا کہ آخر نارمن

ایسی کتابوں سے کیوں دلچسپی رکھتا ہے؟
مزید اوراق پلٹنے سے ایک باب کے عنوان پر نظر پڑی، لکھا تھا۔
''مردوں کی کتاب'' عنوان کے نیچے یہ لرزہ خیز عبارت نظر آئی۔
''خدا آرہا ہے۔ خدا آرہا ہے، روحیں تیرے اطراف میں کھڑی ہیں'' ان الفاظ سے مجھ پر کپکپی تاری ہوگئی لیکن ہمت کرکے چند جملے مزید پڑھنے کی کوشش کی۔
'آئی سس تجھ سے مخاطب ہوگئی۔ نیقاطی تجھ سے ہمکلام ہوگی۔ اور اب روحیں تجھے گھیر لیں گی۔''
میں اس خوف ناک کتاب کو بند کرکے باہر نکل آئی۔ اس سلسلے میں ایک عجیب صورت یہ تھی کہ میں سب کچھ دیکھتی اور محسوس کرتی تھی، لیکن بلی کے علاوہ کسی سے کوئی بات کا تذکرہ تک نہ کرسکتی تھی۔ مثلاً بچوں کے مجسموں کا حرکت کرنا اور میرے گرد جمع ہوجانا۔ ہوتائی ہوتائی کی آوازیں واضح طور پر سنائی دینا۔ کسی نسوانی اور دردناک آواز کا جلتے جلتے پکارنا، حد تو یہ ہے کہ ماہر نفسیات فرنالڈی سے بھی کسی موضوع پر بات چیت نہ کرسکتی تھی ہر رات یہ سوچتی تھی کہ صبح بیدار ہوکر کسی نہ کسی طرح حالات وواقعات بیان کرکے دل کا بوجھ ہلکا کرلوں لیکن۔
ایک دن صبح میں پہلے سے طے کردہ پروگرام کے مطابق ناشتے سے فارغ ہوکر مسز فرگوسن کے مکان میں پہنچ گئی ارادہ تو یہ تھا کہ اس سے ان عجائبات کے متعلق بات چیت کروں جو میرے لئے جسمانی اور روحانی تکالیف کا موجب بنے ہوئے تھے، لیکن اس سے پوچھ بیٹھی۔
''مسز فرگوسن، کیا مالنڈا اکیلڈر کا کوئی اور نام بھی تھا؟ میرا خیال تھا کہ اس کا نام جلتے ہوسکتا ہے۔''
''لوٹیلا'' مسز فرگوسن نے کہا۔ اور چند لمحے غور کرکے توثیق کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں اس کا نام لوٹیلا بھی تھا۔''
مسز فرگوسن کا جواب سن کر میں نے سوچا کہ

غلام

فقر اختیار کرنے سے پہلے حضرت ابراہیم ادھمؒ نے ایک مرتبہ غلام خریدا اس کو لے کر گھر پہنچے تو پوچھا کیا کھاؤ گے؟
غلام: اپ جو کھلائیں گے کھالوں گا۔
ابراہیمؒ: کیا پہنو گے؟
غلام: جو پہنائیں گے پہن لوں گا۔
ابراہیمؒ: تمہارا نام کیا ہے؟
غلام: آپ جس نام سے پکاریں گے وہی میرا نام ہوگا۔
ابراہیم ادہمؒ: کیا کام کرو گے؟
غلام آپ جس کا حکم دیں گے۔
ابراہیم ادہمؒ: تمہاری کوئی درخواست؟
غلام: غلام کو درخواست سے کیا کام؟
حضرت ابراہیم ادہمؒ غلام کی گفتگو سن کر عالم تحیر میں کھو گئے اور اپنے گریبان پکڑ کر کہنے لگے اے بندہ مسکین تو بھی اپنے (آقا خدا) سے اسی طرح پیش آ جس طرح یہ غلام کہتا ہے۔ بہت دیر تک حضرتؒ پر نیم بے ہوشی کا عالم رہا وہ بار بار یہی الفاظ دہراتے رہے اور سر دھنتے رہے جب ہوش آیا تو غلام کو آزاد کردیا۔
(انتخاب: محمد ارمان۔ کراچی)

شاید کیلڈر کا میچ کی غیر مرئی لیکن تاریک قوتوں نے یہ وقت ہمارے خلاف کسی بھیانک منصوبہ پر غور کرنے میں صرف کردیا تھا۔ اس وقفہ امن وسکون کو میں نے مثبت طور پر محسوس کرنا شروع کردیا تھا کہ اب تک جو کچھ ہوا تھا وہ صرف میرے تخیل کی پیداوار تھا جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ تھا۔

کیلڈر کا میچ جو میرے لئے دشمنی اور نفرت کی قوتوں کا مرکز بنی ہوئی تھی، یکا یک دوستی کا گھوارہ بن گئی ایک دن فرنالڈی ایک کتاب لئے ہوئے آیا، جس کا نام پڑھ کر مجھے حیرت ہوئی، یہ بھی جادو سے متعلق تھی، چنانچہ میں نے اس سے سوال کیا۔

''کیا تمہیں بھی اس قسم کی کتابیں پسند ہیں؟''

''کس قسم کی؟'' اس نے میری حیرت سے حیران ہوکر پوچھا۔

''یہی جادو اور کیمیا سازی وغیرہ۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''یہ بڑے اہم علوم ہیں۔'' فرنالڈی نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''لیکن یہ تو واقعات اور دیومالا سمجھے جاتے ہیں۔''

''مگر واقعہ اور دیومالا کسے کہتے ہیں؟'' فرنالڈی نے بڑے علمی انداز میں کہا۔

''ہر وہ بات جس کی بنیاد دلیل پر نہ ہو، وہم یا دیومالا سے تعلق رکھتی ہے!'' میں نے بھی کسی قدر علمی لہجہ اختیار کیا۔

''ان علوم کی بنیاد بھی دلیل پر ہے۔'' فرنالڈی نے دانشورانہ انداز میں کہا۔

''لیکن لوگ اس معلومات سے محروم ہیں جس پر دلیل قائم کی جاسکتی ہے، یوں سمجھ لو کہ آج ہم جس بات کو سائنسی حقیقت سمجھتے ہیں، پچاس سال کے بعد وہی بات واہمہ اور دیومالا قرار پاجائے گی۔ ہم آج تک انسانی شعور وتحت الشعور کی گتھیوں کو نہیں سلجھا سکے، اسی انسانی دماغ کو سمجھ سکے ہیں اور جدید نفسیات کی بنیاد دلیل پر نہیں ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں ہوسکتے کہ ہم انسانی ذہن اور شعور وتحت الشعور کے وجود سے ہی انکار کردیں۔''

جادو ٹیلی پیتھی پیش بینی اور روحوں۔ کی دوبارہ جسموں میں واپسی کے متعلق ہماری معلومات کی کمی کا سبب یہ نہیں ہے کہ وہ سرے سے موجود نہیں بلکہ بات یہ ہے کہ نام نہاد ''سائنس دان'' ان کی اصلیت ہی سے منکر ہیں۔ کیا تم یہ بتاسکتی ہو کہ وہ خیالات جو تمہارے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں وہ تمہارے ہی ہوتے ہیں؟

''یقیناً میرے ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات میرے ہوتے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''یہ احساس بھی تمہارا نہیں بلکہ اس دور کا واہمہ ہے۔'' فرنالڈی نے کہا۔ ''کیا وہ تمام چیزیں تمہاری ایجاد کردہ اور بنائی ہوئی جنہیں تم اپنے گرد و پیش دیکھتی ہو۔''

''نہیں۔'' میں نے قطعیت کے ساتھ جواب دیا۔

''تو پھر تم اس امر کا کس طرح یقین رکھتی ہو کہ جو کیفیت تمہارے ذہن میں پیدا ہوتی ہے اس کا تعلق صرف تمہاری ذات سے ہوتا ہے۔'' فرنالڈی نے کہا۔'' جادو کی بنیاد اس علم ویقین پر ہے کہ ایک انسان اپنے خیالات دوسرے انسان کے ذہن میں منتقل کرسکتا ہے۔ لہٰذا وہ طلسمی نقشے جو پرانے لوگوں نے خبیث روحوں اور شیاطین کو زندہ انسانوں کی سوسائٹی سے دور رکھنے کے لئے بنائے تھے۔ ان کی اساس ہی یہ تھی کہ مرنے والوں کے تحت الشعوری خیالات زندہ انسانوں کے شعور پر مسلط نہ ہوسکیں۔''

''اچھا!'' میں نے ہنس کر کہا۔'' تو گویا جادو اور طلسمی جنتر منتر سب کی بنیاد ٹھوس لیکن عام آدمیوں کی سمجھ میں نہ آنے والے حقائق پر ہے!''

''ایسا سمجھ لو۔'' فرنالڈی نے کہا۔'' اچھا یہ بتاؤ کہ تم نے جادو کا علم حاصل کیا ہے؟''

''نہیں تو۔'' میں نے جواب دیا۔

''تو پھر جس چیز کے متعلق تم کچھ نہیں جانتیں اس سے انکار کیا معنی؟'' فرنالڈی نے کہا، اور اٹھ

کیلڈر کاٹیج سے جلنے کا کوئی تعلق نہیں ہے، اور اس سے قبل کہ میں کوئی دوسرا سوال کروں مسز فرگوسن نے خود بخود ہی کیلڈر کاٹیج کی تاریخ دہرانا شروع کردی۔

مالنڈا کیلڈر اپنے گھر کے متعلق سوچتے سوچتے اپنی اولاد کے غم میں مرگئی، اور اپنی موت سے پہلے ایک چچازاد بہن کو اپنی املاک کا وارث بنادیا۔ اس نے نقد اور کارآمد اسباب پر قبضہ کرنے کے بعد اس کاٹیج کو فروخت کرنا چاہا، لیکن وصیت کی ایک شق کی رو سے وہ اسے فروخت نہ کرسکی، چنانچہ اسے کرائے پر دے دیا گیا۔

سب سے پہلے مسز ولیم نامی ایک خاتون نے اسے کرائے پر لیا، وہ سات بچوں کی ماں تھی اس کا شوہر نیوی میں افسر تھا، کچھ دن بعد اس نے کاٹیج کو چھوڑ دیا۔

تو مسز مارک لینڈ نامی ایک عورت نے اسے کرائے پر لیا۔ وہ اس میں تنہا رہتی تھی، البتہ اس کے ساتھ ایک غیر ملکی عورت بھی تھی۔ یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اس نے اتنا بڑا مکان کیوں کرائے پر لیا تھا۔ اس کا حال تو وصیت کے مطابق اس مکان کے نگراں مسٹر ہنسلے کو بھی معلوم نہیں ہوسکا تھا میں بھی اس سے کبھی رابطہ قائم نہیں کرسکی، اس کے رویے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پڑوسیوں سے تعلقات استوار کرنے کی

دی۔ جس میں مکان کو چھوڑ دینے کا کوئی سبب بیان نہیں کیا گیا تھا، لوگوں کا خیال ہے کہ انہیں پولیس سے سابقہ تھا۔ لیکن یہ بات قطعی غلط معلوم ہوتی ہے۔ مسز مارک لینڈ کے بعد ایک اور خاندان اس میں مقیم ہوا جو صرف ایک ماہ قیام کرسکا، کا مسلوک، اسی خاندان کی عرفیت تھی، اس خاندان میں بہت سے بچے تھے۔"

"میں نے اس خاندان کے بالغ افراد میں سے کسی کو بھی نہیں دیکھا، اس کے بعد آپ کے آنے تک یہ مکان خالی پڑا رہا۔"

اس وقت پانچ بج چکے تھے۔ لیکن مجھے کیلڈر کاٹیج میں جانے سے وحشت ہو رہی تھی۔ تاہم مجبوراً میں نے مسز فرگوسن سے اجازت طلب کی اور فوری طور پر ذہن میں آنے والے ایک منصوبے کے تحت مسز فرگوسن دوسرے روز ڈنر میں شرکت کی دعوت دے دی جس میں فرنالڈی کو شریک کرنا چاہتی تھی۔

مسز فرگوسن کے یہاں سے میں بہ عجلت کاٹیج میں پہنچی، عین اسی وقت نارمن زینے سے اتر رہا تھا، اس کا چہرہ خوشی سے دمکا ہوا، اس نے پرجوش انداز میں میرا بوسہ لیا۔ اس کے کپڑوں سے پینٹ اور تارپین کی بو سی آرہی تھی۔

کر کتابوں کی الماری سے ایک کتاب نکال لی۔ اور کہا۔
''یہ عبرانی کتاب کالے جادو سے متعلق معلوم ہوتی ہے، میرے خیال میں یہ کتابیں اس کاٹیج کے سابق مالک یا مالکہ کی ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے کھڑے کھڑے کتاب کھولی تو اس میں سے ایک کاغذ نیچے گرا، جسے اس نے اٹھا کر پڑھا اور مجھ سے پوچھا۔
''مسز نارمن! یہ جلٹے کون ہے۔''
''فرنالڈی کا سوال سن کر جیسے یک لخت میرا خون منجمد ہوگیا، اور میں سحر زدہ کی طرح اس کا منہ تکنے لگی، اس نے پھر سوال کیا۔
''کون ہے یہ جلٹے؟''
''جلٹے؟'' میری آواز حلق میں پھنس گئی فرنالڈی نے میری یہ کیفیت دیکھ کر وہ کاغذ مجھے دے دیا، جس پر کم و بیش سو مرتبہ جلٹے مرحوم تھا۔
تحریر قطعی طور پر نارمن کی تھی۔ میں سناٹے میں آ گئی اور سوچنے لگی۔ ''کیا واقعی نارمن اس کے لئے دیوانہ ہے۔'' یا پھر وہ بھٹکتی ہے اور نارمن پر بھی اسی طرح مسلط ہے جس طرح مجھ پر رہ چکی ہے۔''
''لوری! کون ہے یہ جلٹے؟'' فرنالڈی نے ہمدردانہ انداز میں مجھے پریشان دیکھ کر کہا۔
''میرے خیال میں کیلڈر کاٹیج کی چڑیل کا نام ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔
''یہ قطعی ممکن ہے کہ ایسا ہو!'' نارمن نے کہا۔
''لیکن ابھی تو تم دلیل پر زور دے رہی تھیں اور اب چڑیلوں تک کی قائل دکھائی دے رہی ہو!''
''تم نے ابھی ابھی تو مجھے بھوتوں کا قائل کرنے کی کوشش کی تھی، غالباً یہ اسی کا اثر ہے۔''
اس واقعہ کے دوسرے دن صبح کو جب نارمن کے تصویر کشی میں مصروف ہونے کے بعد میں کمرے سے نکل کر باغ کے احاطے میں آئی تو مجھے ایک قدیم وضع کا سونے کا میڈل ملا جس پر ایک نقش اور کچھ عبارت منقش تھی، میں نے اسے اٹھالیا، معاً سامنے سے فرنالڈی نے صبح بخیر کہا، تو میں نے جواب دے کر، وہ میڈل اسے دیا۔ اس نے بڑی حیرت اور غور سے اسے دیکھ کر کہا۔
''کاش میں عبرانی جانتا ہوتا۔ لوری، دراصل یہ کوئی طلسمی چیز ہے، تم نے اسے کہاں سے پایا ہے؟''
''مجھے یہ ابھی ابھی یہاں ملا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ فرنالڈی کچھ کہنے والا تھا کہ سامنے سے جمی آ گیا اور میں نے فرنالڈی سے میڈل لے کر اسے دکھا کر پوچھا کہ ''کسی کا میڈل تو نہیں گر گیا ہے۔'' اس نے میڈل کو اس طرح ہاتھ میں لیا جیسے کوئی زندہ بچھو کو ہتھیلی پر رکھ دے اور کہنے لگا۔
''ہاں میں جانتا ہوں ہی کس کا ہے۔''
''جمی کی بات سن کر میرا دل دھڑکنے لگا اور میں نے بے خیالی سے اس سے کہا۔'' شاید یہ تمہاری دادی کا ہے۔'' دادی کا نام سن کر اس کا چہرہ سرخ ہوگیا اور اس نے نہایت غصے کے لہجے میں کہا۔
''میری دادی کا نہیں بلکہ اس کا ہے جو بہت بری تھی۔''
''جو بہت بری تھی۔ کیا مطلب؟'' فرنالڈی نے تفتیش کے لہجے میں کہا۔
''ہاں وہ چاند میں چلی گئی ہے۔'' لونا لونا، ڈائنا ہیکاٹے، میکاٹے، سلنے، سلنے، سلنے۔'' جمی نے آنکھیں بند کرلیں میں نے فرنالڈی کو اشارے سمجھایا کہ جمی سے مزید کوئی سوال نہ کرے۔ اس کے بعد جب ہم دونوں کمرے میں پہنچ گئے تو فرنالڈی نے کہا۔
''ہاں۔'' میں نے مختصر سے الفاظ میں کہا۔
''وہ تمام چاند کی دیوی کے نام ہیں۔ اس نے یقیناً کسی جادوگر سے سنے ہوں گے لیکن یہ ''بہت بری'' کم بخت کیا بلا ہے؟''
فرنالڈی نے کہا۔ ''مجھے تم نے منع کر دیا ہے۔ اب ایک خوش اخلاق مالکہ کی حیثیت سے تم خود جی سے پوچھ کر بتاؤ کہ یہ ''بہت بری'' کون ہے۔ اگر اس مقام پر کوئی جادوگرنی ہوتی تو میں اس سے اس ''بہت بری۔'' کا احوال ضرور معلوم کر لیتا۔''

''جادوگرنی۔'' کیاواقعی فرنالڈی تم......

''جادوگرنی سے میری مراد پیش بینی کرنے اور اپنی مخصوص ذہنی قوت سے اسرار کا انکشاف کرنے والی عورت سے تھی لوری!'' فرنالڈی نے کہا۔''ایسا مرد یا عورت میری ریسرچ میں مفید ثابت ہوسکتی ہے۔''

''میں نے اسے کہیں دیکھا ہے!'' مسز نیلسن نے مجھے میڈل کی صفائی کرتے ہوئے دیکھ کر کہا۔'' اسے کوئی پہنتا تھا۔ آخر اس وقت مجھے یاد کیوں نہیں آجاتا کہ وہ کون تھا۔''

''میں اس میڈل کو پسند کرنے لگی تھی۔ خدا جانے کیوں؟'' اس میں ایک دائرہ بنا ہوا تھا۔

غالباً کوئی مخفی قوت مجھے اسے پسند کرنے پر مجبور کررہی تھی۔ میں نے نارمن سے اس کا تذکرہ نہیں کیا کیونکہ ایک وقفہ عافیت کے بعد کیلڈر کالج کی تمام خبیث روحیں ہم دونوں کے خلاف سرگرم عمل ہوچکی تھیں۔ کئی مرتبہ دہشت کی لہروں نے میرے جسم پر تسلط جمایا میری سحرزدگی مجھے ناتواں بنائے جارہی تھی۔ اس تمام وقت میں نارمن کی راتیں، عجیب درد ناک اور وحشت خیز موسیقی کی دھنیں پیانو پر بجانے میں گزریں۔ میں نے اسے اتنی ہول خیز دھنیں بجاتے ہوئے اس سے قبل نہیں سنا تھا۔ ایک رات میں نے ہمت کرکے نارمن سے پوچھا۔

''نارمن جو دھنیں تم بجار ہے ہو اس کا کیا نام ہے۔''

''اس کا نام ہے جلٹے کے لئے۔'' نارمن نے کہا، اس کی آواز بہت دور کی آواز معلوم ہورہی تھی۔ جیسے وہ نیند میں بول رہا ہو۔

''نارمن، جلٹے کون ہے؟'' میں نے پوچھا اور مجھے سخت حیرانی ہوئی کہ میری آواز اتنی سخت اور بھاری کیونکر ہوگئی۔ نارمن نے پیانو بجانا چھوڑ دیا اور ہال میں سکوت چھا گیا۔

''جلٹے کون ہے؟'' میں نے سخت اور درشت لہجے میں نارمن سے سوال کیا۔

''جلٹے؟ کون جلٹے؟'' نارمن نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔'' میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ میں کسی جلٹے کو نہیں جانتا۔''

''لیکن تم نے ابھی ابھی کہا ہے کہ جو دھن میں بجا رہا ہوں وہ جلٹے کے لئے ہے۔'' میں نے خفگی کے لہجے میں کہا۔

''میں نے کیا کہا؟''

''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تم نے جو کچھ کہا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں نے تو ایک گھنٹے سے کوئی بات نہیں کہی۔'' اس نے ہنس کر کہا۔

''شاید تم نے خواب دیکھا ہے۔''

''میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا یہ تم ہو جو جلٹے کے خواب دیکھتے ہو۔'' میں...... یہ کہہ کر انتہائی غصے کے عالم میں کمرے سے باہر نکل گئی۔ ایسی صورت اس سے قبل پیش نہ آئی تھی۔ اس وقت وہ تمام مشکوک جن کا میں نے کبھی اظہار نہیں کیا تھا اور وہ تمام تکلیفیں جو میں...... خاموشی سے برداشت کررہی تھی یک بیک نقطہ عروج پر پہنچ گئی۔

''پاگل مت بنو لوری۔'' نارمن نے باہر آکر اس نے مستعجب اور سنجیدگی کے انداز میں کہا کہ میں سوچنے لگی کہ کہیں واقعی میں نے خواب ہی نہ دیکھا ہو۔

''میں پاگل ہوسکتی ہوں مگر بہری نہیں ہوں۔'' میں نے غصے سے کہا۔'' تم جلٹے کو جانتے ہو لیکن انجان بن کر مجھے پاگل بنار ہے ہو۔''

''اوہ لوری، میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ میں کسی جلٹے کو نہیں جانتا۔'' نارمن نے اسی سنجیدگی اور بے بسی کے لہجے میں کہا۔

صبح کے وقت میں خواب گاہ سے باہر نکلی، نارمن کا بستر نہ صرف خالی پڑا تھا بلکہ اس پر کوئی شکن تک نہ تھی جو اس امر کی دلیل تھی کہ نارمن نے رات کہیں اور بسر کی ہے۔ میں نے سوچا کہ شاید کل شام کی تلخی اس پر اثر انداز ہوئی ہے میں خود کو ملامت کرنے لگی اور سوچنے لگی کہ یہ عین ممکن ہے کہ جو کچھ رونما ہو رہا ہے وہ سب میرے

داخل ہوتے ہی پھر ایک طلسمی فضاء قائم ہوگئی۔ ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں اگرچہ کافی چہل پہل تھی لیکن ایک پراسرار عورت کی خوف ناک آنکھیں میرے جسم میں پیوست ہوکر میرے خون کی گردش کررہی تھیں، میں باوجود خائف ہونے کے اسے مسلسل دیکھنے پر مجبور تھی۔

نارمن نے میری کیفیات پر کوئی توجہ نہ دی۔ ڈنر سے فارغ ہوکر میں نے اپنی خواہش کے برعکس گھر واپس ہونے پر اصرار کیا اور ہم دونوں اپنے طلسم کدے میں واپس پہنچ گئے۔

پراسرار آنکھیں اب بھی مجھے اپنے جسم پر رینگتی ہوئی محسوس ہورہی تھیں۔ اپنے کمرے میں پہنچتے ہی مجھے خیال آیا کہ میں جمی کا دیا ہوا طلسمی ستارہ گھر پر چھوڑ گئی تھی۔ میں نے فوراً دراز سے نکال کر اس کو بلاؤزر میں چھپالیا۔ معاً مجھے ایک تقویت کا احساس ہوا اور میں نے فیصلہ کرلیا کہ اس طلسمی ستارے کو ہمیشہ اپنے پاس رکھوں گی۔

رات کے تقریباً دو بجے میری آنکھ کھل گئی۔ نارمن بستر پر موجود نہ تھا، یکا یک مجھے خیال آیا کہ آج میں خفیہ طور پر اس کے اسٹوڈیو میں جاکر دیکھوں گی۔ کہ وہ کیا کررہا ہے۔ ایسا خیال اگرچہ متعدد بار ذہن میں آچکا تھا لیکن میں اسے عملی جامہ نہ پہنا سکی تھی

لیکن یہ صرف اس طلسمی ستارے کا اثر تھا کہ مجھ میں غیر معمولی ہمت پیدا ہوگئی اور میں آہستہ آہستہ زینہ طے کرتی ہوئی نارمن کے اسٹوڈیو یعنی جلتے کے کمرے کے قریب پہنچ گئی۔ دروازہ نیم وا تھا۔ باہر اندھیرا اور کمرے میں روشنی تھی اس لئے سب کچھ نظر آرہا تھا چنانچہ میں نے جو کچھ دیکھا وہ ہوش گم کردینے کے لئے کافی تھا۔

ایک خوبصورت عورت کھڑی ہوئی مسکرارہی تھی، اس کی آنکھوں میں جیسے سرخ بجلیاں کوندرہی تھیں اور نارمن جیسے بےخودی کے عالم میں یک ٹک اس پیکر حسن کو دیکھ رہا تھا۔

اب کسی شک اور شبہ کی گنجائش نہ تھی جلتے مجسم طور پر مکان میں موجود تھی اور نارمن اس کی طلسمی آنکھوں کا اسیر تھا مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ کمرے میں داخل ہوکر جلتے کو اپنا تعارف کرادوں لیکن اس سے پہلے کہ میں اس خیال کو عملی جامہ پہناتی عین میرے سر پر یہ الفاظ گونجنے لگے۔

''ہوتائی جلدی......ہوتائی جلدی۔''

ابھی ان الفاظ کی گونج سکوت شب میں گم نہ ہوئی تھی کہ مجھے اپنے دونوں پیروں میں وہ لمس محسوس ہوا جس نے مجھے تھرا دیا۔ یہ بلی تھی جو فرفراتی ہوئی میرے پیروں سے لپٹ رہی تھی میرے حلق سے ایک چیخ نکلی اور زینے سے گر کر لڑھکتی ہوئی نیچے فرش پر آگری اور بے ہوش ہوگئی۔ کچھ دیر کے بعد آنکھ کھلی تو نارمن کو اپنے سرہانے کھڑا ہوا پایا۔

''لوری تمہیں چوٹ تو نہیں آئی آخر تمہیں رات کے وقت باہر نکلنے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی؟ وہ بولا۔

''یہ تمہیں جلد ہی معلوم ہوجائے گا!'' میں نے حد درجہ تلخ لہجے میں کہا اور خاموش ہوگئی۔ نارمن بھی حیران اور خاموش مجھے دیکھتا رہا لیکن اس کے چہرے پر انکشاف جرم کا انفعال موجود نہ تھا۔ بلکہ وہ صرف حیران اور مغموم نظر آرہا تھا۔

''کیا تمہاری طبیعت خراب ہے لوری؟'' اس نے بڑی دل سوزی کے انداز میں کہا۔

''طبیعت نہیں بلکہ قسمت خراب ہے۔'' میں نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا، اتنی بلندی سے گرنے کے باوجود میرے جسم کے کسی حصے میں چوٹ نہیں آئی تھی۔

''گھبراؤ نہیں لوری، آج میری شاہکار تصویر مکمل ہوجائے گی پھر ہم اس کاٹیج کو مقفل کرکے سان فرانسسکو میں جاکر رہیں گے۔'' نارمن نے اسی دل سوزی کے ساتھ کہا۔

''پھر وہ کہاں جائے گی۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''کون وہ؟'' نارمن اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ اور چند ثانیوں میں اس کی حالت بدل

وہم وتخیل کی پیداوار ہوں یکا یک میری نظر جمی پر پڑی۔ اس نے سلام کہا اور سامنے آ کر کہنے لگا۔

''مسز نارمن آپ ایک تحفہ قبول کریں گی؟''

''کیسا تحفہ جمی؟''

''یہ حاضر ہے۔'' اس نے ایک تانبے کا ستارہ جس پر مچھلی کندہ تھی مجھے دیتے ہوئے کہا۔'' اس کا ذکر کسی سے نہ کیجیے گا میں اسے اپنی دادی کی بشارت پر آپ کو دے رہا ہوں۔''

ستارہ ہاتھ میں لیتے ہی مجھے ایک عجیب تقویت کا احساس ہوا۔ اور میں نے اسے جمی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے قبول کرلیا۔

''اس کی وجہ سے آپ اس کے شر سے محفوظ رہیں گی۔ جو بہت بری ہے۔'' جمی نے مسکراتے ہوئے کہا۔'' میری دادی کو اس کے کاموں سے بڑی نفرت تھی۔''

''وہ کون تھی جمی، کیا تمہیں اس کا نام معلوم ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔'' یقیناً وہ نام جلنٹے کا ہوگا۔''

''ہاں جلنٹے ، مگر نہیں۔'' اس نے ذہن پر زور دیا۔ اس کا نام مگڈا ہے۔''

''مگر ابھی تو تم نے جلنٹے کہا تھا۔'' میں نے استفسار کیا۔

''ہاں جلنٹے تھی مگر وہ تو وہ تھی جو بہت اچھی تھی۔ مگڈا اس سے کہا کرتی تھی جلنٹے میرا کہنا مانو مگڈا جو بہت بری تھی۔ اس نے بلی بنائی تھی جو لوگوں کو تباہ اور ہلاک کرتی تھی۔''

''جلنٹے کہاں رہتی ہے۔'' میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

''یہاں، اسی مکان میں وہ اور اس کی بلی دونوں رہتے ہیں۔ میں کئی بار ان کو دیکھ چکا ہوں۔'' جمی نے سنجیدگی سے کہا۔

''لیکن ہمیں تو کوئی دکھائی نہیں دیتا جمی۔'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ ٹھیک ہے لیکن مسز نارمن......'' جمی کہتے کہتے رک گیا۔

''کیا بات ہے جمی صاف صاف بتاؤ، میں بہت دنوں سے پریشان ہوں۔''

''اب آپ زیادہ پریشان نہ ہوں گی مگر وہ بہت خوف ناک ہے۔'' جمی نے خوف زدگی کے لہجے میں کہا۔'' بہر حال کچھ بھی ہو وہ۔'' وہ بری'' اب آپ کو کوئی گزند پہنچا سکے گی۔''

''کیا تمہیں تانبے کے ستارے پر بنے ہوئے نقش پر اتنا ہی اعتماد ہے؟'' میں نے جمی سے کہا۔

''ہاں مسز نارمن۔'' جمی نے بڑے پر وثوق لہجے میں کہا۔'' میری دادی اس۔'' بہت بری۔'' کو ناپسند کرتی تھی اور میں نے اپنی دادی کی ہدایت پر اس بیش بہا چیز کو آپ کے حوالے کیا ہے میں آپ کو اس کے علاوہ کچھ نہ بتا سکوں گا۔''

جمی کے جانے کے بعد میں نے اس ستارے کو بلاؤز میں چھپالیا۔ نارمن مجھے دیکھ کر مسکراتا ہوا ہال میں چلا گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے ہال میں پہنچی یکا یک سرد ہوا کا ایک شدید جھونکا ہال میں داخل اور آبنوسی میز پر رکھی ہوئی لڑکیوں کے دو پتلے فرش پر گر کر ٹوٹ گئے۔

''یہ کیسا جھونکا تھا؟'' نارمن نے میری طرف دیکھ کر سوالیہ انداز میں کہا۔

''میں کیا بتا سکتی ہوں نارمن۔'' میں نے حیرت کے عالم میں جواب دیا۔

''بہر حال یہ ہوا کا جھونکا ہی تھا۔'' نارمن نے توجیہہ کے انداز میں کہا۔

''میں بھی تو اسے زلزلہ قرار نہیں دے رہی ہوں۔'' میں نے طنز کی اور ہم دونوں خاموشی سے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

شام کے وقت نارمن بہت اچھے موڈ میں تھا چنانچہ اس نے ہوٹل میں ڈنر کا پروگرام بنایا اور ہم دونوں اپنی کار میں بیٹھ کر لبرٹی ہوٹل پہنچ گئے۔ کیلڈر کا نیج سے نکلتے ہی میری سحر زندگی ختم ہوگئی تھی۔ لیکن ہوٹل میں

گئی۔ اس کے چہرے اور لہجے سے محبت اور دل سوزی کے اثرات یک بہ یک معدوم ہوگئے اس نے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

''تم واقعی بیمار ہو لوری۔''

نارمن کے باہر نکلتے ہی کمرے میں آواز گونجی۔

''ہوتائی...... ہو...... تائی...... آج رات کو......

ہوتائی...... ہوتائی آج رات کو!''

یہ الفاظ سنتے ہی میرے جسم میں ایک سنسنی دوڑ گئی لیکن دہشت کے بجائے دل میں مقابلے کی خواہش پیدا ہوئی اور میں نے چیخ کر کہا۔

''اچھا۔ اچھا ہوتائی کی خالہ آج رات کو تیرا میرا فیصلہ ہو جائے گا۔''

آخر دن گزر گیا اور رات ہوگئی۔ ڈنر کے بعد مجھ پر ایسی گہری نیند طاری ہوگئی گویا میں نے کوئی خواب آور دوا استعمال کرلی ہے لیکن اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ نارمن بستر پر موجود نہ تھا۔ دفعتاً مجھے اسٹوڈیو سے چیخوں کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز بلاشبہ نارمن کی تھی۔ میں گھبرا کر بستر سے اٹھی اور تیزی سے زینہ طے کرتی ہوئی نارمن کے اسٹوڈیو میں پہنچی۔ نارمن فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اسے اس طرح دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ میں نے دروازے پر کھڑے ہو کر گردوپیش کا جائزہ لیا۔ نارمن کے سامنے ایک خوبصورت عورت کی بہت بڑی تصویر رکھی تھی جو ایک سیامی بلی کو گود میں لئے بیٹھی تھی۔

اس تصویر کی آنکھوں سے نیلے رنگ کی شعاعیں نکل کر نارمن کے جسم پر پڑ رہی تھیں اور نارمن کے جسم سے سرخ رنگ کی شعاعیں نکل کر تصویر میں داخل ہو رہی تھیں۔ اس دہشت ناک منظر کو دیکھ کر میں لرز گئی لیکن دل مضبوط کر کے میں نے قریب قریب چیخ کر کہا۔

''خبردار ہوتائی، میں آ پہنچی ہوں۔''

ابھی میرے منہ سے جملہ پورا بھی نہ ہو سکا تھا کہ فریم سے ایک عورت نکل کر سامنے آ گئی اور اس نے اپنا اسکریٹ اٹھا کر کہا۔

''او مردار کہاں چلی گئی، اب وار کر؟''

بلی اس عورت کی ٹانگوں میں جا گھسی اور وہ مجھے خوف اور حیرت سے دیکھ کر چیخی۔

''ہائے میری محنت اور زندگی دونوں کا خاتمہ ہوگیا۔''

میں ستارہ لئے ہوئے آگے بڑھی، وہ بلی کو ہاتھوں میں اٹھا کر تصویر کے فریم سے چپک گئی اور یکا یک سرخ رنگ کی بھاپ میں تبدیل ہو کر غائب ہوگئی۔

میں دوڑ کر نارمن کے پاس پہنچی اس کی نبض ٹٹولی اور کان لگا کر دل کی حرکت سنی، وہ صرف بے ہوش تھا۔ اس کا رنگ زرد پڑ چکا تھا۔ جیسے کسی ویمپائر نے سارا خون پی لیا ہو۔ کھڑکیوں سے آنے والی روشنی صبح کے نور سے معمور تھی۔ میں نے چاہا کہ دوڑ کر مسز نیلسن کو مدد کے لئے بلاؤں، یکا یک زینے پر بہت سے لوگوں کے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور پھر جمی، فرنالڈی اور مسز نیلسن کے ساتھ وہ معمر عورت جسے گزشتہ شب میں نے ہوٹل میں دیکھا تھا اسٹوڈیو میں داخل ہوئی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''تم بچ گئیں مگر مسز مارک لینڈ ہمیشہ کے لئے مرگئی۔''

''مسز مارک لینڈ!'' میں نے حیرت سے کہا اور فرنالڈی سے پوچھا۔

''یہ کون صاحبہ ہیں فرنالڈی؟''

''یہ مسز کیلڈر ہیں مسز نارمن۔'' فرنالڈی سے پہلے جمی نے کہا۔ ''انہوں نے آپ کی اور مسٹر نارمن کی جان بچانے کے لئے جتنے اور اس کی بلی کا خاتمہ کردیا۔''

''مسز مارک لینڈ؟ جتنے؟ آخر کیا معاملہ ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''میں سب کچھ بتادوں گی۔ پہلے آپ لوگ نارمن کو خواب گاہ میں پہنچادیں۔'' مسز کیلڈر نے کہا اور میرا بازو پکڑ کر اسٹوڈیو سے نیچے اتری نارمن کو بھی ہوش آ گیا۔ جمی اور فرنالڈی اسے سہارا دے کر نیچے لائے اور مسہری پر لٹا دیا۔ میں نے مسز نیلسن سے کہا کہ

وہ سب کے لئے عمدہ کافی تیار کرے۔''

فرنالڈی نے مسز کیلڈر سے کہا کہ'' وہ حسب وعدہ ان طلسمی حالات کا انکشاف کرے جو کیلڈر کاٹیج میں پیش آتے رہے ہیں۔''

''بات یہ ہے جناب۔''مسز کیلڈر نے بلند آواز میں کہا۔''جلٹے یعنی مسز مارک لینڈ میرے ساتھ اس مکان میں مقیم تھی۔ آپ لوگ چونکہ سائنسی انداز نظر رکھنے والے لوگ ہیں اس لئے شاید آپ کو ان واقعات وحالات پر یقین نہ آئے تاہم میں بیان ضرور کردوں گی۔ میں جمی کی دادی کی شاگرد ہوں اور میں نے ان سے ہر قسم کے طلسمی علوم کے علاوہ کالا جادو بھی سیکھا تھا۔ جلٹے خود بھی جادو جانتی تھی لیکن وہ صرف خیالات کو مجسم اور ٹھوس جسم دینے کے طلسمی علوم کا مطالعہ کررہی تھی اور اس کا ایک عمل کے دوران اس کمرے میں انتقال ہوگیا تھا۔ جہاں نارمن نے تصویر بنائی ہے۔ ڈاکٹروں نے جلٹے کی موت کا سبب حرکت قلب بند ہوجانے کو قرار دیا لیکن یہ کیسے معلوم تھا کہ قلب کی حرکت کیوں بند ہوئی۔''

مسز کیلڈر نے جو کالے جادو کی ماہر تھیں جلٹے کی روح کو طلسم بند کردیا تھا جو ایک جسم کی تلاش میں تھی تاکہ وہ خوبصورت جسم میں غیر فانی روح کی حیثیت سے حلول کرکے زندگی کے مزے لوٹ سکے جلٹے کا دائرہ عمل صرف اسی کاٹیج تک محدود تھا۔

میں نے مسز کیلڈر کو اس امر سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی کہ وہ جلٹے کی روح کو طلسم بند نہ کرے لیکن وہ نہ مانی اور ایک بلی کی تخلیق کردی جس کا کام یہ تھا کہ وہ اس عورت کو ہلاک کردے گی جس کے جسم کو جلٹے کا طلسم بند وجود اپنے قیام اور تسلط کے لئے منتخب کرے چنانچہ جلٹے میں مسلط ہونے کی قوت بھی پیدا ہوگئی۔

جلٹے کے کام کو آسان بنانے کے لئے مسز کیلڈر نے نارمن کا انتخاب کیا تاکہ وہ اس کی تصویر بنادے اور کینوس پر اپنی تکمیل کے بعد اس کی بلی مسز نارمن کو ہلاک کردے اور وہ ان کے جسم میں حلول کرجائے۔ جلٹے کی نیت میں فتور آگیا تھا اسے اس امر کا اندازہ تھا کہ نارمن کو اپنی بیوی سے عشق ہے اس لئے اس نے پہلے نارمن کا خون پینا چاہا تاکہ بعد میں مسز نارمن کو اپنی بلی کے ذریعہ ہلاک کراکے اس کے جسم پر قابض ہوجائے اور پھر مسٹر فرنالڈی سے اپنی خون گشتہ جنسی آرزوؤں کی تکمیل کرے۔ مجھے اپنے علم کے ذریعے اس کے ارادے سے آگاہی حاصل ہوئی اور میں نے فوراً نارمن اور مسز نارمن کو بچانے کا تہیہ کرلیا۔

مجھے جلٹے سے بڑی محبت تھی پہلے میرا خیال تھا کہ ایک خاص عمل کی تکمیل سے جلٹے کی روح کو مسز کیلڈر کے طلسم سے نجات دلادوں گی لیکن حالات نے تیزی سے جو رخ اختیار کیا ان کے نتیجے میں اپنے ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکی اور آخر کار جلٹے کو جو مجھے بیٹی کی طرح عزیز تھی فنا کردینا پڑا۔''

''لیکن میں تو سمجھتی ہوں کہ یہ طلسمی ستارہ میرے کام آیا ہے۔''میں نے ستارہ اسے دکھاتے ہوئے کہا۔

''آپ کا خیال درست ہے مسز نارمن۔''مسز کیلڈر نے کہا۔''یہ ستارہ جمی کی دادی کی روحانی ہدایت کے مطابق میں نے ہی بھجوایا تھا، جلٹے جس طلسم میں گرفتار تھی وہ چاند سے تعلق رکھتا تھا جبکہ اس طلسمی ستارے کا تعلق مریخ سے ہے اسی لئے اسے مقابلے میں فتح ہوئی، میرا خیال تھا کہ اپنے طلسم کو ٹوٹتے ہوئے دیکھ کر کہیں مسز کیلڈر خود میدان میں نہ آجائے، اس لئے میں خود اس مقام پر دور دراز کا سفر طے کرکے وارد ہوگئی لیکن وہ نہ آئی اور میری محبوب جلٹے کا خاتمہ خود میرے ہاتھ سے ہوگیا۔

بہرحال اب آپ لوگ تمام طلسمی اثرات سے آزاد ہیں اور اب آئندہ کسی کا وار آپ پر کارگر نہ ہوگا۔''

ہم سب محوحیرت بنے ہوئے مسز کیلڈر کا ہوشربا بیان سن رہے تھے فرنالڈی کے چہرے پر شک وشبہ کے آثار پیدا ہوئے تو مسز کیلڈر نے کہا۔

”مسٹر فرنالڈی اگر آپ کو عملی طور پر دلچسپی ہے تو میں آپ کو کالے جادو اور اس کے اثرات کی حقیقت سے مطمئن کردوں گی لیکن فی الحال آپ میرے اس مشورے کی تائید کریں کہ مسٹر اور مسز نارمن کو جلد از جلد یہ مکان بلکہ یہ شہر چھوڑ دینا چاہئے۔“

مسز کیلڈر یہ کہہ کر روتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد نارمن جو لیٹا ہوا سب کچھ سن رہا تھا۔ ایک دم بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا اور بولا۔

”لوری تمہیں یاد ہوگا میں نے کہا تھا کہ تصویر مکمل ہوتے ہی ہم یہ جگہ چھوڑ دیں گے۔“ میں نے اس کی طرف دیکھا کہ وہ بہت کمزور لیکن پہلے سے زیادہ محبوب نظر آ رہا تھا۔

میں اور نارمن دونوں پروگرام کے مطابق سان فرانسسکو منتقل ہوگئے، جلٹے کی تصویر شہر کے سب سے بڑے حال میں نمائش کے لئے رکھی دی گئی۔ اس کی تعریف میں مصوری کے نقادوں نے نارمن کو خراج تحسین پیش کیا لیکن نارمن کے اصرار اور غالباً اپنی خواہش کے مطابق جب میں اس تصویر کو دیکھنے کے لئے ہال میں پہنچی تو میری مڈبھیڑ مسز کیلڈر سے ہوئی جو رومال سے آنسو پونچھتی ہوئی ہال سے باہر آ رہی تھی۔ میں اس کے المناک چہرے اور مغمومیت کی تاب نہ لاسکی اور اس عورت کی بے مثال تصویر دیکھے بغیر لوٹ آئی۔ جو مرنے کے بعد بھی مرنے پر رضامند نہ تھی۔

”محترم گریٹ وچ ڈاکٹر......“ میں نے اپنی پوری روداد سنادی، اب آئے دن جلٹے کی روح میرے خواب یا پھر جاگنے پر جب میں تنہا ہوتی ہوں تو میرے پاس آتی ہے اور مجھے طرح طرح کی باتوں سے پریشان کرتی ہے، آپ خود ہی اندازہ کریں کہ ایک روح جب آئے دن کسی زندہ آدمی کے پاس آ کر اپنی باتیں کرے تو زندہ شخص کس اذیت سے دوچار ہوسکتا ہے۔

”پلیز! آپ جلٹے کی روح سے میرا پیچھا چھڑا دیں میں تاحیات آپ کو دعائیں دیتی رہوں گی آپ کو خداوند کا واسطہ...... پلیز! میری مدد کریں تاکہ میں سکھ کا سانس لے سکوں۔“ اور پھر مسز نارمن خاموش ہوگئی۔

رولوکا نے مسز نارمن کو شام تک اپنے پاس روک لیا۔ رولوکا نے بڑی آؤ بھگت کی۔

شام کا اندھیرا پھیلتے ہی رولوکا نے جلٹے کی روح کو حاضر کیا، مسز نارمن بھی موجود تھی۔

رولوکا نے جلٹے کی روح سے دریافت کیا۔ ”آخر تم نے مسز نارمن کو کیوں پریشان کر رکھا ہے اور کیا یہ اچھی بات ہے کسی کو خواب یا جاگتے میں پریشان کرنا۔“

جلٹے کی روح بولی۔ ”گریٹ وچ ڈاکٹر......“ دراصل مسز نارمن مجھے بہت اچھی لگتی ہے اور میں مر کر بھی اسے چاہتی ہوں۔“ اس کے ذریعے میں اپنی آخری خواہش کی تکمیل نہ کرسکی، یہ مجسم مجھے اس قدر پسند آئی کہ میں بہت کوشش کے باوجود بھی اپنی خواہش وپسند کو دبا نہ سکی اور میں نے حتمی فیصلہ کرلیا کہ اس کا وجود ختم کر کے اس کے جسم میں داخل ہوجاؤں گی، لیکن پھر بعد میں جو مداخلت ہوئی اس کی وجہ سے میں مجبور ہوگئی اور پھر میری آخری خواہش کی تکمیل نہ ہوئی۔

وچ ڈاکٹر اور پھر اب آپ کی مداخلت سے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کی ذات کی سوچ سے بھی الگ ہوجاؤں گی، یہ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ میں کبھی بھی اس کے قریب نہیں آؤں گی۔

خیر رولوکا نے جلٹے کی روح سے مسز نارمن کا پیچھا چھڑا دیا۔

رولوکا کی بات مان کر جلٹے کی روح نے آئندہ مسز نارمن کو تنگ کرنے یا اس کے خواب میں آنے سے انکار کردیا۔

مسز نارمن خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی، مسز نارمن نے رولوکا کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور تاحیات دعائیں دینے کا وعدہ کر کے وہ واپس چلی گئی۔ سان فرانسسکو۔

(جاری ہے)

فرشتۂ اجل

مدثر بخاری - شہر سلطان

خوفناک شکل اجنبی کی آواز آئی۔ "تم مجھے پہچان نہ سکے میں زندگی بھر تمہارے ساتھ رہا، تمہاری زندگی کی حفاظت کرتا رہا، کیونکہ موت زندگی کی حفاظت کرتی ہے، مجھے اجل کا فرشتہ کہتے ہیں۔" اور عمر رسیدہ شخص لرز کر رہ گیا۔

رگ و پے میں خوف و ہراس کی لہر گردش کرتی ہوئی ایک ناقابل یقین دل گرفتہ اور حقیقی روداد

میں نے جہاں آنکھ کھولی اسے قبرستان کہتے ہیں۔ "ہے نا عجیب بات۔" لوگ گھر میں پیدا ہوتے ہیں یا کسی اسپتال کے نرم و گداز بیڈ پر..... مگر میری پیدائش تھوڑی الگ قسم کی تھی..... بہت عرصہ تک مجھے بھی اصل حقیقت کا پتہ نہ تھا، صرف اتنا معلوم تھا کہ میں قبرستان میں پیدا ہوا میرا باپ ایک گورکن تھا، ہر روز نئی قبر تیار کرتا اور بے جان جسم کو زمین کے حوالے کر دیتا۔

قبر تیار کرنا ایک آسان کام ہے یہ لوگوں کا نظریہ ہے مگر میرا باپ اپنی زندگی اسی مخصوص پیشہ میں گزار چکا ہے۔ وہ کچھ الگ تجربہ رکھتا ہے۔

"دیکھو بیٹا..... جب تم قبر کے لئے زمین کھودتے ہو تو تمہارا خیال یہ ضرور سوچنے پر مجبور ہوگا کہ یہ کسی زندہ انسان کے لئے ہرگز نہیں بلکہ ایک ایسے انسان کی قبر ہے جو اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ گزار چکا پھر جب دنیا

میں اس کا رزق ختم ہوگیا تو اللہ پاک نے اسے اپنے پاس بلالیا''یعنی موت نے اسے آدبوچا۔''

''تم سوچو ذرا...... کہ زندگی میں انسان اپنی عزت اورانا کے لئے کیسے کیسے قدم اٹھاتا ہے زندگی میں اسے کوئی مردہ ہونے کا طعنہ دے دے تو انا کا مسئلہ بنالیتا ہے۔مگر جب وہ واقعی مردہ ہوجاتا ہے تو ساری دنیا اسے مرحوم کے نام سے یاد کرتی ہے۔مگر وہ شخص کچھ بھی کرنے کا اہل نہیں ہوتا۔طاقت یعنی انرجی اس کے جسم سے نکال لی جاتی ہے جسے روح کہا جاتا ہے۔''

میرا باپ پڑھا لکھا نہیں تھا مگر اس کی باتیں بڑی گہری ہوتی تھیں جو اکثر میرے دماغ سے اوپر گزر جاتی تھیں۔

وقت گزرتا گیا اور پھر ایک دن میرا قبرستان سے تعلق ٹوٹ گیا،قبرستان میری جائے پیدائش تھی میں نے اپنے باپ کے ساتھ قبرستان سے ملحقہ ایک کچے کمرہ میں بچپن گزارا۔بابا نے ہمیشہ یہی درس دیا کہ''بیٹا وقت گزرتے دیر نہیں لگتی ہے وقت کو تیز رفتار پر لگے ہوتے ہیں یہ اڑتا ہے تو اپنے ساتھ بہت سی زندگیاں بھی اڑا کرلے جاتا ہے۔بچے جوان،جوان،ادھیڑ عمر اور ادھیڑ عمر بوڑھے ہوجاتے ہیں اور پھر ایک دن سب کچھ ختم ہوجاتا ہے۔سب مٹی میں مل جاتا ہے۔''

مجھے وہ وقت یاد ہے جب میرا بابا ایک دن ایک بہت بڑے رئیس کی قبر کھود کر لوٹا تھا......اس رات اس نے بڑی گہری باتیں کہی تھیں۔

''تجھے پتہ ہے۔آج جس شخص کی قبر کھودی ہے وہ کتنا امیر آدمی تھا۔''

''ہاں بابا...... سنا ہے۔ بہت بڑا آدمی تھا وہ......''میں نے کہا۔

''کتنا بھولا ہے تو میرا بچہ...... امیر آدمی اور بڑے آدمی میں فرق ہوتا ہے۔امیر آدمی ہماری معاشرتی زبان میں اس کو بولتے ہیں جو دولت والا ہو جس کے پاس فیکٹریاں ہوں۔زمینیں ہوں اور بہت سارو پیہ۔

مگر میں ایسا نہیں کہتا...... میرے خیال میں امیر وہ آدمی ہے جو بہت سے دوست رکھتا ہو جو لوگوں کا خیال رکھتا ہو لوگوں سے محبت کرتا ہو۔بڑا آدمی وہ ہوتا ہے۔جو دل کا سخی ہو اور اس کی سوچ بہت اونچی ہو جو ہمیشہ اچھا سوچتا ہو،جو آسمان پر چمکتے ستاروں جتنی سوچ رکھتا ہو۔لوگوں کی عزت کرتا ہو...... لے دے کر یہی سوچ انسانیت کا اصل سرمایہ ہے باقی تو ہڈیاں اور گوشت ہے ناں......

''تجھے ایک بات بتانا بھول گیا......امیر آدمی کی قبر اور غریب آدمی کی قبر ایک جیسی ہوتی ہے۔اور کفن بھی ایک جیسا ہوتا ہے۔کوئی فرق نہیں ہے ان دونوں میں۔''

یہ بات بہت خاص تھی کہ چاہے کوئی امیر ہو یا غریب مرنا سب نے ہے اور سب کی قبر بھی ایک جیسی تیار ہوتی ہے اور کفن بھی ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔مگر پھر بھی میرے دماغ میں کچھ سوال ابھرتے تھے۔

اس رات بابا نے ایک بہت غریب آدمی کی قبر کھودی اور قبر کھودنے کا ایک روپیہ بھی نہ لیا......وہ آتے ہی غسل کر کے چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''ہاں بابا......آج کتنے پیسے ملے......؟''

بابا کسی گہری سوچ میں مستغرق تھا۔

''آج ثواب کمایا ہے بیٹا......غریب لوگ تھے بالکل ہماری طرح......میں نے فی سبیل اللہ قبر کھود دی۔''

''مگر بابا......ایک فرق تو ہے۔''میں بولا۔

''جب تم نے امیر آدمی کی قبر کھودی تھی تو بہت پیسہ ملا تھا......مگر غریب آدمی سے بھلا تمہیں کیا فائدہ ہوا......؟''

''کیسی باتیں کرتا ہے......فرق بہت بڑا ہے۔دیکھو......امیر آدمی کی قبر کھودنے سے ہمیں پیسہ ملا اور ہم نے دنیاوی ضروریات پوری کیں۔ اڑ گیا سارا پیسہ......کدھر گیا......کچھ باقی نہ بچا......مگر غریب آدمی کا کام کرنے سے ہمیں آخرت کا فائدہ ملا...... یہ دنیا گزر جائے گی۔مگر اگلی دنیا کے لئے کچھ تو ہو۔جو ہمیں جہنم سے آزادی دلا سکے۔''

میرا بابا بہت سادہ آدمی تھا۔مگر اس کی باتیں

بہت گہری ہوتی تھیں۔

پھر ایک دن ایک نوجوان کی میت قبرستان میں دفن ہونے کے لئے آئی..... وہ بہت خوبصورت تھا۔ اس کے پاؤں صحت منداور موٹے تھے۔ بابا نے اس کی قبر کھودی..... اس دن بابا بہت مغموم تھا۔ میں نے بابا کو اس طرح پریشان پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

اس دن کی مصروفیات کے بعد ہم اپنے کمرہ میں آ گئے۔

''بہت برا کیا اس نوجوان نے اپنے ساتھ..... کیسا وقت آ گیا ہے؟''

''مگر بابا ہوا کیا ہے؟''

میرا بچہ..... آج جس نوجوان کی میت دفن کی ہے وہ کسی لڑکی کے پیچھے مجبور تھا عشق کرتا تھا اس لڑکی سے ،لڑکی نے شادی سے انکار کر دیا تو زہر پی لیا..... چند لمحوں میں چل بسا..... اپنی ساری دنیا وآخرت اجاڑ گیا۔'' بابا بولا۔

''کتنا نقصان کیا اس نوجوان نے..... لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں بابا؟'' میں نے تاسف بھرے لہجے میں پوچھا۔

''شیطان کا آلہ کار بن جاتے ہیں ،دو راستے ہیں ایک رحمان کا دوسرا شیطان کا..... شیطان بہکاتا ہے انسانوں کو..... خودکشی کرنے والے کی بخشش نہیں ہے، خودکشی حرام ہے۔ بہت بڑا گناہ ہے۔ اپنی زندگی کو ختم کر دینا بہت بڑا جرم ہے۔ جس کی سزا ہمیشہ بھر جہنم کی آگ میں جلنا ہے۔''

''بابا قبر میں انسان کے ساتھ کیا ہوتا ہے؟''

قبر دو قسم کی ہوتی ہے ایک جہنم کا گڑھا ،دوسری جنت کا ٹکڑا..... اگر اعمال اچھے ہیں تو برزخ کا سفر کامیاب ،اور برے ہیں تو سزا۔''

''برزخ کسے کہتے ہیں بابا؟''

''مرنے کے بعد روحوں کا جو ٹھکانہ ہے اسے عالم برزخ کہتے ہیں۔'' اور قیامت کے بعد جب اللہ رب العزت ان قبروں سے سارے مردے دوبارہ زندہ کر کے حشر کا میدان سجائے گا اور پھر خدا کی عدالت میں فیصلہ ہوگا نیکی کرنے والے جنتی اور بدی والے سزا کے طور پر جہنم میں جائیں گے اور اللہ چاہے گا تو اپنی رحمت سے مخلوق کو جنت میں داخل کر دے گا۔''

☆.....☆.....☆

اس قبرستان میں ایک قبر ایسی تھی جو میری زندگی کا محور تھی پتہ نہیں کیوں میرا دل چاہتا تھا کہ اس قبر پر ٹھہر کر دعا کروں اس مرجانے والے کے لئے جو اس قبر کے اندر موجود تھا مجھے اس قبر سے جیسے عشق تھا..... میں ہر شام اس قبر کے قریب بیٹھ کر دعا مانگتا اور اس کے ساتھ اگے خوبصورت پھولوں کو پانی دیتا۔

مجھے اس قبر سے واقعی دلی محبت تھی۔ ایک اندرونی خوشی ملتی تھی اس قبر کے قریب بیٹھ کر..... اور میرا بابا مجھے حیرت سے دیکھتا رہتا مگر بہت عرصہ چپ رہا..... ایک دن بولا۔

''تو ہر صبح شام اس قبر کے پاس بیٹھ کر کیا کرتا رہتا ہے۔''

''کچھ نہیں بابا..... بس میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس قبر والے کے لئے دعا کروں..... میرے قدم خود بخود اس قبر کی طرف اٹھ جاتے ہیں مجھے ایک اندرونی سکون ملتا ہے اس قبر پر..... دلی اطمینان اور خوشی۔''

میرا بابا حیرت سے میرا منہ تکتا رہتا اور بولا۔

''بچہ..... یہ سیدوں کا قبرستان ہے یہاں سارے سید لوگ دفن ہیں ان کی عزت کرنا ہمارا فرض ہے۔''

''مگر بابا..... میں نے سنا ہے ذات پات تو صرف پہچان کے لئے ہیں اصل درجہ تو تقویٰ سے حاصل ہوتا ہے۔''

''ارے واہ..... میرا بچہ تو بڑی باتیں کرنے لگا ہے کہاں سے سنا یہ سب.....؟''

''میں پچھلے جمعہ نماز کے لئے مسجد گیا تھا وہاں امام صاحب کہہ رہے تھے۔''

میری ماں نہیں تھی اور میرا بابا نے دوسری شادی بھی نہ کی میری ماں میری پیدائش کے دوران ہی

دنیا سے چلی گئی میں نے ماں کی محبت کو اپنے بابا کی محبت میں دیکھا...... پھر وقت بدلا۔

ایک رات میں نے بابا سے کہا۔

''مجھے اسکول جانا ہے بابا۔''

''نہیں...... تو اسکول نہیں جائے گا۔'' بابا بولا۔

''مگر کیوں......؟'' میں نے پوچھا۔

''تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے میرے بچے...... باہر کی ہوا بہت بری ہے۔ باہر کی دنیا بہت بری اور بھیڑیا صفت ہے۔ تو میرے ساتھ رہ میری آنکھوں کے سامنے۔''

''نہیں بابا...... میں پڑھنا چاہتا ہوں پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بننا چاہتا ہوں۔ آخر کب تک ہم اس چھوٹے سے کمرے میں رہیں گے...... مجھے پڑھنا ہے۔''

''تجھے کیا ہوگیا ہے میرے بچے...... تو ضرور پڑھ مگر اس کمرے کو چھوٹا مت کہہ۔ یہ میری کل کائنات ہے۔ تیرے علاوہ میرا ہے کون۔''

''بابا...... میں کہیں دور تھوڑی جارہا ہوں۔ یہ میرا گھر ہے لوٹ آؤں گا ہر شام تمہارے پاس...... اور تمہیں مایوس نہیں کروں گا اور پتہ ہے میں نے بڑا ہوکر کیا بننا ہے؟''

''کیا بننا ہے میرے بچے نے۔'' بابا نے پوچھا۔

''ایک ڈاکٹر...... جسے لوگ مسیحا بھی کہتے ہیں۔'' میں بولا۔

''مگر میرا بچہ۔''

''سب ہوجائے گا...... تم فکر مت کرو بابا۔ پھر ہم ایک اچھے سے گھر میں رہیں گے۔'' میں بولا۔

''تو کتنا سیانا ہوگیا ہے۔ مگر ایک وعدہ کر۔''

''بولو بابا......''

''تو کبھی بھی اس گھر کو نہیں بھولے گا۔''

''یہ گھر تو میری جنت ہے۔ کیسے بھول سکتا ہوں اس کو۔''

''نہیں اس گھر کو نہیں۔'' وہ بولا۔

''تو پھر کون سا گھر......؟''

''قبر...... اپنی اصل زندگی اپنی رہائش گاہ کو کبھی مت بھولنا...... اپنی سوچ بلند رکھنا مگر قبر کو مت بھولنا دنیا ایک دھوکہ ہے فریب ہے۔''

پھر میری نئی زندگی شروع ہوئی میں اسکول جانے لگا وقت گزرتا گیا اور پھر میں نے میٹرک کرلیا...... میں بہت خوش تھا اور میرا بابا اتنا ہی اداس...... کیونکہ میں ہاسٹل جارہا تھا میرا بابا بڑی مشکل سے راضی ہوا تھا کہ میں داخلہ لوں مگر جیسے تیسے کر کے میں نے شہر کے اچھے کالج میں داخلہ لے لیا۔

FSC کے دوران ایک ساتھی ملی...... وہ میری دھڑکن تھی یا امید کی کرن...... وہ ایک نیا احساس تھا اس سے پہلے ایسا کچھ محسوس نہ ہوا تھا۔ جب حنا سلیم میری زندگی میں داخل ہوئی تو زندگی واقعی زندگی لگنے لگی۔ میں ہاسٹل میں ہوتا تھا، ہم دونوں کی دوستی نجانے کب محبت میں بدل گئی کچھ پتہ نہیں، ہم دونوں کا ڈاکٹر بننے کا شوق تھا اسے کوئی اعتراض نہ تھا کہ میرا بابا گورکن ہیں۔

میں اسے ایک بار اپنے گھر لے گیا۔ میرا بابا حیران ہوگیا۔

خوب آؤ بھگت کی...... مگر جب ہم اٹھے تو بابا نے ایک حیران کن بات بتائی۔

''بیٹا...... میں نے تم سے کہا تھا کہ تم بھول جاؤ گے...... اپنے اصل گھر کو بھول جاؤ گے...... اور ابتداء ہوچکی ہے۔''

''نہیں بابا...... میں بھلا کہاں بھول سکتا ہوں...... مگر زندگی بھی تو گزارنی ہے...... میں اچھا رہوں گا تو اصل گھر بھی اچھا رہے گا اور اگر خدانخواستہ کچھ غلط کیا تو سزا تو ہوگی ناں......'' میں بولا۔

''مگر تو بھول جائے گا۔ سب کچھ...... دیکھ لینا۔''

میرے بابا...... بہت اچھے تھے مگر حنا کو کچھ عجیب لگے۔

''یار...... انسان ساری زندگی قبر کو کیسے یاد رکھتا ہے بے شک مرنا ہے مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ ڈر اور خوف میں زندگی گزار دی جائے خدا کی رحمت وسیع ہے۔ ہمیں اچھائی کی امید رکھنی چاہئے جو بھی ہوگا

اچھا ہوگا۔" وہ بولی۔

"چھوڑو...... بابا نے ساری زندگی قبریں کھودی ہیں اور ٹھیک ہی تو کہتے ہیں کہ اچھے کام کرو اور دنیا کی عیاشیوں میں مت پڑو کسی کا حق مت کھاؤ اور انسانیت کی فلاح کے لئے اپنے آپ کو وقف کردو...... یہی سب کچھ اپنے اصل گھر کو بچانے والی بات ہے ناں...... ڈر اور خوف کیسا؟"

انٹری ٹیسٹ میں ہم دونوں پاس ہوکر آگے بڑھے ڈاکٹر بننے کی خواہش پوری ہونے لگی تھی میں نے نئے شہر جانا تھا نیا دیس نئے لوگ اور نئی امنگیں۔

وقت گزرنے کا پتہ ہی نہ چلا کہ میری ڈگری مکمل ہوگئی ہاؤس جاب شروع ہوگئی تھی۔

ایک دن مجھے ایک خط ملا۔ لکھا تھا۔

پیارے بیٹے اکبر۔

خدا تمہیں خوش رکھے۔ میری حالت ٹھیک نہیں ہے میں نے اپنی قبر تیار کرلی ہے۔ وقت ملے تو ایک بار اپنا چہرہ دکھا جاؤ۔ زندگی بھر میں نے تم سے ایک بات چھپائی کے تم میرے بیٹے ہو...... تم حقیقت میں میرے بیٹے نہیں ہو، تم ایک سیدزادے ہو۔ جس قبر پر تم روزانہ فاتحہ پڑھنے بیٹھتے تھے وہ ہی اصل میں تمہاری ماں کی قبر ہے۔

ایک رات میں نے ایک قبر سے کسی بچے کی رونے کی آواز سنی میں بھاگ کر گیا اور اس روتے بچے کو قبر سے باہر نکال لیا۔

تمہاری ماں پہلے ہی فوت ہوچکی تھی میں تمہیں اپنے گھر لے آیا۔ اور ہمیشہ یہ بات تم سے چھپائی...... باہر جانے سے روکتا تھا تاکہ تم مجھ سے جدا نہ ہوجاؤ۔ نیچے تمہارے گھر کا پتہ درج ہے تمہارا باپ بہت بڑا سرمایہ دار ہے۔ ساری حقیقت بتا کر تم اسے سچ بتا سکتے ہو اور ہوسکے تو حنا سے شادی کرلینا میرے جنازے میں شرکت کرنا اور ہوسکے تو قبر میں بھی اتار دینا۔ تمہارا انتظار رہے گا۔ میرا بچہ...... اللہ تمہیں کامیاب کرے۔

تمہارے بابا۔

وہ خط میرے لئے قیامت تھا، میرا اپنا بابا اس

معلومات عامہ

☆ حضرت شیثؑ اور حضرت ہودؑ حضرت آدمؑ سے مشابہ تھے۔

☆ سورۃ الوداع قرآن پاک کی سورۃ نصر کو کہا جاتا ہے۔

☆ شاہی مسجد لاہور میں سب سے پہلے امامت اورنگ زیب عالمگیر نے کی تھی۔

☆ بابا فرید الدین شکر گنجؒ کی شادی برصغیر کے مشہور مسلمان بادشاہ غیاث الدین بلبن کی بیٹی سے ہوئی تھی۔

☆ پاکستان کی پہلی خاتون چانسلر کا نام بیگم رعنا لیاقت علی خان ہے۔

☆ عیدی امین اور شاہ فیصل دو ایسے سربراہ گزرے ہیں جو عید کے دن پیدا ہوئے۔

(شان۔ ٹنڈو آدم)

دنیا سے جا رہا تھا۔ بے شک وہ میرا سگا باپ نہیں تھا مگر سگے باپ سے بڑھ کر پیار کرتا تھا۔ اسی وقت گاؤں کے لئے نکلا۔

اگلی صبح واقعی بابا اس دنیا سے جا چکا تھا...... جنازہ اس کمرے کے وسط میں رکھا تھا۔ مگر میرا بابا خاموش تھا "میرا بچہ" سننے کے لئے میرے کان ترس گئے تھے۔ نصیحتوں والی زبان آج خاموش تھی۔

میرا سب کچھ میرا بابا ہی تو تھا جس کی تربیت نے مجھے انسان بنائے رکھا تھا...... آج وہ بھی چلا گیا۔

کہتے ہیں جب اپنے بچھڑتے ہیں تو دل پر چوٹ

سی لگتی ہے وہ میرا خون نہ تھا مگر خون سے بڑھ کر تھا...... اس کی وصیت کے مطابق میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے دفن کیا......اور اس کچے گھر کو ہمیشہ کے لئے تالا لگا آیا۔

میں نے بابا کی وفات کے بعد حنا سلیم کو شادی کا سندیسہ بھیج دیا اور یوں ہم نے کچھ عرصہ بعد شادی کر لی۔ میں ڈاکٹری کی ڈگری کے لئے لندن چلا گیا۔ دو سال بعد ہمارے گھر اذان پیدا ہوا۔ وہ بہت بڑی خوشی تھی۔

میں نے ہارٹ اسپیشلسٹ کے طور پر پریکٹس شروع کی۔ ساتھ ہی گورنمنٹ جاب بھی ہوگئی۔ زندگی ایک نئے رنگ میں رنگ گئی تھی۔

حنا نے کڈنی میں اسپیشلسٹ کیا اور یوں ہماری زندگی کی رنگینیوں میں اضافہ ہوتا گیا، رفتہ رفتہ میں دنیاوی روشنیوں میں کھونے لگا تھا۔ ہماری سوسائٹی میں اعلیٰ قسم کے امیر کبیر لوگ شامل تھے۔ پہلے پہل مجھے سب عجیب محسوس ہونے لگا مگر پھر آہستہ آہستہ مجھے ہر قسم کی محفل میں سکون ملنے لگا۔

حیا وعزت صرف نام تک محدود تھی میری بیوی چھوٹے چھوٹے کپڑے پہنتی اور مسیحا ہونے کا دعویٰ بھی کرتی مگر ایسا وہ نہ کرتی تو اسے اولڈ فیشن یا کلوز ڈ مائنڈ کہا جاتا، ہم کلب جانے لگے تھے اکثر پارٹیوں میں بیویاں بدل کے ڈانس روٹین کا حصہ تھا۔

حنا ویسے بھی اسی ماحول میں پلی بڑھی تھی اسے کچھ نیا اور عجیب نہ لگا تھا جبکہ اب میں خود اسی ماحول کا عادی ہوگیا تھا۔

☆......☆......☆

میں ڈرائیونگ سیٹ پر تھا اور میری گاڑی دھیمی رفتار آگے بڑھ رہی تھی، روڈ بالکل خالی تھا، اکا دکا ہی گاڑی کراس کر جاتی تھی یہ روڈ لنک روڈ تھا شہر سے گاؤں جانے والی واحد سڑک......اسی وجہ سے ٹریفک نہیں تھا...... پھر میں نے ایک ایسی گاڑی کو دیکھا جو جھاڑیوں میں تھی مجھے گڑبڑ کا احساس ہوا...... میں نے بریک لگائے اور گاڑی کی طرف بھاگا...... وہاں ایک انکل نما آدمی اسٹیرنگ پر سر رکھے بے ہوش پڑا تھا...... میں نے جلدی سے اسے باہر نکالا......وہ بے ہوش تھا۔ میں اسے جلدی سے اپنی گاڑی میں لے کر اسپتال روانہ ہوگیا۔

ایمرجنسی وارڈ میں اجنبی شخص کو داخل کر دیا گیا...... چند ساعتوں بعد ڈاکٹرز باہر آگئے۔

''دیکھئے...... گھبرائیے مت......وہ بالکل خیریت سے ہیں البتہ مریض کو ذہنی پریشانی ہے۔ ہلکا سا ہارٹ اٹیک تھا اب ان کی حالت خطرے سے باہر ہے۔''

''جی بالکل...... کیا میں ان سے مل سکتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

ضرور...... مگر خوش رکھیں انہیں...... آپ ان کے بیٹے ہیں؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''جی۔'' میں نے مختصر کہا۔

میں ایمرجنسی وارڈ میں انٹر ہوگیا اجنبی معصوم آدمی تھا، میں اس کے بیڈ کے نزدیک کھڑا ہوگیا۔

'''کیسے ہیں انکل......؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت اچھا ہوں بیٹا...... تم نے ہماری جان بچائی جس کے لئے ہم تمہارے شکر گزار ہیں۔''

''نہیں انکل...... یہ تو میرا فرض تھا...... آپ کسی کو اپنے بارے میں مطلع کرنا چاہیں گے؟''

''ہاں......اور تو کوئی نہیں...... میری بیوی ہے۔''

''سر......ضرور نمبر میرے فون سے ڈائل کریں۔''

انہوں نے بات کی...... چند ہی لمحوں بعد آنٹی اسپتال میں تھیں۔

صورت حال واضح ہوئی تو مجھ پر واری نیاری ہوئی جا رہی تھیں۔

''تم ہمارے گھر چلو بیٹا...... چائے پی کے جانا۔''

آنٹی نے اتنی محبت سے کہا کہ میں انکار نہ کر سکا اور ان کے گھر چلا گیا۔

''ہمارا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ تنہا رہتے ہیں اس بڑے گھر میں۔'' آنٹی بولیں۔

''تم کرتے کیا ہو بیٹا؟'' انکل بولے۔

''جی میں ڈاکٹر ہوں۔ ہارٹ اسپیشلسٹ۔''

''واہ...... زبردست...... ہم نے بھی ایک خواب دیکھا تھا کہ اگر ہمارا بیٹا ہوا تو ہم اپنے بچے کو ڈاکٹر بنائیں گے۔ مگر اولاد نہ ہوئی......!''

''میں بھی تو آپ کا بیٹا ہوں۔ غم نہ کریں اور میری بیوی بھی اور بچہ بھی...... ہم سب کسی روز اکٹھے آئیں گے آپ کے گھر۔'' میں بولا۔

''ضرور...... میری بہو اور بچے کو لے آنا...... ہم بوڑھوں کی زندگی میں رونق آجائے گی۔'' انکل بولے۔

''ویسے انکل آپ گاؤں کی طرف جارہے تھے گاؤں میں کوئی رشتہ دار رہتے ہیں۔'' میں نے پوچھا۔

وہ غم زدہ ہوگئے۔''رشتہ دار تو نہیں مگر ایک رشتہ ہے جو مدفن ہے وہاں۔ اس کی قبر پر حاضری پر جارہا تھا۔''وہ بولے۔

''اوہ...... میں نے چائے پی اور میں ان لوگوں سے مل کر خوشی محسوس کرنے لگا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی گہرا رشتہ ہو ان لوگوں سے...... عجیب اپنے پن کا احساس اور پھر میں اپنے گھر آ گیا۔

اس کا ذکر میں نے اپنی بیوی سے کیا...... اس نے خاص نوٹس نہ لیا مگر مجھ سے محبت کے ناطے اس نے وہاں ایک دن جانے کی منظوری دے دی۔

پھر ایک شام ہم سب انکل وہاج کے گھر میں تھے۔ انہوں نے خوب اہتمام کیا تھا...... باتوں باتوں میں سب گھل مل گئے، میں نے پورا گھر دیکھ ڈالا...... ایک مانوسیت سی لگی جیسے میں پہلے وہاں رہ کر گیا ہوں؟ میرا لاشعور مجھے پکار رہا تھا کہ تم اس گھر کے باسی ہو مگر کیسے؟

وہاں پورے گھر میں دو تصویریں تھیں انکل وہاج اور ان کی بیوی جو اس وقت موجود تھی۔ انکل کی ایک اور تصویر تھی جو خاصی پرانی تھی مگر ان کے ساتھ ایک اور عورت تھی وہ عورت کون تھی۔؟

تبھی گیلری میں سے ملازمہ اندر آئی بوڑھی ملازمہ کو پتہ ہوگا میں نے پوچھ لیا اس نے تفصیل بتائی۔

''وہاج سائیں کی پہلی بیوی شادی کے ایک سال بعد وفات پاگئی یہ ان کی تصویر ہے۔ ان کا نام سائرہ بی بی تھا۔ بہت اچھی اور نیک بی بی تھیں ان کا بچہ بھی ان کی قبر میں چلا گیا تھا ڈاکٹر بولتے تھے دونوں ہی فوت ہوگئے ہیں۔''

ملازمہ نے بہت بڑا انکشاف کرڈالا تھا...... میں کچھ پریشان ہوگیا تھا۔

''اور وہ بچہ میں تھا جسے بابا نے پالا......!'' میں نے دل ہی دل میں کہا۔

اگلی شام میں نے بابا کا دیا ہوا خط پڑھا۔ اس کے نیچے سید وہاج شاہ اور پھر موجودہ پتہ لکھا ہوا تھا۔ مطلب وہاج انکل میرے والد تھے۔ جسے وہ واقعی نہیں جانتے تھے میں نے سارا قصہ حنا کو بتایا اور ہم نے انکل وہاج کو ساری حقیقت بتادی۔ میں نے انہیں وہ لیٹر دکھایا جس میں بابا نے چند نشانیاں لکھی تھیں۔ اور یوں مجھے ایک بار پھر بابا کی شفقت نصیب ہوئی۔

اور اب اس واقعہ کو تیس سال گزر چکے ہیں میں بوڑھا ہو چکا ہوں مگر صحت مند ہوں۔ اذان کی شادی ہوگئی اور ہم دادا اور دادی بن گئے۔

وہاج ابو سے ملاقات کے دس سال بعد ان کی وفات ہوگئی، میں ان دنوں لندن میں تھا مگر آخری رسومات تک نہ پہنچ سکا۔ پھر ماں چلی گئی...... ایک ایک کرکے سارے رشتے بچھڑ گئے۔

میری زندگی اتنی مصروف گزری کہ کچھ پتہ نہ چلا، بالوں میں سفیدی اور تھکن سی محسوس ہونے لگی...... مگر متوازن غذا تھی سب نارمل تھا۔

میں پاکستان سے لندن جارہا تھا اہم میٹنگ تھی میرا پہنچنا ضروری تھا۔

سب کو الوداع کہہ کر میں ائیرپورٹ آ گیا۔ رات گیارہ بجے ہماری فلائٹ تھی مجھے لگا جیسے سب ٹھیک تھا...... اور تھا بھی سب کچھ ٹھیک۔

جہاز پر سیڑھی لگادی گئی تھی ریزرویشن اور سامان کی بکنگ کے بعد میں جہاز کی جانب چل رہا تھا۔

تبھی میں نے حنا کو مسیج کیا کہ آئی ایم ریڈی ٹو ٹیک آف...... پرواز نمبر 327 رن وے پر موجود تھی، ستارے آسمان پر موجود تھے میں سیڑھیاں چڑھتا جہاز میں جا بیٹھا اپنی مطلوبہ سیٹ پر بیٹھ کر مجھے اطمینان محسوس ہوا۔ پھر سیڑھی ہٹادی گئی۔ مسافر جہاز میں سوار ہو چکے تھے۔ اور سیٹ بیلٹ باندھنے کی ہدایات جاری ہونے لگیں۔

تبھی میرے ساتھ ایک بھیانک صورت آدمی آ بیٹھا۔ اس کے بیٹھتے ہی مجھے ایک زوردار جھٹکا لگا۔ مجھے نجانے کیوں اس سے خوف آنے لگا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ یہ آدمی یہاں سے اٹھ جائے۔ وہ واقعی انسان تھا؟ شاید...... مگر انسانوں سے خوف کیوں؟

جہاز رن وے پر دوڑ رہا تھا ہم سب نے سیٹ بیلٹ باندھ لئے تھے ایک ہلکے سے جھٹکے کے بعد جہاز اونچائی کی طرف بڑھا اور پھر سیدھا ہو گیا۔

''کیسے ہو دوست؟'' وہ مسکرا کے بولا۔

''بہت اچھا......!''

''ایک بات بتاؤں......!''

''جی......!''

''جہاز میں فنی خرابی ہے، شاید کریش کر جائے!''

''کیا مطلب...... کون ہو تم؟...... میں ابھی عملے سے کہتا ہوں۔''

''خاموش ہو جاؤ...... مجھے صرف تم دیکھ سکتے ہو۔ تمہاری بات کا کوئی یقین نہیں کرے گا۔ کیونکہ جہاز روانگی سے پہلے ہر ممکن، بالکل مکمل چیکنگ کے بعد روانہ ہوتا ہے۔''

''تم کون ہو......؟'' میں نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

''جواب دینا ضروری نہیں۔'' وہ بولا۔

جہاز اچانک جھٹکے کھانے لگا۔ لائٹ آف ہو گئی۔ ہر طرف شور مچ گیا۔ جھٹکے بڑھتے جارہے تھے۔ لائٹ دوبارہ آن ہو گئی۔ مگر یکایک طیارے کی ایک ونڈو ٹوٹ گئی۔ ایمر جنسی طور پر آکسیجن ماسک ہر سیٹ کے اوپر سے لٹک گئے۔ اور پھر دو لوگ اسی ونڈو سے باہر اڑ گئے۔ مجھے موت واضح نظر آنے لگی۔

میرے قریب بیٹھا خوف ناک شکل دیونما انسان غائب تھا...... میں نے آکسیجن ماسک پہن لیا...... مگر میری پچھلی جانب سے ونڈو کا شیشہ ٹوٹ گیا تھا اور لوگ موت کے منہ میں جارہے تھے۔

''تم بھول جاؤ گے بیٹا...... اپنے اصل گھر کو، مت بھولنا...... میرا بچہ...... ایک دن زندگی ختم ہو جاتی ہے اور وقت گزر جاتا ہے...... اپنی قبر...... اپنی آخرت...... کو کبھی مت بھولنا...... تم نے لوٹ کے جانا ہے۔'' میرا بابا ایک عظیم انسان تھا...... وہ لمحہ صرف اس کی یاد دلا گیا۔ موت واضح تھی۔

مجھے بچپن، جوانی اور پھر ساری زندگی یاد آنے لگی کیا کھویا، کیا پایا۔

چند روزہ رنگینیوں نے مجھے اندھا کر دیا تھا، انسان واقعی اپنے اصل گھر کو بھول کر دھوکہ اور فریب کی زندگی گزار دیتا ہے۔ کسی محفل میں موت کا نام بھی معیوب سمجھا جاتا ہے جب کہ یہ اٹل حقیقت ہے۔ جسے کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔ اس سے فرار نہیں۔

جہاز میں آگ لگ چکی ہے اور پتہ نہیں میری لاش میرے وارثوں تک پہنچتی بھی ہے کہ نہیں۔ مجھے جانا ہے۔ اپنے اصل گھر...... جہاں مجھے ہر غم سے آزاد تنہا رہنا ہے۔ اپنی آخری منزل کی طرف......!

آگ کی تپش سے میری سانسیں اکھڑنے لگیں۔

تبھی مجھے اس ہیبت ناک آدمی کی آواز آئی۔

''تم مجھے پہچان نہ سکے مگر میں زندگی بھر تمہاری زندگی کی حفاظت کرتا رہا۔ کیونکہ موت زندگی کی حفاظت کرتی ہے۔ اور مجھے اجل کا فرشتہ عزرائیل کہتے ہیں۔''

کل نفس ذائقۃ الموت۔

گرداب

عامر زمان عامر۔ ڈیرہ اسماعیل خان

عامل کی بات کو گرہ میں باندھ کر نوجوان کئی راتوں سے الٹے سیدھے منتر پڑھتا رہا وہ بھی قبرستان میں رات کے اندھیرے میں، خوفناک مناظر جب اس کے سامنے آئے تو وہ سر پر پائوں رکھ کر بھاگا اور پھر......

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے اور اس درد کی دوا کیا ہے، اس کے مصداق دل گرفتہ کہانی

اس کے اندر کئی دنوں سے اضطراب کی ہلکی محبت کی چنگاری بھڑکتے بھڑکتے ایک خطرناک شعلے کی شکل اختیار کر چکی تھی وہ رقیہ کو پانے کے لئے کسی بھی حد سے گزرنے کے لئے تیار تھا، آتش عشق میں پوری طرح جھلس جانے کے بعد وہ کسی بھی خطرے سے کھیلنے اور کسی بھی آگ میں کودنے کے لئے پرعزم تھا اس کے ذہن اور سوچ پہ گزشتہ کئی دنوں سے ایک ہی جنون ایک ہی بھوت سوار تھا۔

’’وزیر تم تھوڑا صبر سے کام نہیں لے سکتے، صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے کوئی نہ کوئی حل ڈھونڈ لیں گے ویسے بھی ابھی رشتے کی بات چل رہی ہے، تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے اس کا رشتہ طے ہوگیا، ذرا تحمل سے کام لو اور اپنی دیوانگی پہ قابو رکھو شاید کوئی صورت نکل آئے سب سے اہم بات اپنے گھر والوں کو اپنے اعتماد میں لو۔‘‘

''واہ بھئی تم حل ڈھونڈتے رہنا اور وہ چپکے سے ڈولی میں بیٹھ کے میری زندگی سے ہمیشہ کے لئے چلی جائے یہی چاہتے ہو تم، رقیہ کے گھر والے اس کے لئے رشتہ ڈھونڈ نہیں رہے بلکہ ڈھونڈ چکے ہیں اور بات پکی بھی ہو چکی ہے اور لڑکے والے بہت جلد منگنی کرنے بھی آ رہے ہیں اور تم صبر کے جھولے پہ بیٹھ کے انتظار کرنے کا کہہ رہے ہو، امی اور ابو کو مولوی صاحب نے کھلے لفظوں میں جواب دیا کہ دوبارہ ہمارے گھر آنے کی زحمت بھی مت کرنا۔''

وزیر تے اپنے دوست کی جھوٹی تسلی سن کے لاوے کی طرح پھٹ پڑا اس کی امید کی شمع بجھتی جا رہی تھی۔

''میرے دن کا سکون لٹ چکا ہے راتوں کی نیند حرام ہوگئی ہے میری زندگی میں روشنی صرف رقیہ کے دم سے ہے اس کے بغیر ہر طرف گھپ اندھیرے ہیں اگر وہ میری زندگی میں نہیں آئی تو اس کے بغیر میں جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا میری زندگی کی ادھوری عمارت میں اس کی ذات ہی ستون ہے اور ستون کے بغیر عمارت ہمیشہ نامکمل ہوتی ہے میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا میں حاصل کر کے رہوں گا کسی بھی طرح کسی بھی قیمت پر، اسے پانے کے لئے میں سب کچھ کھونے کا بھی حوصلہ رکھتا ہوں اس کے لئے جو بھی قربانی دینا پڑی لمحے بھر کی تاخیر بھی نہیں کروں گا، راستے میں آنے والی ہر چٹان سے ٹکرا جاؤں گا، میں ہر طوفان کا رخ موڑ دوں گا اس کے لئے مجھے اپنی جان کی بازی بھی لگانا پڑی تو میں پیچھے نہیں ہٹوں گا وہ میری صرف میری ہے اگر وہ میری نہیں رہی تو پھر میری یہ زندگی اور اس کی خوشی میرے کس کام کی۔''

وہ جذبات کے دھارے میں بہتا جا رہا تھا اس کی آنکھوں میں جنون اور جنون میں پختگی تھی اس نے بڑے واضح الفاظ میں اپنا نقطہ نظر اپنے دوست کے سامنے رکھتے ہوئے اسے اپنے عزائم سے باخبر کیا۔

''مگر مجنوں میاں جیسا تم کہہ رہے ہو ایسا ہو سکتا ہے اس نے حالات سے سمجھوتہ کیا ہو۔''

''اوئے کیا بات کر رہا ہے تو سورج مشرق کی بجائے مغرب سے نکل سکتا ہے زمین آسمان آپس میں مل سکتے ہیں مگر ایسا سوچنا بھی مت، میری رقیہ ایسا نہیں کر سکتی وہ میرے ساتھ کبھی دھوکہ نہیں کر سکتی یہ فیصلہ صرف اس کے بڈھے باپ کا ہے، رقیہ کی ماں بھی اپنی بیٹی کی خوشی چاہتی ہے مگر مجبوراً بڈھے کی ہاں میں ہاں ملا رہی ہے۔'' دوست کی بات پوری بات ہونے سے پہلے ہی وہ طیش میں آ کے تلملا اٹھا۔

''اگر یہ بات سچ ہوئی تو یاد رکھنا جس جنون کے لئے میں اپنی جان دینے کا حوصلہ رکھتا ہوں اس کے لئے کسی کی جان لینا بھی مشکل نہیں ہوگا، راستے میں آنے والی ہر دیوار کو پاش پاش کر دوں گا مار ڈالوں گا سب کو۔''

''بس بس جذبات کو ٹھنڈا رکھو ایک عاشق سے قاتل مت بنو، کچھ سوچتے ہیں۔''

اس نے ہنستے ہوئے نرمی سے موضوع بدل کے اس کے اندر کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

''یار کچھ بھی کرو کوئی راستہ تلاش کرو جو مجھے اس تک لے جائے میرے پاس وقت بہت کم ہے میرے دوست، میں ہر طرف سے بالکل مایوس ہو کے تمہارے پاس آیا ہوں مجھے یقین ہے تم میرے سب سے اچھے دوست ہو تم میری مدد ضرور کرو گے۔''

وزیر نے التجا بھرے لہجے میں دوست کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''ہونہہ...... اگر تم ٹھنڈے دماغ سے میری بات مانو تو تمہارا کام چٹکی میں ہو سکتا ہے سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی مگر......''

اس نے رائے جاننے کے لئے جملہ جان بوجھ کے ادھورا چھوڑ دیا۔

''مگر کیا......؟''

اس نے بے قراری سے جملہ دہرایا۔

''اس بات کو تمہیں اپنے تک ہی محدود رکھنا ہوگا اور اپنے جنون اور دیوانگی پہ قابو رکھنا ہوگا میرا تم سے

وعدہ ہے، ہم بے فکر ہو جاؤ تمہارا کام ہو جائے گا۔"

"تو ٹھیک ہے چلو ابھی لے چلو مجھے کہاں ہے اس عامل کا ڈیرہ یہاں سے کتنی دور ہے۔" وزیر نے بے صبری سے پوچھا۔

"پھر وہی بات ارے صبر نام کی کوئی چیز تم میں ہے کہ نہیں، اس عامل کا ڈیرہ ہمارے گاؤں سے زیادہ دور تو نہیں ہے مگر ایسے موسم وہ بھی رات کے وقت جانا ٹھیک نہیں ہے راستہ بہت ہی خطرناک ہے اس کا ڈیرہ جنگل میں ہے اس لئے کل دن کے وقت چلیں گے۔"

"کیوں ابھی ممکن کیوں نہیں ہے کوئی کام بھی مشکل ضرور ہوتا ہے ناممکن نہیں دیکھو میں شدید ذہنی کوفت میں ہوں تم دوست ہو کے میرا اتنا سا کام نہیں کر سکتے خدمت کرو، اب اگر مجھے راستہ دکھایا ہے تو منزل تک میرا ساتھ بھی دو پہلے ہی میں بہت پریشان ہوں اٹھو چلتے ہیں جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

اس نے دوست کو کندھوں سے پکڑ کے اٹھایا تو وہ انکار نہ کر سکا اس کے نزدیک اپنی جان سے بڑھ کر دوست کے جذبات زیادہ قیمتی تھے اس نے یقین دلایا کہ وہ اس کے ساتھ ہے۔

دسمبر کے اوائل کی یخ بستہ ٹھنڈی رات تھی گاؤں سے عامل کا ڈیرہ دو میل کی مسافت پہ تھا مگر سفر جنگلی راستے پر مشتمل تھا وہ پر کٹھن راستے پر شدید ٹھنڈے سکڑتے ہوئے خاموشی سے چل رہے تھے، پراسرار خاموشی میں پورا ماحول ڈوبا ہوا تھا، گہرے سکوت میں ہر شے منجمد تھی ویران منظر، سنسان راستے اور شدید سردی پگڈنڈی کھیتوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی گاؤں کی نکڑ سے نہر پہ جانکلتی تھی، سڑک نہر کنارے جنگل سے گزرتے ہوئے ان کے گاؤں کو دوسرے گاؤں سے ملاتی تھی گاؤں کے شمال مشرق سے نہر والی پکی سڑک کے بعد جنگل کا آغاز ہوتا تھا، نہر وہاں سے مغربی سمت مڑ جاتی تھی یہی جنگل والا راستہ عامل کے ڈیرے پر پہنچنے کا واحد ذریعہ تھا۔

کھیتوں میں کام کرنے والے کسان شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہی اپنے کام کو ختم کر کے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے، کیا پتہ کس لمحے کون سی جھاڑی یا درخت کی اوٹ سے کوئی جنگلی جانور نکل کے سامنے آ جائے۔

مگر وہ تمام خطرات سے بے نیاز ہو کے منزل کی جانب بڑھ رہے تھے تنگ ٹیڑھے میڑھے راستے اور ہر سو گہری تاریکی کی سیاہ چادر ہر سو تنی تھی وزیر دائیں ہاتھ میں چاقو تھامے ہوئے بائیں ہاتھ سے شاخوں کے پتے ہٹاتا ہوا دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا اس کے پیچھے اس کا دوست سہمے ہوئے انداز سے اس کے اٹھتے ہوئے قدموں کی تقلید کر رہا تھا۔

غراہٹ کی آواز سے ایک دم چونکتے ہوئے وزیر کے قدم رکے تو وہ بھی ٹھٹھک گیا اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

"کسی جنگلی جانور کے غرانے کی آواز ہے۔"

اعصاب پر اترے ہوئے ڈر کو چھپاتے ہوئے اس نے سرگوشی کی۔

"ہونہہ لگتا تو یہی ہے۔"

"اب کیا کریں تم سے کہا بھی تھا ایک رات میں کون سی قیامت آ جائے گی......"

"شی......"

غرغراہٹ کی آواز صاف سنائی دینے کا مطلب تھا کہ سر پر منڈلانے والا خطرہ لمحہ بہ لمحہ ان کی جانب بڑھ رہا تھا اس لئے آواز کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے تعاقب میں کان چوکنے کرتے ہوئے اس نے خاموش رہنے کی ہدایت کی۔ "وزیر تو مرے گا خود بھی اور مجھے بھی مروائے گا، میری بات مان اب بھی بھاگ جاتے ہیں یہ کوئی خون خوار درندہ ہے اور لگتا ہے ہمیں نہیں چھوڑے گا۔"

مگر وزیر نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی وہ دل میں سوچنے لگا کہ وزیر کے ساتھ ساتھ آج اس کی زندگی بھی اس کے جنون کی بھینٹ چڑھے گی ان کے سامنے غرغراہٹ کی آواز کے ساتھ بہت گہرا سایہ بھی لہرا رہا تھا اس نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔

وزیر ہمت سے آگے بڑھا اس نے مستعدی سے چاقو لہرایا اس سے پہلے کہ جنگلی جانوران پر حملہ آور ہوتا، وزیر بڑی پھرتی سے اس پر جھپٹا، وزیر کا قہقہہ بلند ہوا تو بے سکون ماحول میں ارتعاش پیدا ہوئی اسے وزیر کے پاگلانہ قہقہہ پر حیرانی ہوئی۔

''ارے تم تو بہت ڈرپوک ہو وہ کوئی جنگلی بلی تھی چاقو دیکھتے ہی بھاگ گئی ارے بزدل آنکھیں کھولو۔''

''شکر ہے یار میں تو واقعی بہت ڈر گیا تھا۔''

دوست بولا

اس نے اطمینان سے طویل سانس خارج کرتے ہوئے اسے دیکھا۔

''وہ روشنی نظر آرہی ہے ناں وہ ڈیرہ ہے۔'' ابھی وہ ڈیرے کی حدود سے پیچھے ہی تھے کہ کتوں کے بھونکنے کی گرج دار خوف ناک آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی ان کے بڑھتے ہوئے قدم ایک بار پھر رک گئے۔

''کون ہے آگے آجاؤ کتے بندھے ہوئے ہیں۔''

کتوں کی آواز کے بعد یہ گرج دار آواز عامل کے چیلے کی تھی، انہوں نے آگے بڑھ کے اپنا تعارف کروایا۔

تمہاری قسمت اچھی تھی میں نے بروقت تمہیں دیکھ لیا ورنہ اس وقت ڈیرے کے گرد ہم کتے کھلے چھوڑ دیتے ہیں۔

میں ابھی کتوں کو چھوڑنے آ ہی رہا تھا کہ میری نظر پڑ گئی ورنہ خون خوار کتے تمہیں تکا بوٹی میں بدل دیتے۔

خیر چلو آؤ میں تم لوگوں کو ڈیرے پر چھوڑ کے آتا ہوں پھر انہیں آزاد کردوں گا۔

شاہد کو ایک بار پھر اس کی حماقت پر غصہ آیا اس نے وزیر کو کھا جانے والی نظروں سے گھورا گاؤں سے دور اجاڑ ویران ماحول میں عامل کا ڈیرہ جنگل میں منگل کا سماں پیش کررہا تھا کچی مٹی پر مشتمل یہ ایک کشادہ حویلی تھی دیواریں تمام کمرے کچی مٹی اور گارے سے بنے تھے حویلی کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا بالائی حصے میں عامل کے چیلے جانوروں کے لئے بڑے سے کمرے کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا شرقی حصے میں خواتین و مرد کے لئے الگ الگ مہمان خانے تھے چار دروازے تھے حجرے کے عقب میں ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جہاں عامل اور اس کی چڑیل نما لونڈیوں کے علاوہ اور کوئی نہیں جاسکتا تھا۔

''ایسے اجاڑ میں مجھے ایسی توقع ہرگز نہ تھی۔''

یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے کی رونق بحال ہوتی نظر آئی اس سے پہلے شاہد کوئی جواب دیتا عامل کا بلاوا آگیا۔

عامل نرم گداز مسند پر بڑے آرام سے بیٹھا تھا ہاتھوں میں بڑے بڑے کھلے کڑے، لال سرخ داڑھی سر کے بال اس کی پیٹھ سے لٹکتے ہوئے زمین کو چھو رہے تھے گلے میں موٹے دانوں والی لمبی ان گنت تسبیحاں لٹک رہی تھی۔

وزیر کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں عامل شکل سے بابا کم آسیب زیادہ لگ رہا تھا اس کے دونوں طرف دو سفید بالوں والی ادھیڑ عمر عورتیں بال کھولے آنکھیں بند کئے بیٹھی تھیں۔

عامل کے سامنے زمین پر آگ جل رہی تھی ساتھ ہی مٹی کے دو بڑے پیالے پڑے ہوئے تھے آگ سے ذرا فاصلے پر اس کے سامنے کچھ مرد خواتین ادب سے سر جھکائے بیٹھے تھے عامل نے قدموں کی چاپ سنتے ہی اپنی آنکھیں کھولے بغیر انہیں ایک طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا، وہ جھٹ سے سہم کے دری پر بیٹھ گئے عامل منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا وہ منتر پڑھتے پڑھتے ایک پیالے سے سفید رنگ کا سفوف اٹھا کے جلتی ہوئی آگ پر ڈالتا تو آگ بھڑک اٹھتی اس کے لپکتے ہوئے شعلے چھت کو چھونے لگتے پھر کچھ پڑھتے پڑھتے ایک دم آگ بجھ گئی۔

عامل کے پاس بیٹھی ہوئی عورت نے خوف ناک انداز میں قہقہہ لگایا تو ایک دم عامل نے آنکھیں کھول دیں اس نے چڑیل نما عورت کو خوف ناک

نظروں سے گھورا اپنے سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کو اٹھ جانے کا اشارہ کیا پھر موٹی گردن گھما کے اس عورت کی طرف دیکھا تو وہ بھی اٹھ کے عقب میں کمرہ خاص کی طرف بڑھ گئی وزیر نے اپنا مدعا بیان کیا اور جواب کے لئے وہ اسے ٹکٹکی باندھے عامل کو تکے جارہا تھا۔

''جوان تم محبت کے آسیب میں گرفتار ہو، محبت نے تمہارے حوصلے مضبوط کردیئے ہیں...... جس جنگل اور خوف کے دریا تم رات کی سیاہی میں عبور کرکے آئے ہو لوگ دن کے اجالے میں ان راستوں پر چلنے سے گھبراتے ہیں بڑی بہادری اور ہمت کا مظاہرہ کیا ہے تم نے تمہاری جرأت کی داد دینا پڑے گی۔'' اس نے ضروری سوالات پوچھے اس کے بعد رات حویلی میں ٹھہر کے صبح سویرے واپس لوٹ جانے کی ہدایت کی اور دوبارہ دو ہفتے کے بعد منگل کے دن حاضر ہونے کو کہا، انہیں تاکید کرتے ہوئے مزید کہا کہ دوبارہ رات کے سناٹے میں آنے کی غلطی مت کرنا تمہارا کام ہوجائے گا۔''

وہ دونوں رات مہمان خانے میں ٹھہر گئے، صبح کا اجالا ہوتے ہی واپس چلے آئے، وزیر نے اس راز کا کسی سے ذکر نہ کرنے کا شاہد سے وعدہ لیا اور ساتھ ہی اس کی مدد کرنے پر کا شکریہ ادا کیا۔

رقیہ اس کے گاؤں کے امام مسجد کی اکلوتی بیٹی تھی اس نے اپنی بیٹی کو بڑے نازونعم سے پالا اسے دنیا کی ہر خوشی ہر راحت میسر کی امام صاحب انتہائی شریف النفس انسان تھے وہ گزشتہ دو دہائیوں سے اس مسجد میں امامت کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔

وزیر ان کا پڑوسی تھا اس کے والد بچپن میں فوت ہوگئے تھے، اس سے بڑا بھائی غلام قادر اس کا بھائی ہونے کے ساتھ ساتھ باپ بھی تھا، وزیر کی دو بہنوں کی شادی اسی گاؤں میں ہوچکی تھی وہ اور رقیہ تین سال سے محبت کی آنکھ مچولی کھیل رہے تھے، وہ محبت کے انجام سے بے خبر ایک ساتھ جینے مرنے کے وعدے قسمیں کھا چکے تھے۔

رقیہ ہی کے کہنے پر اس نے اپنی ماں اور بھابھی کو رشتہ کے لئے امام صاحب کے گھر بھیجا تھا مگر شاید تب تک پانی سر سے گزر چکا تھا ان کی چھت پر ملاقاتوں کے قصے اور تعلق کے چرچے پورے گاؤں میں پھیل چکے تھے۔

جوانی بڑی مستانی ہوتی ہے اس عمر کا عشق چھپائے نہیں چھپتا۔ سماج دو دلوں کے ملاپ کا ازلی دشمن ہے قدم بہ قدم راہ میں رکاوٹیں ڈالتا ہے اس راہ پر چلتے ہوئے ہر گام رسوائی اور بدنامی کے طوق گلے پڑتے ہیں، بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جنہیں دو قدم چلنے کے بعد ہی نشان منزل مل جاتا ہے تمناؤں اور خواہشوں کے سبھی خواب پورے ہوں یہ ضروری تو نہیں ہے یہ ایک ایسا سفر ہے جس کے دھندلکے میں کسی کو آنکھیں نہیں ملتی تو کسی کو دیکھنے کے لئے چہرہ میسر نہیں آتا، محبت کے راستے پرخار بھی ہیں دشوار گزار بھی، وزیر کی ماں اور بھابھی کے پہنچنے سے پہلے ہی لوگوں کی زبانی ان کی محبت کے قصے امام صاحب تک پہنچ چکے تھے۔

امام صاحب لوگوں کے طعنوں اور شرمندگی کے

میاں بیوی

میاں بیوی سڑک پر بیٹھے دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے اور سر پر خاک ڈال رہے تھے۔

میاں چلا رہا تھا۔

''لٹ گئے، لٹ گئے، لٹ گئے۔''

''بیوی سر پر دوہتھڑ مار کر کہہ رہی تھی۔

''ہائے اب چھوٹے بچوں کا کیا ہوگا'' ہم تو کہیں کے نہ رہے ہم تو برباد ہوگئے اجڑ گئے، مر گئے۔

ایک راہگیر نے ان سے پوچھا۔

بابا کیا ہوا روتے کیوں؟''

اس پر وہ آدمی آنکھیں خشک کر کے بولا۔ ''ہم نے بیٹی کی شادی پر سب کچھ لٹا دیا ہے۔ بارات جاچکی ہے اب ذرا دل کی بھڑاس نکال رہے ہیں۔''

(فاطمہ۔کراچی)

بوجھ تلے بری طرح دبے ہوئے تھے۔ انہیں اعتماد کے شیشے کی ٹوٹی ہوئی کرچیاں اندر ہی اندر گھائل کررہی تھیں وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ جو شخص مسجد میں بیٹھ کر پانچ وقت شرم وحیا، حرام حلال میں فرق کی تلقین کرتا ہے اچھے برے کاموں کے فلسفے کا درس دیتا ہے، جو ماں بہن بیٹی کے تقدس کا وعظ کرتا ہے اس کی اپنی لاڈلی صاحبزادی اسے یوں دنیا کی نظروں میں سرعام رسوا کرے گی۔

''رقیہ کی ماں مجھے بیس برس سے زیادہ عرصہ اس گاؤں میں بیت گیا ہے آج تک کسی نے میری شرافت پر انگلی نہیں اٹھائی ہے نہ ہی اپنی ماں، بہن، بیٹی کو ہمارے گھر بھیجتے ہوئے میرے کردار پر شک کیا ہے مگر آج پورے گاؤں میں میری عزت کا جنازہ نکالا جارہا ہے، جو لوگ بصد احترام راہ میں نظریں بچھاتے تھے آج وہی حقارت سے میرا تمسخر اڑاتے ہیں، آج میں مسجد سے آرہا تھا، کہ محلے کی دکان پر کھڑے دو جوان لڑکے مجھے دیکھتے ہی فقرے کسنے لگے۔

''بھئی آج کل تو ہماری گلی عاشقی معشوقی کا اکھاڑہ بن کے رہ گئی ہے۔''

''پتہ ہے ہم بھی اسی گلی میں رہتے ہیں فیقو کریانے والے کی دکان سے سیٹی بجتی ہے تو کس کے گھر کی کھڑکی کھلتی ہے ہمیں سب معلوم ہے۔''

یہ وہ الفاظ تھے جو امام صاحب کی سماعتوں پر تیر بن کے برسے وہ ہتک کا بوجھ اپنے بوڑھے کندھوں پر لادے پلک جھپکنے سے پہلے گھر میں داخل ہوگئے۔

''رقیہ کی ماں اس سے پہلے کہ میں گھر سے نکلوں اور لوگ مجھے پتھر ماریں میں نے رقیہ کو اس گھر سے رخصت کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے کان کھول کے سن لو اور اپنی لاڈلی کو بھی سمجھا دو یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔''

امام صاحب کے حتمی فیصلے کے اگلے روز وزیر کی ماں اپنی بڑی بہو کے ساتھ اس کے کرتوں سے عاجز آکے امام صاحب کے گھر آدھمکی۔

''دیکھو بہن آپ کے بیٹے کی وجہ سے پہلے ہی میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا اب اور مجھے ذلیل مت کرو اس سے پہلے کہ گاؤں والے مجھے دھکے دے کر گاؤں سے باہر نکال دیں اپنے صاحبزادے کو لگام ڈالو، میں رقیہ کا رشتہ اپنی برادری میں طے کرچکا ہوں اس لئے آج کے بعد بھول کے بھی یہ ذکر مت کرنا۔''

اس کے بعد امام صاحب نے اس کے بڑے بھائی غلام قادر کو بلا کے صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے اس کے آگے بھی ہاتھ جوڑ دیئے اس نے امام صاحب سے معافی مانگی اور وعدہ کیا کہ اس کا بھائی کبھی ان کے لئے بدنامی کا باعث نہیں بنے گا، گھر آ کے اس نے وزیر کو آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے دھمکی دی۔'' کہ اگر آئندہ اس کی طرف سے شکایت آئی تو وہ اسے زندہ زمین میں گاڑ دے گا۔''

''رقیہ تم ہماری اکلوتی اولاد ہو آج تک تمہاری چھوٹی بڑی ہر خواہش پوری کی ہے میں نہیں جانتی تمہارے دل میں کیا ہے مگر تمہارے ابو کی باتیں تم خود اپنے کانوں سے سن چکی ہو اس لئے میری عزت اب تمہارے قدموں میں پڑی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے ماں نے اپنے سر سے دوپٹہ اتار کے اپنی بیٹی کے قدموں میں ڈال دیا۔

رقیہ کے لئے وہ وقت کسی کڑے امتحان سے کم نہیں تھا، عورت ازل سے بے بس ہے معاشرتی رسم ورواج نبھانے میں قربانی ہمیشہ عورت کے حصے میں آئی ہے ایک طرف اس کی محبت سے گوندھے جذبات تھے اور دوسری طرف ممتا کے دودھ کا قرض کٹھن مرحلہ تھا فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا۔

رقیہ نے اپنے دل پر پتھر رکھتے ہوئے دوپٹہ اٹھا کے ماں کے سر پر رکھا اور اس نے اپنی ماں سے معافی مانگی اسے یقین دلایا کہ ''آپ بے فکر ہوجائیں، آپ لوگ جیسا چاہتے ہو ویسا ہی ہوگا۔''

وزیر ہر طرف سے مایوس ہوچکا تھا پریشانیوں کے گھیرے اس کے گرد تنگ ہوتے جارہے تھے اپنے بڑے بھائی کی باتوں اور لوگوں کے طعنوں سے تنگ آ کر وہ گوشہ نشین ہوگیا گھر اور دنیا داری سے کٹ کے رہ

گیا اسے ڈھونگی عامل کے پاس جاتے ڈیڑھ ماہ ہو چکا تھا وہ اسے بھاری نذرانے بھی پیش کر چکا تھا مگر نتیجہ صفر۔

اس کا جگری یار جو اسے عامل کے پاس لایا تھا وہ بھی ساتھ چھوڑ گیا اس دوران رقیہ کی رخصتی بھی ہوگئی مگر جھوٹے عامل نے اپنی چکنی چپڑی باتوں کے گرداب میں الجھائے رکھا، ہر بار وہ یہ کہتے ہوئے اس کے اندر نفرت کی آگ کو ہوا دیتا تھا کہ ''مراد پانے کے لئے انتظار کی کوفت سے تو گزرنا پڑے گا۔''

رقیہ کی شادی کے بعد عامل نے اسے مزید گمراہ کرتے ہوئے نئی ڈگر پر ڈال دیا کہ ''تم انتقام کے شعلوں کو کبھی ٹھنڈا مت پڑنے دینا میری باتوں پر عمل کرو گے تو دیکھنا وہ لوگ تباہ و برباد ہو جائیں گے اور رقیہ سب کچھ چھوڑ کے تمہارے پاس آ جائے گی تم عمل کر کے موکلات کو اپنے قبضے میں کامیاب ہو گئے تو دیکھنا جیت تمہاری ہوگی۔''

وہ عامل کے بتائے ہوئے راستے پر آنکھیں بند کئے چلتا رہا وہ کبھی رات کے اندھیرے میں جنگل میں تعویز لٹکانے جاتا کبھی رات کے سناٹے میں کالے بکرے کا سر قبرستان میں پھینکنے جاتا، اپنے مقصد کے حصول کے لئے کبھی وہ قیمتی صندل اور زعفران عامل کو پیش کرتا تو کبھی امام صاحب کے گھر کے آگے خون کے چھینٹے مارتا۔

وزیر کو زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا عامل نے اسے کہاں غائب کر دیا یا وہ کسی جنگلی جانور کی خوراک بن گیا، وہ مر گیا یا زندہ تھا تمام لوگ اس کی پراسراری روپوشی سے لاعلم تھے مگر وہ گزشتہ کئی راتوں سے عامل کے بتائے ہوئے الٹے سیدھے منتر اور وظائف کی مدد سے قبرستان میں ہوائی مخلوق سے براہ راست مکالمے کی خواہش میں قبرستانوں میں بھٹکتا رہتا، بہت دفعہ خوف ناک مناظر سے ڈر کے وہ بھاگنے کی کوشش کرتا مگر اس کی آنکھوں پر بندھی انتقام کی پٹی اور عامل کی ہدایت اس کے لئے ڈھال بن جاتی۔

وہ رات بھر قبرستان کے مخصوص حصے میں بیٹھ کے چلہ کرتا صبح ہونے سے پہلے اپنے ٹھکانے کی طرف لوٹ جاتا خونخوار چڑیلوں جنوں کو اپنی آنکھ سے دیکھنے کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ عامل ٹھیک کہتا ہے اب منزل قریب آ گئی ہے پھر جیت بس اس کی ہوگی کئی راتوں کے مسلسل عمل سے اسے جنات کو اپنے قبضے میں کر لینا بہت آسان نظر آ رہا تھا۔

وہ اس کے عمل کی آخری سردیوں کی یخ بستہ ٹھٹھرتی لرزتی کالی رات تھی دہشت و تنہائی کا ہر سو راج تھا ماحول پر کہر اس طرح اٹھ رہا تھا جیسے کسی دل جلے کے دل سے دھواں اٹھ رہا ہو درختوں نے اپنے لبادے سیاہ کر لئے تھے شاخیں دھند سے لپٹ کے ٹنڈ منڈ ہوگئی تھیں ہری بھری گھاس اور فصلوں کا رنگ فق ہو چکا تھا پتے شدت ٹھنڈ سے سوکھ کے ملگجی ہو کے زمین پر گرجاتے دیکھتے دیکھتے ہر درخت کے تنے میں خشک گرے ہوئے پتوں کا ڈھیر لگ جاتا اس رات ہوا کے قدم بھی لڑکھڑا گئے جیسے درختوں نے اپنی برداشت سے کہیں زیادہ بوجھ اٹھا رکھا تھا ہوا ایک دم برفیلے کوڑے برساتی تو درخت لرز جاتے۔

وہ کہر آلود ماحول میں قبرستان کے راستے پر تھرتھراتے قدموں سے چل رہا تھا برف سے لبریز ہوا کا جھونکا چھو کے گزرتا تو وہ اپنی میلی چادر سے ہاتھ باہر نکال کے پرانی جرسی کے ڈھیلے کالر کھینچ کر اپنے کانوں سے گردن تک لے جانے کی ناکام کوشش کرتا مگر ہاتھ باہر نکالتے ہی ایک دم انگلیوں میں خون جمنے لگتا اس کے لئے فیصلہ کرنا قدرے مشکل ہو جاتا کہ وہ پہلے اپنے ہاتھ ٹھنڈ کی شدت سے بچائے یا اپنے برف ہوتے کان۔

وہ قبرستان کی حدود میں دھڑکتے دل کے ساتھ داخل ہوا چہار سو درختوں کے بلند و بالا دھندلے عکس دل ہلا رہے تھے پورا قبرستان دھند کی سفید چادر اوڑھے گہرے سناٹے میں ڈوب چکا تھا مختلف قبریں پھلانگتا ہوا وہ اپنی مطلوبہ جگہ پہنچ گیا۔

پراسرار ماحول پر ایک نظر طائرانہ ڈال کے زمین پر کپڑا بچھایا اور دائرے کی شکل میں لکیر کھینچنے کے بعد اگربتی جلا کے آلتی پالتی مار کے زمین پر بیٹھ گیا۔

آج اس کے عمل کٹھن امتحان کی آخری رات

تھی یہی وہ جھوٹی تسلی تھی جو اس کے جمے ہوئے خون میں حدت پیدا کر کے اس کے ٹھنڈے جسم اور حوصلے کو گرما رہی تھی۔

آج مراد برآنے کی رات تھی آج اسے ہر عمل پوری یکسوئی سے پڑھنا تھا، عمل اس نے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق پہلا دور ختم ہونے کے بعد اس نے بوتل سے پانی نکالا دائرے کے باہر چھڑکاؤ کیا آنکھیں کھول کے دیکھا تو غیر انسانی مخلوق کا ایک گروہ خوف ناک ہنسی کے ساتھ دائرے کی طرف بڑھتے بڑھتے کچھ دیر بعد عقبی حصے میں گم ہوگیا وہ پورے حوصلے سے پڑھنے میں مصروف رہا دوسرا دور ختم ہوا، پھر تیسرے دور کی ابتداء میں ہی زوردار دھماکے سے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

سامنے والی قبر پھٹ چکی تھی اس سے بدنما خوف ناک شکل کی ایک لڑکی اپنے خون خوار لمبے دانت نکالے دائرے کی طرف بڑھ رہی تھی، خوف سے اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے وہ اپنی آنکھیں بند کر کے اس کی حرکات وسکنات اور خوف ناک آواز کو نظر انداز کیے تیزی سے عمل پڑھنے میں مگن ہوگیا۔

عمل پورا ہونے کے بعد پانی چھڑکنے کے لئے اس نے جونہی دوبارہ آنکھیں کھولیں اس کے خون آلود نوکیلے دانت اسے کھانے کے لئے اس کی طرف پھر بڑھنے لگے اس نے جلدی سے دائرے کے اندر سے پانی پھینکا پانی پڑتے ہی اس کا بھدا جسم پھٹنے لگا اس کے ٹکڑے ہوا میں تیرنے لگے۔

رات زینہ درزینہ سہمے ہوئے انداز میں خوف کے صحرا میں اترتی جارہی تھی ایک لمحے کے لئے وہ خوف سے کنارہ کرنے کے لئے ڈر سے اپنی آنکھیں موند کے اگلے عمل کی طرف متوجہ ہوگیا لرزادینے والی تیز ہواؤں کا شور تھمنے لگا پراسرار خاموشی کے ساتھ ہی ماحول میں ٹھہراؤ آ گیا اس کے بعد مزید تین دور باقی تھے اس نے حیرانی میں ڈوب کے دیکھا دراز قد وقامت کی خوبصورت لڑکی کا غول زرق برق لباس زیب تن کیے ہواؤں میں اڑتے ہوئے قبرستان کے نشیبی حصے میں اتر رہا تھا، ان کے گلے میں سفید چمکتے ہوئے موتیوں کے ہار اور ہاتھوں میں سفید رنگ کے تازہ پھولوں کے گلدستے تھے انہوں نے چند قدم کے فاصلے سے وزیر کو بڑی رسانیت سے مخاطب کیا۔

''اٹھو وزیر تمہاری آرزو تمہارے من کی مراد پوری ہوگئی ہے آؤ اٹھو ہمارے ساتھ چلو ہم تمہیں لینے آئے ہیں۔''

وہ خوش ہو کے اپنی جگہ چھوڑنے ہی والا تھا کہ اس کے کانوں میں عامل کے الفاظ گونجے۔ ''کچھ بھی ہو سات دور مکمل ہونے سے پہلے بھول کے بھی اپنی جگہ چھوڑ کے دائرے سے باہر مت نکلنا۔'' وہ انہیں نظر انداز کیے ہنوز اپنی جگہ براجمان رہا نیلے رنگ کی روشنی میں وہ اس کی آنکھوں کے سامنے غائب ہوگئیں۔

چھٹے دور کا آغاز ہوا اس کے بعد ایک دور باقی تھا ابھی آدھے حصے تک پہنچا تھا گہرے سبز رنگ کی روشنی نے زمین سے آسمان تک ہرے رنگ کی چادر تان دی دھند کا نام ونشان تک مٹ گیا موسلا دھار بارش شروع ہوگئی مگر حیرت انگیز طور پر بارش کی ایک بھی بوند دائرے کے اندر نہیں ٹپکی اس کے ساتھ ہی بہت ساری خوبصورت لڑکیاں پھر گلابی رنگ کے ریشمی ملبوسات میں دائرے کے گرد منڈلانے لگیں اس نے دائرے کے اندر زمین سے مٹھی بھر مٹی اٹھا کے دائرے سے باہر پھینکی ایک دم سب کے جسموں سے گلابی رنگ کے لباس غائب ہوگئے خوف ناک حد تک ان کے جسم پھیلنے لگے شکلیں بگڑنے لگیں ان کے خدوخال بڑھتے بڑھتے آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگے کچھ دیر بعد دردناک چیخوں کے شور میں وہ بھی اوجھل ہوگئیں۔

بارش اور دھند چھٹ چکی تھی دور بالکل آخری مراحل میں تھا زوردار آندھی چلنے لگی نصف گھنٹے میں تیز ہواؤں نے خوف اور سناٹے میں دوگنا اضافہ کردیا، ہوا کا زور کم ہوا تو ایک دم تمام قبریں پھٹ گئیں بے شمار مردے ایک ساتھ دائرے کی شکل میں اس کی طرف بڑھنے لگے ان کے گلے سڑے جسموں سے اٹھنے والی بدبو سے اس کی سانسیں بند

ہونے لگیں وہ خوف سے لرز اٹھا آنکھیں بند کرنے کے باوجود بھی اس کے خوف میں کچھ کمی نہیں آئی تھی۔

لمحے خوف و دہشت سے اٹے ہوئے تھے اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا ڈر سے کلیجہ منہ کو آنے لگا ان کے چہرے اور شکلیں اس کے تصور سے کہیں زیادہ خوف ناک اور ڈراؤنی تھیں اس کے قریب آنے کے بعد وہ مردے عجیب و غریب مخلوق میں بدل گئے اس کی آنکھوں کے گرد اندھیرا چھانے لگا اس کے اوسان خطا ہونے لگے۔

بڑی مشکل سے اپنے اعصاب پہ قابو پاتے ہوئے تیزی سے زیر لب تمام جنتر منتر دہرانے لگا گھپ اندھیرے میں آنکھوں کو چندھیا دینے والے ایک روشنی کا گولا پھٹا جس سے اس کی روح تک کانپ اٹھی۔

اندھیرا چھٹتے ہی قبرستان میں کوئی جھاڑی نہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ ایک صاف چٹیل میدان میں تھا اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی وہ قبرستان سے ایک دم خشکی کے خطے میں کیسے اتر گیا قریب سے اس نے اپنے اردگرد نظر دوڑائی اس کے ہاتھ سے کھینچی ہوئی زمین پر لکیر اور دائرے کے اندر مٹی، پانی کی بوتل اب بھی موجود تھی اس کے رگوں میں خوف کی جگہ ڈر گردش کرنے لگا بے شمار خون خوار خوف ناک بلائیں اسے کچا چبانے کے لئے اس کے سامنے کھڑی تھیں اس کے ہونٹ سل چکے تھے وہ پڑھنا بھول گیا تھا اس کے سانس سینے میں اٹک کے رہ گئے عجیب و غریب شکلیں کسی کے چہرے سے آنکھیں غائب تو کسی کا دھڑ ہے تو سر موجود نہیں ہے ان کے دانتوں اور ہاتھوں کے نوکیلے ناخنوں سے تازہ لہو رس رہا تھا لمبے ہاتھ اس کی طرف بڑھے ان کے دہشت زدہ دانت دیکھ کے وزیر کے طوطے اڑ گئے اس کے حوصلے ٹوٹ گئے اسے اپنی جان کے لالے پڑ گئے وہ سب کچھ بھول گیا۔

موت کو اپنے قریب آتے دیکھ کے بوکھلاہٹ سے اس نے دائرے سے باہر نکل کے اپنی جان بچانے کے لئے دوڑ لگا دی، اس کے ہاتھ پاؤں خوف سے پھول گئے بھاری قدم اٹھانا اس کے بس میں نہ تھا تھوڑی دور بھاگنے کے بعد وہ بے ہوش ہو کے گر پڑا۔

اگلی صبح وہ قبرستان کے ایک کونے میں شدید زخمی حالت میں پڑا تھا، گردن چہرے اور پیٹ پر نوکیلے دانتوں، ناخنوں اور زخموں کے نشان واضح نظر آرہے تھے وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا اسے فوراً اسپتال پہنچایا گیا۔

اس کی ماں، غلام قادر سب اس کی زندگی کے لئے دعا مانگ رہے تھے کچھ دیر بعد وہ خطرے سے باہر تھا اس کی زندگی کی شمع گل ہوتے ہوتے رہ گئی سردی سے اس کا جسم سکڑ گیا تھا مگر ابھی وہ خوف سے سہا ہوا تھا۔ خون زیادہ بہہ جانے کے باعث وہ پورا دن بے ہوشی کی حالت میں پڑا رہا، ہوش میں آنے کے بعد اس پر مسلسل غشی اور پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔

اس کی جان تو بچ گئی مگر وہ ہوش میں آتے ہی پاگل پن کی حرکتوں پر اتر آتا کئی ماہ مختلف اسپتالوں میں زیر علاج رہنے کے باوجود اس کا ذہنی توازن جوں کا توں رہا، جو بھی اس کے قریب آتا وہ کاٹنے کو دوڑتا، منہ میں جو عناب شناب آتا رشتے کی تمیز کئے بغیر بک دیتا۔

مجبوراً وزیر کے گھر والوں نے اسے زنجیروں میں جکڑ کے گھر میں باندھ دیا، ڈاکٹروں سے مایوس ہونے کے بعد اس کے روحانی علاج کے لئے انہوں نے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کردیئے اس کا جسم بالکل لاغر ہو چکا تھا اس کی ماں اس کی حالت سے سب سے زیادہ پریشان تھی مگر وہ موت کے گرداب سے سلامت نکلا تو نئے گرداب میں پھنس گیا۔

ماں کی ممتا سوچ سوچ کے ہلکان ہو رہی تھی اسے کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا، امید کی کوئی کرن کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی وہ اپنے بیٹے کی پاگل ہنسی میں اس کی آنکھوں کے کرب اور دل کے درد کو سمجھ سکتی تھی اسے کسی بھی قیمت پر اپنے بیٹے کی خوشی چاہئے تھی۔

اس کے لئے انہوں نے گلی گلی نگر نگر کی خاک چھانی مگر وزیر کو کچھ افاقہ نہ ہوا، نہ اس کی ذہنی حالت میں کچھ تغیر پذیر ہوا، اس کی ماں راتوں کو اٹھ اٹھ کے اسے دیکھتی اس کی حالت پر کڑھتی جاگ جاگ کے اس کے

لئے دعائیں مانگتی ،انہوں نے پورے علاقے کے روحانی مراکز اور درباروں پر جاکے اس کے لئے شفا کی کی دعائیں مانگیں، خیر خیرات کی مگر نتیجہ صفر۔

وزیر کو ذہنی توازن کھوئے سال گزر چکا تھا وہ بالکل مایوس ہوچکے تھے ہر کوشش ان کی ناکام ہو چکی تھی۔

علی الصبح وزیر پر شدید جان لیوا پاگل پن کا دورہ پڑا تھا، وہ تکلیف میں تھا سب گھر والے اس کے قریب جانے سے ڈر رہے تھے مگر ماں نے قادر کو دوسرے گاؤں کے دربار کے ایک بزرگ کو جلدی سے لانے کے لئے کہا کیونکہ جب بھی اس پر ایسی کیفیت طاری ہوتی اس بزرگ کے دم سے ہی آرام آتا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد قادر بھی مایوس لوٹا وہ بزرگ نہیں ملا تو ان کی پریشانی دوگنی ہوگئی ایسے لگ رہا تھا یہ دورہ اس کی زندگی کا چراغ گل کردے گا انہیں کچھ نہیں سوجھ رہا تھا سب پریشانی کے عالم میں اس سے دور سہمے کھڑے تھے ان کے گھر آدھے سے زیادہ گاؤں ہجوم بن کے جمع تھا۔

گلی سے گزرتے ہوئے ایک بزرگ نے بھیڑ دیکھ کے پوچھا۔ ''کیا ہوا ہے اس گھر میں اس قدر اتنی بھیڑ کیسی ہے؟''

وزیر کی حالت کا جان کر وہ بھی اندر چلا گیا اس نے وزیر کی ماں کو بتایا کہ ''یہ جنات کی کسر لگتی ہے تم لوگ اسے فوراً حاجی شیر لے جاؤ وہاں سینکڑوں دماغی امراض کے مریض بزرگ کے کرشماتی معجزے سے شفا پاکے تندرست ہوچکے ہیں خدا نے چاہا تو تمہارا بیٹا بالکل تندرست ہو جائے گا۔''

ان کے گاؤں سے حاجی شیر چار گھنٹے کی مسافت پر تھا، بڑی مشکل سے انہوں نے گدھا گاڑی پر اسے زنجیروں میں جکڑا اور شام ہونے سے پہلے وہ دیوان صاحب پہنچ چکے تھے، دیوان صاحب المعروف حاجی شیر کے آستانے کا یہ فیضان عام تھا جو بھی دماغی امراض میں مبتلا پاگل آستانہ پر دیوان صاحب کے خاص فیض سے جھولی بھر کے لوٹتا۔

وزیر کو لنگر خانے کے ساتھ کھلے صحن میں زنجیروں میں باندھ دیا گیا اکیس دن اور اکیس راتیں وہ لنگر خانے سے لنگر کھاتا پیتا رہا اس کے بعد مزید نو دن کے بعد اس کی زنجیریں کھول دی گئیں، زنجیر کے ساتھ ایک تالا اس کے ایک پاؤں کے ساتھ باندھ دیا گیا، مزید نو دن رات دربار پر اسے کھلا چھوڑ دیا گیا جہاں وہ نو دن دیگر خادمین کے ساتھ لنگر تقسیم کرتا رہا اس کے بعد معجزاتی طور پر خدا نے اسے شفا سے فیض یاب کیا۔

آج وزیر کو لنگر خانے میں لنگر تقسیم کرتے ہوئے نویں رات تھی، خانقاہ حضرت دیوان پر اس کی آخری رات تھی، وزیر کی ماں اور بڑی بہن نم آنکھوں سے خدا کے حضور سجدہ ریز تھیں ماں کی ممتا سے بھری دعائیں رنگ لے آئیں آج ان کو من کی مراد مل گئی۔

وزیر کی زندگی کی کشتی عرصہ دراز سے جس گرداب میں پھنسی ہوئی تھی آج ماں کی دعاؤں حضرت دیوانؒ کے فیض کے طفیل وہ کنارے پر لنگر انداز ہو چکی تھی، وہ بڑے مہمان خانے میں ٹھہرے ہوئے تھے، ماں کو وزیر کی صورت میں دنیا کی سب سے بڑی خوشی مل چکی تھی وہ بڑی بے قراری سے صبح ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔

سورج کی پہلی کرن مہمان خانے کے روشن دانوں میں اس کے لئے نئی زندگی کی نوید لے کر اتر رہی تھی، وزیر کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا، گزشتہ رات اس کی ماں سکون سے گہری نیند سوئی تھی، صبح کا سورج ان کے لئے دائمی خوشیوں کا پیغام لایا تھا گزشتہ رات کے اندھیرے میں وحشت و مایوسی کے تمام لمحے روشن صبح میں ڈھل گئے وزیر چمکتی ہوئی آنکھوں سے ماں کو جگا رہا تھا، خوشی اس کے تن بدن سے پھوٹ رہی تھی۔

''ماں...... ماں...... اٹھو دیکھ! سورج سر پر چڑھ آیا، قادر بھائی ہمیں لینے آتے ہوں گے ...... اٹھو ماں......''

مگر......

انوکھی وصیت

عامر ملک۔ راولپنڈی

رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں سڑک کے درمیان ایک شخص اچانک آگیا اور پھر وہ کار سے بری طرح کچلا گیا، مگر یہ کیا وہ زخمی شخص کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا، اور اس پر نظر پڑتے ہی گاڑی میں موجود نوجوان کا دل ڈوبنے لگا

کہتے ہیں کالا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے اور یہ ہے بھی حقیقت، ثبوت کہانی میں موجود ہے

خدا جانے اس منحوس سلسلے کی ابتداء کب ہوئی اور کیسے ہوئی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس نے میری زندگی کے دھاروں کا رخ تبدیل کردیا ہے۔ لوگ مجھے پاگل ڈاکٹر کہتے ہیں۔ میرا کاروبار قطعی طور پر تباہ ہو کر رہ گیا ہے میری اس تباہی میں میرے ایک گہرے دوست منیر کا ہاتھ ہے۔

ایک دن میں ایک گاؤں میں ایک مریض کو دیکھنے گیا ہوا تھا اور جب واپس شہر آنے لگا تو منیر کے بوڑھے چچا کا پیغام ملا کہ وہ مجھ سے کسی اہم مسئلے پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں ان کی خواہش پر مجھے بے حد تعجب ہوا۔ کیونکہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے بالکل اجنبی تھے۔ کئی سال قبل طالب علمی کے زمانے میں منیر کے ہمراہ میری ان سے سرسری ملاقات ہوئی تھی۔ نیز منیر کے اپنے چچا کے متعلق فراہم کردہ معلومات کے مطابق

ان کے چچا تمام عزیزوں میں انتہائی سڑیل مزاج اور بددماغ مشہور تھے۔ ساری زندگی خاندان کے ہر فرد سے تعلقات کشیدہ رہے۔ آوارہ مزاجی کا یہ عالم کو قریب قریب دنیا کا ہر ملک دیکھا اور بڑھاپے میں اس چھوٹے سے غیر معروف گاؤں میں سکونت اختیار کرلی زندگی بھر نہ کوئی کام کیا اور نہ ہی روئی کمانے کی فکر دامن گیر رہی۔ ان کی آمدنی کا ذریعہ کیا تھا۔ کسی کو معلوم نہ تھا ان تمام کمزوریوں کے باوجود اپنے بھائی کی موت کے بعد انہوں نے منیر کے تعلیمی اخراجات کا بوجھ اٹھا کر اس کے غیر یقینی مستقبل کو تباہ ہونے سے بچالیا۔

ان حالات میں اس کے چچا کا مجھ سے ملنا اور کسی اہم مسئلے پر گفتگو کرنے کی خواہش کا اظہار یقیناً تعجب خیز تھا، میں یہ کہنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا کہ منیر کے چچا کے بارے میں، میری رائے اچھی نہیں تھی۔ بہرحال میں اپنے دل میں نفرت کو چھپائے ان سے ملنے گیا۔ وہ بڑی بے تابی سے میرا انتظار کررہے تھے وہ بڑی خوش اخلاقی سے پیش آئے چائے سے تواضع کی اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد کہنے لگے۔

''مسٹر شاہد! میں گزشتہ کئی دنوں سے تم سے ملاقات کے لئے سوچ رہا تھا۔ اچھا ہوا تمہیں گاؤں آنا پڑا۔ ورنہ مجھے تمہارے پاس شہر جانا پڑتا۔''

''فرمایئے۔'' میں نے مودب ہوکر کہا۔

''بات یہ ہے کہ......'' وہ تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہوگئے۔ ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے وہ اپنا مدعا بیان کرنے کے لئے الفاظ تلاش کررہے ہیں۔ انہوں نے میز پر رکھے ہوئے سگریٹ کے پیکٹ سے سگریٹ نکالا اور طویل کش لگانے کے بعد اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگے۔

''میری زندگی کی گنی چنی گھڑیاں رہ گئی ہیں۔ وقت بہت کم ہے...... کل شام تک۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' یہ سن کر میں پریشان ہوگیا۔

''صحیح بات تمہیں بتا رہا ہوں۔'' انہوں نے مسکرا کر کہا۔ ''میں نے وصیت لکھ دی ہے اور آج ہی تمہارے اور منیر کے کلاس فیلو وکیل جمیل کو بھجوا رہا ہوں، میری وصیت کے مطابق تم میری موت کے بعد اس مکان کو آگ لگا کر ہمیشہ کے لئے ختم کردینا میری لاش کو بھی دفن نہ کرنا اسی مکان میں پڑی ہے اور مکان کی تمام چیزوں کے ساتھ جلادینا، یہ خیال رکھنا کہ مکان میں موجود کوئی چیز بھی کوئی شخص نہ لے کر جائے۔

''مگر......''

''دیکھو شاہد......'' چچا نے میری بات کاٹی۔ ''میں تمہاری کوئی بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ کیونکہ میں سچ کہہ رہا ہوں...... میں نے تو پاگل ہوں اور نہ بڑھاپے سے میرا دماغ سٹھیا گیا ہے میں نے بڑی سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے۔''

''اگر آپ......''

''ہاں...... تم ٹھیک کہتے ہو۔'' انہوں نے میری بات دوبارہ کاٹی۔ ''میں منیر سے یہ بات نہیں کہہ سکتا وہ مجھے اپنی زندگی سے زیادہ عزیز ہے۔ وہ میرے خاندان کی آخری نشانی ہے میں، نہیں چاہتا کہ اسے میری وجہ سے کوئی تکلیف پہنچے، میں نے زندگی بھر بڑے دکھ اٹھائے ہیں ایک پل بھی راحت، نہیں مل سکی مجھ سے زندگی میں بس ایک غلطی ہوئی ہے۔ اور اب میں دوسری غلطی کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا، پہلی غلطی میں نے نادانستہ طور پر کی۔ لیکن اس سے میں مالا مال ہوگیا۔ مجھے بے پناہ دولت مل گئی لیکن سکھ چین سب کچھ لٹ گیا۔ چچا کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ وہ چند لمحے خاموش رہے اور پھر اپنے جذبات پر قابو پانے کے بعد بولے۔

''اس گھر کی ہر چیز منحوس ہے۔ اسے جلنے دینا، اسی میں سب کی بہتر ہے۔ اگر میری وصیت پر عمل نہ کیا گیا تو خدا جانے کتنے ہولناک نتائج برآمد ہوں۔ یہ میری آخری خواہش ہے۔ کل میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔''

چچا یہی باتیں بار بار دہراتے رہے۔ ممکن ہے

اس اعادہ سے ان کا مقصد اپنی باتوں اور وصیت کی اہمیت واضح کرنا ہو۔ لیکن مجھے یقین ہوگیا کہ وہ دماغی توازن کھو بیٹھے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ بغیر کسی معقول وجہ کے مکان کو آگ لگادیں اور پھر یہ بات تو قطعی طور پر ناقابل یقین تھی کہ وہ کل شام تک مرجائیں گے۔ میں نے دل میں تہیہ کرلیا کہ شہر پہنچتے ہی منیر کے چچا کے علاج کے سلسلے میں بات کروں گا کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ پاگل پن میں مکان کو آگ لگادیں اور خود بھی تماشہ دیکھتے ہوئے جل مریں یا گاؤں کے کسی آدمی کو نقصان پہنچائیں۔

میں چچا سے رخصت ہوکر شہر پہنچا اور منیر سے ملنے چلا گیا لیکن اتفاق سے ہماری ملاقات نہ ہوسکی کہ وہ گھر پر نہیں تھا۔ اس کے بعد میں اپنے کام میں اس قدر مصروف رہا کہ اس تمام واقعہ کو یکسر بھول گیا اور تیسرے دن اس وقت یاد آیا جب منیر مجھ سے ملنے میرے کلینک آیا۔

میں نے منیر کو صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ ''اس کے چچا پاگل ہوگئے ہیں۔ اس لئے ان کا علاج جلد کرانا ضروری ہے ابھی پاگل پن کی ابتدائی صورت ہے اور اگر زیادہ وقت اسی حالت میں گزر گیا تو علاج سے بھی فائدہ نہ ہوگا۔''

منیر نے خاموشی سے میری بات سننے کے بعد کہا۔

''بھائی شاہد تم چچا کے علاج کی باتیں کررہے ہو۔ اور انہیں فوت ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے ہیں میں اسی سلسلہ میں تم سے ملنے آیا ہوں۔''

''تو کیا چچا کی پیشن گوئی صحیح تھی۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

''میرے نزدیک تو پیشن گوئی کا صحیح ہونا محض اتفاق ہے۔'' منیر کہنے لگا۔ ''خیر جو ہونا تھا ہوچکا، میں ابھی جمیل کے پاس سے اٹھ کر آیا ہوں میں نے اسے کہہ دیا ہے کہ اگر وصیت پر عمل درآمد کی کوشش کی گئی تو میں عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا کر اپنا حق وصول کرلوں گا۔ چچا آخری عمر میں پاگل ہوگئے تھے۔

تم نے بحیثیت ڈاکٹر انہیں پاگل قرار دیا ہے ایسی صورت میں وصیت کا مقصد ہی فوت ہوجاتا ہے۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ بغیر کسی معقول وجہ کے ہم اپنا گھر جلا کر تماشہ دیکھیں۔ جمیل نے اصولی طور پر میری بات سے اتفاق کیا ہے۔ اب تم بتاؤ تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

''مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔'' میں نے منیر کی بات سے اتفاق کیا۔

''تو پھر تمہیں بھی میرے ساتھ گاؤں جانا ہوگا۔'' منیر نے کہا۔ ''چچا کی تجہیز و تکفین کے بعد تم اور جمیل چلے آنا میں چھٹیوں کے دو ماہ وہیں گزاروں گا۔''

دوسرے روز میں نے کلینک بند کیا اور منیر کے ساتھ ہولیا۔ جمیل بھی ہمارے ساتھ تھا۔ دوپہر کے وقت ہم تینوں گاؤں پہنچے چچا کی لاش اب تک ویسے ہی بے گور و کفن پڑی تھی۔ لاش کو دیکھتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ جمیل بھی گھبرا گیا ان کی شکل بگڑ کر انتہائی بھیانک ہوگئی تھی۔ بے نور آنکھیں ایسے چمک رہی تھیں جیسے رات کی تاریکی میں خونخوار جانوروں کی چمکا کرتی ہیں۔ ہاتھوں کے ناخن بڑھ کر نوکیلے ہوگئے تھے۔ لاش کی یہ حالت دیکھ کر ہم نے فوراً تجہیز و تکفین کا انتظام کیا اور فارغ ہونے کے بعد شام تک میں اور جمیل واپس شہر لوٹ آئے۔

☆......☆......☆

وقت کے معمول میں کوئی فرق نہ آیا۔ دن گزرتے گئے اور پھر ایک دن جب میں کلینک سے فارغ ہوکر گھر جارہا تھا میری ملاقات ڈاکٹر کمال سے ہوگئی۔ ڈاکٹر کمال کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں تھی۔ وہ ملک کے مشہور و معروف ماہر لسانیات اور ان دنوں یونیورسٹی کی لائبریری کے انچارج تھے۔

''کیا منیر سے ملاقات ہوئی ہے؟'' ڈاکٹر نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''کل دوپہر ایک مریض کو دیکھنے مجھے گاؤں جانا ہے۔ ارادہ ہے کہ منیر سے بھی مل لوں گا۔ کیا کوئی کام ہے۔''

''لائبریری سے سنسکرت کی ایک قدیم کتاب غائب ہے۔'' ڈاکٹر کمال نے بتایا۔ ''دنیا کی سب سے

قدیم ہے جو کسی جوگی کی لکھی ہوئی تھی۔‘‘
’’تو کیا آپ کا مطلب ہے کہ منیر نے وہ کتاب چوری کرلی ہے۔‘‘ میں نے صاف بات کی۔
’’نہیں بھئی۔ میں نے یہ کب کہا ہے۔‘‘ ڈاکٹر کمال نے بات بناتے ہوئے کہا۔ ’’لائبریری کے کلرک کی غلطی سے ایسا ہوا ہے۔ ورنہ ایسی نادر کتاب کوئی بھی شخص لائبریری سے باہر لے جانے کا مجاز نہیں۔ بلکہ لائبریری ہی میں بیٹھ کر استفادہ کرسکتا ہے۔ بہرحال جیسے بھی ہوا۔ آپ مہربانی کرکے منیر سے کتاب لے آنا۔ اس کتاب کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ دنیا میں صرف یہی ایک جلد ہے۔‘‘
میں نے ڈاکٹر سے کتاب کی واپسی کا وعدہ تو کرلیا۔ لیکن پریشان تھا کہ منیر سے جاکر کیا کہوں گا اور کتاب کیونکر حاصل کروں گا۔ اگر اس نے کتاب چوری کی ہے تو وہ واپسی کے لئے رضامند نہیں ہوگا اسی ذہنی الجھن میں مبتلا دوسرے دن جب میں منیر سے ملا تو کوئی بات نہ کرسکا۔ تھوڑی دیر بعد جب میں نے جانے کی رخصت چاہی تو منیر نے خود ہی پریشانی دور کردی اور کتاب کو الماری سے نکال کر مجھے دیتے ہوئے کہا۔
’’یہ کتاب مہربانی کرکے ڈاکٹر کمال کو دے دینا۔ اب یہ میرے کسی کام کی نہیں ہے۔ میں نے اس کی ایک نقل تیار کرلی ہے۔‘‘
میں نے منیر کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور چمڑے کی مجلّہ کتاب کو کار میں اپنے ساتھ والی سیٹ پر رکھتے ہوئے خدا حافظ کہہ کر شہر روانہ ہوگیا۔
منیر کی باتوں سے مجھے ڈاکٹر کمال کے شکوک کی تصدیق ہوگئی۔ لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ آخر منیر کو کتاب چوری کرنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی۔ اس کتاب میں رکھا ہی کیا ہے، ڈاکٹر کے اس کتاب سے مستفید ہونے کی بات تو سمجھ میں آتی ہے لیکن منیر کے لئے قطعاً بے مقصد ہے میں نے شہر پہنچتے ہی کتاب ڈاکٹر کمال کے حوالے کی اور زندگی کے ہنگاموں میں کھوگیا۔

اس قصے کے تقریباً تین چار ماہ بعد مجھے پھر ایک مریض کو دیکھنے گاؤں جانا پڑا اتوار کا وقت تھا سوچا منیر سے بھی ملتا جاؤں۔ دروازے پر دستک دی تو دروازہ منیر نے ہی کھولا اور مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ لیکن اسے دیکھ کر مجھے بے حد افسوس ہوا۔ کاش میں اس سے ملنے نہ آتا۔ داڑھی بڑھی ہوئی سر کے بال الجھے ہوئے جسم سوکھ کر کانٹا ہوگیا تھا آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اور میلا لباس گویا وہ کسی وحشی قوم کا فرد ہو۔
’’اپنی یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟‘‘ مجھ سے رہا نہ گیا تو میں نے پوچھ لیا۔
منیر مسکراتے ہوئے بولا۔ ’’اب مجھ سے مصنوعی زندگی نہیں گزاری جاتی میں نے تصنع ترک کردیا ہے زندگی کی حقیقت کو پانے کے بعد میں تمام تکلفات سے بے نیاز ہوگیا ہوں۔ اگر میں بھی آپ......‘‘ منیر بات کرتے کرتے ایک دم خاموش ہوگیا اور دروازے کی سمت دیکھنے لگا۔ میں نے پہلی بار دروازے کی طرف دھیان دیا۔ جو اندر سے مقفل تھا اور کوئی شخص اسے کھولنے کی کوشش کررہا تھا۔ پھر کسی کے بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ بالکل ایسے جیسے کوئی شخص کیچڑ میں چل رہا ہو۔ تھپ، تھپ...... آواز آہستہ آہستہ کم ہوتی چلی گئی۔ منیر اور میں دروازے کی طرف دیکھتے رہے۔
میں اٹھ کر دبے پاؤں دروازے تک گیا اور کان لگا کر سننے لگا۔ پھر میں نے چابی گھما کر تالہ کھولا اور باہر جھانک کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔
’’ارے بھئی...... کس چکر میں پڑ گئے ہو۔ یہاں تو ہر روز یہی ہوتا ہے خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔‘‘
منیر نے قہقہہ لگایا۔ ’’ابتداء میں مجھے بھی پریشانی ہوئی تھی لیکن ہم میں جلد دوستی ہوگئی۔‘‘
’’کس سے؟‘‘ میں نے پوچھا۔
’’تم جنہیں بھوت پریت کہتے ہو۔‘‘ منیر نے کہا۔ ’’خیر چھوڑو ان باتوں کو تم نہیں سمجھ سکتے۔ یہ بتاؤ تم نے وہ کتاب ڈاکٹر کمال تک پہنچادی تھی یا نہیں۔‘‘
’’ہاں...... اسی وقت۔‘‘ میں نے مختصر جواب دیا

اور جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس گھر میں بیٹھے ہوئے مجھے ایک انجانا خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ منیر بھی میرے ساتھ باہر تک آیا اور جب میں کار کا دروازہ کھول کر بیٹھنے لگا۔ تو اس نے کہا۔

''کبھی کبھار ملتے رہا کرو لیکن دن کے وقت رات میں نہیں۔''

میں اتنا پریشان تھا کہ جواب دیئے بغیر ہی کار اسٹارٹ کر کے شہر روانہ ہوگیا۔ میرا ذہن الجھ گیا تھا کہ ''کمرے سے باہر کون تھا؟'' حقیقی زندگی سے اس کی مراد کیا تھی اور اس نے رات کے وقت ملنے سے کیوں منع کیا ہے؟ یہاں آنے کے بعد کہیں اس نے مجرمانہ زندگی تو نہیں اختیار کرلی؟ شاید اسی لئے شہر کے بجائے گاؤں میں رہائش رکھی ہو؟'' میں گھر پہنچنے تک سارا راستہ یہی سوچتا رہا۔ میرے دماغ میں اس کی ایک ہی بات گونجتی رہی۔

اس واقعہ کے تقریباً تین ہفتے بعد جمیل مجھ سے ملنے آیا۔ وہ بہت پریشان دکھائی دے رہا تھا اس نے میرے قریب ہی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اخبار میرے سامنے میز پر رکھول کر پھیلا دیا اور کہنے لگا۔

''کیا آج کا اخبار دیکھا ہے؟''

''نہیں۔ صبح سے فرصت ہی نہیں ملی۔ کیا کوئی خاص خبر ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں...... بہت اہم خبر ہے۔'' جمیل نے پیشہ ور وکیل کے لہجے میں زور دے کر کہا۔ ''منیر کے چچا کی لاش قبر سے غائب ہوگئی ہے۔ یہ دیکھو قبر کی تصویر'' جمیل نے تصویر پر انگلی رکھ کر بتایا۔

''ممکن ہے کسی بھوکے جانور نے قبر کھود کر پیٹ بھرا ہو۔'' میں نے اپنا خیال ظاہر کیا...... جمیل نے مجھے غور سے دیکھا جیسے اس کے لئے میں کوئی عجوبہ ہوں۔

''کیوں کیا بات ہے۔ میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو؟''

''تمہارا مطلب ہے کہ جانور نے پیٹ بھرنے کی خاطر قبر کھودی ہوگی اور اس کے بعد کفن کو ایک میل کے فاصلے پر سڑک کے کنارے جا پھینکا ہے یہی ہے نا تمہارا خیال۔'' جمیل نے تلخ لہجے میں کہا۔

''ہاں...... ایسا ممکن تو ہے۔'' میں نے اپنی بات پر اصرار کیا۔ جب کوئی جانور لاش کو نوچ نوچ کر کھا رہا ہوگا تو شاید کئی دوسرے جانور بھی دعوت میں شرکت کے لئے آ دھمکے ہوں اور اسی چھینا جھپٹی میں کوئی کفن ہی کو منہ میں دابا کے بھاگا ہو۔''

''واہ بھئی...... تمہاری منطق بھی خوب ہے۔'' جمیل نے سنجیدگی سے ڈانٹ دیا۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ کوئی جانور اتنی گہری قبر کھودے اور پھر لاش کو قبر سے باہر نکالنا تو قطعی ممکن نہیں۔ بس یہی نہیں بلکہ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ کفن بالکل صحیح سلامت ہے۔ اگر جانور کھینچ کر لاش سے اتارتا تو یقیناً وہ پھٹ جاتا۔ اس کے علاوہ قبر کے اطراف میں زمین پر کسی بھی جانور کے پنجوں کے نشان دکھائی نہیں دیئے۔

خبر میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کفن کے قریب گاؤں کے چوکیدار کی لاش بھی پڑی ملی ہے اس کی شہ رگ پھٹی ہوئی تھی جیسے کسی خونخوار جانور نے پنجے اور دانت مار کر پھاڑ ڈالی ہو۔ دوسری حیرت انگیز بات یہ ہے کہ زمین پر کسی جگہ خون کا کوئی دھبا دکھائی نہیں دیا۔''

''یہ تو ناممکن سی بات ہے۔'' میں نے حیرت سے کہا۔

''اسی لئے تو متفکر ہوں۔'' جمیل کہنے لگا۔ ''میرے خیال میں منیر اس پراسرار واردات میں ملوث ہے۔'' جمیل کی بات پر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ میری نظروں کے سامنے منیر کا چہرہ گھوم گیا۔ اس کی بڑھی ہوئی داڑھی۔ سر کے بال بے ترتیب، سیاہ حلقے اور میلا لباس، اس کی الٹی سیدھی باتیں بھوت پریت سے دوستی۔ رات کو ملنے سے منع کرنا۔ میں نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد سوچتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میرا تو اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت ہے۔ منیر اگر مجرم ہے تو پولیس اسے گرفتار کرلے گی۔''

''یہ پولیس کے بس کی بات نہیں ہے۔'' جمیل

نے کہا۔ ''کیا تم نے کبھی یہ سوچا ہے کہ منیر کے چچا نے اپنی عجیب وغریب وصیت کیوں کی۔ اور مجھے کیوں بھیجی، تمہیں اس وصیت پر عمل درآمد کا ذمہ دار کیوں ٹھہرایا۔ جب کہ ہم دونوں کا اس سے کوئی تعلق اور واسطہ نہ تھا۔ منیر کا کلاس فیلو ہونا تو کوئی ایسی بات نہیں۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو، صاف صاف بات کرو۔'' میں نے پریشان ہو کر کہا۔

''میں تمہارے پاس اس لئے آیا ہوں کہ تم فوراً گاؤں جاؤ اور منیر کو جیسے بھی ہو ساتھ لیتے آؤ۔ شاید اس طرح وہ تباہی سے بچ جائے۔'' جمیل نے کہا۔

''کیسی تباہی؟...... تم بھی منیر کی طرح پہیلیوں میں باتیں کر رہے ہو۔'' میں نے کہا۔

''تو کیا اس نے تم سے کوئی بات کی تھی۔'' جمیل نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

میں نے منیر سے ملاقات۔ کمرے کے باہر بھاری قدموں کی آواز اور بھوت سے دوستی۔ غرض یہ کہ ہر بات تفصیل سے جمیل کو بتائی جسے سننے کے بعد وہ مزید پریشان ہو گیا اور سوچنے کے بعد بولا۔

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ منیر بہت آگے نکل چکا ہے، اب اس کا واپس لوٹ آنا مشکل ہی نہیں شاید ناممکن ہو۔ بہر حال ہمیں کوشش کرنی چاہئے۔''

''کیا کوشش کرنی چاہئے میری سمجھ میں تو تمہاری بات نہیں آئی۔'' میں نے اونچی آواز میں کہا۔ ''منیر جانے اور اس کا کام۔ میں اس کے نجی معاملات میں مداخلت کو مناسب نہیں سمجھتا۔ تمہیں بھی یہی مشورہ دوں گا کہ کسی کے نجی معاملات میں دلچسپی نہ لیا کرو۔''

میری اس بات کا جمیل نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے اٹھ کر چل دیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ موجودہ صورت حال سے جمیل تو درکنار میں بھی مطمئن نہیں تھا میرے ذہن میں کھلبلی سی مچ گئی تھی جمیل نے پیشہ ور وکیل کی طرح مجھے بھی شکوک وشبہات کی دلدل میں لا پھینکا تھا۔

''آخر بوڑھے چچا نے اپنی انوکھی وصیت کے لئے مجھے اور جمیل کو کیوں منتخب کیا۔ مکان کو آگ لگا کر تباہ کرنے میں آخر کیا راز پوشیدہ ہے؟ اسے اپنی موت کے بارے میں کیونکر علم ہو گیا تھا۔ منیر نے لائبریری سے کتاب کیوں چوری کی؟ جبکہ وہ بحثیت کالج کے پروفیسر کے آسانی سے کتاب حاصل کر سکتا۔ منیر کا انجانا دوست کون ہے؟ جن بھوت یہ تو انسان کے توہمات کی تخلیق ہیں۔'' میں سوچتا رہا اور خیالات کا تانا جانا الجھتا چلا گیا اتفاق دیکھئے کہ اسی دن بعد دوپہر مجھے ایک مریض کے لئے گاؤں جانا پڑا۔ مریض کو دیکھنے کے بعد میں منیر سے ملنے اس کے گھر آیا۔ دروازے پر دستک دی مگر کوئی جواب نہ ملا۔ تیسری دستک پر منیر کی نحیف آواز سنائی دی۔ ''کون صاحب ہیں؟''

''ارے بھئی میں ہوں شاہد...... دروازہ کھولو۔'' میں نے اونچی آواز میں کہا۔ دروازہ کھلا اور میں منیر کو دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ چند ہی دنوں میں وہ بوڑھا دکھائی دینے لگا تھا۔ جھکی ہوئی کمر، اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں چہرے پر جھریوں کا جال، سر اور داڑھی کے بال برف کی طرح سفید، جسم ہڈیوں کا پنجر۔

منیر نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ اور میرے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی اس وقت میں نے منیر کی اس حرکت پر توجہ نہ دی۔ لیکن جب اس نے کمرے میں داخل ہونے کے بعد دروازے کو اندر سے مقفل کر دیا تو مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ میں یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ منیر خوف زدہ سا ہے اور اپنے گھر میں ہوتے ہوئے بھی خود کو غیر محفوظ سمجھتا ہے۔

اس وقت شام گہری ہونے لگی تھی۔ میرا خیال تھا کہ جلد ہی مطلب کی بات کر کے رخصت ہو جاؤں گا لیکن چچا کی لاش کی بابت بات کرنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ بیٹھے بیٹھے منیر اچھل کر کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔

''تمہیں میں نے پچھلی مرتبہ کہہ دیا تھا کہ رات کے وقت مجھ سے ملنے نہ آنا۔ اب میں سوائے اظہار افسوس کے کیا کر سکتا ہوں۔ مجھے اس وقت بہت ضروری کام ہے۔ تم دن میں کسی وقت آنا۔''

منیر کی اس حرکت پر مجھے بہت غصہ آیا۔ مگر اس کی ابتر حالت دیکھ کر میں نے کوئی بات کرنا مناسب نہ سمجھا اور جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ منیر مجھے خدا حافظ کہنے کے لئے باہر میری کار تک آیا۔ کمرے سے نکلنے سے پہلے اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور پھر مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا، میں نے کار میں بیٹھتے ہوئے صرف اتنا کہا۔

''تم نے اپنی یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ بیمار معلوم ہوتے ہو۔ تمہارے جسم میں تو خون کا قطرہ بھی نہیں رہا۔ میرے ساتھ شہر چلو۔ وہاں علاج بھی ہوگا اور تمہاری دیکھ بھال بھی کرتا رہوں گا۔ وہاں تمہیں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی بوڑھا فضل دین ہر وقت تمہاری خدمت پر ماہور ہوگا۔ تم بہت جلد تندرست ہو جاؤ گے کیا خیال ہے تمہارا؟''

''نہیں میں یہاں سے نہیں جا سکتا۔'' منیر نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میرا یہاں رہنا بہت ضروری ہے، میں تمہیں یا کسی اور کو اپنے ساتھ مصیبت میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا۔''

''چچا کی لاش کا کچھ پتہ چلا۔'' میں نے پوچھا۔

''ہاں...... چچا آج کل میرے ساتھ ہی مقیم ہیں۔ ان کی وجہ سے میں یہاں مقیم ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''مگر تم نے......''

''میں نے کچھ نہیں کہا۔'' منیر نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''وہ خود ہی میرے پاس چلے آئے ہیں، مگر تمہاری سمجھ میں یہ بات نہیں آئے گی۔ پھر کسی وقت بات کریں گے تم جس قدر ممکن ہو...... یہاں سے چلے جاؤ...... اچھا خدا حافظ۔''

اتنا کہہ کر منیر چلا گیا اور اس نے دروازہ بند کر لیا۔

میں بھی شہر لوٹ آیا، ابھی دو میل کا فاصلہ ہی طے کیا ہوگا کہ کار کی بتیوں کی روشنی میں سڑک کے درمیان کوئی شخص اوندھے منہ پڑا دکھائی دیا، میں سمجھا کہ مجھ سے پہلے کسی بس یا گاڑی سے حادثہ پیش آیا ہوگا اور وہ کسی راہگیر کو کچل کر گزر گئی ہے۔

میں نے قریب پہنچ کر بریک لگائے لیکن پھر خیال آیا۔ ''کوئی قتل کی واردات نہ ہو اور مجھے اس معاملے میں ملوث سمجھ کر پولیس کے ہاتھوں پریشان نہ ہونا پڑے۔ لہٰذا بہتر ہے خاموشی سے اپنی راہ لی جائے۔'' یہ سوچ کر میں نے کار کچے راستے سے گزارنی چاہی تاکہ لاش کے اوپر سے نہ جانا پڑے۔ بس پھر کیا تھا وہ شخص اچھل کر کھڑا ہو گیا اور کار میں سوار ہونے کے لئے آگے بڑھا۔ گویا یہ مسافروں کو لوٹنے کے لئے سڑک کے درمیان لیٹا ہوا تھا اور اس کے کئی ساتھی قریب ہی کہیں چھپے ہوں گے لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ میں خوف سے کانپ گیا میری حالت یہ تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں، میرے حواس مختل ہو گئے اور مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ رہا۔ اسی گھبراہٹ اور حواس باختگی کے عالم میں ایکسلیٹر پر پاؤں کا وزن بڑھنے سے ایک دم کار کی رفتار بے تحاشہ تیز ہو گئی۔

اور میں منیر کے چچا کو اپنی کار کے پہیوں تلے روندتا کچلتا آگے بڑھ گیا۔

اس واقعہ سے میں اتنا خوف زدہ ہوا کہ اپنے گھر جانے کے بجائے سیدھا جمیل کے پاس پہنچا اس وقت وہ ایک قتل کے مقدمہ کی تیاری میں مصروف تھا۔

شرم و حیا

لاجونتی کے پودے نے کسی عورت سے کہا۔ ''مجھ میں اتنی شرم ہے کہ اگر کوئی مجھے ہاتھ لگائے تو میں شرم سے سکڑ جاتا ہوں۔''

عورت نے کسی کے ہاتھوں کا تصور کیا اور شرم سے چھوئی موئی ہو گئی۔

لاجونتی کا پودا اسے حیرت سے تک رہا تھا۔

(شہریار۔کھپرو)

میں نے اسے حالات سے آگاہ کیا تو وہ مجھ سے بھی زیادہ پریشان ہوگیا اور مجھے اپنے ہی گھر میں رات بسر کرنے کے لئے روک لیا اس کے خیال کے مطابق گھر جانا میرے لئے خطرناک تھا۔

وہ رات بڑی ہی بھیانک بن کر گزری۔ میں ایک پل کے لئے سو نہ سکا اور کروٹیں بدلتا رہا۔

صبح ناشتہ کرنے کے بعد معمول کے مطابق جب میں کلینک پہنچا تو وہاں منیر کو اپنا منتظر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ منیر نے چھوٹتے ہی کہا۔

''میں تمہیں صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ تم شہر چھوڑ کر چپکے سے کہیں اور چلے جاؤ۔ یہاں سے دور کسی دوسرے شہر۔''

''کیوں......؟'' میں نے پوچھا۔

''اس لئے کہ یہاں تمہاری جان خطرے میں ہے۔''

''کیسے؟'' میں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا۔'' منیر کہنے لگا۔ ''جس قدر جلدی ممکن ہو یہ شہر چھوڑ جاؤ اور دو چار دن اگر یہاں رہنا ہی ہے تو اس دوران اپنی رہائش کی جگہ تبدیل کرتے رہو۔ ایک رات سے زیادہ کسی جگہ قیام نہ کرنا اور رات کے وقت کہیں نہ جانا۔ نہ کسی سے ملو۔ چاہے میں ہی کیوں نہ ہوں، میں نے جس تباہی کو روکنے کی کوشش کی تھی وہ میری تباہی کے بعد بھی میرے بس میں نہیں رہی۔ یہ ہماری آخری ملاقات ہے، خدا حافظ۔''

منیر کی پچکی ہوئی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ منہ پھیر کر چل دیا۔ میں نے اسے روکنا چاہا۔ لیکن میری آواز حلق میں ہی اٹک کر رہ گئی۔

وہ رات بھی میں نے جمیل کے گھر گزاری اور دوسرے دن جب میں کلینک پہنچا تو میں نے ایک پولیس کے سپاہی کو اپنا منتظر پایا۔

''کیوں کیا بات ہے؟'' میں نے سپاہی کو مریض سمجھتے ہوئے پوچھا۔

''جناب میں بیمار نہیں ہوں۔ اور نہ ہی کسی مریض کے لئے آپ کے پاس آیا ہوں۔'' سپاہی نے کہا۔

''تو پھر......؟''

''رات کو آپ کے گھر چوری کی واردات ہوئی ہے اور آپ کا بوڑھا ملازم قتل ہوگیا ہے۔ اس نے چور کے آگے مزاحمت کی ہوگی۔'' سپاہی نے بتایا۔

''اور چور؟''

''وہ فرار ہوگیا۔''

یہ اطلاع ملتے ہی میں سپاہی کے ساتھ گھر پہنچا۔ جہاں تھانیداروں اور سپاہی پہلے ہی سے موجود تھے ایسے معلوم ہو رہا تھا جیسے میں گھر نہیں پولیس اسٹیشن آگیا ہوں۔

گھر کی حالت کسی کباڑی کی اجڑی ہوئی دکان سے مختلف نہ تھی کمروں میں ہر طرف چیزیں بکھری پڑی تھیں فرنیچر اور کراکری میں سے کوئی بھی چیز سلامت نہ تھی دیوار و پر آویزاں تصاویر کے فریم اور شیشے توڑ کر تصویروں کو نکال کر پھاڑ اگیا تھا میرے تمام کپڑوں کی بھی یہی حالت تھی ایک جوڑا بھی استعمال کے قابل نہ چھوڑا تھا۔ اور فضل دین کی لاش بھی کمرے میں پڑی تھی اس کی گردن پر پنجوں کے نشانات واضح تھے اور گلا بھی ایسے پھٹا ہوا تھا جیسے کسی کند آلے سے اسے کاٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔

فضل دین کے قتل کے سلسلہ میں پولیس کی تھیوری یہ تھی کہ چور نے اپنے تحفظ کی خاطر اسے قتل کیا ہے۔ نیز گلے پر کاٹنے وار تار ماری گئی ہے بظاہر یہ بات ٹھیک معلوم ہوتی تھی۔ لیکن میرے نزدیک ایسا نہیں تھا کیونکہ مکان میں کسی بھی جگہ خون کا دھبہ یا نشان موجود نہیں تھا۔ میں نے جب تھانیدار کی توجہ اس جانب مبذول کروائی تو مجھے یہ کہہ کر خاموش کر دیا گیا کہ مجرم کوئی جنونی یا پاگل شخص ہے۔ اس نے فضل دین کی موت کے بعد خون کسی کپڑے وغیرہ سے صاف کر دیا تھا بعض ایسے پاگل بھی تو ہوتے ہیں جنہیں خون دیکھ کر خوف آنے لگتا ہے جیسے کوئی شخص پانی سے ڈرتا ہو وہ بلندی پر اپنے اوسان بحال نہیں رکھ سکتا۔ لیکن ایسی صورت حال

میں خون آلود کپڑا تو ملنا چاہیئے تھا۔
اس واردات سے مجھے منیر کی باتیں یاد آ گئیں۔ اس نے صاف الفاظ میں مجھے خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔ کہ اب اس مکان میں قیام میرے لئے خطرناک ہوسکتا ہے۔ جتنی جلدی ممکن ہو مجھے یہ مکان ہی نہیں بلکہ شہر چھوڑ کر چلا جانا چاہیئے منیر کی وارننگ کا واضح مفہوم یہ تھا کہ مجرم گزشتہ رات سے میری تلاش میں آیا تھا۔ چوری کی نیت سے نہیں۔ مجھے گھر میں موجود نہ پا کر اس نے چیزوں کو توڑ پھوڑ کر اپنا غصہ نکالا توڑ پھوڑ کی آواز سے فضل دین کی آنکھ کھل گئی اور مزاحمت کی صورت میں مجرم نے اسے ہلاک کر دیا۔
حالات کے پیش نظر مجھے فضل دین کے قاتل کے بارے میں کوئی شک نہ رہا۔ ''یہ کام منیر کے چچا ہی نے کیا ہے وہ مرا نہیں زندہ ہے اس نے کیسی خاص مقصد کے تحت موت کا ڈھونگ رچایا ہے لیکن مجھ سے اس کی کیا دشمنی ہوسکتی ہے۔ میں نے اس کا کیا بگاڑا ہے میرے اور اس کے درمیان اجنبیت کی دیوار حائل رہی ہے کیا وہ دوراتیں، پیشتر میری کار کے نیچے کچلا جانے کے باوجود بھی مرا نہیں۔'' میں سوچ میں پڑ گیا۔ وہ یقیناً پاگل ہے اور یہ فعل بھی اس کے پاگل پن کا نتیجہ ہے منیر نے اپنے پاگل چچا کی دیکھ بھال ہی کے لئے گاؤں میں رہائش اختیار کر رکھی ہے۔
پولیس کی کارروائی مکمل ہونے کے بعد میں نے مکان کو مقفل کیا اور جا کر جمیل کو تازہ حالات سے آگاہ کیا اور اس کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے رات میں نے ایک ہوٹل میں گزاری ...... دو دن بعد میں کلینک میں بیٹھا مریضوں کو دیکھ رہا تھا کہ جمیل میرے پاس آیا وہ بہت پریشان تھا۔
''کیسے آنا ہوا...... خیریت تو ہے؟'' میں نے پیشہ ور ڈاکٹر کی طرح پوچھا۔
''گزشتہ رات فضل دین کا قاتل دیوار پھلانگ کر میرے گھر میں داخل ہوا۔'' جمیل بتانے لگا۔
''کتے نے اس کا استقبال کیا اور میری آنکھ کھل گئی۔ ابتدا میں تو کتا حملہ آور ہونے کے لئے آگے بڑھا لیکن دوسرے ہی لمحے خوف سے کانپتے ہوئے دم دبا کر ایک طرف ہٹ گیا۔ مجھے کتے کی بزدلی پر بہت غصہ آیا اور سرہانے کے نیچے سے پستول نکال کر قاتل کو ڈرانے کے لئے دو فائر کئے جس پر اس نے تضحیک آمیز قہقہہ بلند کیا۔ دوسری مرتبہ میں نے اس کے سینے کا نشانہ لیا گولی ٹھیک نشانے پر لگی مگر میری طرف اس کے بڑھتے قدم نہ رکے مجبور ہو کر میں نے آخری تین گولیاں بھی چلا دیں تمام گولیاں اس کے سینے کو چھیدتی ہوئی پار نکل گئیں لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ یہ تو خدا کا شکر ہے کہ فائرنگ کی آواز سن کر ڈیوٹی پر موجود سپاہی بھاگے ہوئے میری مدد کو آ پہنچے اور ہمسائے بھی ان کے ساتھ ہو لئے۔ جس سے فضل دین کا قاتل پیچھے ہٹتا ہوا دیوار کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ اس نے حالات کو مخالف پا کر دیوار پھلانگ کر مکان کی پچھلی طرف سے بھاگ نکلا۔
''وہ کون تھا؟'' میں نے اپنا شک دور کرنے کے لئے پوچھا۔
''منیر کا چچا۔'' جمیل نے بتایا۔
''یہ بات میری سمجھ میں اب تک نہیں آئی کہ اس نے موت کا ڈھونگ کیوں رچایا تھا؟'' میں نے سوال کیا۔
''ڈھونگ نہیں حقیقت میں وہ مر گیا تھا۔'' جمیل نے کہا۔ ''اب اس کے جسم پر شیطانی قوتوں نے قبضہ کر لیا ہے یہ شیطانی قوتیں ساری زندگی اس کی تابع تھیں رہی آخری عمر میں چچا کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ اس لئے اس نے عجیب غریب وصیت کی تھی۔
''افسوس اس وقت ہم حقیقت سے بے خبر تھے۔ ورنہ وصیت پر عمل کرتے اور ہمیں یہ دیکھنا نہ پڑتا۔ ہم سے بہت بڑی غلطی ہوئی ہے خدا جانے انجام کیا ہوگا۔؟''
''تو کیا تمہارے خیال میں منیر بھی اپنے چچا کے ساتھ اس کارستانی میں شریک ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''ممکن ہے۔'' جمیل نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''یا شاید اس تباہی سے لوگوں کو بچانے کے لئے گاؤں میں

قیام کیے ہوئے ہے۔''

''تمہارا کہنا درست ہے ورنہ وہ مجھے خطرے سے آگاہ نہ کرتا۔'' میں نے جمیل کی رائے سے اتفاق کیا۔

''اب ہمیں اس شہر میں نہیں رہنا چاہئے۔'' جمیل کہنے لگا۔ ''پہلے تو صرف تمہیں اس سے خطرہ تھا اور اب وہ میری جان کے بھی درپے ہے۔''

''کیوں؟''

''اس لئے کہ ہم دونوں حقیقت سے آگاہ ہوچکے ہیں۔'' جمیل نے کہا۔ ''اب وہ اپنی غذا کے لئے دوسروں کو لقمۂ اجل بنائے گا۔''

''لیکن ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔'' میں نے تشویش کا اظہار کیا اور دونوں خاموش ہوگئے۔ ہمارے لئے فوری طور پر شہر چھوڑ کر جانا ممکن نہیں تھا۔ اور نہ ہی ہم پولیس کو بتا سکتے تھے کیونکہ ہماری بات پر کوئی بھی اعتبار نہیں کرسکتا تھا۔ بلکہ الٹا ہمیں ہی پاگل سمجھ کر مذاق اڑایا جاتا۔

اس کے بعد تین چار ماہ تک کوئی واقعہ پیش نہیں آیا اور نہ ہی کوئی غیر معمولی بات سننے میں آئی۔ لیکن ہماری حالت قابل رحم تھی۔ دو دن ایک ہوٹل میں قیام کرتے تو تیسرے دن کسی دوسرے ہوٹل میں پناہ لیتے۔ رفتہ رفتہ ہم مطمئن ہوگئے کہ خطرہ ٹل گیا ہے مگر یہ ہماری خام خیالی تھی۔ اچانک ہی حالات نے پلٹا کھایا اور ایک رات میں دو جگہ بالکل ایک سے واقعات پیش آئے۔

شہر میں تین بچے ہلاک ہوئے اور دو آدمیوں کی لاشیں گاؤں کی آبادی سے دور کھیتوں میں پڑی ملیں ان سب کے گلے کٹے ہوئے تھے۔ اخبار میں یہ خبر پڑھتے ہی ہمارے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ہم دونوں اس بات پر متفق تھے کہ اس تازہ واردات میں منیر اور اس کا چچا دونوں ملوث ہیں۔ یہ کارروائی کسی ایک کی نہیں ہوسکتی۔ پولیس انتہائی کوشش اور دوڑ دھوپ کے باوجود مجرموں کا کھوج لگانے میں ناکام رہی۔

وقت گزرتا گیا اور لوگ اس خوف ناک واردات کو بھول گئے تھے کہ ایک بار پھر شور بپا ہوگیا اخبارات نے چار بچوں کی ہلاکت کے لئے پولیس کو خوب اچھالا۔

مگر پولیس بھی کیا کرتی، مجرموں کو گرفتار کرنا کسی کی بس کے بات نہیں تھی۔ مجرم رات کی تاریکی میں گاؤں کی بجائے شہر میں واردات کر جاتے کہ گاؤں کی چھوٹی سی آبادی میں پکڑے جانے کا امکان زیادہ تھا۔

پولیس کو مجبور ہوکر زیادہ مستعدی کا مظاہرہ کرنا پڑا۔ لیکن مجرم ان سے کہیں زیادہ ہوشیار تھے شروع میں تو چند دن خاموشی رہی اور پھر پولیس کے دو سپاہیوں کو رات کو گشت کرتے ہوئے انہوں نے ہلاک کردیا اور فرار ہوگئے۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے میں نے خطرہ مول لینے کا فیصلہ کیا۔ کامیابی کی صورت میں سب کا۔ پوری نوع کا انسانی بچاؤ تھا اور ناکام ہونے کی صورت میں میری جان چلی جاتی۔ ایک دن میں جمیل سے مشورہ کئے بغیر منیر سے ملنے گاؤں چلا گیا۔ وہ مجھ سے بڑے تپاک سے ملا۔ چائے پلائی مگر اس نے خود میرے ساتھ چائے نہ پی۔ ہم بیٹھے گپیں مارتے رہے۔ اب وہ بالکل تندرست ہی نہیں بلکہ انار کی طرح سرخ ہورہا تھا۔ نہ کمر خمیدہ تھی اور نہ ہی سر کے بال الجھے ہوئے اور سفید تھے۔ وہ کلین شیو تھا اور بہترین سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ میں نے گھما پھرا کر بات کی۔

''میں تمہاری صحت کے بارے میں بہت فکرمند تھا۔ اسی لئے تمہیں دیکھنے چلا آیا ہوں۔ اب تمہیں تندرست دیکھ کر بہت خوش ہوا ہوں۔ کس سے علاج کرایا ہے؟''

''چچا سے۔'' منیر نے جواب دیا اور میں پریشان ہوگیا۔

''ہاں بھئی۔ خوب یاد دلایا...... جس دن تم مجھ سے ملنے آئے تھے اسی رات چچا نے میرے گھر دھاوا بول دیا۔''

''پھر......'' منیر کرسی سے اچھلتے ہوئے بولا۔

''فضل دین بے چارا مارا گیا ہے اور کیا بتاؤں۔'' میں نے کہا اور منیر کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا مگر چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

''تم یہاں کس لئے آئے ہو؟'' منیر نے سرد آہ

بھرتے ہوئے کہا ''میں اب ان باتوں سے بے نیاز ہوتا جارہا ہوں۔''

''منیر! یہ تم کیا کہہ رہے ہو'' میں نے کہا۔

''چلو میرے ساتھ شہر۔ وہاں پھر سے تمہاری زندگی میں ترتیب آجائے گی۔''

''بہت خطرناک ہے۔ میرا یہاں رہنا بہت ضروری ہے۔'' منیر نے کہا۔ ''اگر میں یہاں سے چلا گیا تو پھر یہاں تقریباً ہر رات واردات ہونے لگے گی۔''

منیر اتنا کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ گویا ملاقات کا وقت ختم ہوگیا ہو۔ وہ حسب عادت مجھے خدا حافظ کہنے کے لئے باہر میرے ساتھ گاڑی تک آیا۔ اور پھر ادھر ادھر دیکھ کر میرے کان میں کہنے لگا۔

''چچا کی وصیت پر عمل کرو۔ میں اس اذیت ناک زندگی سے اکتا گیا ہوں۔ اگر چچا نے اپنی رہائش بدل لی تو کچھ نہ ہوسکے گا۔ وہ یہاں سے قریب ہی پہاڑیوں میں جاکر رہائش اختیار کرسکتا ہے۔ اب مجھ میں اور اس میں تھوڑا سا فرق رہ گیا ہے۔ اس لئے جلدی کرو۔ تاخیر خطرناک ہے۔''

اتنا کہہ کر وہ مکان میں چلا گیا اور میں بھی واپس شہر آگیا۔ جمیل سے مشورہ کرکے ہم دونوں نے مکان کو آگ لگا کر جلا دینے کا فیصلہ کیا۔

پیٹرول کے دو کین میری کار کی ڈگی میں بھرے پڑے تھے لیکن ہم سخت پریشان تھے دن کے وقت لوگوں کی موجودگی میں ہمارے لئے کچھ کرنا ممکن نہیں تھا اور ناکامی کا بھی اندیشہ تھا۔ پولیس کو اعتماد میں لینا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ رات کے وقت منیر اور اسکے چچا کی گھر میں موجودگی کا پتہ چلانا ہمارے لئے بہت ہی مشکل تھا۔ اگر ہم ان دونوں کی گھر سے عدم موجودگی کے دوران آگ لگا کر ان کے اس ٹھکانے کو ختم کردیتے ہیں تو دونوں کا کسی محفوظ جگہ منتقل ہونا زیادہ خطرناک ثابت ہونے کا اندیشہ تھا۔

آخر ہم نے فیصلہ کیا کہ شام کے وقت گاؤں کی آبادی سے ہٹ کر کسی ایسی جگہ چھپ جائیں اور مکان کی نگرانی کریں۔ جہاں ہمیں کوئی دیکھ نہ سکے اور ہم موقع ملتے ہی پیٹرول چھڑک کر مکان کو آگ لگا کر چلتے بنیں۔

وہ دن ہم نے بڑی بے چینی سے گزارا اور شام ہوتے ہی طے شدہ پروگرام کے مطابق گاؤں روانہ ہوئے ہم نے کار کو گاؤں سے باہر درختوں کے جھنڈ کے پیچھے کھڑا کیا اور وہاں کار میں بیٹھے مکان کی نگرانی کرنے لگے۔

لوگ کام کاج سے فارغ ہوکر گھروں کو جارہے تھے اور گاؤں کے بازار کی دکانیں بھی بند ہونے لگی تھیں۔ پھر ہمیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا...... وہ وقت ہمارے لئے بڑا ہی کٹھن تھا...... ایک ایک پل صدی بن کر گزر رہا تھا، خوف کے مارے ہم دونوں بالکل خاموش بیٹھے تھے...... تاریکی کے گہرے ہوتے ہی ہم نے پیٹرول سے بھرا ہوا کین اٹھایا اور مکان کی سمت چل دیئے۔ ہمارے دلوں کی دھڑکنیں بہت تیز ہوگئی تھیں اور سردی کے باوجود پسینے میں نہا گئے تھے۔

مکان کی کھڑکیوں...... دروازوں اور دیواروں پر ہم نے ہر جگہ پیٹرول چھڑکا۔ اور پھر کار کی طرف بھاگتے ہوئے ہم نے دیا سلائی جلا کر پھینکی تو ہر طرف آگ ہی آگ بھڑک اٹھی سارا مکان چند ہی لمحوں میں شعلوں کی لپیٹ میں آگیا اور ہمارے کار تک پہنچنے سے پہلے ہی آگ کے شعلے آسمان تک بلند ہوگئے اور اس کے ساتھ ہی دھماکوں سے دونوں کین بموں کی طرح پھٹ گئے جو ہم نے وہیں پھینک دیئے تھے، دھماکوں کی آواز سے بھونچال سا آگیا اور گاؤں کے لوگ گھبرا کر گھروں سے باہر نکل آئے۔ بچے، بوڑھے، عورتیں مرد ہر طرف ہنگامہ تھا...... لوگ دیکھ رہے تھے...... منیر اور اس کا چچا آگ کے اندر دونوں چیخیں مارتے، مدد کے لئے پکار رہے تھے۔

اس جہنم کی آگ سے ان کو کون بچاتا۔ لوگ حیران تھے کہ منیر کا چچا مرنے کے بعد قبر سے نکل کر زندہ کیسے ہوگیا۔ لیکن انہیں حقیقت کون بتاتا۔

زندہ صدیاں

قسط نمبر:13

ایم اے راحت

صدیوں پر محیط سوچ کے افق پر جھلمل کرتی، قوس قزح کے دھنک رنگ بکھیرتی، حقیقت سے روشناس کراتی، دل و دماغ میں ہلچل مچاتی ناقابل یقین ناقابل فراموش انمٹ اور شاہکار کہانی

سوچ کے نئے دریچے کھولتی اپنی نوعیت کی بے مثال، لاجواب اور دلفریب کہانی

میری آنکھیں بے اختیار بند ہوگئیں۔ ایک لمحے میں کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ لیکن دوسرے لمحے بہت کچھ سمجھ میں آ گیا۔ نائلون کی انتہائی مضبوط رسی سے بنا ایک جال میرے اوپر آ گرا۔ کوروتی کی بھی ہلکی سی آواز سنائی دی تھی۔

پھر ایک بھاری آواز سنائی دی۔ ''تم دونوں پولیس کے نرغے میں ہو، کوئی حرکت کی تو گولیوں سے بھون دیئے جاؤ گے۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا، آنکھوں میں ابھی تک سرخ سیر یئے ناچ رہے تھے۔ پھر بہت سے بوٹوں کی آواز سنائی دی اور پھر مجھے بری طرح دبوچ لیا گیا۔ بالکل ایسا ہی لگا تھا جیسے کسی جنگلی درندے کو پکڑا جا رہا ہو۔

''لے چلو۔ باہر لے چلو۔ اسی بھاری آواز نے کہا۔ اور مجھے دبوچنے والے مجھے جال سمیت باہر کھینچنے لگے۔ روشنی مدھم کر دی گئی تو میری آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں۔ میں نے چندھیائی آنکھوں سے اپنے اطراف کا جائزہ لیا۔ پولیس کی وردی میں بے شمار افراد آس پاس نظر آ رہے تھے۔ یہ سب بھاری اسلحہ سے لیس تھے لیکن اور بھی کچھ نظر آیا۔ یہ کوروتی تھی ایک خوف ناک ڈھانچے کی شکل میں۔ اسے بھی میرے جیسے مضبوط جال میں جکڑ لیا گیا تھا اس بار پولیس والے اس سے خوف زدہ نہیں تھے اور اسے دبوچے ہوئے تھے۔

ہم دونوں کو باہر لایا گیا۔ باہر بھی پولیس کی گاڑیوں سے روشنی کر دی گئی تھی۔ بھاری آواز والا ایک اعلیٰ افسر تھا بے حد شاندار شخصیت کا مالک وہ ہماری طرف سے بہت محتاط تھے۔ ''انہیں الگ الگ گاڑیوں میں بیٹھاؤ۔'' اس نے حکم دیا۔ مجھے جال سمیت ایک پولیس موبائل میں بیٹھایا اور کوروتی کو دوسری موبائل میں لے جایا گیا۔ لیکن پولیس ہیڈ کوارٹر کے ایک ہال نما کمرے میں ہم دونوں کو ایک ساتھ لے جایا گیا تھا۔

اس بار یہ ڈیوٹی بہت نڈر پولیس والوں کے سپرد کی گئی تھی کیونکہ وہ کوروتی سے خوف زدہ نہیں نظر آ رہے تھے۔ جبکہ کوروتی اس وقت بھی جال میں لپٹی بے حد خوف ناک نظر آ رہی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھے اس لئے آپس میں کوئی بات نہیں کر پا رہے تھے۔

پھر کچھ دیر کے بعد ایک اور عمل ہوا۔ پولیس والوں کا ایک اور جتھہ آیا اور کوروتی کو جال سمیت لے کر اس ہال سے باہر نکل گیا۔ چار پولیس والے اب بھی اس ہال نما کمرے میں میری نگرانی پر مامور تھے۔ کوئی

ایک گھنٹے کے بعد ایک اور پولیس کانسٹیبل اندر آیا۔ اور اس نے ان چاروں سے کچھ کہا اور ان میں سے دو افراد اٹھ کر میرے پاس آ گئے۔

''آپ کو ابھی اسی جال میں رہنا پڑے گا مسٹر ذیشان عالی۔''

''جی......!'' میں نے کہا۔

''اس جال سے باہر نکلنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے یعنی یہ سامنے والا دروازہ، دروازے کے دوسری طرف ساری رات ایک مسلح اسکواڈ ڈیوٹی دے گا۔ اسے ہدایت ہے کہ آپ کی طرف سے ذرا بھی کوئی تحریک ہو تو آپ کو گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے۔''

''شکریہ۔'' میں نے طویل سانس لے کر کہا۔

''امید ہے آپ عقل سے کام لیں گے۔''

''ضرور۔ بس ایک بات بتا دیں۔''

''جی۔ فرمایئے۔؟''

''میری ساتھی کو کہاں لے جایا گیا ہے۔''

''اسے غسل دے کر دفنا دیا جائے گا۔'' وہ اپنے پنجر کو لے کر کہاں بھاگتی پھرے گی۔ ایک پولیس والے نے پر مزاح لہجے میں کہا۔

''برا کریں گے آپ......'' میں نے کہا۔

''کیوں......؟'' وہ اسی شرارت آمیز لہجے میں بولا۔

''وہ ہندو ہے۔ آپ اسے جلا دیں۔'' میں نے کہا اسی وقت دوسرے کانسٹیبل نے کہا۔

''بس کر رحمت خان۔ چل سمجھا دیا اسے باقی اس کی تقدیر۔''

وہ سب باہر نکل گئے۔ اور میں نے اس عجیب دغریب جال کا جائزہ لیا۔ موٹی مضبوط نائلون کی رسیوں سے بنا ہوا تھا بمشکل تمام میں لیٹ سکا تھا لیکن رسیاں بدن میں چبھ رہی تھیں۔ پھر میں نے اس نئی افتاد کے بارے میں سوچا۔ بہت برا ہوا تھا میرے ساتھ۔ بہت ہی منحوس ساعت تھی جب مجھے یہ دونوں، یعنی گوتم بھنسالی اور کوروتی ملے تھے۔ اس کے بعد کچھ ہوا تھا اس سے مجھے کیا حاصل ہوا تھا۔ صدیوں کی تاریخ تو کچھ نہ کچھ دیکھ کر بھی لکھی جا سکتی تھی۔ سارے کام اس طرح ہوتے ہیں۔ پوری دنیا کے سفرنامے ایک چائے خانے میں لکھے جاتے ہیں تاریخ کے کسی بھی گوشے میں ٹانگ اڑا دو۔ تاریخ کے کسی بھی دور یا کسی بھی کردار کے ساتھ بھی رومان انگیز اور رنگین داستان نتھی کر دو۔ سب چلتا ہے، زندہ صدیاں کوروتی کے بغیر بھی لکھی جا سکتی تھی۔ اور اب، سب کچھ ختم پیسہ ہضم۔ لیکن پولیس نے بڑا حیرت انگیز کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ اب کیا ہوگا، ارے باپ رے۔ ڈاکٹر قیصر شاہ کے قتل کی مجرم گرفتار ہوئی ہے اور مجھے اس کا معاون قرار دیا گیا ہے۔

پھانسی، یا عمر قید۔

ساری رات انہی سوچوں میں گزری تھی۔ نیند بھلا کہاں آتی۔ لیٹتا تو رسیاں بدن میں چبھنے لگتیں خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ دن کو دس بجے کے قریب چھ پولیس والے اندر آئے مجھے جال سے نکالا گیا۔ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پیروں میں بیڑیاں پہنائی گئیں پھر ہال سے باہر لایا گیا میرا خون خشک ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے تختہ دار پر جا رہا ہوں۔

پولیس ہیڈ کوارٹر کے ایک شاندار کمرے میں مجھے پہنچایا گیا۔ اس دوران میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ پولیس کو اپنی بے قصوری کی داستان سنا کر رحم کی درخواست کروں گا۔ کمرے میں ایک جگہ مجھے ایک کرسی پر بیٹھا دیا گیا۔ کوئی پانچ منٹ کے بعد ایڑیاں بجنے کی آوازیں سنائی دیں اور پھر بڑی بارعب شکلوں والے پانچ اعلیٰ پولیس افسران اندر داخل ہو گئے انہوں نے اپنی نشستیں سنبھال لیں۔ وہ بری طرح مجھے گھور رہے تھے۔

آخر کار مجھ سے سوالات کی کارروائی شروع ہو گئی۔ ایک شخص نے کاغذ قلم سنبھال لیا۔

''تمہارا نام ذیشان عالی ہے۔''

''جی سر......''

''تم تو بہت عرصے سے لکھنے لکھانے کا کاروبار کر رہے ہو۔''

''جی سر......''

''یہ انسانی ڈھانچہ کوروتی کا ہے......؟ دوسرے افسراعلیٰ نے کہا۔

''جی سر......'' میں نے جواب دیا لیکن مجھے حیرت ہوئی تھی کہ یہ لوگ کوروتی کا نام کیسے جانتے ہیں۔

''کیا یہ جادوگرنی بھی ہے۔''

''نہیں سر۔''

''ذیشان عالی۔ ہم مکمل تفصیل جاننا چاہتے ہیں۔ اصل میں اس کوٹھی سے زندہ صدیاں نامی کتاب کا مسودہ ہمیں حاصل ہوگیا تھا جسے پڑھنے کے بعد ہمیں کوروتی کے بارے میں معلوم ہوا۔ ہمیں اندازہ ہوگیا تھا کہ تم جہاں بھی ہوگے اپنے مسودے کی تلاش میں ضرور آؤگے۔ چنانچہ ہم نے تمہارے پکڑنے کا بہترین انتظام کیا۔''

''ذیشان عالی۔ مسودے میں جو کچھ لکھا ہے کیا وہ سچ ہے؟'' دوسرے افسر نے کہا۔

''جی سر۔ میں صدیوں پر محیط ایک سچی داستان لکھنا چاہتا تھا ایسی داستان جو دنیا بھر میں تہلکہ مچادے۔''

''لیکن......؟''

''ہاں، لیکن کیا؟''

''پھر میں بدترین حالات کا شکار ہوگیا۔''

''کوروتی ڈھانچے کی شکل میں مجھے ملی تھی۔''

''نہیں ایک پروقار عورت کی شکل میں۔ میں نے اپنی کتاب میں اس کے بارے میں لکھا ہے۔''

''پھر وہ ڈھانچے میں کیسے بدل گئی۔'' ایک اور افسر نے کہا۔

''میں بتاتا ہوں۔ میں نے کہا اور انہیں گوتم بھنسالی کی کہانی سنائی۔ وہ بے اعتباری کی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ پوری کہانی سننے کے بعد ایک اور افسر نے کہا۔

''لاک اپ سے نکلنے کے بعد تم لوگوں نے کیا کیا۔''

''ہم پولیس سے پوشیدہ رہنے کے لئے چھپتے رہے۔ ڈاکٹر قیصر شاہ کے قتل سے میرا ذرا بھر تعلق نہیں ہے سر، مجھے کیا ضرورت پڑی تھی وہ کمبخت خود اپنے بدن کی تکمیل کے لئے سرگرداں ہے اور جنونی ہورہی ہے۔'' میں نے اسپتال کی کہانی پھر بے چاری ثنا کے بدن کی تفصیل اور پھر وہاں کی پوری کہانی بے کم وکاست سنادی، پھر فریادی لہجے میں کہا۔ ''میں تو خود اس سے جان چھڑانا چاہتا تھا سر، اسی لئے میں وارڈ بوائے کے لباس میں آکر وہاں سے بھاگا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ ثناء کے وجود میں ہے۔''

''پتھر کی اس کتاب کی کیا کہانی ہے۔''

''اس میں صدیاں پوشیدہ ہیں۔''

''تم نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ تم اس پتھر کی کتاب میں داخل ہوکر ماضی کی سیر کرچکے ہو، ماضی سے واپسی کا کیا طریقہ ہوتا تھا۔''

''وہ خود مجھے ماضی سے حال میں لاتی تھی۔''

''مسٹر علی نواز۔ کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم اسے رہائی کا وعدہ کرکے مجبور کریں کہ وہ کمشنر صاحب اور ان کے ساتھی کو واپس لے آئے۔''

''کیسی باتیں کررہے ہیں آپ، وہ اس کے لئے کیوں تیار ہوگی۔ فرض کریں وہ تیار ہوجاتی ہے اور اپنی کتاب کے ذریعے ماضی میں چلی جاتی ہے پھر کیا وہ پاگل ہے کہ واپس آکر خود کو ہمارے حوالے کردے۔''

''اس کی ایک ترکیب ہے سر۔'' دوسرے افسر نے کہا۔

''کیا......''

''وہ ذیشان عالی سے محبت کرتی ہے، ہم اسے ایک وقت دیتے ہیں وہ کمشنر صاحب کو لے کر واپس آجائے ورنہ اس کی جگہ ذیشان عالی کو سزائے موت دے دی جائے گی۔ دوسری صورت میں ان دونوں کو رہائی دی جاسکتی ہے۔''

''خدا غارت کرے اس بدبخت کو جس نے یہ تجویز پیش کی تھی میں نے دل ہی دل میں اس افسر کو کوسا

دوسرے اس پر غور کرنے لگے تھے۔ پھر سب سے بڑے افسر نے کہا۔

''کیوں مسٹر ذیشان عالی، آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔''

''بات یہ ہے جناب کہ میں ایک ناگہانی مصیبت کا شکار ہوا ہوں، مجھے اس عورت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے وہ آپ کے پاس ہے آپ جیسے چاہیں اسے مجبور کریں، اگر کوئی خدمت میرے سپرد کرنا چاہیں تو میں حاضر ہوں۔ لیکن یہ تسلیم کریں کہ میں بے قصور ہوں۔''

''آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں سچ کہہ رہے ہیں......؟''

''موت کے شکنجے میں جکڑ گیا ہوں۔ اب بھی جھوٹ بولوں گا۔''

''ویسے مسٹر ذیشان عالی، کیا واقعی وہ آب حیات پئے ہوئے ہے کیا اس جدید سائنس کے دور میں ایسی کسی کہانی پر غور کیا جاسکتا ہے۔'' ایک اور افسر نے کہا۔

''واقعی یہ کوئی طلسمی داستان معلوم ہوتی ہے۔'' دوسرا بولا۔

''آپ ایک ترکیب کرکے دیکھ لیں سر۔'' میں نے کہا۔

''کیا......''

''وہ ایک مجرمہ ہے، ایک قاتلہ ہے، ڈاکٹر قیصر شاہ جیسی قیمتی شخصیت کو قتل کرنے کے نتیجے میں اسے سزائے موت تو ملنی ہی چاہئے۔ آپ اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کردیں آپ کو خود پتہ چل جائے گا کہ وہ کتنی سچی ہے اگر وہ مرجاتی ہے تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی اور اپنے نگرانوں کو ہلاک کرنا چاہا تھا۔ ویسے میں آپ سے عرض کردوں کہ اگر وہ آپ کے چنگل سے نکل گئی تو بہت نقصان کرے گی۔''

میری اس تجویز سے وہ بہت متاثر ہوئے تھے۔ دیر تک وہ خاموش رہے، پھر ایک افسر نے کہا۔ ''ہم اس بارے میں مشورہ کریں گے۔ آپ مطمئن رہیں آپ سے تعاون کیا جائے گا، ہمیں کمشنر صاحب کے بارے میں تشویش ہے، کسی طرح وہ بازیاب ہوجائیں۔ اس کے لئے ہمیں آپ کا تعاون درکار ہوگا۔''

''میں حاضر ہوں۔''

''آپ کو ابھی سخت نگرانی میں رکھا جائے گا۔ لیکن آپ کو ہر سہولت مہیا کی جائے گی ہم مشورے کے بعد آپ کو بتائیں گے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ ویسے ایک بات بتائیں، کیا آپ کو دوبارہ سے ایک لاک اپ میں رکھا جائے۔''

''ہرگز نہیں سر۔ میں ہر قیمت پر اس سے جان چھڑانا چاہتا ہوں۔''

''خیر آپ آرام کریں۔''

مجھے واپس لاک اپ میں لے آیا گیا۔ تھوڑا سا اطمینان ہوا ان لوگوں کے دل میں میرے لئے نرم گوشہ پیدا ہوگیا تھا۔ کوروتی بھی اس بار پھنس گئی تھی اس کی پراسرار قوتیں اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ ویسے مجھے اپنی حماقت کا احساس تھا، اخبارات کی خبروں میں کئی جگہ اس بات کی نشاندہی ہوئی تھی کہ ان لوگوں کو میری کتاب کا مسودہ مل گیا ہے اور وہ میرے لئے جال تیار کررہے ہیں لیکن میں اس پر غور نہیں کرسکا تھا۔

کوئی بھی عقل کل نہیں ہوتا، میں بھی نہیں تھا۔ کوروتی سے چھٹکارے کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ بیشک زندہ صدیاں میری شاہکار کتاب ہوتی، لیکن ایسے کسی شاہکار کا کیا فائدہ جو زندگی ہی چھین لے۔

نئے لاک اپ میں مجھے واقعی بہترین سہولتیں دی گئی تھیں عمدہ کھانا، آرام دہ بستر، لیکن میرا اضطراب بے پناہ تھا، سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا ہوگا اعلیٰ حکام بھی الجھن میں تھے، وہ دن بھی گزر گیا، رات کو پھر مجھے اس جگہ طلب کرلیا گیا جہاں پہلے بلایا گیا تھا، وہاں وہی افسران موجود تھے جن سے پہلے ملاقات ہوچکی تھی۔

مجھے بڑے نرم لہجے میں مخاطب کیا گیا۔ ''ہم نے پہلے تمہارے بارے میں غور کیا ہے ذیشان عالی ہمارے خیال میں تم ایک شریف آدمی ہو اور ناگہانی

مشکلات میں گرفتار ہوگئے ہو۔ اس تحقیقات کے بعد تمہارے بارے میں کچھ فیصلے کئے گئے ہیں جو تمہارے حق میں ہیں۔ لیکن ایک خطرناک وجود تم سے منسلک ہے جب تک اس کے بارے میں فیصلہ نہیں ہوتا ہم تمہیں آزاد نہیں کرسکتے۔ وہ جو کوئی بھی ہے ایک خطرناک مجرمہ ہے جس نے کئی پولیس والوں کو زخمی کیا ہے۔ ایک مایہ ناز ڈاکٹر کو قتل کیا ہے اور اس کی وجہ سے ہمارے کمشنر صاحب اور ایک اور افسر لاپتہ ہوئے ہیں ہم اسے فوری موت کی سزا دے سکتے ہیں لیکن تم نے کچھ دہم پیدا کردیئے ہیں اس لئے ہم نے ایک اور فیصلہ کیا ہے۔

''جی سر......؟ میں نے کہا۔

''تمہیں مجبوراً اسی لاک اپ میں پہنچایا جارہا ہے جہاں وہ ہے۔''

''کیوں سر......''

''سب سے پہلے تمہیں یہ معلوم کرنا ہے کہ اس کتاب کے ذریعے جو تاریخ میں پہنچ جاتا ہے اسے واپس کیسے لایا جاسکتا ہے۔ کوئی تو ترکیب ہوگی۔''

''جی......''

''دوسرے تمہیں چالاکی سے یہ معلوم کرنا ہے کہ اس کی موت کس طرح واقع ہوسکتی ہے ہم اسے لاک اپ میں جلاسکتے ہیں تیزاب ڈال کر اس کی ہڈیاں گلا سکتے ہیں۔ اس کی ہڈیوں میں ہائی وولٹیج کرنٹ دوڑا سکتے ہیں وغیرہ۔ مائی ڈیئر ذیشان عالی تمہارے اس تعاون کے عوض نہ صرف تمہیں باعزت رہا کردیا جائے گا بلکہ بہت بڑا انعام بھی دیا جائے گا۔''

''جی......! میں نے تشویش سے کہا۔ مجھے اندازہ ہورہا تھا کہ وہ لوگ بڑے سطحی انداز سے اس کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ وہ بہت آگے کی چیز ہے۔ انہیں مکمل ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن مجھے اپنی زندگی بھی عزیز تھی میں جانتا تھا کہ کوروتی مجھے کبھی نقصان نہیں پہنچائے گی کیونکہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے جبکہ یہ لوگ عدم تعاون پر میری کھال اتار دیں گے۔''

''کیا سوچ رہے ہو مسٹر عالی۔''

''سر...... میں یہ سوچ رہا تھا کہ وہ کس طرح قابو میں آئے گی۔؟''

''گڈ...... ہم آپ کو اس کے پاس بھیج رہے ہیں۔''

''جی سر......! میں نے گردن ہلادی۔''

کوروتی کو میں نے اس حال میں پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ لاک اپ کے اندر ایک دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر خوش ہوگئی اور بولی۔ ''اوہ عالی، میری جان، پاگل ہوگئی ہوں میں تمہارے لئے، مجھے اپنی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ بس تمہارے لئے میں دیوانی ہورہی تھی۔''

وہ اٹھ کر مجھ سے لپٹ گئی لاک اپ کے بارہ پولیس والے حیران نظروں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ایک انسانی ڈھانچہ گوشت پوست کے ایک انسان سے لپٹ کر اسے چوم رہا تھا۔ اور زندہ انسان اس سے خوف زدہ نہیں تھا۔ اس نے کہا۔ ''انہوں نے تمہیں اذیت تو نہیں دی۔''

''نہیں، لیکن غلط ہوگیا ہے۔''

''کیا......؟''

''میری کتاب کا مسودہ ان کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ انہیں ہمارے بارے میں سب معلوم ہوگیا ہے۔ اور اب وہ ہمارے لئے سزا تجویز کررہے ہیں۔''

وہ خاموش ہوگئی جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔ پھر اس نے کہا۔ ''مجھے بتاؤ گے وہ میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں۔''

''ان کا بہت بڑا افسر کتاب کے ذریعے ماضی میں کہیں پہنچ گیا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ تم اسے واپس لانے میں مدد کرو۔''

''اس کے بعد وہ کیا کریں گے۔''

''انہیں اس بات کا یقین نہیں کہ تم امر ہوچکی ہو۔ وہ یہ نہیں مانتے کہ تمہیں موت نہیں آئے گی اس کے بعد وہ تمہیں موت کی سزا دینا چاہتے ہیں۔''

''ہوں......!'' وہ سوچ میں ڈوب گئی، پھر مجھے

اس کی ہنسی کی آواز سنائی دی اور میں نے چونک کر اسے دیکھا پھر بولا۔

''کیا ہوا، تم کیوں ہنسی ہو؟''

''مجھے تمہاری دنیا کی ہوا لگ گئی ہے۔''

''میں نہیں سمجھا۔''

''وہ سازشیں اور چالاکیاں آ گئی ہیں جو تمہاری اس دنیا کا حصہ ہیں۔''

''اب بھی نہیں سمجھا۔'' میں نے کہا۔

''کچھ وقت میرے ساتھ گزار و۔ اور پھر انہیں اطلاع دو کہ تم نے مجھے اس افسر کی واپسی کے لئے راضی کرلیا ہے، پھر مجھے ان سے ملا دو۔''

''اس کے بعد کیا ہوگا۔''

''بس دیکھتے جاؤ، کیا ہوگا۔'' اس نے خطرناک لہجے میں کہا اور میں خاموش ہوگیا۔

عجیب سے احساسات تھے میرے، وہ بھی خاموش بیٹھی تھی۔ میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ کیا کردں پولیس کے اعلیٰ افسران تذبذب میں تھے۔ ایک ایسی مخلوق کے بارے میں وہ یقین نہیں کر سکتے تھے جو صدیوں سے زندہ ہو۔ لیکن میں جانتا تھا کہ کوروتی ایسی ہی ہے جیسا بتاتی ہے اس نے مجھے مہابھارت کا دور دکھایا۔ یونان کے قدیم کردار دکھائے تھے جو میں نے ہوش وحواس میں دیکھے تھے۔ کم ازکم میں اس بات پر یقین رکھتا تھا۔ پھر کافی وقت کے بعد اس نے کہا۔

''عالی......! اب تم ان سے مل لو۔''

''مجھے ان سے کیا لینا ہے۔''

''یہی کہ تم نے مجھے تیار کرلیا ہے کہ میں اس افسر اعلیٰ کو ماضی سے واپس لے آؤں۔ اس کے بدلے وہ تمہیں رہا کردیں گے۔''

''اور تمہیں۔''

''میں خود ان سے بات کرلوں گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ لاک اپ کے جنگلے کے پاس آ کر میں نے پہرے پر موجود کانسٹیبل سے کہا۔ ''افسران کو اطلاع دو کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس کا فوری بندوبست کیا جائے۔''

کوئی آدھے گھنٹے کے بعد مجھے لاک اپ سے نکال لیا گیا اور وہ لوگ مجھے لے کر چل پڑے۔ مجھے اسی جگہ لے جایا گیا جہاں پہلے ان لوگوں سے ملاقات ہوئی تھی۔ ان لوگوں کی اس معاملے سے دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ وہ سب کے سب موجود تھے۔

مجھے خوش آمدید کہا گیا اور پوچھا گیا کہ کوئی کام کی بات ہوئی؟ ''جی سر...... مجھے بڑی شرمندگی سے کہنا پڑ رہا ہے کہ وہ بدبخت مجھ سے بہت محبت کرتی ہے۔''

''ہمیں رپورٹ مل چکی ہے۔'' ایک افسر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں نے اس کو چکر دیا ہے اگر کمشنر صاحب کو ماضی سے نکال لایا جائے تو ہمیں خفیہ طور پر رہائی دی جاسکتی ہے۔ ورنہ اسے قید اور مجھے سزائے موت دے دی جائے گی۔ وہ اس کام کے لئے تیار ہوگئی ہے۔''

''زندہ باد یعنی وہ کمشنر صاحب کو زندہ نکال لائے گی۔'' خوشی سے کہا گیا۔

''کیا وہ سچ کہہ رہی ہے؟''

''ہاں...... یہ وعدہ اس نے مجھ سے کیا ہے۔''

اعلیٰ افسران ایک دوسرے سے مشورے کرنے لگے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ کوروتی کی بات مان لی جائے۔ ایک افسر نے کہا۔

''ہر چند کہ وہ قاتلہ ہے اور تم جو کچھ بھی ہے اس کے شریک کار ہو، لیکن ہم ایک انتہائی قیمتی افسر کی بازیابی کی خوشی میں تم دونوں کو رہا کردیں گے نہ صرف رہا کردیں گے بلکہ اس بدروح کے علاج کے لئے بھی کوششیں کریں گے۔

میں جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ میں انہیں کی دنیا کا باشندہ تھا ان کی رگ رگ سے واقف تھا۔ قانون ان کی ملکیت نہیں تھا کہ وہ کسی قاتل کو معاف کردیتے۔ لیکن صورت حال ہی ایسی آ پڑی تھی کہ جان بوجھ کر بے وقوف بننے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔

''تم اسے اطمینان دلاؤ کہ ہم تم دونوں کو رہا کردیں گے۔''

''ٹھیک ہے جناب!'' میں نے کہا۔ انتظامات کئے جانے لگے۔ میں خود بھی شدید تجسس کا شکار تھا کہ آخر کوروتی کیا کرے گی۔ اس نے بات تو بڑے اعتماد سے کی ہے، لیکن پتہ نہیں اس کا عمل کیا ہوگا وہ کامیاب ہوسکے گی یا نہیں۔''

مجھے اس کے پاس بھیجا گیا اور کہا گیا کہ اسے لے کر آجاؤں۔ پولیس والے اس سے بری طرح خوف زدہ تھے۔ اسے افسروں کے پاس لانے کے لئے جو جتن کئے گئے تھے وہ دیکھنے کے قابل تھے۔ پولیس کے جوانوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ اگر وہ کسی طرح کا خطرہ محسوس کریں تو بندوقوں کے دہانے کھول دیں اور ہم دونوں کا قیمہ بنادیں۔ اس کے بارے میں مجھے بتادیا تھا۔

میں نے کوروتی سے کہا کہ افسران ہم سے تعاون کے لئے تیار ہیں۔ اور اسے طلب کیا گیا ہے۔

''میں ان کے آدمی کو ان کے حوالے کردوں گی اور اگر انہوں نے بدتمیزی کی تو میرے انتقام سے نہیں بچ سکیں گے۔ یہ بات انہیں بتادی جائے۔'' میں نے یہ بات انہیں بتادی۔ وہ سب عجیب نظروں سے کوروتی کو دیکھ رہے تھے۔

''میڈم کوروتی، کیا آپ دل سے ہمارے ساتھ تعاون کے لئے تیار ہیں۔''

''میں بڑی آسانی سے آپ لوگوں کے چنگل سے نکل سکتی ہوں۔ لیکن میرا محبوب کسی مشکل میں گرفتار ہو، میں نہیں چاہتی۔ میں جو کچھ کروں گی اس کے لئے کروں گی۔''

''ہم نے وعدہ کیا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں۔''

''آپ کیا کریں گی؟''

''میں ذیشان عالی کے ساتھ کتاب کے ذریعے تاریخ میں جاؤں گی اور آپ کے دونوں آدمیوں کو تلاش کروں گی اور انہیں واپس لے آؤں گی۔''

''ذیشان عالی کے ساتھ۔''

''ہاں۔''

''سوری میڈم، ہم یہ رسک نہیں لے سکتے، معاف کیجیے ہم یہ سوچنے میں حق بجانب ہیں کہ آپ اپنے محبوب کے ساتھ تاریخ میں گم ہوجائیں گی اور ہم آپ کا انتظار کرتے رہ جائیں گے۔'' سب سے بڑے افسر شاہ میر صاحب نے کہا۔

''پھر آپ کیا چاہتے ہیں۔''

''آپ تنہا جائیں اور اپنا کام کرکے واپس آئیں، ذیشان عالی ضمانت کے طور پر ہمارے پاس رہیں گے۔''

''مجھے اپنے ساتھ لے جانے کے لئے کسی کی ضرورت ہوگی۔'' کوروتی نے کہا۔

''ہم میں سے کوئی آپ کے ساتھ جاسکتا ہے۔''

''مجھے اعتراض نہیں، کیونکہ میں خلوص سے آپ کی مدد کرنے کے لئے تیار ہوں۔''

''اس کے لئے میں تیار ہوں۔'' شاہ میر صاحب نے دلیری سے کہا۔

''سر...... آپ ہم میں سے کسی کو حکم دیں۔'' چند افسران نے کہا۔

''نہیں، یہ میری زندگی کا سب سے دلچسپ تجربہ ہوگا۔'' شاہ میر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

تھوڑی سی ردوقدح کے بعد یہ مسئلہ حل ہوگیا۔ یہ ایک ناقابل یقین تجربہ تھا جس کے لئے بڑی سنسنی محسوس کی جارہی تھی یہ کام فوری طور پر کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا۔ پھر ایک بند گاڑی تمام افسروں کے ساتھ مجھے اور کوروتی کو لے کر کوروتی کی کوٹھی کی طرف چل پڑی۔

میں خود بھی ان میں تھا۔ نہ جانے کوروتی کیا کرنا چاہتی ہے۔ اس نے مجھے بھی اس بارے میں نہیں بتایا تھا۔ ویسے میرا خیال تھا کہ وہ مجھے ساتھ لے کر تاریخ کے کسی دور میں چلی جائے گی اور یہ لوگ انتظار کرتے رہ جائیں گے۔ لیکن وہ شاہ میر کے ساتھ جانے پر تیار ہوگئی تھی۔ اب موقع بھی نہیں تھا کہ میں کوروتی سے اس کے

منصوبے کے بارے میں پوچھ سکتا۔

ہم کوروتی کی کوٹھی پہنچ گئے۔ شدید سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ پولیس کے افسران شدید ہیجان کا شکار تھے۔ انہوں نے کوروتی سے پوچھا۔ ''آپ کو یہ کیسے پتہ چلے گا کہ کمشنر صاحب اور ہمارا دوسرا ساتھی کس دور میں ہیں۔''

''آپ سب لوگ میرے ساتھ چلیں اور سب مل کر انہیں تلاش کریں ورنہ میرا کام مجھے ہی کرنے دیں تو بہتر ہے۔'' کوروتی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ اس کے بعد سب خاموش ہوگئے تھے کوروتی نے تیاریاں کیں پھر شاہ میر کو اشارہ کیا اور کتاب کی سیڑھیاں طے کرنے لگی سب کے چہرے پر شدید سنسنی پھیلی ہوئی تھی کوروتی ایک ابھار پر چڑھ گئی اس نے شاہ میر کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ اس کے بعد اس نے سب کی طرف ہاتھ ہلایا اور شاہ میر سمیت کتاب کے تعویز میں غرق ہوگئی۔

حقیقت یہ تھی کہ مجھے بھی کوروتی کے منصوبے کا علم نہیں تھا کہ وہ کیا کرے گی۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ زیادہ چالاک نہیں ہے، بیشک وہ پراسرار علوم کی ماہر تھی، لیکن جدید دور کے علوم اس سے زیادہ پراسرار تھے اور وہ ان سے ہار سکتی تھی۔

ان لوگوں نے مجھے یرغمال بنا کر رکھا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کوروتی میری دیوانی تھی لیکن میں اس کی وجہ سے بڑے عذاب میں گرفتار ہوگیا تھا۔ کافی وقت گزر گیا۔ ایک افسر نے مجھ سے پوچھا۔ ''آپ کا کیا خیال ہے عالی صاحب۔ اس کی واپسی کب تک ہوجائے گی۔''

''یہ آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں؟''

''کیا مطلب......''

''آپ کو اس سے پوچھنا چاہئے، ویسے میں ایک بات آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔''

''جی فرمایئے۔''

''زندہ صدیوں کا مسودہ میری زندگی کا بہت بڑا کام تھا۔ میری یہ کتاب ساری دنیا میں تہلکہ مچا دیتی پتہ نہیں بین الاقوامی طور پر میری کتنی پذیرائی ہوتی۔ جتنی تاریخ لکھی گئی ہے وہ سب میری اس کتاب کے سامنے ہیچ ہوتی کیونکہ میں ان ادوار کا دیدہ ور ہوتا۔ اور تاریخ کا آنکھوں دیکھا حال لکھتا لیکن، میں دوسری شکل میں گرفتار ہوگیا مجھے اپنے مسودے کی گمشدگی کا بے حد دکھ ہوا تھا لیکن اب میں اس سے خوش ہوں۔

''وہ کیوں......'' ایک نے دلچسپی سے پوچھا۔

''کیونکہ آپ لوگوں نے اس مسودے کو پڑھ لیا ہے۔''

''اس سے کیا فرق پڑا۔''

''آپ اس کے ذریعہ بہت سی حقیقتوں سے واقف ہوگئے ہیں۔ اس کا آپ کو بھی یقین ہوگا کہ وہ میں نے آپ کے لئے نہیں لکھا تھا، اس کی رو سے میں ایک ناگہانی کا شکار ہوں اور اس کے جرم میں، میں براہ راست ملوث نہیں ہوں نہ ہی وہ جرم میری وجہ سے کیا گیا ہے۔''

''ہم نے آپ کے ساتھ نرم رویہ رکھا ہے۔'' افسر نے کہا۔

''میری دلی دعا ہے کہ کمشنر صاحب اور دوسرے ساتھی بازیاب ہوجائیں، لیکن اس بات کو تسلیم کیا جائے کہ کوروتی کے کسی جرم میں، میں شریک نہیں ہوں۔''

وقت بہت گزر گیا۔ کافی رات ہوگئی، کوروتی کی کوٹھی میں باقاعدہ آپریشن اسٹیشن بنالیا گیا۔ ان لوگوں کے وہیں کھانے پینے کا بندوبست کرلیا تھا۔ مجھے بھی اس میں شریک کیا تھا ساری رات گزر گئی سب جاگتے رہے تھے۔

اس وقت صبح کے چار بج رہے تھے جب کتاب کے تعویز سے کچھ آہٹیں ابھریں اور سب لوگ ہوشیار ہوگئے خود میری نظریں بھی اس طرف جمی ہوئی تھیں۔ سب سے پہلے تعویز سے شاہ میر صاحب برآمد ہوئے تھے۔ جیسے ہی وہ آگے بڑھ کر سیڑھیوں کے پاس پہنچے سب لوگوں نے ان کی طرف دوڑ لگادی۔ انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ شاہ میر صاحب بڑے تھکے تھکے نظر آرہے تھے۔ انہوں نے نحیف آواز میں کہا۔

’’میں جن عجیب وغریب حالات سے گزرا ہوں انہوں نے میرے دماغ کی چولیں ہلادی ہیں۔ لیکن میں آپ لوگوں کو مختصراً صورت حال ضرور بتاؤں گا۔اس کے بعد براہ کرم مجھے آرام کا موقع دیا جائے۔‘‘

’’ضرور سر...... کیا کمشنر صاحب کا کچھ پتہ چلا۔‘‘

’’نہیں......لیکن امید ہے کہ وہ انہیں تلاش کرکے ضرور لے آئے گی۔ کیونکہ اس کی مجبوری ہمارے ہاتھ میں ہے۔یعنی ذیشان عالی۔‘‘

’’ہمیں کچھ تفصیل بتایئے سر۔‘‘

’’ہاں......ایک عجیب طلسمی ماحول میں وہ مجھے لے گئی۔ یہ راجہ بکر ماجیت کا دور تھا، دربار شاہی لگا تھا، قدیم ماحول تھا، وہاں کمشنر صاحب کو تلاش کیا گیا بہت کوششیں کی گئیں لیکن کوئی پتہ نہیں چل سکا، پھر ہم دوسرے ادوار میں گئے۔ کوروتی ہمارے ساتھ بھرپور تعاون کررہی تھی۔ وہ خود بھی پریشان تھی، وہاں کی فضا میری زندگی کے لئے بہت خطرناک تھی میں بھرپور سانس نہیں لے پارہا تھا۔وہ پریشان ہوگئی، اس نے کہا وہ کمشنر صاحب کی بازیابی کے لئے مخلص ہے،لیکن میں خود دیکھ لوں یہ اتنا آسان کام نہیں ہے، میں نے اس سے کہا کہ شاید میں وہاں زیادہ دیر نہ رہ سکوں۔تب اس نے پریشانی سے کہا کہ کمشنر صاحب کے بارے میں یہ تعین نہیں ہوسکا کہ وہ کون سے دور میں ہیں انہیں تلاش کرنے میں وقت لگے گا تب میں نے تجویز پیش کی کہ اگر وہ رک کر انہیں تلاش کرے تو وہ مل سکتے ہیں وہ مجھے واپس پہنچادے۔وہ مان گئی اور مجھے واپس پہنچا گئی۔‘‘

’’اوہ۔اس نے کوئی وعدہ کیا ہے؟‘‘

’’ہاں۔اس نے کہا ہے کہ وہ یہ کام جلد سے جلد کرے گی،لیکن اس کی شرط ہے کہ ذیشان عالی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ ورنہ وہ کمشنر صاحب کو ہلاک کردے گی۔‘‘

شاہ میر صاحب کو ان کے گھر پہنچادیا گیا۔ مجھے بھی کوٹھی سے لے آیا گیا انہوں نے آپس میں مشورہ کیا اور مجھے ایک افسر صاحب کے گھر لے جایا گیا جہاں میرے لئے ایک بیڈ روم کا بندوبست کیا گیا لیکن مجھے بتادیا گیا کہ میں سخت پہرے میں ہوں اور یہاں سے فرار ہونے کی کوشش نہ کروں ورنہ بنا ہوا کام بگڑ جائے گا۔

دن نکل آیا تھا۔لیکن مجھے سخت نیند آرہی تھی۔ مجھے بہترین ناشتہ دیا گیا اور ناشتے کے بعد میں گہری نیند سو گیا۔ دوپہر کو دو بجے آنکھ کھلی تو شاید بخار ہوگیا تھا۔ جن صاحب کے گھر میں تھا وہ بھی بہت بڑے پولیس افسر تھے۔ میرے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا جارہا تھا۔ ڈاکٹر کو بلا کر مجھے چیک کرایا گیا انجکشن دیا گیا پھر کھانا دیا گیا۔ رات بھر جاگا تھا اس لئے طبیعت خراب ہوگئی تھی۔لیکن دل بھی پریشان تھا، اب ہوگا کیا، کیا کوروتی کمشنر کو تلاش کرلے گی، کیا کمشنر زندہ ہوگا۔ اگر وہ نہ ملا تو کیا کوروتی خود کو ان کے حوالے کردے گی۔یا پھر کوئی اور کھیل شروع ہوجائے گا؟

کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ طبیعت پر شدید جھنجلاہٹ طاری تھی۔ میں زندہ صدیوں کو کوس رہا تھا جس نے مجھے عذاب میں گرفتار کردیا تھا۔ بلکہ مجھے اس سے نفرت ہوتی جارہی تھی۔خواہ مخواہ مجرم بن کر رہ گیا تھا۔

یہ رات دوسرا دن پھر تیسرا دن، مجھ سے کسی طرح کا رابطہ نہیں کیا گیا تھا لیکن میں نے محسوس کیا تھا کہ میرے اوپر سخت پہرہ رکھا جاتا ہے۔اور یہاں سے کسی طور فرار کی گنجائش نہیں ہے۔

پھر میری ان افسر صاحب سے ملاقات ہوئی جن کا میں مہمان تھا۔ وہ خود ہی میرے کمرے میں آئے تھے۔’’جی ذیشان عالی۔لگتا ہے کوروتی ہمیں دھوکا دے گئی۔‘‘

’’میں کیا کہہ سکتا ہوں۔‘‘ میں نے خشک لہجے میں کہا۔

’’آپ سے بھی اس کا کوئی رابطہ نہیں ہوا۔‘‘

’’ہاں اس کی روح خواب میں آئی تھی۔ میرا

مذاق اڑا رہی تھی۔"

"حواس قائم رکھ کر بات کریں جو کچھ ہوا ہے آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔" افسر نے بگڑ کر کہا۔

"ٹھیک ہے آپ مجھے ڈاکٹر قیصر شاہ کا قاتل قرار دے کر سزائے موت دلوادیں۔ ایسے کام آپ کے لئے کون سے مشکل ہوتے ہیں۔" میں نے کہا اور افسر کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ بمشکل تمام انہوں نے خود پر قابو پایا اور بولے۔

"لگتا ہے آپ کا ذہنی توازن خراب ہوگیا ہے۔ آپ نے جو بکواس کی ہے اس کا جواب میں ایسا دے سکتا ہوں کہ آپ مرنے کے بعد بھی یاد رکھتے۔"

"بڑی عمدہ بات کہی ہے آپ نے۔ یعنی کرنے کے بعد، ظاہر ہے آپ کی ناراضگی کے بعد زندہ رہنے کا تو تصور ہی مٹ جاتا ہے۔ لیکن محترم، اتفاق سے قدرت نے میری بے گناہی کا ثبوت میرے مسودے کی شکل میں آپ تک پہنچادیا ہے آپ نے اس میں پڑھ لیا ہے کہ وہ بلا مجھ پر کس طرح نازل ہوئی۔ وہ سب کچھ میں نے آپ کے لئے نہیں لکھا تھا۔"

افسر صاحب خود کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ پھر بولے۔" خیر آپ سے تفصیل سے بات ہوگی۔ فی الحال آپ کو یہ بتانا ہے کہ شاہ صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"شاہ میر صاحب۔"

"جی۔"

"مجھے اب کسی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ مجھے میری قسمت کا فیصلہ سنادیا جائے۔ میں نے بیزاری سے کہا۔"

"یہ فیصلہ بھی وہ خود ہی سنادیں گے۔ آپ تیاری کریں۔"

"مجھے کیا تیاری کرنی ہوگی؟" میں نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

"آپ کے لباس وغیرہ آپ کے گھر سے منگوائے گئے ہیں، آپ اپنا حلیہ ٹھیک کرلیں، آپ کو شاہ میر صاحب کی کوٹھی جانا ہوگا۔"

"اوہو، اس کا مطلب ہے کہ پولیس میرے گھر پر بھی قبضہ کرچکی ہے۔ ویری گڈ۔"

"تم ضرورت سے زیادہ بکواس کررہے ہو۔ اگر شاہ میر صاحب اس وقت تمہارا انتظار نہ کررہے ہوتے تو میں تیر کی طرح سیدھا کردیتا۔" افسر صاحب نے کہا۔ وہ آپ سے تم پر آگئے۔ اور شاید میں اس کے بعد کچھ کہتا تو......

میں غسل خانے میں داخل ہوگیا۔ وہاں میرے کپڑے بھی تھے۔ شیو وغیرہ کرنے کا سامان بھی چنانچہ میں نے تیاری کرلی۔ باہر نکلا تو ایک ایس آئی میرا انتظار کررہا تھا۔"

"چلیں......؟" اس نے پوچھا۔

"جی......!" میں نے جواب دیا۔ اور اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔ باہر ایک پولیس موبائل کھڑی ہوئی تھی جو مجھے لے کر چل پڑی۔ راستے بھر میں سوچ میں ڈوبا رہا تھا، کیا ہوگا، شاہ میر نے مجھے کیوں طلب کیا ہے، پھر ہم ایک شاندار کوٹھی پر پہنچ گئے۔ عالی شان کوٹھی میں چاروں طرف پولیس والے بکھرے ہوئے تھے۔ وہ مختلف کام سرانجام دے رہے تھے مجھے کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں پہنچادیا گیا۔

مجھے بیٹھے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ پروقار شخصیت کے مالک شاہ میر صاحب اندر داخل ہوگئے۔ میں ان کے احترام میں کھڑا ہوگیا۔

"بیٹھئے ذیشان عالی!" انہوں نے کہا۔ اور خود بھی میرے سامنے بیٹھ گئے۔ کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد انہوں نے کہا۔" مجھے کچھ عجیب شواہد ملے ہیں میں آپ سے ان کی تصدیق چاہتا ہوں۔"

"جی۔ فرمائیے۔"

"ایک سوال کروں آپ سے۔"

"میں حاضر ہوں۔"

"جیسا کہ آپ کی کتاب سے ظاہر ہے کہ کوروتی آپ کو بے پناہ چاہتی ہے، دیکھئے میں آپ

سے کچھ کھلے سوالات کر رہا ہوں۔ آپ محسوس نہ کریں اور مجھے ان کے صحیح جواب دیں۔''

''جی۔'' میں نے مختصراً کہا۔

''وہ آپ کو بے پناہ چاہتی ہے، کیا ایسا ہے؟''

''جی...... ایسا ہے۔''

''کیا اس کے اور آپ کے درمیان ہر طرح کے تعلقات قائم تھے، آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہوں گے۔''

''جی ہاں......''

''تعلقات تھے۔''

''جی۔''

''جب تک اس کی جسمانی کیفیت بہتر تھی آپ بھی اسے پسند کرتے ہوں گے۔''

''جی۔''

''اس کے بعد، میرا مطلب ہے جب وہ ڈھانچے کی شکل میں رہ گئی۔''

''آپ یہ سوال خود کو میری جگہ رکھ کر سوچیں اور مجھے اس کا جواب دیں۔''

''نہیں۔ یہ جواب آپ کو دینا ہے۔'' شاہ میر صاحب نے سنجیدگی سے ان کے لہجے میں ایک حکم کی سی کیفیت تھی۔

''میں ان لمحات میں سخت اذیت کا شکار رہتا تھا۔''

''کن لمحات میں۔''

''جب ایک انسانی ڈھانچے کو مجھے اپنی قربت میں برداشت کرنا پڑتا تھا، آپ خود سوچئے ان لمحات میں کسی انسان کی کیا کیفیت ہو سکتی ہے۔''

''وہ آپ سے مطمئن ہوئی تھی۔''

''جی۔''

''گویا اسے اپنی اس کیفیت کا احساس نہیں ہوتا تھا۔''

''شاید نہیں۔''

''ہوں!'' شاہ میر صاحب گہری سنجیدگی سے ہنکارہ بھر کر خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر کے بعد انہوں نے کہا۔ ''جہاں آپ کو رکھا گیا ہے وہاں آپ کو کوئی تکلیف ہوئی؟''

''نہیں۔''

''وہاں آپ سے کچھ سوالات کئے تھے۔''

''نہیں۔''

''کچھ کھانا پینا پسند کریں گے۔''

''شکریہ سر...... آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔''

''بتایئے......؟''

''یہ سوالات جو آپ نے مجھ سے کئے ہیں میرے لئے بالکل غیر متوقع ہیں۔ ان کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''میں آپ کی مکمل تسلی کروں گا۔ تھوڑا توقف کریں۔'' شاہ میر نے کہا۔ اور میں خاموش ہو کر گہری سانسیں لینے لگا۔

شاہ میر کے سوالات نے مجھے چکرا کر رکھ دیا تھا۔ اور میں کوئی نتیجہ اخذ کرنے میں ناکام رہا تھا۔ اچانک انہوں نے سوال کیا۔

''کار ڈرائیور کر سکتے ہو؟''

''جی......'' میں نے جواب دیا۔

''ہمیں تھوڑا سا سفر کرنا ہوگا، آؤ اٹھو۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھے تو میں بھی اٹھ گیا۔ پھر ہم دونوں باہر نکل آئے۔ انہوں نے ایک پولیس والے کو اشارہ کیا تو وہ دوڑتا ہوا پاس آ گیا۔ اس نے ادب سے سلوٹ کیا۔

''فضل سے کہو گاڑی لائے۔'' شاہ میر صاحب نے پر رعب لہجے میں کہا۔ اور پولیس والا دوڑ گیا کچھ ہی لمحوں میں ایک ہنڈا سٹی پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس سے اترنے والے باوردی کانسٹیبل نے جلدی سے پچھلا دروازہ کھول دیا۔ شاہ میر اندر بیٹھ گئے اور ڈرائیور سے کہا۔

''چابی انہیں دے دو۔ گاڑی یہ چلائیں گے۔''

ڈرائیور نے جلدی سے چابی مجھے دے دی اور میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے چابی سنبھال لی۔ ''چلو ذیشان، کار

ڈرائیو کرو۔“

میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا اور میں نے اسٹیئرنگ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کردی، پھر میں گاڑی کو عمارت سے باہر نکال لایا۔ ”بائیں سمت چلو۔“ شاہ میر نے پر رعب لہجے میں کہا۔ اور میں نے گاڑی آگے بڑھادی۔ میری عقل چکرائی ہوئی تھی یہ سب مجھے بے حد پراسرار لگ رہا تھا۔ لیکن میں کار دوڑا رہا تھا۔ اس بات پر حیران تھا کہ شاہ میر نے ایک گرفتار شدہ شخص پر اتنا بھروسہ کیوں کرلیا، میں فرار ہونے کے لئے انہیں کوئی بھی ڈاج دے سکتا تھا۔ لیکن یہ بھی سوچا میں نے کہ وہ ایک بڑے پولیس آفیسر ہیں بلاوجہ میں اتنے بڑے عہدے تک نہیں پہنچے ہوں گے۔ یقیناً وہ مسلح ہوں گے اور میری کوئی بھی غلط حرکت محسوس کرکے میری کھوپڑی اڑا سکتے ہیں۔

وہ مجھے راستے بتاتے رہے۔ پھر ہم شہر سے باہر نکل آئے۔ اب میری حیرت عروج پر پہنچتی جارہی تھی۔ کیا چاہتا ہے یہ شخص اور مجھے کہاں لے جارہا ہے۔ ہم شہر سے کوئی ساٹھ کلو میٹر دور نکل آئے۔ پھر ایک جگہ شاہ میر صاحب نے کہا۔ ”رفتار سست کردو۔ آگے بائیں ہاتھ پر ایک پگڈنڈی ہے اس پر اتر جانا۔“

”جی سر، لیکن۔“ میں نے کہا۔

”چلتے رہو۔ سب بتادوں گا۔“ انہوں نے میری ہچکچاہٹ کے جواب میں کہا۔ پگڈنڈی کوئی آدھے کلو میٹر تھی۔ اچھی خاصی چوڑی پگڈنڈی تھی میں نے احتیاط سے کار نیچے اتاری اور سست رفتاری سے آگے بڑھتا رہا۔ تھوڑے فاصلے پر بہت قدیم کھنڈرات نظر آرہے تھے۔ یہ گجنالہ کے کھنڈرات کہلاتے تھے اور سکندر اعظم کے منسوب کہلاتے تھے۔ میں نے صرف ان کے بارے میں سنا تھا کبھی دیکھا نہیں تھا اکثر سر پھرے یہاں پکنک منانے آجاتے تھے۔

کار ان کھنڈرات کے پاس پہنچ گئی۔ بڑی خوف ناک جگہ تھی۔ شاہ میر نے ان کے دوسری طرف جانے کے لئے کہا۔ اور میں نے ان کی اس ہدایت پر بھی عمل کیا، لیکن میرا سر چکرا رہا تھا۔ شاہ میر مجھے یہاں کیوں لائے ہیں۔ وہ کار سے اترے اور کھنڈر کی طرف بڑھنے لگے۔ انہوں نے مجھے بھی ساتھ آنے کا اشارہ کیا تھا۔

میں ان کے ساتھ کھنڈر میں داخل ہوگیا۔ بڑی خوف ناک جگہ تھی۔ لیکن عمارت کے کچھ کمرے اس قابل تھے کہ ان میں کچھ وقت گزارا جاسکے۔ وہ میرے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہوگئے۔ یہاں پتھر کی سلیں لگی ہوئی تھیں۔ ان کی پاٹھ دار آواز ابھری۔

”بیٹھو ذیشان عالی۔“ یہ کہہ کر وہ پتھر کی ایک سل پر بیٹھ گئے۔ میں ان سے تھوڑے فاصلے پر بیٹھ گیا۔ وہ کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کچھ لمحوں کے بعد انہوں نے سر اٹھایا اور بولے۔ ”ذیشان عالی، میں...... میں کوروتی ہوں۔“

میں سل پر سے گر پڑا۔ کنارے پر ہی ٹکا ہوا تھا۔ بدن کو اتنی زور کا جھٹکا لگا تھا کہ توازن قائم نہ رہ سکا۔ اس بات پر کبھی یقین نہ کرتا اگر کوروتی کی آواز نہ سن لیتا۔ اس کا انداز نہ پہچان لیتا کھسیائے ہوئے سے انداز میں اٹھا اور دوبارہ سل پر بیٹھ گیا۔

”تمہیں بہت حیرت ہوئی ہے۔“ آواز دوبارہ سنائی دی۔ اور میں گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ آواز دوبارہ ابھری۔ ”یہی میرا منصوبہ تھا۔ ان لوگوں پر اسی طرح قابو پایا جاسکتا تھا۔ پولیس کمشنر کس دور میں گیا ہے۔ وہاں اس پر کیا گزری، میں بھی نہیں جانتی۔ وہ ماضی میں چلا گیا وہ نہیں جانتا ہوگا کہ ماضی میں خود کو کس ادوار میں ضم کیا جاسکتا ہے وہ زندہ نہ رہ سکا ہوگا میں بھلا اسے کیا لاتی۔ مگر ان سے گلوخلاصی کا یہی ایک طریقہ تھا جو میں نے اختیار کیا۔ تم خاموش کیوں ہو۔ کیا ابھی یقین نہیں آرہا۔“

”تم واقعی کوروتی ہو۔“

”میری آواز تک بھول گئے۔“

”نہیں۔ آواز تمہاری ہی ہے۔“ میں نے مری مری آواز میں کہا۔

”تمہیں حیرت نہیں ہونی چاہئے۔ میں اس کے علاوہ کچھ نہیں کرسکتی تھی میں اسے ساتھ لے کر بکرماجیت

کے دور میں گئی۔ کچھ وقت وہاں گزارا پھر میں نے اسے گردن دبا کر ہلاک کر دیا۔ مجبوری تھی میں کسی مردہ بدن میں ہی داخل ہو سکتی ہوں۔ اسے مارنے کے بعد میں نے اس کا بدن حاصل کیا اور واپس آ گئی۔''

''تب سے تم اس بدن میں ہو۔''

''ہاں۔ یہ بھی مجبوری ہے۔''

''کیا مطلب۔''

''میں اس کا بدن چھوڑوں گی تو یہ اپنے اصلی جسم کے ساتھ نمایاں ہوگا۔ تمہیں شاء کا بدبودار بدن یاد ہوگا۔ سڑا ہوا گوشت، ہڈیوں سے جدا ہوتا ہوا۔''

''ہاں۔'' میں نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

''اس کا گوشت بھی اب گلنا شروع ہو گیا ہوگا۔ بس یہی میری پلاننگ تھی۔ میں اسے لے کر گئی اور پھر اسے ختم کر کے اس کے روپ میں واپس آ گئی۔''

''گویا تم نے ایک اور انسانی زندگی لے لی۔'' میں نے افسردگی سے کہا۔ اور اچانک اس کے چہرے پر خشونت کے آثار پھیل گئے۔ اس کی پر کیفیت کا اظہار شاہ میر کے تاثرات سے ہو رہا تھا۔ اس نے کسی قدر کرخت لہجے میں کہا۔

''ہاں۔ ایک اور کیا۔ اب میں اپنی ضرورت کے مطابق انسانی زندگیاں لیتی رہوں گی۔ مجبوری ہے ذیشان عالی، میں نے ہر دور کے انسان کا تجربہ کیا ہے۔ خصوصاً مرد، ذیشان تم لوگ بے حد خود غرض ہوتے ہو۔ صرف اپنے لئے جیتے ہو، کوئی تمہارے لے کچھ بھی کرے لیکن تم اسے اپنے دل میں کوئی مقام نہیں دیتے۔ تم اپنی پسند مقدم رکھتے ہو۔''

''تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔'' میں نے کہا۔

''تم نے میرا دل ٹکرے ٹکڑے کر دیا۔''

''میں نے ......'' میں حیرت سے بولا۔ اور وہ شاہ میر کی حیثیت سے مجھے گھورنے لگی۔ پھر اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''آپ کے اور اس کے درمیان ہر طرح کے تعلقات تھے۔''

''جب تک اس کی جسمانی کیفیت بہتر تھی آپ بھی اسے پسند کرتے ہوں گے۔''

''اس کے بعد جب میں ڈھانچے کی شکل میں رہ گئی۔''

''یہ سوالات میں نے اپنے اور آپ کے درمیان کی آخری حد متعین کرنے کے لئے کئے تھے اور آپ کو اپنے جواب ضرور یاد ہوں گے۔''

میرے مسامات نے پسینہ اگل دیا۔ کم بخت نے شاہ میر کی حیثیت سے یہ سوالات کئے تھے، اور میں نے ان کے سچے جواب دیئے تھے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ شاہ میر کے روپ میں کورونی ہے۔ جو میرے دل میں تھا وہ میں نے کہہ دیا تھا۔ اب کیا کروں؟ ڈھٹائی کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے خود کو سنبھال کر کہا۔

''کیا کہنا چاہتی ہو۔''

''یہ کہ اب میں خود کو دھوکہ دینا نہیں چاہتی۔''

''مطلب۔''

''تمہارے دل کی بات جان چکی ہوں اور اب اپنے دل کی بات تمہیں بتانا چاہتی ہوں۔''

''بتاؤ۔''

''میں نے ان صدیوں میں ایک سے ایک حسین مرد دیکھا ہے۔ بے شمار میری طرف جھکے بھی ہیں لیکن میں نے ان پر تھوکا بھی نہیں۔ میری بدنصیبی کے اس دور میں آ کر میں تمہاری محبت میں گرفتار ہو گئی اور میری شخصیت پارہ پارہ ہو گئی۔ میں نے اپنا وجود اپنی محبت کو سونپ دیا۔ مجھے ان لمحات کی چاہت نہیں تھی جو میں نے تمہیں دیئے میں تو تمہارے دل کی ہر خوشی چاہتی تھی۔ اور میں نے تمہاری ہر مانگ پوری کر دی، میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ میں عورت ہوں۔ اور عورت کی طلب ایک مرد بھی ہوتا ہے، تم میرے مرد بن گئے اور میں تمہاری دیوانی ہو گئی۔ مجھے ہر وقت یہ غم کھائے جاتا تھا کہ تم بوڑھے ہو جاؤ گے مر جاؤ گے پھر میں کیا کروں گی لیکن میرے پاس اس کا کوئی حل نہیں تھا البتہ میں اپنے ذہن میں مسلسل یہ سوچ رہی تھی کہ تمہیں کیسے امر

کروں۔ خیر ...... یہ الگ بات ہے اب جبکہ مجھے تمہارے دل کی بات معلوم ہو چکی ہے مجھے پتہ چل چکا ہے کہ تم مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہو تو میں نے بھی ایک فیصلہ کیا ہے۔
''کیا فیصلہ......؟'' میں نے سوال کیا۔
''میں خود کو تمہاری پولیس کے حوالے کئے دیتی ہوں۔ میں انہیں پوری تفصیل بتادوں گی، ان سے کہہ دوں گی کہ قیصر شاہ کے قتل اور اب شاہ میر کے قتل میں ذیشان عالی کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ اس کی ذمہ دار میں ہوں۔ وہ میرے ساتھ جو بھی سلوک کریں۔''
میں اس کے الفاظ سے بہت متاثر ہوا تھا۔ کچھ سوچنے کے بعد میں نے کہا۔ ''نہیں کوروتی میں یہ نہیں چاہتا دیکھو۔ میں انسان ہوں، ایک نئی دنیا سے میرا تعلق ہے۔'' ''تم خود سوچو۔ بس میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ میں کیا چاہتا ہوں۔''
''تم جو چاہتے ہو وہ بھی کر سکتی ہوں۔'' اس نے کہا۔
''کیا......؟''
''یہ میں تمہیں نہیں بتاؤں گی۔''
''کیا مطلب......؟'' میں نے کہا۔ لیکن وہ خاموش رہی۔ میں نے اس کے بعد کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ شاہ میر کی شکل میں خاموش بیٹھی رہی۔ پھر بولی۔
''شاہ میر کے بدن کا کیا کریں۔''
''یہ تو مر چکے ہیں۔''
''ہاں اور اب گلنا سڑنا شروع ہو گیا ہوگا۔''
''تم ان کے بدن میں رہو۔''
''نہیں، تمہیں یاد ہوگا شا کے بدن میں بھی میں زیادہ دیر نہیں رہ سکی تھی۔ یہ بدن شاید اتنا بھی ساتھ نہ دے سکے۔ میں محسوس کر رہی ہوں ایک صورت یہ ہے کہ ہم اسے یونہی چھوڑ دیں اور یہاں سے چلیں۔''
''یہ بہتر نہیں ہوگا۔ اسے ان کے لواحقین کے پاس پہنچنا چاہئے تاکہ وہ ان کی تجہیز و تکفین کر سکیں میں کسی لاش کی یہ بے حرمتی برداشت نہیں کر سکتا۔''
''اور میری......؟'' وہ طنز سے بولی۔
''ایسی باتیں نہ کرو کوروتی۔''
''ایک آخری بات بتادو، براہ کرم ایک آخری بات بتادو۔''
''پوچھو......!''
''جب تک زندگی ہے۔ میرا ساتھ پسند کرو گے۔''
''سوچنے کی ضرورت نہیں تھی، میں ایک بے گناہ مجرم تھا۔ لیکن میرے ہم وطن کبھی نہیں مانیں گے کہ میں بے گناہ ہوں۔ زندہ صدیاں بھی ان کے قبضے میں ہے۔ کوروتی کا ساتھ چھوڑ دیا تو کیا کروں گا۔ وہ کم از کم اپنی پراسرار قوتوں کا سہارا تو لے گی۔'' چنانچہ میں نے کہا۔
''ہاں...... میں تمہارا ساتھ پسند کروں گا۔''
''دل سے۔''
''ہاں......''
وہ خوش ہو گئی جس کا اظہار اس کی آنکھوں سے ہو رہا تھا۔ یعنی شاہ میر کی آنکھوں سے۔ پھر وہ کچھ دیر سوچتی رہی، پھر بولی۔
''شاہ میر کی حیثیت سے اس کے گھر میں رہنا ہمارے لئے خطرناک ہوگا۔ پولیس والے بہرحال ذہین ہوتے ہیں۔ اور پھر تمہارا شاہ میر کے ساتھ رہنا کوئی مقصد نہیں رکھتا۔''
''ہاں ایسا ہے، لیکن میں شاہ میر کی لاش یہاں نہیں چھوڑ سکتا اسے ان کے گھر والوں تک پہنچنا چاہئے۔'' میں نے کہا۔
''یوں کرتے ہیں، تم معمول کے مطابق کار لے کر چلو، کسی معروف جگہ میں شاہ میر کا بدن چھوڑ دوں گی اور اسے کار میں پڑا رہنے دیں گے۔ لوگ خود اسے اس کے گھر پہنچا دیں گے۔
''اور ہم......'' میں نے کہا تو وہ مسکرا دی۔
''تمہارا ہم کہنا مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔'' ہم بھی اپنا کوئی بندوبست کر لیں گے۔ بس اب ساری باتیں تم مجھ پر چھوڑ دو بھروسہ کرو گے۔

میں نے گردن ہلادی۔ پھر ہم وہاں سے واپسی کے لئے تیار ہوگئے۔ میں نے کار کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اور وہ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی شاہ میر کی حیثیت سے، کار چلاتے ہوئے مجھے شاہ میر کی موت کا بہت دکھ ہورہا تھا۔ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہورہا تھا لیکن ایک اور احساس بھی مجھے ہورہا تھا وہ یہ کہ کوروتی اب خون خوار ہوگئی تھی مجھے خوف تھا کہ اب وہ بے دریغ قتل کرے گی اور جو قتل ہوں گے میرے ہم وطن ہوں گے اس بدروح کو میں اپنے ہاتھوں سے فنا کردیتا اگر یہ میرے لئے ممکن ہوتا۔

میں کار چلاتا رہا۔ پھر ہم شہر پہنچ گئے، ایک ہری بھری جگہ کوروتی نے کار روکنے کے لئے کہا اور میں نے کار روک دی۔ وہ بولی۔ ''وہ سامنے ایک ریسٹورنٹ نظر آرہا ہے۔ اس طرف۔''

''ہاں......'' میں نے کہا۔

''آؤ، وہاں چل کر بیٹھیں گے۔''

''خیریت، وہاں کیوں۔''

''کچھ سوچنا چاہتی ہوں۔''

''کیا......''

''میں اپنا پروگرام تھوڑا سا بدل رہی ہوں۔''

''میں نہیں سمجھا۔''

''شاہ میر کا بدن یوں سرعام نہیں چھوڑنا چاہئے۔ ہم پھر کسی روپ میں یہاں سے آگے بڑھیں گے۔ تم بھی عوام کے شناسا ہو اور میں بھی۔ گڑبڑ ہوجائے گی۔''

''پھر......''

''یوں کرتے ہیں چلتے ہیں یہاں سے۔ ابھی ہمارے پاس ایک ٹھکانہ ہے۔ جونہی میں محسوس کروں گی کہ مجھے شاہ میر کے بدن سے نکلنا ہے۔ ہم وہاں سے چل پڑیں گے۔ اس دوران یہ فیصلہ کرلیں گے کہ ہمیں آگے کیا کرنا ہے۔''

''جیسے تم پسند کرو۔ پھر تم نے اتنی تگ ودو کیوں کی۔ مجھے شاہ میر کی حیثیت سے اپنے پاس بلایا پھر اس ویران عمارت میں لے گئیں اور اب......''

''تم سمجھتے کیوں نہیں ہو عالی، میں نے بیشک قدیم دور سے آج تک وقت گزارا ہے۔ لیکن میں ہر دور سے اچھی طرح آشنا نہیں ہو پاتی، جب اسے سمجھنے میں کامیاب ہوتی ہوں تو دور بدل جاتا ہے۔ جس دور میں اب ہوں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی وہ تو بس تکے لگاتی ہوں۔ کتاب کی گہرائیوں میں اتر کر میں بکرماجیت کے دور میں پہنچی لیکن وہاں میں نے زیادہ وقت ضائع نہیں کیا۔ میرا منصوبہ یہی تھا کہ شاہ میر کے بدن میں آکر سب سے پہلے تمہیں مشکل سے نکالوں۔ سو موقع ملتے ہی میں نے ایسا کیا۔ شاہ میر کے گھر آکر میں نے یہ کوشش شروع کردی کہ کوئی ایسا ٹھکانہ تلاش کروں جہاں میں اور تم قیام کریں۔ میں نے شاہ میر کے ڈرائیور کو پھانسہ اور اس سے کہا کہ مجھے ایک ایسی ویران عمارت کی تلاش ہے جہاں مجھے ایک کام کرنا ہے، ڈرائیور نے اس عمارت کی نشاندہی کی۔ بس یوں سمجھ لو میرے ذہن میں کچھ واضح نہیں ہے عمارت میں جاکر مجھے احساس ہوا کہ یہاں آنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔''

''پھر اب۔''

''چلو واپس چلو۔ دیکھیں گے آگے کیا کیا جاسکتا ہے۔''

''میں اس کی بات سمجھ گیا تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ میری عقل نے بھی ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اور میں اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ الغرض میں نے دوبارہ گاڑی دوڑائی شاہ میر کی کوٹھی کی طرف بڑھادی۔ وہاں پہنچا تو پولیس کے کچھ افسران کو شاہ میر کا منتظر پایا۔ شاہ میر کے اس طرح میرے ساتھ تنہا آنے پر وہ تشویش کا شکار ہوگئے تھے۔

انہوں نے مجھے مشتبہ نگاہوں سے دیکھا تھا۔

کوروتی شاہ میر کے ایک ایک انداز کی اداکاری کررہی تھی۔ اس نے شاہ میر کے پروقار لہجے میں ان کی آمد کی وجہ پوچھی۔

''سر آپ سے کچھ کام تھا'' ایک آفیسر نے

کہا۔

''ہوں، ذیشان تم میرے کمرے میں جاؤ۔ میں آتا ہوں۔'' کوروتی نے کہا اور میں اندر چل پڑا۔

کوئی بیس منٹ کے بعد کوروتی شاہ میر کے روپ میں اندر آ گئی۔

''کچھ کھانا پینا چاہتے ہو۔''

''بالکل نہیں۔ خیریت، یہ لوگ کیوں آئے تھے۔''

''بتاتی ہوں۔'' اس نے کہا اور جوتے وغیرہ اتار کر صوفے سے جمائے بستر پر آ گئی۔ ''تھک گئی ہوں بری طرح۔''

''ہوں۔'' میں نے مختصراً کہا۔ پھر بولا'' کیوں آئے تھے وہ لوگ۔''

''تمہارے بارے میں تشویش کا شکار ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ تم قابل بھروسہ نہیں ہو۔ کوروتی کسی بھی وقت تاریخ سے واپس آ سکتی ہے اور تمہیں لے جا سکتی ہے کیونکہ وہ تم سے محبت کرتی ہے تمہیں اس آزادی سے میرے پاس نہیں رہنا چاہئے۔ یعنی شاہ میر کے پاس۔''

''تم نے کیا کہا۔''

میرے اس سوال پر کوروتی شاہ میر کے انداز میں مسکرائی پھر بولی۔'' کافی وقت ہو گیا ہے تمہاری دنیا میں۔ تھوڑی سی عقل تو آ گئی ہے۔ میں یعنی شاہ میر ان سب سے بڑے عہدے کی حامل ہوں میں نے سخت رویہ اختیار کرتے ہوئے کہا کہ وہ مجھے بے وقوف سمجھتے ہیں۔ میں اپنے عمل کی خود ذمہ دار ہوں پھر میں نے نرم رویہ اختیار کر کے ان سے کہا کہ ذیشان ایک نیک نام صفت ہے وہ صرف حالات کا شکار ہو گیا ہے ورنہ وہ برا انسان نہیں ہے۔ وہ مجھ سے تعاون کر رہا ہے اور اس بات کے لئے تیار ہے کہ اگر کوروتی اس کے پاس آئی تو وہ اسے مفلوج کر کے آخر کار ان کے حوالے کر دے گا۔''

میرے دل میں بے ایمانی آئی۔ میں نے سوچا کہ اس سے پوچھوں کہ اسے مفلوج کیسے کیا جا سکتا ہے۔ تاکہ موقع ملنے پر میں ایسا ہی کروں۔ لیکن پھر میں خاموش ہی رہا۔

''بس میں نے انہیں اطمینان دلا دیا کہ وہ فکر نہ کریں۔ وہ کم بخت میری رہائش گاہ میں کتاب کے آس پاس رہ کر اس کی نگرانی کر رہے ہیں۔ تاکہ جیسے ہی کوروتی اس سے باہر آئے اسے گرفتار کر لیں۔''

''پہلے تو وہ اسے تباہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔''

''ہاں...... اب شاہ نے یہ ارادہ عارضی طور پر ملتوی کر دیا ہے۔ یہ ان کی خام خیالی ہے عالی، وہ اسے کبھی تباہ نہیں کر سکیں گے۔''

''یہ کتاب آخر ہے کیا کوروتی، تم نے اسے کیسے تعمیر کیا ہے؟''

میرے اس سوال پر وہ سوچ میں ڈوب گئی۔ پھر گردن اٹھا کر بولی۔'' کسی اور وقت اس کا جواب دوں گی۔ اس وقت ضروری نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ اب کیا ارادہ ہے؟''

''ایک طرح سے ہمیں آزادی ہی ہے۔ میں جانتی ہوں تم میرے ساتھ خوش نہیں ہو۔ جس کا اظہار تم کر چکے ہو۔ میں نے اس پر بہت غور کیا ہے۔ لیکن عالی، میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میں نے اپنی انا کو سامنے رکھ کر بہت سوچا ہے کہ۔ تمہارا پیچھا چھوڑ دوں، تم سے دور چلی جاؤں، لیکن عالی، میں ایسا نہیں کر پاؤں گی۔ عالی یہ سوچ کر ہی میں عجیب کیفیت کا شکار ہو جاتی ہوں۔ میں تمہیں اپنی اس کیفیت کے بارے میں بتا نہیں سکتی۔ اس وقت ایک خیال بڑی شدت سے مجھے بے بسی کا شکار کر دیتا ہے۔ وہ یہ کہ کاش میں بھی عام انسانوں کی طرح مر سکتی۔ اگر موت مجھے آ سکتی تو میں اسے خوشی سے گلے لگا لیتی۔ کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ کاش کوئی ایسا عمل ہو سکے جس کی بنیاد پر مجھے موت آ جائے۔ آہ، اب بھی لاتعداد انسانوں کے دل میں ایسی خواہش جاگی ہو گی کہ انہیں لمبی عمر حاصل ہو جائے۔ انہیں آب حیات یا امرت جل پینے کو مل جائے۔ لیکن، وہ پاگل نہیں جانتے کہ موت کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ جیسے پورے دن کی

مشقت کے بعد۔ آرام دہ بستر، اور کالی رات کی نیند۔''
اس کی آواز خواب آلود ہوگئی۔ وہ دیر تک اس تاثر میں ڈوبی رہی۔ پھر ایک دم چونک کر میری طرف دیکھا اور ہنس پڑی۔ پھر بولی۔ ''ایک بات پوچھوں۔؟''
میں نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ خاموش رہی۔ سوچتی رہی، پھر بولی۔ ''چلو ٹھیک ہے نہیں پوچھتی۔''
آپ میری پریشانی، میری الجھن کا اندازہ ضرور لگا سکتے ہیں۔ میں ایک محب وطن انسان ہوں، اپنے وطن، اپنے لوگوں سے مجھے پیار ہے۔ ایک بدروح نما عورت کے ہاتھوں میرے وطن کے کسی شخص کو کوئی نقصان پہنچے، مجھے بالکل گوارہ نہیں، بدنصیبی سے ایک طلسماتی جال میں پھنس گیا تھا میں نے ایک منفرد کتاب لکھنے کے لئے ان دو کرداروں سے رابطہ کیا جو اتفاقاً مجھے مل گئے تھے کیسے اس کی تفصیل میں آپ کو ضرور بتاؤں گا، لیکن اس وقت جب تقدیر مجھے زندہ صدیاں مکمل کرنے کا موقع دے گی تو پھر اب...... آگے کے کسی دور کے بارے میں مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ کیا ہوگا۔
اس نے مجھے آواز دی۔ ''ذیشان۔'' اور میں چونک پڑا۔ ''کس خیال میں کھوگئے۔''
''بس......'' میں نے پچھلے سے انداز میں کہا۔
''پریشان ہو۔''
''سونا چاہتا ہوں۔'' تھک گیا ہوں۔
''چلو سو جاؤ۔''
''کہاں۔؟'' میں نے کہا۔
''یہیں...... اور کہاں۔ تم میرے مہمان ہو، میں تمہیں جہاں چاہوں رکھوں۔'' اس نے کہا۔ میں ایک گہری سانس لے کر وہیں ایک صوفے پر لیٹ گیا۔ واقعی ذہن بھی تھکا ہوا تھا بدن بھی، نیند آگئی، نہ جانے کتنا سویا آنکھ کھلی تو گہری رات ہو چکی تھی کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی جس سے پتہ چل رہا تھا کہ بہت رات گزر چکی ہے۔ پھر ایک اور احساس ہوا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں صوفے پر سویا تھا لیکن اس وقت میں مسہری پر تھا بڑے بدن کے نیچے نرم فوم کا گدا تھا۔ اور ایک گداز بدن میرے جسم سے لپٹا ہوا تھا میرے سارے بدن میں کرنٹ سا دوڑ گیا۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا میں نے ٹٹول کر اس جسم کو دیکھا تو مجھے ایک بے حد خوبصورت آواز سنائی دی۔
''میں ہوں۔''
''کون......؟''
''کوروتی۔''
''ایں۔؟'' میں بے اختیار بولا۔ اور میں نے کافی حد تک بے اختیاری کے عالم میں دوبارہ اس بدن کو چھو کر دیکھا۔ بدن میں شدید سنسناہٹ دوڑ گئی۔ یہ تو بے حد نرم و ملائم اور پرگوشت بدن تھا۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے گھورنے لگا۔ گھور تاریکی کی وجہ سے اس کے خدوخال تو پیش نظر آ رہے تھے لیکن ایک خاکہ سا ضرور محسوس ہو رہا تھا کسی نوجوان منتسب شباب وجود کا تھا کہ۔
''ذیشان!'' اس بار آنے والی آواز کوروتی کی تھی۔ جذبات سے بوجھل، مے میں ڈوبی ہوئی۔ میرے منہ سے آواز نہیں نکلی۔ ''ذیشان۔'' اس نے پھر خمار آلود لہجے میں مجھے پکارا۔ اور میں مسہری سے اٹھ گیا۔ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ شاہ میر کی خواب گاہ ہی ہے جہاں میں سویا تھا۔ میں مسہری سے نیچے اتر آیا اور اندازے سے آگے بڑھ کر میں نے دیوار کا سوئچ تلاش کر کے روشنی کر دی۔ پھر میری نظریں مسہری کی طرف اٹھ گئیں۔ وہاں ایک خوبصورت لڑکی باریک نائٹی میں ملبوس لیٹی پیار بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔
''کون ہو تم؟''...... میں نے غصے سے کہا۔
''کیوں...... خوبصورت نہیں ہوں۔'' آواز کوروتی کی تھی۔
''کوروتی۔؟'' میں نے کہا۔
''ہاں...... میں ہی ہوں۔'' وہ بولی۔
''لیکن یہ سب۔''
''تمہارے لئے کیا ہے۔''
''کیا مطلب......!''

''مطلب تم جانتے ہو، تمہیں بدن کی دلکشی چاہئے۔ روح کی دلکشی سے تمہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میرا سوکھا ہوا پنجر تمہارے لئے ناقابل برداشت تھا، اور اب میں تمہیں ایک دلکش پیشکش کرتی ہوں۔''

''پیشکش۔؟''

''ہاں۔ اپنی پسند کی کسی دلکش حسینہ کی طرف اشارہ کردو۔ کوئی مقبول اداکارہ ہو، کوئی آرٹسٹ ہو، سوناکشی سنہا، آشاتاکیہ، یامادھوری ڈکشٹ یا کوئی بھی۔ وہ اپنے اصلی وجود کے ساتھ تمہارے پاس ہوگی لیکن اس کے وجود کے اندر کوروتی ہوگی۔''

''تم پاگل ہوچکی ہو کوروتی۔'' میں نے غصے سے کہا۔

''مجھے کب انکار ہے۔'' اس نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

''یہ کس کا بدن ہے۔''

''شاہ میر کی بھتیجی خوشبو کا۔''

''کیا مطلب؟''

''مجھے اچھی لگی۔ میں نے تمہارے لئے منتخب کرلیا۔'' اس نے کہا لیکن میرا دل لرز گیا۔ ایک اور واردات۔ اس دیوانی نے ایک اور واردات کرڈالی۔ وہ بتاچکی تھی کہ وہ کسی زندہ وجود میں نہیں داخل ہوسکتی۔ اس کا مطلب تھا کہ خوشبو بھی...... میں نے رندھی آواز میں پوچھا۔

''تو کیا تم نے......؟''

''ہاں...... موبائل فون پر اپنے کسی محبوب سے محبوبانہ گفتگو کررہی تھی۔ میں اس کی مسہری کے نیچے چھپی اس کی باتیں سن رہی تھی پھر جب اس نے فون بند کرکے رکھا اور سونے کے لئے لیٹ گئی تو میں مسہری کے نیچے سے نکل آئی...... اور...... میں نے گردن دبا کر اسے زندگی سے محروم کردیا۔ پھر اس کے بدن میں داخل ہوگئی۔ اس کے بعد میں نے اس کی الماری میں سے اس کے لباس تلاش کئے اور یہ لباس مجھے پسند آیا۔ سو میں نے اسے تمہارے لئے پہن لیا۔''

''کوروتی۔ تم میرے لئے کتنی پھانسیاں تیار کروگی۔'' میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ اور وہ کسی قدر غضب ناک ہوگئی۔ اس کی آواز میں غراہٹ پیدا ہوگئی۔

''کیا نہیں کررہی میں تمہارے لئے کسی بھی عمل کو سراہنے کے بجائے تم صرف میری مذمت کرتے ہو مجھے ذہنی مریض مت بناؤ...... ورنہ...... ورنہ میں...... چن چن کر ایک ایک حسین لڑکی کو قتل کردوں گی۔ پھر اس لڑکی کے چہرے کو تیزاب سے بگاڑ دوں گی جو خوبصورت ہوگی۔ سمجھ رہے ہو تم۔ مت آمادہ کروں مجھے اس کام کے لئے اور میں جو بھی ہوں تم صرف میرے لئے ہو۔ اور مجھے قبول کروگے۔''

اس کا خوف ناک لہجہ بتارہا تھا کہ وہ جو کہہ رہی ہے وہ ضرور کرڈالے گی۔ میری وجہ سے کتنی زندگیاں جائیں گی کس کے ساتھ کیا ہوگا اس کا مجھے اندازہ ہورہا تھا۔

جس لڑکی کا اس نے نام لیا تھا۔ اسے میں نے اس کوٹھی میں ایک بار دیکھا تھا لیکن کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ اب میں نے اسے غور سے دیکھا تو میرے دل کو شدید دکھ کا احساس ہوا۔ کافی خوبصورت اور چھوٹی سی عمر کی تھی۔ میری وجہ سے ایک چڑیل کے ہاتھوں زندگی ہار گئی تھی۔ اس کی قاتل کوروتی نہیں بلکہ میں تھا۔

میرے تن بدن میں چنگاریاں دوڑ گئیں۔ میں نے خونی نگاہوں سے کوروتی کو دیکھا اور وہ مسکرادی۔

''مجھے سوئیکار کروعالی۔ میرا شریر پیاسا ہے۔''

اس نے دلکش مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور میں بے اختیار ہوگیا۔ میں دانت بھینچ کر اس پر جھپٹا اور میں نے اس کی خوبصورت صراحی دار گردن دبوچ لی۔

''میں۔ میں تجھے فنا کردوں گا۔ شیطان کی بچی۔'' میرے حلق سے غراہٹ نکلی۔ اور میں اس کی گردن دبانے لگا۔ اس کی آنکھیں ابل پڑیں۔ لیکن صرف ایک لمحے کے لئے۔ دوسرے لمحے وہ ساکت ہوگئی۔ اسی وقت تھوڑے فاصلے پر مجھے کوروتی کی ہنسی سنائی دی اور میرے ہاتھ لرز گئے۔ میں نے خوشبو کی گردن چھوڑ دی

اور مڑ کر دیکھا۔ کوروتی کا مکروہ ڈھانچہ سامنے کھڑا تھا۔ وہی ہنس رہی تھی۔ پھر اس کی آواز ابھری۔

''مری ہوئی کو مار رہے ہو۔ وہ بے چاری تو پہلے ہی مر چکی ہے۔''

میں ساکت رہ گیا۔ کوروتی لڑکی کے بدن سے نکل گئی تھی اور میں ایک مردہ وجود کی گردن دبا رہا تھا میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں نے ڈبڈبائی آنکھوں کے خوشبو کے مظلوم بدن کو دیکھا جس کے ساتھ میں نے بھی زیادتی کی تھی۔ میں خود پر اختیار نہ رکھ سکا اور بے اختیار رو پڑا۔ اس قدر بے اختیار ہو گیا کہ میں نے خوشبو کے پاؤں پکڑ لئے۔

''مجھے معاف کر دینا میری بہن، میری بیٹی، مجھے معاف کر دینا میں اس چڑیل کے چنگل میں پھنس گیا ہوں۔ مجھے معاف کر دینا۔'' میں نے روتے ہوئے کہا۔ کوروتی خاموش کھڑی تھی۔ میں دیر تک روتا رہا۔ وہ کچھ نہ بولی۔ پھر میں خاموش ہوا تو اس کی سلگتی آواز ابھری۔

''تم اس کے لئے رو رہے ہو۔ میرے لئے رونے والا کون ہے۔ میں بھی تو انسان ہوں، جیتی جاگتی انسان پریم کے آگے مار کھا گئی ہوں۔ ورنہ صدیاں خوشی سے گزارتی میں۔ مگر کیا کروں اب پتہ چلا کہ پریم روگ، سنسار کا سب سے بڑا روگ ہے۔ یہ بیماری جسے لگ جائے سمجھو اس کا سنسار بھشٹ ہو گیا۔ مجھ پر یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ ورنہ وہ پاپی تو صدیوں سے مجھے رو رہا تھا۔''

''سن کوروتی، تو نے کہا تھا کہ تو میرے لئے کسی کے بھی بدن میں جا سکتی ہے۔ اب میں تجھے بتاؤں کہ آکاش کی اپسرا بھی بن کر آئے تو، تو میں تجھے قبول نہیں کروں گا آج سے میں ہوس کے یہ دروازے بند کر رہا ہوں۔'' میری جلتی آواز ابھری۔

''تو تم بھی سن لو عالی۔ میں روز ایک لڑکی کو قتل کر کے اس کی لاش تمہارے سامنے پھینکتی رہوں گی اگر تم مجھے میری اس حقیقت میں سوئیکار نہ کرو گے تو۔'' اس نے کہا اور اس کا ڈھانچہ آگے بڑھ کر صوفے پر لیٹ گیا۔

مجھے شدید غصہ آرہا تھا۔ میں اگر اس ڈھانچے پر حملہ بھی کرتا تو مجھے اس سے کیا حاصل ہوتا اگر میں اس کی ہڈیاں توڑنے کی کوشش کرتا تو کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اسے موت تو پھر بھی نہ آتی اور یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ اس کی یہ ہڈیاں ٹوٹیں گی بھی یا نہیں۔

میں بے چاری خوشبو کی لاش کے پاس بیٹھا رہا۔ سوچتا رہا، مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکوں گا۔ وہ جنونی ہے، طاقتور ہے، بے خوف ہے ہزار بندے بھی مل کر اسے مارنے کی کوشش کریں تو نہیں مار سکیں گے اور وہ، اوہ میرے خدا، وہ واقعی ایک لڑکی کو روزانہ قتل کر دے گی بے گناہ لڑکیاں ماری جائیں گی۔

کیا کروں کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ بہت دیر گزر گئی آخر کار میں نے ایک فیصلہ کیا اور اس پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ ''کوروتی؟'' میں نے اسے آواز دی۔

''ہوں۔''

''میرے پاس آؤ۔'' میں نے نرم لہجے میں کہا اور وہ صوفے سے اٹھ گئی۔ پھر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی مسہری تک آئی اور اس کے ایک کونے پر بیٹھ گئی۔ ''تم کیا سوچ رہی ہو۔''

''کچھ نہیں۔''

''آگے کیا کرنا ہے۔''

''میں نہیں جانتی۔''

''شاہ میر کی لاش کہاں ہے۔''

''تھوڑے فاصلے پر ایک بند کمرے میں۔''

''کیا اس کا بدن سڑ چکا ہے۔''

''کافی حد تک۔''

''اس سے بدبو اٹھ رہی ہے۔''

''ہاں، لیکن میں نے کمرے کی کھڑکیاں بند کر دی ہیں۔ دروازہ بھی ائیر ٹائٹ ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''آؤ......ہم یہاں سے چلیں۔''

''کہاں۔''

''تو کیا یہاں مروگی۔'' میں پھر جھلا گیا۔ لیکن غیر متوقع طور پر وہ ہنس پڑی۔

''کیا مزے کی بات کی ہے۔ یہاں مروگی۔ واہ چلو ٹھیک ہے مر جائیں گے اگر تم کہو گے۔''

''ہاں، تمہیں فکر نہیں ہے کیونکہ تمہیں موت نہیں ہے۔ مرنا مجھے ہوگا، ویری گڈ، یہ بھی اچھا آئیڈیا ہے۔'' یہ کہہ کر میں خاموش ہوگیا، لیکن وہ کچھ بے چین ہوگئی کچھ دیر میرے بولنے کا انتظار کرتی رہی پھر جب میں کچھ نہ بولا تو خود بول پڑی۔

''تم نے اپنا آئیڈیا نہیں بتایا۔''

''صبح کو میں ان لوگوں کو پوری تفصیل بتادوں گا اور کہوں گا کہ خوشبو کو میں نے اس کی عزت لوٹنے کے لئے قتل کیا ہے۔ اپنی گرفتاری پیش کردوں گا اور مجھے سزائے موت ہوجائے گی۔ اس خوف کی زندگی سے تو بہتر ہے کہ موت اپنالی جائے۔ کچھ دوسرے تو زندہ بچ جائیں گے۔''

وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی۔ ''نہیں ایسا نہیں کرنا۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں تمہیں میری جسمانی قربت نہیں چاہئے ٹھیک ہے، میں بھی اس سے کنارہ کش ہوجاتی ہوں۔ لیکن مجھے اپنے قریب تو رہنے دو۔ تم کہو گے تو میں خود کو پولیس کے حوالے کردوں گی اپنے سارے جرم قبول کرلوں گی۔ وہ میرے ساتھ جو سلوک کرنا چاہیں کریں۔ ختم تو نہیں کرسکیں گے مجھے قید کردیں گے موت کی سزا دیں گے پھانسی پر چڑھائیں گے تو خود شرمندہ ہوں گے۔ ویسے بھی میں جب چاہوں گی ان کی قید سے نکل آؤں گی۔ مجھے مشکل نہیں ہوگی۔ بس تم محفوظ رہو۔''

''کوروتی جی۔ میرے محفوظ رہنے کی اب کوئی گنجائش نہیں ہے۔''

''کیوں۔''

''یہ بات میں جانتا ہوں۔''

''مجھے بھی بتاؤ۔''

''مجھے تمہارے برابر کا مجرم قرار دیا گیا ہے۔ ہم دونوں کی سزا ایک ہے۔ یعنی سزائے موت اور وہ سزا وہ تمہیں نہیں دے سکیں گے۔ میں خاموشی سے پھانسی کے پھندے پر لٹک جاؤں گا۔''

''اوہ۔'' وہ تشویش سے بولی۔ پھر کہنے لگی۔

''پھر بتاؤ کیا کریں۔ میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ میں تمہاری جسمانی قربت سے کنارہ کش ہوتی ہوں۔ اب تمہیں پریشان نہیں کروں گی۔''

''وعدہ۔'' میں نے کہا۔

''ہاں۔''

''تو پھر ہمیں یہاں سے فوراً نکل چلنا چاہئے۔ یہاں دو دو لاشیں موجود ہیں۔ اور ان دونوں کے ذمہ دار ہم ہی ہیں۔ ان کے برآمد ہونے کے بعد ہمارا جو حشر ہوگا وہ یہیں اسی کوٹھی میں ہوجائے گا۔''

''چلو'' اس نے بڑی سادگی سے کہا۔

مجھے بھی چڑھ گئی۔ چنانچہ میں بھی فوراً آمادہ ہوگیا۔ وہ کہنے لگی۔ ''میں اس کا بدن لے لوں۔ بعد میں تم کہو گے تو چھوڑ دوں گی۔''

''نہیں، وہ اس گھر کی بیٹی ہے۔ کیسے گئی ہے کوئی نہیں جانتا۔ گھر سے غائب ہوگی تو طرح طرح کی باتیں ہوں گی۔ لوگ الزامات لگائیں گے، کہیں گے کسی کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی ہے۔ وغیرہ، موت کے بعد بھی بے چاری رسوا ہوگی اور اس مظلوم خاندان کے سر شرم سے جھک جائیں گے۔''

''ارے واہ...... ویری انٹرسٹنگ۔'' وہ ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولی۔ پھر کہنے لگی۔ ''ٹھیک ہے آؤ چلتے ہیں۔''

ہم دونوں باہر نکل آئے۔ لیکن کمرے سے باہر قدم رکھا تھا کہ گھر کے دو افراد جو کسی وجہ سے جاگ رہے تھے اچانک ایک کمرے سے نکل آئے۔ کمرے ایک راہداری میں لائن سے بنے ہوئے تھے اور راہ داری میں تیز روشنی تھی چنانچہ ان دونوں نے ہمیں دیکھ لیا۔ ایک لمحے کے لئے وہ حیران ہوئے پھر جو انہوں نے بھیانک چیخیں ماریں انہوں نے میرے بھی کان پھاڑ دیئے۔ کوروتی اتنی جذباتی ہوئی تھی کہ اس نے باہر نکلتے ہوئے کوئی چادر بھی نہیں اوڑھی تھی جبکہ کوئی

چادروغیرہ بستر سے اٹھائی جاسکتی تھی مجھے بھی کوئی خیال نہیں آیا تھا۔

راہداری میں موجود کمرے روشن ہوئے۔ ''کیا ہے۔کون ہے؟'' کسی کی آوازیں ابھریں اور ہمیں دوڑ لگانی پڑی۔ راہداری کے ایک درمیانی حصے میں سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں جو باہر پورچ میں اترتی تھیں ہم ان سیڑھیوں سے نیچے اتر گئے۔ پورچ میں کھڑی کاروں کے پاس دو ڈرائیور چارپائیوں پر سو رہے تھے وہ شور سے اٹھ گئے۔ پھر وہ بھی حلق پھاڑ کر چیخنے لگے۔ انہوں نے کوروتی کے ڈھانچے کو بھاگتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

پولیس کے افسر اعلیٰ کی کوٹھی تھی اس لئے باہر کئی پولیس والوں کی ڈیوٹی تھی۔ ہم گیٹ کی طرف بھاگے اور کچھ ہی لمحوں میں ہمیں پولیس کی چلائی ہوئی گولیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ گولیاں ہمارے آس پاس سے گزر کر گیٹ میں لگیں۔

اصل میں ہر طرف روشنی ہو رہی تھی اور ہمیں ہر جگہ بخوبی دیکھا جا سکتا تھا اس لئے صورت حال بے حد سنگین ہوگئی تھی۔ گیٹ پر بھی پولیس کے سپاہی تعینات تھے گیٹ پر گولیوں کی باڑھ لگی تو وہ بھاگ کر کیبن میں جا گھسے کیونکہ انہیں صورت حال معلوم نہیں تھی۔ گولیاں چونکہ اندر سے آئی تھیں اس لئے گیٹ کے محافظوں نے کچھ نہ سمجھ کر اندر کی طرف گولیاں چلانی شروع کردیں۔ اندر سے کئی چیخیں سنائی دی تھیں ان کی یہ غلط فہمی اور افراتفری ہمارے لئے کارآمد رہی اور ہم دونوں گیٹ سے نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔

''بھاگو۔ ابھی ہمارا تعاقب شروع ہوجائے گا۔'' میں نے کہا اور ہم دونوں پوری قوت سے دوڑنے لگے کوروتی بھی مجھ سے پیچھے نہیں تھی پیچھے گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ لیکن وہ آپس ہی میں مصروف ہوگئے تھے۔ اس کے باوجود میں بھاگتا رہا پھر ایک چھوٹا سا پارک نظر آیا جس میں اندر جانے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی کھلا پارک تھا میرا سانس بری طرح پھول رہا تھا سینہ دھونکنی بنا ہوا تھا۔ میں نے پارک کے کنارے رک کر اس کا جائزہ لیا اور پھر اس میں اندر داخل ہوگیا۔

پارک میں بنچیں پڑی ہوئی تھیں ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ میں ایک بنچ پر جا بیٹھا کوروتی میرے پاس آبیٹھی تھی کچھ دیر خاموش رہی پھر وہ بولی۔

''تمہارا تو برا حال ہے سانس بری طرح پھولا ہوا ہے۔''

''ہاں، اور تمہارا......'' میں نے بمشکل کہا۔

اور وہ ہنس پڑی۔ پھر بولی۔

''سانس کا تعلق پھیپھڑوں سے ہوتا ہے۔''

''تو پھر......''

''میرے پھیپھڑے ہی نہیں ہیں۔ اس نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ میرے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اندر کا پورا نظام خالی ہونے کے باوجود وہ زندہ تھی۔ سائنس اس بارے میں کیا کہتی تھی مجھے نہیں معلوم تھا لیکن وہ کائنات کا بہت بڑا عجوبہ تھی۔ ''وہاں تو خوب جنگ شروع ہوگئی تھی۔ اس نے کچھ دیر کے بعد کہا۔

میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ البتہ میں سوچ رہا تھا کہ اب تو میں کوروتی سے بڑا مجرم گردانا جاؤں گا اور سارے پھندے میری گردن میں لگیں گے۔ دفعتاً میری نظر میں سامنے کی طرف اٹھ گئیں اسپتال کے ٹیون سائن نظر آرہے تھے یہ وہی اسپتال تھا جہاں مجھے ثناء معصوم ملی تھی اور ایک چھوٹی سی کہانی نے جنم لیا تھا۔

دفعتاً میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں نے کہا۔ ''کوروتی۔ تم نے صبح کے بارے میں کچھ سوچا ہے۔''

''صبح ہمیشہ خوبصورت ہوتی ہے۔ پرندوں کے نغموں سے سجی ہوئی اجالا، زندگی جیسا۔'' اس نے کہا۔

''اور پولیس والوں کے بوٹوں کی دھمک موت کے فرشتوں جیسی۔'' میں نے بے تکے لہجے میں کہا۔

''تمہیں موت سے بہت ڈر لگتا ہے۔''

''ہاں...... میں صدیوں پرانا بوڑھا نہیں ہوں۔ نوجوان ہوں۔ امنگوں بھرا...... زندگی بلکہ مختصر زندگی سے لطف اندوز ہونے والا۔''

''مجھ پر طنز کر رہے ہو۔''
''کچھ غلط تو نہیں کہہ دیا۔''
''تمہیں ڈر ہے کہ تم مر جاؤ گے۔''
''تو اور کیا۔''
''ہائے کتنے خوش نصیب ہو۔ موت کتنی دلکش چیز ہے۔ اس کے بعد سکون ہی سکون، کیسا لگتا ہوگا مرنے کے بعد۔''
''فرشتے آتشیں گرز سے وہ کٹ لگاتے ہیں کہ بس، نہ جانے کیا کیا یاد آ جاتا ہے۔'' میرے بدن میں اس کی بکواس سے آگ لگ رہی تھی۔ وہ پھر ہنس پڑی۔
''بہت غصہ آ رہا ہے۔''
''کوروتی۔ صبح سے پہلے اس پارک سے نکل جانا ہے۔'' ''تم لطف لے رہی ہو۔
''یہ تمہاری دنیا ہے، تمہارا شہر ہے۔ میں اس دور کی مہمان ہوں، تم میرے میزبان ہو، جو سلوک چاہے مہمان کے ساتھ کرو۔''
آرزو تو یہ تھی کہ اس معزز مہمان کو پولیس کے حوالے کر کے کہوں کہ لو سنبھالو اپنا مجرم اور جو سلوک اس کے ساتھ چاہو کرو...... لیکن...... اپنے دیس کی، اپنے شہر کی پولیس کو بھی جانتا تھا سب سے پہلے تو وہ میرا ہی حساب کتاب کرے گی اور کہے گی کہ مہمان اکیلا کہاں جائے گا عالم بالا میں فرشتوں کو کہاں تکلیف دو گے وہاں بھی تم ہی اس کی میزبانی کرنے کے لئے اس کے ساتھ جاؤ۔''
''کیا سوچنے لگے۔؟'' کوروتی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔
''کچھ سوچ رہا ہوں۔''
''مجھے نہیں بتاؤ گے؟''
''بتایا تھا نا۔''
''دوبارہ بتاؤ۔''
''دن کی روشنی ہونے سے پہلے ہمیں یہ پارک چھوڑنا ہوگا۔''
''کہاں جائیں گے۔''
''اس اسپتال میں۔''
''وہاں کیوں۔''
''میں نے کچھ سوچا ہے۔ آؤ اٹھو۔ میں نے کہا اور وہ خاموشی سے اٹھ گئی۔ اس اسپتال میں، میں وارڈ بوائے کی حیثیت سے گھوما پھرا تھا۔ وہیں سے ایک جگہ سے میں نے وارڈ بوائے کی وردی حاصل کی تھی مجھے یاد تھا کہ اسی اسٹور سے ملحق سرد خانہ تھا جہاں لاوارث مردے رکھے جاتے تھے۔ اس جگہ مردہ گھر کا بورڈ لگا ہوا تھا۔
مردہ گھر...... میں نے سوچا پھر کوروتی نے کہا۔
''کوروتی، ایک بات بتاؤ۔ جو میں کہوں گا وہ کرو گی۔''
''اب تک ایسا نہیں کیا......'' وہ شکایتی لہجے میں بولی۔
''ٹھیک ہے آ جاؤ۔'' میں اسے لے کر اسپتال کی طرف بڑھ گیا۔ اسپتال کے گیٹ پر کوئی پہرہ نہیں تھا۔ مریض اور ان کے لواحقین آ جا رہے تھے۔ میں نے ایک سنسان جگہ منتخب کی اور کوروتی کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ اندر پہنچ کر میں نے انتہائی احتیاط سے تاریک راستوں کا سفر اختیار کیا اور کسی نہ کسی طرح مردہ گھر تک پہنچ گیا۔
چونکہ رات کا آخری پہر چل رہا تھا اس لئے اسپتال کے ملازمین بھی متحرک نہیں تھے۔ سرد خانے کا سلائیڈنگ دروازہ سامنے تھا۔ کچھ فاصلے پر ''مردوں کا محافظ'' زمین پر پڑا خراٹے بھر رہا تھا۔
''شکر ہے باباجی۔ آپ سو رہے ہیں۔ ورنہ اندر داخل ہونے کے لئے آپ کے ساتھ بدتمیزی کرنی پڑتی۔'' میں نے دل میں سوچا۔ کوروتی خاموشی سے میرے ہر قدم کی پیروی کر رہی تھی۔ میں نے بہت بڑے سلائیڈنگ ڈور پر طاقت صرف کی، لیکن وہ ہاتھ کی معمولی سی کوشش پر ہی کھل گیا۔ اندر سے انتہائی سرد ہوا کا جھونکا باہر نکلا تھا۔ کوروتی کو اندر آنے کا اشارہ کر کے میں اندر داخل ہو گیا۔
اندر جدید قبرستان آباد تھا۔ اس شہر خموشاں میں مٹی کی قبریں نہیں تھیں بلکہ انتہائی جدید اسٹیل کے

ریک بنے ہوئے تھے جن کے اندر موت کا شکار ہونے والے اپنی قبر کے انتظار میں سو رہے تھے۔ مدھم سا بلب روشن تھا جس سے ماحول اور خوف ناک ہوگیا تھا۔

سب سے پہلے میں نے دروازہ بند کیا اور اس جگہ کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگا کہ کوئی اندر آئے تو آسانی سے چھپا جاسکے۔ ایسی دو تین جگہیں مجھے نظر آگئیں اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کے بعد میں اسٹیل کے قبرستان کی طرف متوجہ ہوگیا۔ میں نے ایک ریک باہر گھسیٹا اس میں انسانی جسم کے تین ٹکڑے رکھے ہوئے تھے جو ریک کے کھلنے بند ہونے کی وجہ سے بے ترتیب ہوگئے تھے۔ میں نے گہری سانس لے کر اسے بند کردیا۔ دوسرے ریک میں ایک بھاری بدن کا مرد لیٹا ہوا باہر نظر آتنے والے کسی بھی شخص کو گھور رہا تھا مگر اس کی زبان ہرنکلی ہوئی تھی۔ مختلف انداز کے کئی مردہ جسم دیکھنے کے بعد ایک بدن پر میری نظر ٹک گئی۔ یہ کوئی بھکارن عورت تھی ظاہر ہے لاوارث ہوگی اس کے بدن پر اس کے اپنے ہی کپڑے تھے۔ دھوپ سے جھلسا ہوا چہرہ، سادہ سے نقوش، خاص بات یہ تھی کہ اس کے بدن میں کوئی ٹوٹ پھوٹ نہیں تھی۔ غالباً دم گھٹنے یا دل کے دورے وغیرہ سے مری تھی۔ میں کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے کوروتی کو آواز دی۔

''کوروتی۔''

''ہوں۔'' وہ پرخیال لہجے میں بولی۔

''دیکھ رہی ہو۔''

''ہاں۔ میرے لئے نیا تجربہ ہے۔'' وہ متاثر لہجے بولی۔ ''میں نے ایسا پہلے کبھی نہیں دیکھا۔''

''آؤ۔ اسے نکالیں۔''

''کیوں۔ وہ چونک کر بولی۔''

''ہاں۔ اسے ریک سے نکالیں۔''

''کیوں......''

''تمہیں اس کے بدن میں جانا ہے۔''

''کک۔ کیا بکواس کررہے ہو۔'' وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

''ہاں کوروتی۔ تم صرف مردہ جسموں میں داخل ہوتی ہو۔ کسی زندہ انسان کو ہلاک کرنے کے بجائے ایک مردہ جسم کیوں نہ اپنا لیا جائے۔ میں تمہیں ٹپ دے رہا ہوں۔ یہ جسم گل جائے تو دوسرا ایسا ہی بدن تلاش کرلیا جائے۔''

کوروتی کچھ دیر خاموش رہی پھر گھمبیر لہجے میں بولی۔ ''تم مجھ سے انتقام لے رہے ہو عالی۔''

''کیوں۔''

''یہ جسم منتخب کیا ہے تم نے۔ ایک گندی، بھدی، بدصورت بھکارن۔''

''تو تم حسینہ عالم بن کر کیا کروگی۔ میں تمہیں اپنے وطن کی اپنے شہر کی معصوم لڑکیوں کو ہلاک کرنے کی اجازت کیسے دے سکتا ہوں۔''

''تم اس بات سے خوش ہوگے۔''

''تم جانتی ہو، مجھ پر یہ افتاد تمہاری وجہ سے پڑی ہے کوروتی۔ میرے لئے جینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے میں جانتا ہوں کہ جان بچانے کے لئے مجھے کیا کرنا چاہئے۔''

''ٹھیک ہے، آؤ اسے نکالیں۔'' بھکارن کے بدنصیب کو ریک سے نکالا گیا۔ اسے سیدھا زمین پر لٹا دیا اور کوروتی اس کے سرہانے کھڑی ہوگئی میری آنکھیں دنیا کا سب سے انوکھا منظر دیکھ رہی تھیں۔ ایک ناقابل یقین منظر، کوروتی کا ڈھانچہ آہستہ آہستہ تحلیل ہورہا تھا اس کا سر غائب ہوا تو بھکارن کا سر ملنے لگا۔ باقی بدن کی بھی یہی کیفیت تھی۔ ہاتھوں نے اپنی ڈائریکشن بدلی پھر پیروں نے اور پوری کوروتی غائب ہوئی تو بھکارن نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے گردن گھما کر مجھے دیکھا اور اس کی آنکھوں میں پیار امنڈ آیا۔

''خوش ہو۔'' ایک نامانوس آواز سنائی دی۔

''ہاں کوروتی۔ تمہیں کسی نہ کسی جسم میں آنا تھا۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میں نے کسی بے گناہ کی زندگی بچالی۔ کوروتی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ افسردہ تھی اور مجھے اس پر غصہ آرہا تھا کوروتی کا تو مسئلہ حل

ہوگیا تھا۔ اب میں رہ گیا تھا۔ لیکن مجھے کوئی ایسا عمل نہیں نظر آتا تھا جس سے میں اپنا حلیہ بدل لوں۔

الغرض یہاں سے نکلنا ضروری تھا چنانچہ میں کوروتی کے ساتھ باہر نکل آیا۔ ہمیں اسپتال سے باہر آنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔ کوروتی کا موڈ بھی بہتر ہوتا جا رہا تھا۔ تھوڑا فاصلہ طے کیا تھا کہ وہ ہنس پڑی۔

''عالی......'' اس نے کہا۔

''ہوں۔''

''تمہیں بھیک مانگنا آتی ہے۔''

''جی نہیں۔''

''مجھے بھی نہیں آتی۔ لیکن مزہ آئے گا۔ ہم بھیک مانگیں گے۔''

''تمہارے ساتھ رہ کر یہی کرنا تھا'' میں نے کہا اور اس کی طرف دیکھا لیکن اس نے میری بات کا برا نہیں مانا تھا۔ اور بھکارن کے روپ میں بدستور مسکرا رہی تھی۔ میرا موڈ بھی خوشگوار ہوگیا۔ میرے بدن پر صاف ستھرے کپڑے تھے البتہ شیو وغیرہ کافی دن سے نہیں بنا تھا مجھے کچھ سوجھی اور میں ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا کچھ فاصلے پر مجھے ایک گلی سی نظر آئی۔ سامنے ایک ڈھابہ تھا اور یہ اس نچلے درجے کے ہوٹل کا پچھلا حصہ تھا جس میں ڈھابے کے جھوٹے بچے کچے کھانے کے ڈرم پڑے تھے آس پاس کافی گندگی تھی۔

''آؤ کوروتی۔'' میں نے کہا اور گلی کی طرف بڑھ گیا۔ کوڑے کے ڈبے کے پاس پہنچ کر میں نے ایک نگاہ اسے دیکھا پھر گندے گلے سڑے کھانے اور سڑے ہوئے بدبودار پھلوں کو اٹھا کر اپنے کپڑوں پر ملنے لگا۔

''ارے ارے۔ یہ...... یہ کیا......'' کوروتی کے منہ سے حیرت کی آواز نکلی۔ لیکن میں نے اپنے کپڑے خوب گندے کر لئے۔ اور پھر سیدھا کھڑا ہوگیا۔

''کیسا لگ رہا ہوں؟'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''گندے۔ چھی۔'' وہ ناک سکوڑ کر بولی۔

''تمہیں بھی ایسا ہی کردوں۔'' میں نے شرارت سے جھک کر کہا۔ اور وہ ہلکی سی چیخ کے ساتھ پیچھے ہٹ گئی۔ کچھ فاصلے پر ایک نلکا لگا ہوا تھا۔ میں نے وہاں جا کر اچھی طرح ہاتھ دھوئے اور پھر اپنے بال بری طرح منتشر کر لئے۔ اب میں بھی واقعی پورا فقیر لگ رہا تھا کوروتی نے شاید اب میرا مقصد سمجھا تھا اس نے پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''اے بھگوان، تم کتنے چالاک ہو عالی۔ مجھے بھکارن بنایا اور خود بھکاریوں کا روپ دھارن کرلیا اب تو تم میرے پتی لگ رہے ہو۔''

''پتی نہیں شوہر۔'' میں نے بھی خوشگوار موڈ میں کہا۔ اور وہ خوش ہوگئی۔

ہر طرف صبح کی روشنی پھیل چکی تھی۔ سڑکوں بازاروں میں زندگی جاگ گئی تھی۔ ساری رات جاگنے سے طبیعت بوجھل تھی۔ ہم دونوں ایک مسجد کے سامنے ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گئے۔ تھکن بری طرح سوار تھی دل چاہ رہا تھا کہ لیٹ جائیں۔

''ایک گدڑی کا بھی انتظام کرنا ہوگا کوروتی۔''

''یہ کیا ہوتا ہے۔''

''فقیروں کا بیڈ روم، بستر۔'' میں نے کہا۔ اسی وقت ایک کار ہمارے سامنے آ کر رکی۔ اور اس میں سے کسی نے آواز دی۔

''اے۔ تم دونوں ادھر آؤ۔'' روح فنا ہوگئی تھی۔'' یہ کیا ہوا۔ یہ کون ہے؟''...... آواز پھر سنائی دی۔

''سنا نہیں تم نے ادھر آؤ۔''

میں لرزتے قدموں سے اٹھا کوروتی بھی میرے ساتھ اٹھ گئی تھی۔ تھوڑا اور قریب پہنچا تو بس دم ہی نکل کر رہ گیا۔ جس شخص نے مجھے آواز دی تھی اسے میں نے پہچان لیا تھا یہ ثناء مرحوم کا وہ رشتہ دار تھا جس کا تعارف کراتے ہوئے عبدالحکیم صاحب کے بیٹے نے بتایا تھا کہ وہ سینٹرل انٹیلی جنس کا چیف آفیسر اشتیاق احمد ہے۔ اور جس نے میرے چہرے کو بڑے غور سے دیکھا تھا۔

(جاری ہے)

خونی موبائل

طارق محمود- کامرہ کلاں اٹک

گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اچانک ایک عجیب الخلقت بلا سامنے نمودار ہوئی جسے دیکھ کر دل دھل گیا اور رگوں میں خون منجمد ہوتا ہوا ذہن کو منتشر کرنے لگا اور پھر.....

آج پہلو میں دل ناشاد نہیں، کسے دے آئے کہاں بھول اٹھے کچھ یاد نہیں، خونی کہانی

گرمیوں کی رات تھی چاندروش روشن تھا جس کی چاندنی ہرسو پھیلی ہوئی تھی اس کچے سے گھر کے صحن میں تین چار پائیاں بچھی تھیں جن پر ایک مرداور دو عوتیں بلکہ ایک عورت اور ایک نوجوان لڑکی عاتکہ تھی، عاتکہ کے والدین سو رہے تھے لیکن عاتکہ کی آنکھوں میں نیند کا نام تک نہ تھا وہ کروٹ بدلے لیٹی تھی اس کے چہرہ پر مسکراہٹ اور ہاتھوں میں موبائل تھا، جس کی اسکرین روشن تھی۔ لگتا تھا کہ نیٹ پر گپ شپ لگائی جارہی تھی۔ کچھ سیکنڈ اسکرین کو دیکھتے رہنے کے بعد وہ میسج ٹائپ کرتی اور پھر سینڈ کرنے کے بعد انتظار کرنے لگتی جب اس کے میسج کا ریپلائی آتا تو اس کو پڑھتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر پھیلی مسکراہٹ مزید گہری ہوجاتی۔

عاتکہ کی عمر سترہ سال تھی۔ گاؤں کا ماحول اور

غریب والدین، اس نے میٹرک تک پڑھا اور پھر اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے ضد کرکے کالج میں داخلہ لے لیا جو کہ ان کے گاؤں سے کچھ دور شہر میں تھا۔

عاتکہ گاؤں میں پلی بڑھی تھی جبکہ شہر میں ماڈرن لڑکیاں اور ان کے پاس موبائل اور موبائل کے متعلق دلچسپی سے بھری باتیں جنہیں سن سن کر عاتکہ بھی موبائل لینے کے لئے مچلنے لگی اور پھر آخر کار ایک دن اس کی روز روز کی ضد کے آگے اس کے والد نے ہتھیار ڈال دیئے اور اس کے لئے موبائل خرید لیا۔

کالج میں اس کی کچھ سہیلیاں بن گئی تھیں جو کہ اپنے اپنے فون پر اپنے بوائے فرینڈز سے میسج اور کال پر بات کرتی رہتیں اور پھر اپنے قصے خوب مرچ مصالحہ لگا کر سناتیں، عاتکہ کو اس کھیل سے بہت ڈر لگتا تھا۔ وہ کسی بھی لڑکے کو اپنا دوست نہیں بنانا چاہتی تھی اسے ایک تو اپنے والدین کی عزت کا پاس تھا اور دوسرا اس کے والد اس سے محبت بھی بہت کرتے تھے لیکن وہ غصہ کے بھی بہت تیز تھے، اسی لئے وہ اس کھیل سے ڈرتی تھی۔ لیکن کب تک اپنی سہیلیوں کی محبت اور رومانس سے بھرپور باتیں سن کر اور ان کے محبت و پیار بھرے میسج پڑھ پڑھ کر جو کہ اس کی دوست خاص طور پر اس کو پڑھاتی تھیں تاکہ وہ بھی کسی لڑکے سے فرینڈ شپ کرلے۔ عاتکہ کی سوچ بھی آخر بدل گئی۔

عاتکہ چارپائی پر لیٹی موبائل سے کھیلتی ترچھی نظر سے والدین کی طرف بھی دیکھ رہی تھی اور جب اسے یقین ہوگیا کہ اس کے والدین اب گہری نیند سو گئے تو وہ آہستہ سے اٹھی اور دبے پاؤں احتیاط سے دروازہ کی طرف بڑھی اس کا منہ دروازہ کی طرف لیکن دھیان اپنے والدین ہی کی طرف تھا اور پھر دروازہ کے پاس پہنچ کر اس نے آہستہ سے کنڈی کھولی اور ایک آخری نظر والدین کی چارپائیوں پر ڈالی اور اسی وقت اس کا سانس جیسے سینے میں اٹک سا گیا۔ کیونکہ اس کے والد کروٹ بدل کر اچانک اٹھ بیٹھے تھے۔

☆......☆......☆

تنویر کی عمر تیس سال تھی وہ ایک بھرپور جوان اور اپنی عمر سے کافی چھوٹا دکھائی دیتا تھا، وہ صحیح معنوں میں ایک عمر چور جوان تھا، شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ، اس میں صنف نازک کے لئے ایک خاص قسم کی کشش تھی وہ خوب صورت تو بہت تھا لیکن اس کی دلکش باتیں لڑکیوں کو اس کا گرویدہ کردیتیں، عاتکہ بھی تنویر کو اپنا دل دے بیٹھی اور پھر تنویر کا نمبر لینے میں اسے کوئی مشکل پیش نہ آئی۔

تنویر پڑھا لکھا جوان تھا وہ عاتکہ کے برابر والے گاؤں میں رہتا تھا اور اسی گاؤں کے بازار میں اس کی کپڑے کی دکان تھی اور اس نے اپنی دکان کی پبلسٹی کے لئے باقاعدہ اپنے نام پر دکان کے کارڈ پرنٹ کروا رکھے تھے، جن پر اس کا نمبر درج تھا، اس طرح سے تنویر کا نمبر نا صرف عاتکہ بلکہ بہت سی لڑکیوں کے موبائل میں چلا گیا تھا۔

تنویر کو میسج آتے رہتے تھے۔ مختلف نمبروں سے لیکن وہ پڑھ کر اگر میسج اچھا لگتا تو مسکرا دیتا لیکن اس نے کبھی جواب نہ دیا تھا۔

ایک دن جبکہ اس کے پاس کافی رش تھا اسے ایک میسج آیا وہ ہر میسج کو ایک نظر ضرور دیکھتا تھا وہ میسج بھی ایک نئے اور انجان نمبر سے تھا۔

جب سے دیکھا تم کو
بے خودی ہوں میں
خوابوں میں خیالوں میں تیرا ہی چہرہ ہے
نظر جاتی ہی نہیں اور کہیں اب تو
تیرے چہرے کا عکس کتنا گہرہ ہے

رش کی وجہ سے تنویر نے جلدی سے میسج پڑھا اور پھر گاہکوں سے مصروف ہوگیا، اس میسج کے بعد تو جیسے میسجز کی بارش ہونے لگی اس نے فون کو سائلنٹ پر لگا دیا اور گاہک ڈیل کرنے لگا لیکن اس کا دھیان فون کی طرف ہی تھا اور جب دوپہر ہوئی تو گاہک بالکل نہ رہے گرمیوں کی گرم دوپہر تھی اسی لئے کسی کے آنے کا امکان بہت ہی کم تھا۔ اس نے دوسرے میسج پڑھے جو کہ

اسی نمبر سے آئے تھے اور آخری میسج پڑھتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

''اب آپ کی طرف سے بھی کچھ ہو جائے۔''

تنویر نے کوئی جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور نماز ظہر کے وقت نماز پڑھ کر گھر چلا گیا اور کھانا کھاتے ہی کچھ دیر کے لئے آرام کی غرض سے لیٹ گیا، لیکن اس نیو نمبر کے بارے میں اسے کچھ تجسس سا تھا۔ اس نے کال ملائی، لیکن آگے سے بزی کر دیا گیا۔

''کال نہیں پلیز! میسج۔'' کال کے فوراً بعد ہی اسے میسج ریسیو ہوا۔

''آپ پہلے اپنا تعارف تو کروائیں؟'' تنویر نے لکھا۔

''اتنی جلدی کیا ہے جناب تعارف بھی ہو جائے گا۔'' اس طرح تنویر کی ایک نجانی لڑکی سے ایس ایم ایس فرینڈ شپ ہوگئی، دونوں ہی کال کرنے سے اجتناب کرتے تھے بس میسج ہی میسج۔

کچھ دنوں بعد ایک صبح اس کی دکان پر دو لیڈیز آئیں، جس میں سے ایک چالیس سال کے قریب عمر کی خوب صورت سی عورت تھی اور اس کے ساتھ ایک سترہ سال کی ایک خوب صورت سی لڑکی، تنویر مختلف کلر اور ڈیزائن کے کپڑے نکال نکال کر انہیں دکھانے لگا، لڑکی تھوڑا پیچھے ہٹ کر بیٹھی تھی۔ عورت ہی ہر کپڑے کو دیکھتی اور اس لڑکی کی طرف بڑھا دیتی۔

اسی وقت تنویر کو ایک ہلکی سی مس کال آئی اور پھر اس کے فوراً بعد ہی ایک میسج بھی آ گیا۔ تنویر نے موبائل نکال کر مس کال اور پھر میسج پڑھا۔ ''میں آپ کے سامنے بیٹھی ہوں۔'' مس کال اور میسج اسی نمبر سے تھا تنویر نے ایک دم سے سامنے بیٹھی کپڑے دیکھتی اس عورت کی طرف دیکھا لیکن وہ اسی طرح کپڑے دیکھنے میں محو تھی۔ اس کی نظر پھر اس ینگ لڑکی کی طرف اٹھ گئی تو اسے اس لڑکی کے چہرے پر ایک دل آویز مسکراہٹ اور ہاتھوں میں موبائل فون پکڑا نظر آیا اور اس کی آنکھوں میں ایک شرارت سی نظر آئی۔

تنویر کو اتنی چھوٹی سی لڑکی دیکھ کر ایک حیرت کا جھٹکا لگا اس کے ایس ایم ایس سے تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی میچور لڑکی ہوگی لیکن یہاں تو ایک سترہ سال کی لڑکی تھی لیکن بہت خوب صورت۔

اور پھر دونوں ایک دوسرے کے بارے میں جاننے لگے تنویر اور عاتکہ۔

عاتکہ کی کلاس فیلو لڑکیاں چوری چھپے اپنے فرینڈز کے ساتھ گھومتی پھرتی تھیں، لیکن عاتکہ میں اتنی ہمت نہ تھی، بس وہ ہفتہ بھر بعد تنویر کی دکان پر کپڑے لینے کے بہانے چلی جاتی تھی کبھی کبھی اس کی امی ساتھ ہوتیں اور کبھی اکیلی، بس وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر اور ہلکی پھلکی گپ شپ لگا کر پیاس بجھاتے۔

ایک دن تنویر، عاتکہ کا ایک میسج پڑھ کر پریشان ہوگیا۔ ''اگر میں تم سے خفا ہو جاؤں تو مجھے کیسے مناؤ گے۔''

''یار میں تمہیں خفا ہی نہیں ہونے دوں گا۔'' تنویر نے جلدی سے لکھا۔

''نہیں پھر بھی اگر ہوگئی تو......'' عاتکہ نے پوچھا۔

''پھر میں منانے کی کوشش کروں گا۔'' تنویر نے کہا۔

''وہی تو بتاؤ کہ کیسے مناؤ گے؟'' اس کے بعد تنویر کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

''ارے یار اس میں اتنا سوچنے کی کیا بات ہے۔ کوئی رومانٹک، کوئی پیار بھری بات کوئی کس لینے دینے کی بات کرو جس سے میں فوراً مان جاؤں۔'' جب تنویر نے کچھ دیر تک میسج کا جواب نہیں دیا تو عاتکہ نے خود ہی میسج کر دیا۔ ''دیکھو پلیز! یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں ہم تو بس فرینڈز ہیں اور بس۔''

لیکن عاتکہ نہ مانتی تھی اور نہ وہ مانی۔ ''نہیں آج تم مجھے رومانس کے متعلق کچھ بتاؤ گے، بس، یا پھر آج سے ہماری دوستی ختم۔'' عاتکہ کی یہ بات پڑھ کر تنویر کے دل میں جیسے ہلچل سی مچ گئی کیونکہ اس وقت تک تنویر کو

عاتکہ اور اس کے میسجز کی اتنی عادت پڑ گئی تھی کہ اس کے لئے یہ سب چھوڑنا ناممکن تھا اور پھر اس کے بعد دونوں میں ایک رومانس بھری گپ شپ چل پڑی، جو کہ بہت آگے تک چلی گئی اور پھر اس کے بعد دونوں ہی کو اس گپ شپ میں مزا آنے لگا۔

عاتکہ بہت ایڈوانس ہوتی جا رہی تھی، ساتھ ہی تنویر بھی جو کہ اپنی بیوی اور بچوں کو ٹائم بھی نہ دے پا رہا تھا اور پھر جب تنویر کو تھوڑا ہوش آیا اور پھر اس کو اپنے کئے پر شرمندگی ہونے لگی تو اس نے عاتکہ سے کنارہ کشی کرنا چاہی جو کہ تھی تو بہت مشکل لیکن اب اس کے لئے یہ بہت ضروری تھا، اب اسے دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا عاتکہ یا پھر اس کی بیوی اور بچے۔

ان ہی دنوں اس کے محلّہ میں ایک شادی شدہ نوجوان لڑکی نے خودکشی کر لی۔ لڑکی کے فون سے دو نوجوان لڑکوں کے نمبر ملے اور پھر پولیس ان لڑکوں کو پکڑ کر لے گئی۔ ان کی خوب چھترول ہوئی بہت مشکل سے ان کی ضمانت ہوئی لیکن پولیس نے ٹھیک ٹھاک پیسہ بٹور لیا۔

وہ دونوں باہر تو آچکے تھے لیکن ان کی بدنامی اتنی ہو چکی تھی کہ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل ہی نہ رہے اور پھر کچھ دنوں بعد وہ علاقہ سے غائب ہو گئے، اس واقعہ سے تنویر بہت زیادہ ڈرا، اسے بھی اپنی عزت اور گھر والوں کی جان خطرے میں نظر آنے لگی۔ ''اس کے بعد کوئی کال یا میسج نہ کرنا پلیز۔''

تنویر نے اسی دن عاتکہ کو کال کی اور کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد کہا تو عاتکہ کا ردعمل شدید تھا۔ ''او ئے ایسا کیوں؟''

''بس میں اب اس قصے کو ختم کرنا چاہتا ہوں میں بہت ڈر گیا ہوں۔''

اور پھر تنویر نے اسے سمجھانے کی کوشش کر دی، لیکن عاتکہ زخمی ناگن کی طرح پھنکارنے لگی۔ ''تم ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں۔''

لیکن تنویر نے موبائل آف کر دیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا لیکن اس کے دل میں عجیب عجیب سے وسوسے جنم لے رہے تھے وہ بہت پریشان تھا کہ اب نہ جانے کیا ہو گا اسے بہت دکھ اور افسوس ہونے لگا اس نے بہت غلط کیا دوستی کر کے بہت ہی غلط کیا اس نے وہ پورا دن موبائل بند رکھا اور جب رات کو سونے کی غرض سے چارپائی پر لیٹا تو اسے عاتکہ سے کی ہوئی تمام باتیں یاد آنے لگیں اور پھر اس کے ذہن میں آیا کہ اس کے تو بہت سے میسج عاتکہ کے موبائل میں محفوظ ہوں گے۔ اس نے جلدی سے موبائل آن کیا اور پھر عاتکہ کے بہت سے میسج ریسیو ہونے لگے جو کہ تنویر کے فون آف کرنے سے اکٹھے ہو گئے تھے۔

''پلیز ایسا نہ کرو ریئلی آئی لو یو، میں اب تمہارے بن رہ نہیں سکتی۔'' اسی طرح کے بہت سے میسج تھے لیکن آخری میسج پڑھتے ہی اسے چکر سے آگئے اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اسے اپنے دل پہ ایک انجانا سا بوجھ محسوس ہوا، تو وہ بستر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا لیکن اس کے پیروں تلے سے زمین کھسکتی محسوس ہوئی اور کمرہ ہلتا محسوس ہوا اور پھر وہ گرتا چلا گیا۔

اسے جس بات کا ڈر تھا وہ ہی بات ہو گئی تھی۔

اس کی بیوی نے جب اپنے شوہر کی ایسی حالت دیکھی تو اسے تشویش ہوئی، اس نے ہمت کر کے جیسے تیسے بستر پر ڈالا اور بھاگ کر اس کے لئے پانی لے آئی ساتھ ہی اس کا موبائل جو کہ نیچے پڑا تھا اور اس کی اسکرین جگمگا رہی تھی اٹھا کر تکیہ کے نیچے رکھ دیا۔

تنویر کو جب ہوش آیا تو اس نے اپنی بیوی کو اپنے بستر پر بیٹھے پایا جو کہ ہاتھ کا پنکھا جھل رہی تھی، تنویر کے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ ''ارم کب تک یوں پنکھا جھلتی رہو گی، جاؤ سو جاؤ میں اب ٹھیک ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے بیوی کو بچوں کے پاس دوسرے کمرے میں بھیج دیا، اس کی بیوی تو جیسے حکم کی غلام تھی، اس نے یہ تک نہ پوچھا کہ آپ کو اچانک ہو کیا گیا تھا۔

اس کے جاتے ہی تنویر نے پانی پیا اور فون اٹھا لیا جس کی میموری میں بہت سے ان ریڈ میسج دیکھے جو کہ

سارے کے سارے عاتکہ کی طرف سے تھے۔ اس نے وہ میسج پھر سے پڑھا جس نے اسے ہوش سے بیگانہ کردیا تھا۔ ''میرے موبائل میں تمہارے بہت سے میسج ہیں اگر تم نے مجھے چھوڑنے کا سوچا تو میں خودکشی کرلوں گی اور پھر میرا فون میرے والدین اور پولیس کو مل جائے گا، آگے تم پڑھے لکھے اور سیانے بندے ہو۔''

وہ ساری رات تنویر نے جاگ کر گزار دی، جس بات کا ڈر تھا آخر وہ ہی ہونے جارہا تھا، تنویر نے جذبات میں بہہ کر بہت سے ایسے میسج کردیئے تھے جو کہ لغویات سے بھی بڑھ کر تھے، اب وہی میسج اس کے لئے خطرناک ہوتے جارہے تھے، تنویر کو اپنی عزت اور اپنے بیوی بچے بہت ہی عزیز تھے اس کے جذباتی میسج اب اس کے لئے وبال جان بننے والے تھے۔

آخر پوری رات جاگتے رہنے کے بعد اس نے ایک فیصلہ کرہی لیا اور پھر مطمئن اور مجبوری میں عاتکہ سے اسی طرح گپ شپ لگانے لگا، اسی طرح سال گزر گیا، پھر سے گرمیاں آگئیں اب اس کی سوچ کے مطابق عمل کرنے کا وقت آگیا۔

آخر تنویر عاتکہ سے اکیلے میں ملنے کے لئے ضد کرنے لگا، عاتکہ آخر مان گئی اور ملاقات کے لئے وقت اور جگہ طے ہوگئی۔

اس رات بیوی بچوں کے سونے کے بعد تنویر نے موٹر سائیکل نکالی اور عاتکہ کے گاؤں کی طرف چل دیا۔ کچھ دیر بعد وہ گاؤں کے ساتھ کھیتوں میں جھاڑیوں کے اندر موٹر سائیکل چھپارہا تھا اور خود فصلوں میں ایسی جگہ چھپ گیا جہاں سے کھیتوں میں داخل ہونے والا راستہ بخوبی نظر آرہا تھا۔ چاندنی رات تھی ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی موسم بڑا سہانا تھا۔

دوسری طرف عاتکہ گھر کے دروازے سے نکلنے ہی لگی تھی کہ اس کے والد اچانک چارپائی پر اٹھ بیٹھے۔ عاتکہ کا سانس جیسے گلے میں اٹک گیا، لیکن اس کے والد پھر لیٹ گئے اور کروٹ بدل لی اور ادھر ادھر دیکھا تک نہیں، تب عاتکہ کی جان میں جان آئی اور وہ جلدی سے گھر سے نکل کر کھیتوں کی طرف بڑھنے لگی، تنویر اس کا منتظر تھا جس کے میسج اب بھی اسے آرہے تھے اور عاتکہ انہیں بڑھتی احتیاط سے مستی کی چال چلتے ہوئے اسی سمت بڑھ رہی تھی جس کے بارے میں اسے گائیڈ کیا جارہا تھا۔ کیونکہ وہ موبائل کو دیکھ کر ہاں کے انداز میں سر کو ہلارہی تھی اور پھر کھیتوں میں اگی فصلوں نے عاتکہ کو اپنے اندر گم کرلیا، وہ چلتے چلتے گاؤں سے بہت دور اور فصلوں کے اندر تک آگئی تھی۔ اب اسے ڈر لگنے لگا تھا۔ اس نے جلدی سے تنویر کو کال ملائی پہلی ہی ٹیون پر کال ریسیو ہوگئی۔ ''تنویر تم کہاں ہو مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

''بس تھوڑا اور آگے آجاؤ۔'' تنویر نے جواب دے کر کال کاٹ دی۔

عاتکہ کے سامنے گھنی جھاڑیاں تھیں جن کے اندر کچھ سرسراہٹ سی ہورہی تھی اور پھر ایک زور کا کھٹکا ہوا۔ جیسے کوئی سوکھی ٹہنی ٹوٹی ہو، عاتکہ بدک کر پیچھے ہٹی اور پھر اس کی آنکھیں جو کہ جھاڑیوں پر ہی مرکوز تھیں، حیرت سے پھیل گئیں اور وہ پیچھے ہٹتے ہوئے فصلوں کے اندر گرنے لگی۔

تنویر کو عاتکہ کھیتوں میں داخل ہوتی نظر آئی۔ تنویر فصلوں کے اندر رہتے ہوئے عاتکہ سے چھپ کر اس سے کچھ فاصلہ رکھ کر چلنے لگا اس نے اپنے موبائل سائلنٹ پر لگادیا۔ تنویر اس سے چھپ کر لیکن اس پر نظر رکھے ہوئے کافی دور لے جانا چاہتا تھا وہ عاتکہ کو میسج پر گائیڈ کررہا تھا کہ آگے چلتی جائے۔ کافی دور آنے کے بعد بھی اسے کوئی جگہ پسند نہیں آرہی تھی کہ گھنی جھاڑیوں کے پاس پہنچتے ہی عاتکہ کی کال آگئی، عاتکہ اسے ادھر ہی ملنے کا کہہ رہی تھی لیکن اس نے تھوڑا مزید آگے جانے کا کہہ دیا۔

کال ختم ہوئی ہی تھی کہ ان گھنی جھاڑیوں میں سرسراہٹ سی ہوئی، ساتھ ہی کھٹاک کھٹاک کی اونچی آواز نے تنویر کو بھی ڈرادیا، عاتکہ اتنی ڈری کہ پیچھے ہٹتے ہٹتے کھیت میں گرتی چلی گئی۔

اسی وقت تنویر کی آنکھیں بھی حیرت سے پھیل گئیں کیونکہ جھاڑیوں کے اندر سے درمیانے قد کا ایک خونخوار بھیڑیا چھلانگ لگا کر باہر نکلا تھا، اس کی سرخ

انگارہ ہوتی آنکھیں عاتکہ پر لگی ہوئی تھیں عاتکہ کی تو جیسے آواز بلکہ سانس تک بند ہوگیا۔

بھیڑیا تھا تو درمیانے قد کا لیکن درندہ ہوتا تو خطرناک ہی ہے۔

تنویر نے جمپ لگا کر بھیڑیا کے آگے اچانک آنے کا سوچا۔ ''ہوسکتا ہے بھیڑیا ڈر کر بھاگ جائے۔'' لیکن پھر ایک شیطانی خیال نے اس کے ذہن میں پنجے گاڑے، جسے سوچ کر اس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ کھیلنے لگی اگر بھیڑیا عاتکہ کا کام تمام کر دیتا تو تنویر آسانی سے اس کا موبائل لے لیتا اور پھر واپس چلا جاتا۔

تنویر کے پہلے بھی یہ ہی پلان تھا کہ کسی طرح عاتکہ سے موبائل چھین سکے یا اس میں سے مسیج اور کال میموری ہی ڈیلیٹ کر سکے۔

اسی وقت بھیڑیا نے ایک غراہٹ کے ساتھ اپنے آپ کو جھکایا جیسے کہ حملہ کرنے والا ہو لیکن عاتکہ کا کوئی ردعمل نہ ہوا، یقیناً وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

لیکن اگلا لمحہ تنویر اور شاید بھیڑیا کے لئے بھی حیران کن تھا۔

اچانک ہی گھنی فصل سے ایک آدمی ہاتھ میں بڑا سا کلہاڑا تھامے چھلانگ لگا کر بھیڑیا کے سامنے ایک عجیب سا نعرہ لگاتے نمودار ہوا، بھیڑیا بھی اس اچانک افتاد سے تھوڑا ڈرا اور پیچھے ہٹا۔

تنویر اس آدمی کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا جو کہ اچانک کہیں سے نمودار ہوا اور تنویر کو اپنا پلان ڈوبتا نظر آنے لگا۔

وہ اکبر نام کا شخص تھا جو کہ عاتکہ کے گاؤں ہی کا تھا اور عاتکہ اسی کی فصل میں پڑی تھی۔ اکبر رات کو اپنی فصلوں کی حفاظت کے لئے پہرہ دے رہا تھا۔

رات کے بارہ بجے اس نے عاتکہ اور پھر بعد میں تنویر کو اپنی فصلوں میں داخل ہوتا دیکھ لیا اور وہ تجسس میں عاتکہ اور تنویر کا پیچھا کرنے لگا اور جب بھیڑیا جھاڑی سے نمودار ہوا تو اکبر کو عاتکہ کی زندگی خطرے میں نظر آنے لگی، وہ ایک دلیر انسان تھا، اسی

کیا ایسا نہیں ہوسکتا

ایک دفعہ ایک اخبار نویس ڈوب رہا تھا اتفاق سے ایک شخص نے اسے ڈوبنے سے بچایا اخبار نویس نے اپنے محسن کا شکریہ ادا کیا اور اسے مکمل ایڈریس دیا اور کبھی دفتر آنے کی دعوت دی۔ ایک عرصہ بعد اس شخص نے ایک نظم لکھی اور اسے کہیں چھپوانا چاہا اسے اسی اخبار نویس کا خیال آیا تو فوراً دفتر جا دھمکا اخبار نویس نے بڑی آؤ بھگت کی اور پھر آنے کا مدعا پوچھا اس شخص نے فوراً اخبار میں اپنی نظم چھپوانے کی خواہش ظاہر کی۔ اخبار نویس نے نظم پڑھی اور ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

''حضور کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ مجھے پھر وہیں لے چلیں۔ جہاں آپ نے مجھے ڈوبنے سے بچایا تھا۔''

(ڈاکٹر ندیم۔شاہ پور کھڈرو)

لئے اس نے فوراً ایک فیصلہ کیا اور ٹھیک اس وقت جب بھیڑیا عاتکہ پر چھلانگ لگانے والا تھا، کود کر بھیڑیا کے سامنے آ گیا۔

بھیڑیا اکبر کے سامنے اچانک نمودار ہونے سے ڈر کر پیچھے ہٹا ضرور لیکن جب اس نے اپنے سامنے ایک انسان کو دیکھا تو اس نے زبردست دہاڑ کے ساتھ اکبر پر حملہ کر دیا، اکبر سامنے تو تیار حالت میں ہی آیا تھا لیکن شاید اسے بھیڑیا کے اتنی جلدی حملہ کرنے کی توقع نہ تھی۔

بھیڑیا ہوا میں اڑتا ہوا اس کے اوپر جا پڑا اس کا دایاں پنجہ اکبر کے کندھے کو خاصا زخمی کرتا نکل گیا اکبر زوردار آواز سے زمین پر گرا اور اس کے منہ سے ایک سسکی نکلی، بھیڑیا ایک طرف گرنے کے بعد فوراً اٹھا، اکبر کے کپڑے کندھے سے پھٹ گئے تھے، اور کندھے سے خون نکلنے لگا تھا، اس کو کافی تکلیف ہو رہی تھی لیکن

اس نے کلہاڑی کو دائیں ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑا اور بھیڑیا کے سامنے کھڑا ہوگیا۔

دونوں کی آنکھوں میں ایک دوسرے کے لئے نفرت وغصہ کی چنگاریاں واضح نظر آرہی تھیں۔

پھر ایک انسان اور درندے کی خونی لڑائی شروع ہوئی، دونوں ہی ایک دوسرے پر وار کرنے لگے، اکبر بہت بہادری سے اس بھیڑیا سے مقابلہ کررہا تھا اس نے دو تین کاری وار بھیڑیا کے جسم پر کلہاڑی سے لگائے تھے لیکن وہ خود بھی بہت زخمی ہوگیا تھا، اتنے زخمی ہونے کے باوجود بھی دونوں آمنے سامنے ڈٹے ہوئے ایک دوسرے کو گھور رہے تھے، اور پھر بھیڑیا نے اکبر پر جست لگائی، اس کی غراہٹ اتنی خطرناک تھی کہ تنویر جو گم صم بیٹھا، یہ لڑائی دیکھ رہا تھا، اس کا دل لرز اٹھا اور عاتکہ بھی اسی وقت جیسے ہوش میں آگئی۔

بھیڑیا اڑتا ہوا اکبر پر حملہ آور ہوا، اس کا دایاں پنجہ اکبر کے نرخے پر پڑا لیکن اس سے پہلے اکبر کا ہاتھ چل چکا تھا، اس کے ہاتھ میں پکڑی کلہاڑی ہوا کو چیرتی ہوئی بھیڑیا کے سر میں پیوست ہوگئی، ساتھ ہی بھیڑیا کے پنجے نے اکبر کا نرخرہ ادھیڑ دیا۔ دونوں ہی ساتھ ساتھ گرے اور تھوڑی دیر تڑپنے کے بعد ٹھنڈے ہوگئے۔

تنویر اس لڑائی سے سب کچھ بھول گیا تھا لیکن جب اکبر اور بھیڑیا دونوں گر کر ساکت ہوگئے، تو اس نے جلدی سے عاتکہ کی طرف دیکھا جو کہ آنکھیں بند کئے زمین پر پڑی لرز رہی تھی اور اس کا موبائل اس کے پاس ہی زمین پر پڑا تھا۔

تنویر کے لئے اب موقع اچھا تھا، وہ آہستہ آہستہ عاتکہ کی طرف بڑھا اور پھر موبائل کے پاس پہنچتے ہی عاتکہ کی طرف دیکھ کر اس کا موبائل اٹھالیا، اسی وقت عاتکہ نے آنکھیں کھول دیں اس کی آنکھیں جیسے خون سے بھری ہوئی تھیں۔

تنویر اس کو اپنی طرف گھورتے دیکھ کر ڈر گیا لیکن پھر وہ جیسے ہوش میں آیا اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر جلدی سے پلٹنے کا ارادہ کیا لیکن اچانک عاتکہ نے اپنے دونوں بازو آگے کیے اور تنویر کی ایک ٹانگ پکڑ لی، تنویر نے اس سے اپنی ٹانگ چھڑانے کی بہت کوشش کی لیکن عاتکہ پر تو جیسے جنون سوار ہوگیا تھا، وہ زور لگا کر تنویر کو گرانے کی کوشش کرنے لگی اس کے منہ سے ہیجان میں عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں۔

تنویر بھی کمزور نہ تھا لیکن وہ کب تک مدافعت کرتا۔ عاتکہ نے زور زور سے جھٹکے مارے تو وہ گرنے لگا اور گرنے سے بچنے کے لئے اس نے ہوا میں ہاتھ چلائے تاکہ کسی چیز کو پکڑ کر گرنے سے بچ سکے۔

وہاں کچھ اور تو نہ تھا جسے وہ پکڑ سکے مگر اس کا ہاتھ بھیڑیا کے سر میں پیوست کلہاڑی کے دستہ پر جا پڑا اور کلہاڑی نکل کر اس کے ہاتھ میں آگئی جس سے وہ گرنے سے نہ بچ سکا اور سیدھا عاتکہ کے اوپر جا گرا، تنویر خود کو سنبھالتے ہوئے ایسی پوزیشن میں گرا کہ کلہاڑی کا پھل اس کے نیچے آگیا۔ جس پر وہ اپنے پورے وزن سے گرا اور کلہاڑی کا تیز پھل کھچ سے عاتکہ کے نرخرہ میں جا گھسا، عاتکہ کے گلے سے خرخراہٹ جیسی آواز نکلی اس کے ہاتھوں نے تنویر کو چھوڑ دیا اور تنویر کو ایک جھٹکا لگا۔ ”یہ کیا ہوگیا۔“

تنویر تو ایسا کبھی نہیں چاہتا تھا اس نے جلدی سے کلہاڑی واپس کھینچی تو عاتکہ کے گلے سے خون کا زبردست فوارہ چھوٹا، وہ ایک ہچکی لے کر خاموش ہوگئی، اس کی آنکھوں میں ایک حسرت سی منجمد ہوکر رہ گئی تھی، تنویر ادھر ہی جم کر رہ گیا۔

اور جب صبح لوگ کھیتوں میں پہنچے تو عاتکہ کا سر تنویر اپنی گود میں رکھے اس سے باتیں کررہا تھا، لوگوں نے پولیس بلوائی لیکن تنویر پاگل ہوچکا تھا، اسے جیل کے بجائے پاگل خانہ بھجوادیا گیا۔

پاگل خانے میں کبھی کبھی عاتکہ کی روح سے تنویر باتیں کرتے نظر آتا ہے، وہ مسکراتا ہے اس کی باتیں ہوتی ہیں۔ ”عاتکہ میں تمہارے لئے نیا موبائل ضرور لاؤں گا۔“

موبائل کے غلط استعمال نے کتنا نقصان کردیا۔

حیران کن

ساجدہ راجہ۔ ہنڈواں سرگودھا

لوگوں کے لاکھ منع کرنے کے باوجود ایک نوجوان اس عمارت میں داخل ہوا، وہ صرف چند منٹ عمارت میں رہ کر جب عمارت سے باہر نکلا تو وہ سوچ کی اتھاہ گھرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا کیونکہ کئی صدیاں گزر چکی تھیں۔

کسی بھی صورت عقل و شعور میں نہ آنے والی رائٹر کے زور قلم کی شاہکار زبردست کہانی

وہ لوگوں کی باتوں پر بہت ہنسا کرتا، جب لوگ یہ کہتے کہ ”فلاں علاقے میں ایک ایسی عمارت ہے جہاں وقت رکا ہوا ہے، ہماری دنیا میں صدیاں گزر جاتی ہیں اور وہاں صرف کچھ لمحے۔“

اس کو لوگوں کی باتوں پر بہت حیرانگی ہوتی تھی کہ ”ان کو کس طرح معلوم ہوا کہ اس عمارت میں وقت تھم گیا ہے اگر وہ لوگ سچ کہہ بھی رہے تھے تو ان کو یہ سب کس طرح معلوم ہو گیا کہ اس عمارت کی یہ حیران کن بات ہے اور دوسرا وہ یہ بھی حیران ہوتا کہ اس عمارت میں ایسی کیا بات ہے کہ وہ اسی دنیا کا حصہ ہوتے ہوئے بھی اس دنیا کا حصہ نہیں ہے۔ کیا وہاں کوئی طلسم تھا یا زمین کی گردش کی وجہ سے کچھ ایسا ہوتا کہ وقت رک جائے۔“

اسے یقین نہیں آتا تھا کہ اس دنیا میں کچھ ایسا

بھی ہو سکتا ہے سائنس کی ایجادات کی بدولت بہت کچھ ممکن تھا لیکن یہ تو قطعاً ممکن نہ تھا کہ وقت کو ایک جگہ پر روک لیا جائے اور دوسری جگہ صدیاں گزر جائیں۔ اس نے خلاء میں بلیک ہولز کے بارے میں سنا تھا کہ وہاں وقت ٹھہرا ہوا ہے لیکن اسی زمین پر تو یہ ناممکن تھا۔

اس نے اس عمارت کے بارے میں بہت تحقیق کی لیکن اسے کوئی خاص بات معلوم نہ ہو پائی کہ یہ عمارت کب اور کس نے تعمیر کروائی اور اس کی یہ حیران کن خصوصیت کب سامنے آئی۔

لیکن اسے صرف اتنا ہی پتہ چل سکا جو وہ پہلے ہی سن چکا تھا کہ وہاں وقت گزرتا نہیں بلکہ رک گیا ہے۔

ایڈمر گلٹن کو تجسس تو بہرحال تھا بے شک لوگوں کی باتوں پر یقین نہ کرتا تھا ان کی ہنسی اڑاتا تھا لیکن اس کے اندر کہیں اس راز سے پردہ اٹھانے کا تجسس بھی تھا اور تجسس تو انسانی فطرت کا خاصہ رہا ہے اسی تجسس کی بدولت اتنی ایجادات ہوئیں انسان نے خلاء میں موجود عناصر کا کھوج لگایا چاند ستاروں، سیاروں کے بارے میں معلومات حاصل کیں، اس کائنات میں جو کچھ ہوا جو ہو رہا ہے اور کیا کچھ ہوگا اس کے بارے میں بھی بہت کچھ معلوم کرلیا ہے، سائنسی ترقی انسان کی کھوج کی ہی مرہون منت ہے۔

اور کھوج کا مادہ ہر انسان میں موجود ہوتا ہے یہ اور بات ہے کہ ہر انسان اسے کام میں نہیں لاتا۔

ایڈی کو بھی یہی کھوج بے چین رکھنے لگی جب انسان کچھ کرنے کی ٹھان لیتا ہے تو وہ کر کے ہی چھوڑتا ہے چاہے وہ اس میں کتنا ہی نقصان اٹھائے۔ ایسے ہی تو نہیں کہا گیا کہ۔

''بے شک انسان خسارے میں ہے۔''

ایڈی ٹھان چکا تھا کہ وہ اس عمارت میں جا کر اس راز کا کھوج ضرور لگائے گا اور لوگوں کی باتوں کو ضرور غلط ثابت کرے گا۔

''یہ لوگ بھی نا....؟ اپنی طرف سے مفروضے قائم کر لیتے ہیں۔'' وہ لوگوں پہ ہنستا یہ سوچے بغیر کہ رائی ہو تو پہاڑ بنتا ہے اور سائنس کی بنیاد ہی مفروضوں پر قائم ہے، مفروضوں کو مشاہدات اور پھر تجربات کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے اور پھر ان کے سچ جھوٹ کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔

ایڈی نے اس کا ذکر اپنی بیوی مارتھا سے کیا۔

مارتھا نے حیرانی سے ایڈی کی طرف دیکھا۔

''تمہارا دماغ ٹھیک ہے ایڈی۔''

''کیوں مجھے کیا ہوا ہے؟''

''تم اس عمارت میں جانا چاہتے ہو جس کے بارے میں لوگ سننا بھی پسند نہیں کرتے۔''

''تو اس میں حرج ہی کیا ہے.....؟'' ایڈی بولا۔

''حرج ہے ایڈی..... تمہارا ایک سال کا بیٹا بھی ہے۔''

''میں جانتا ہوں یار۔'' وہ اکتا گیا۔

''پھر بھی تم جانا چاہتے ہو؟''

''ہاں تو کیا نقصان ہے جانے میں۔''

''نقصان ہے ایڈی۔ لوگ جھوٹ نہیں کہتے یقیناً کچھ نہ کچھ تو ہے وہاں جو اس کے بارے میں اتنی باتیں مشہور ہیں۔''

ایڈی ہنستے ہنستے دہرا ہو گیا۔

''اوہ..... کم آن مارتھا مجھے تم سے ایسی دقیانوسی باتوں کی امید نہیں تھی وہاں ایسا کچھ بھی نہیں بس پہاڑوں کے اوپر اتنی عظیم الشان عمارت کی تعمیر حیران کن ضرور ہے لیکن اہرام مصر کو ذہن میں رکھو تو تمہیں اس کی بھی اتنی حیرانگی نہیں ہوگی۔''

''جنہوں نے وہ اہرام مصر بنائے وہ بھی تو انسان ہی تھے نا، تو یہ عمارت بھی انہی جیسے انسانوں نے بنائی ہوگی۔''

مارتھا نے اس کی بات کاٹ دی۔

''میں عمارت کی تعمیر کے متعلق تم سے بات نہیں کر رہی میں وقت کی بات کر رہی ہوں جو وہاں رکا ہوا ہے اگر وہ سب سچ ہوا تو۔''

''پلیز! مارتھا..... کچھ نہیں ہوگا صرف ایک رات..... اس کے بعد میں واپس آجاؤں گا۔'' مارتھا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ایڈی بولا۔

مارتھا کی آنکھیں پھٹ سی گئیں۔ ’’ایک رات......؟ ایڈی وہاں تو چند لمحے گزریں تو یہاں صدیاں گزر جائیں گی اور تم ایک رات کی بات کررہے ہو؟‘‘ مارتھا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اسے ایڈی سے جنون کی حد تک محبت تھی اور وہ کسی صورت ایڈی کو اس تجربے کی بھینٹ نہیں چڑھنے دینا چاہتی تھی لیکن ایڈی کسی صورت نہ مانتا، وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ ایڈی نے سنجیدگی سے مارتھا کی طرف دیکھا۔

’’کیا تمہیں یقین ہے لوگ ٹھیک کہتے ہیں؟‘‘

’’مجھے کچھ نہیں معلوم۔‘‘ مارتھا ہچکیوں سے رونے لگی۔ ’’مجھے بس اتنا معلوم ہے کہ میں تمہیں کسی صورت کھونا نہیں چاہتی۔ اور کوئی بات تو ضرور ہے ایڈی جو لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں۔‘‘

’’ایڈی نے اسے اپنے ساتھ لگالیا‘‘ اور لوگوں کی انہی باتوں کو تو میں غلط ثابت کرنے کے لئے وہاں جارہا ہوں۔ پلیز مارتھا بہادر بنو، کیا ہوگیا ہے تمہیں، میں کوئی میدان جنگ میں تھوڑی جارہا ہوں جو یوں رو رہی ہو۔‘‘

ایڈی مارتھا کے یوں رونے سے بہت پریشان تھا کیونکہ اس نے کبھی مارتھا کی آنکھوں میں آنسو نہیں آنے دیا تھا۔

’’دیکھو......! میری بات سنو...... میں بس ایک گھنٹے کے لئے وہاں جاؤں گا۔ پوری رات وہاں نہیں گزاروں گا۔ اب تو رونا بند کردو۔‘‘

مارتھا چپ ہوگئی لیکن اس کے آنسو اب بھی بہہ رہے تھے۔ گویا آدھی راضی۔ ایڈی نے دل میں کہا۔

’’چلو چپ کرجاؤ...... صرف آدھا گھنٹہ۔‘‘ ایڈی نے مزید ترمیم کی۔ مارتھا نے اپنے آنسو صاف کئے۔ لیکن چہرہ اس کا ابھی بھی اترا ہوا تھا۔

راضی ہونے کے قریب...... ایڈی دل میں مسکرایا۔

’’چلو ٹھیک ہے۔ میں بس اس عمارت کو اندر سے دیکھوں گا اور فوراً واپس۔‘‘ اور مارتھا کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ’’راضی......!‘‘ ایڈی بھی زور سے ہنس پڑا۔

اور جس جس نے بھی ایڈی کے فیصلے کو سنا سر پکڑ کر رہ گیا سب نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ بھلا کہاں باز آنے والا تھا اس وقت بھی وہ رابرٹ کے پاس بیٹھا تھا جو اسے روکنے کی کوشش میں ناکام ہوا جارہا تھا۔

’’تم تو پڑھے لکھے آدمی ہو تم سے مجھے ایسی بات کی امید نہیں تھی۔‘‘ ایڈی تاسف سے گویا ہوا۔

’’اس میں پڑھے ان پڑھ کی کوئی بات نہیں ایڈی۔ اور پڑھے لکھے تو تم بھی ہو پھر کیوں کسی کی بات پر یقین نہیں کررہے۔ لوگ اتنے کم عقل نہیں کہ یونہی ہر بات پر آنکھیں بند کرکے یقین کرلیں۔ کچھ نہ کچھ تو ہوگا ایڈی۔‘‘

’’اور بلیک ہولز کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔‘‘ رابرٹ کے سوال پر ایڈی نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

’’کیا مطلب......؟ وہ بلیک ہولز ہیں اور خلاء میں تو کچھ بھی ممکن ہے۔ لیکن یار اس کرہ ہوائی میں تو ایسا ممکن نہیں۔‘‘

’’کیوں ممکن نہیں...... جس جگہ وہ عمارت واقع ہے۔ تحقیق کے مطابق وہ جگہ ایک بلیک ہولز کے دائرے میں آرہی ہے۔ وہ پہاڑ کے چوٹی پر واقع عمارت ہے اور پہاڑ کی چوٹی کتنی بلند ہے تم جانتے ہو۔ بے شک وہ بلیک ہول زمین سے بہت دوری پر واقع ہے لیکن وہ انتہائی طاقتور ہے کہ اس کی کشش نے اس جگہ کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ اور......‘‘ رابرٹ کی بات درمیان میں رہ گئی۔

’’یہ کیسے ممکن ہے......؟‘‘ ایڈی متفق نہیں تھا۔

’’کیوں ممکن نہیں ہے......؟ کیا تم اس طاقت سے انکاری ہو جس نے اس پوری کائنات کو سنبھالا ہوا ہے۔ کسی کام میں ایک سیکنڈ کا بھی فرق نہیں ہے تو پھر کیا وہ عظیم الشان خداوند اس کام کو ممکن نہیں کرسکتا۔‘‘

’’لیکن اس عمارت کی تعمیر...... میرا مطلب ہے کہ اگر وہ جگہ بلیک ہول کے دائرہ کار میں ہے تو پھر اس جگہ عمارت کیسے تعمیر ہوگئی۔ تم سمجھ رہے ہو نا رابرٹ۔‘‘

’’بالکل میں سمجھ گیا۔ ایڈی میں نے اس کے

متعلق بہت تحقیق کی ہے اس عمارت کی تعمیر آج سے دوسوسال پہلے ہوئی اور بلیک ہول تقریباً ڈیڑھ سوسال پہلے وجود میں آیا گویا بلیک ہول کے معرض وجود میں آنے سے پہلے ہی یہ عمارت تعمیر ہوچکی تھی مجھے یہ سب اتفاقاً معلوم ہوا ہے کسی ماہر ارضیات نے اس کے متعلق لکھا تھا بہت پرانے کاغذات کا مسودہ جو لائبریری میں اچانک اتفاق سے میرے ہاتھ لگ گیا اب میں اس کو نئے سرے سے لکھ کر شائع کروانا چاہتا ہوں تاکہ سب لوگ اس حقیقت سے واقف ہوسکیں۔''

رابرٹ نے بات مکمل کرنے کے بعد ایڈی کی طرف دیکھا گویا یہ یقین کررہا ہو کہ ایڈی نے اس کی بات پر یقین کیا کہ نہیں۔ لیکن وہاں تاثرات ہنوز سپاٹ تھے۔

''لیکن میں وہاں جاؤں گا چاہے جو بھی ہو۔'' ایڈی فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

رابرٹ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔ بہرحال ایڈی سے اسے اسی جواب کی امید تھی۔

''گویا تم نے مرنے کا ارادہ کرلیا ہے؟'' رابرٹ بولا۔

ایڈی ہنس پڑا۔ ''چلو ایسا ہی سہی۔ بہرحال صدیوں بعد میں واپس آیا تو تمہاری تو ہڈیاں بھی مجھے قبر میں نہیں ملیں گی۔ تمہاری قبر کا بھی نام ونشان مٹ چکا ہوگا۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو، ایسا ہی ہونا ہے۔'' رابرٹ اس کے مذاق پر سنجیدگی سے بولا اور ایڈی کے لبوں سے قہقہہ آزاد ہو کر فضا میں بکھر گیا۔

دودن بعد ایڈی نے روانہ ہونا تھا رابرٹ بھی اس کے ساتھ تھا لیکن رابرٹ کو عمارت کے اندر نہیں جانا تھا۔ اندر صرف ایڈی جاتا۔ رابرٹ باہر رہ کر جائزہ لیتا۔

اس سے پہلے رابرٹ نے کچھ کام کئے۔ ایڈی کے جانے کی تاریخ کمپیوٹر میں محفوظ کی اس نے زبردستی ایڈی سے اس کی جائیداد مارتھا کے نام منتقل کروائی۔

ایڈی خاصا محظوظ ہوا رابرٹ کی حرکتوں سے۔

''یاد رکھنا مارتھا...... میں واپس آکر اپنی جائیداد پھر سے اپنے نام کروالوں گا۔''

مارتھا افسردگی سے مسکرائی ایڈی نے ایک سالہ بیٹے کو اٹھا کر پیار کیا اور مارتھا کے ماتھے کا بوسہ لے کر رابرٹ کے ہمراہ روانہ ہوگیا۔

رابرٹ نے کچھ تحقیقی آلات بھی اپنے ہمراہ رکھے وہ سائنس کے متعلق خاص سدھ بدھ رکھتا تھا اوران آلات کا استعمال اچھی طرح جانتا تھا وہ اس جگہ جاکر کچھ تحقیق کرنا چاہتا تھا اور ایڈی کی بدولت اسے یہ موقع میسر آگیا۔

وہاں پہنچ کر کچھ وقت انہوں نے آرام کیا اور پھر اس جگہ کی طرف چل پڑے جہاں وہ عمارت واقع تھی۔

وہ پہاڑی کافی اونچی تھی ایڈی کو چڑھنے میں اس لئے بھی مشکل نہ ہوئی کیونکہ وہاں جانے کے لئے راستہ موجود تھا جو یقیناً عمارت کی تعمیر کرنے والوں نے بنایا ہوگا اتنی صدیوں بعد وہ راستہ خراب ہوچکا تھا لیکن اس پر چل کر بغیر کسی رکاوٹ کے مطلوبہ مقام تک پہنچا جاسکتا تھا۔

''میں اس عمارت سے آدھے کلومیٹر کے فاصلے پر رہوں گا اور اپنے آلات سیٹ کروں گا تم یہ آلہ اپنے کان میں لگالو اور اندر کی ہر بات مجھے بتانا۔''

رابرٹ کے کہنے پر ایڈی نے ہینڈفری نما آلہ اپنے کان میں لگالیا اور رابرٹ سے الوداعی مصافحہ کرنے کے بعد وہ اس عمارت کی طرف چل پڑا۔

رابرٹ بے چینی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اسے کچھ عجیب سا محسوس ہورہا تھا وہ ایڈی کو روکنا چاہتا تھا لیکن کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ وہ رکنے کے لئے نہیں آیا تھا۔ ایڈی عمارت کی طرف بڑھ رہا تھا ،رابرٹ نے جلدی سے اپنے آلات سیٹ کئے اور پھر اس کی حیرانگی کی انتہا نہ رہی جب کسی بھی آلے نے کام نہ کیا حالانکہ وہ بالکل ٹھیک کام کرتے تھے لیکن اس جگہ آتے ہی انہوں نے کام کرنا چھوڑ دیا۔

رابرٹ نے جلدی سے ایڈی کی طرف دیکھا وہ عمارت کے اندر داخل ہونے والا تھا اندر داخل ہونے سے پہلے ایڈی نے رابرٹ کی طرف مڑ کر دیکھا اور مسکرا کر ہاتھ

ہلایا اور اندر داخل ہوگیا۔ چونکہ ان کے درمیان طے ہوا تھا کہ وہ صرف چند لمحے اندر رہے گا اور پھر اندرونی عمارت دیکھ کر واپس آجائے گا رابرٹ نے کان میں موجود آلے کو منہ کے قریب لے جا کر ایڈی کو پکارا۔

''ایڈی......ایڈی......'' لیکن کوئی جواب نہ آیا۔

''ہیلو ایڈی کیا تم مجھے سن رہے ہو......؟''

جواب ندارد......!

رابرٹ خاموش ہوکر پھر سے اپنے آلات کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے لگا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا سب آلات بے جان رہے۔

''حیرت ہے ایسا تو کبھی نہ ہوا کہ سب آلات ایک ساتھ ہی کام کرنا چھوڑ دیں۔'' رابرٹ حیران ہوگیا۔

پھر اس نے سر اٹھا کر اس عمارت کی طرف دیکھا جس میں کچھ دیر پہلے ایڈی داخل ہوا تھا۔ وہ نہ جانے کیوں کچھ عجیب سا محسوس کر رہا تھا ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کا دل عجیب سے خدشوں کا شکار ہو رہا تھا جیسے کچھ نیا ہونے والا ہو۔ ہر گزرتا لمحہ اسے ایڈی کی طرف سے فکرمند کئے دے رہا تھا اس نے بار بار اسے آوازیں دیں آلے کی مدد سے لیکن کوئی ردعمل نہ آیا آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ رابرٹ کا دل انجانے خدشے سے لرز اٹھا اس کا قیاس یقین میں بدلنے لگا۔

ایڈی کا پریقین انداز دیکھ کر وہ بھی کچھ شک کا شکار ہونے لگا تھا اس عمارت کے بارے میں لیکن ایڈی کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ پریقین ہونے لگا تھا کہ لوگوں کی کہی باتیں اور ماہر ارضیات کی باتیں بے بنیاد نہیں ہوسکتیں۔

''یقیناً کچھ ہے......؟'' وہ بلند آواز سے بڑبڑایا۔

''اے خداوند...... ایڈی کی حفاظت کر...... اسے جلد واپس لے آ۔'' لیکن وہ وقت قبولیت کا نہیں تھا جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا رابرٹ کو یقین ہونے لگا۔

گھنٹے کے بعد بھی ایڈی کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ مزید پریقین ہوگیا۔

اور جب دو گھنٹے گزرے تو وہ مایوس ہوگیا۔

میرا خواب

میں ایک جگہ سے گزر رہا تھا۔ اس گزرگاہ میں ایک ہرا بھرا باغ تھا، باغ میں آم اور امرود کے درختوں کے علاوہ دیگر سرسبز درخت بھی موجود تھے۔ گاؤں کی طرف سے کچھ بچے نمودار ہوکر اس باغ کی طرف چلے آئے، اچانک وہ آم اور امرود گرانے کے لئے اپنے ہاتھوں سے چھوٹے بڑے پتھر اٹھا کر درختوں پر مارنے لگے وہ جس درخت پر پتھر مار رہے تھے اس پر چڑیوں کے گھونسلے تھے، جہاں وہ بچوں سمیت رہتی تھی۔ بچوں کو اس بات کی کوئی خبر نہیں تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے بچوں نے چڑیوں کے تین چار بچے مار ڈالے اس پر مجھے بہت دکھ ہوا، میں فوراً ہی آگے بڑھا اور بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر وہاں سے بھگا دیا۔ چڑیاں اپنے بچوں کے مرنے پر بہت غمزدہ اور افسردہ تھیں، میں نے چڑیوں سے کہا ان بچوں کو معاف کردو ان سے آپ کے بچے انجانے میں مرے ہیں، اس لئے ان کا کوئی قصور نہیں ان کو تو پھل کے علاوہ کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔ چڑیوں کا غم تھوڑا کم ہوا تو آئندہ کے احتیاط کے لئے سب چڑیوں کو ساتھ لیا اور باغ کے ایک گوشے کی طرف چل پڑا، اس جگہ بغیر پھل کے سرسبز درخت نظر آئے تو چڑیوں سے کہا۔ تم سب اس درخت پر اپنے گھونسلے بنالو کیونکہ پھل دار درخت پر تمہیں دوبارہ بھی اس جیسے سانحے سے گزرنا پڑے گا، اس لئے تم سب کے لئے یہ جگہ بالکل محفوظ ہے، اس پر چڑیوں نے میرا شکریہ ادا کیا، اور اسی درخت پر گھونسلے بنا کر رہنے لگیں، میرے کہنے پر انہوں نے بچوں کو بھی معاف کردیا تھا۔ اگر کسی کو خواب کی تعبیر معلوم ہو تو برائے مہربانی بتایئے۔

(رانا حبیب الرحمٰن: سینٹرل جیل لاہور)

’’ایڈی کاش تم ہماری بات مان لیتے......
میرے دوست جب تم لوٹو گے تو کچھ بھی باقی نہیں ہوگا۔ وہ سب کچھ جو تم چھوڑ کر گئے ہو۔‘‘

اور جب رات ڈھلی تو رابرٹ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا لوگوں کی باتیں حقیقت کا روپ دھار چکی تھیں ان کے خدشے بے بنیاد نہیں تھے۔

’’الوداع میرے دوست......‘‘ رابرٹ نے الوداعی نظر اس عمارت پر ڈالی اور شکستہ قدموں سے واپس لوٹ آیا۔

بہت تکلیف دہ ہوتا ہے کسی اپنے کی موت کا یقین کر لینا جبکہ وہ کبھی زندہ بھی ہو لیکن اس سے ملنا ناممکن ہو اور جان بوجھ کر کسی اپنے کو موت کے منہ میں جاتا ہوا دیکھنا کتنا اذیت ناک عمل ہوتا ہے اور روکنے کا اختیار ہوتے ہوئے بھی جب ہم کسی کو روک نہ پائیں تو دل کی بہت بری حالت ہوتی ہے۔

یہی حال اس وقت رابرٹ کا تھا اس کا دل جیسے ٹکڑوں میں بٹ چکا تھا آنکھوں سے بہتے آنسو اس کی اندرونی کیفیت کے گواہ تھے۔ وہ اب کبھی ایڈی کو نہیں دیکھ پائے گا۔؟ یہی بات اسے اذیت سے دوچار کر رہی تھی۔

اور جب واپس پہنچ کر اس نے مارتھا کو اس بات سے آگاہ کیا تو وہ سکتے کی کیفیت میں پھٹی آنکھوں سے سب سنتی رہی۔ اور پھر اپنے بیٹے کو سینے سے لپٹا کر اس بری طرح سے روئی کہ رابرٹ کے لئے وہ سب دیکھنا ممکن نہ تھا وہ دکھی دل سے واپس پلٹ گیا۔

سال پر سال بیتے چلے گئے ایڈی کا بیٹا مائیکل جوانی سے ادھیڑ عمری کی طرف آ گیا۔ مارتھا کب کی ایڈی کی جدائی کو برداشت کرتے ہوئے اس دارفانی سے کوچ کر چکی تھی رابرٹ کی عمر بھی اسی سال ہو چکی تھی اس نے سب یادداشتیں لکھ کر محفوظ کر لیں۔ کمپیوٹر میں بھی اور اخبارات ورسائل میں بھی ان واقعات کا خوب چرچہ ہوا اور پھر آہستہ آہستہ سب نارمل ہوتا چلا گیا۔

دنیا بہت جلد سب بھلا دیتی ہے اور پھر سے نئے واقعہ کی تلاش میں نکل کھڑی ہوتی ہے ایڈی کے اس واقعہ کی گونج بھی مدھم ہوتے ہوتے ختم ہوگئی۔

رابرٹ مر گیا۔

ایڈی کا بیٹا مائیکل بھی بڑھاپے کی سرحد سے موت تک آ گیا لیکن ایڈی واپس نہ آیا اور پھر یہ حقیقت نسل در نسل چلتی محض کہانی یا افسانے کی شکل اختیار کر گئی۔ کچھ نے یقین کیا کچھ نے نہ کیا اور وقت گزرتا چلا گیا کیونکہ وقت کو تو ہر حال میں گزرنا ہی ہے۔

☆......☆......☆

ایڈی اندر داخل ہوا۔ سب کچھ نارمل ہی تھا لیکن درحقیقتاً کچھ بھی نارمل نہ تھا اگر ایڈی کو معلوم ہو جاتا کہ اس کے اس عمارت میں قدم رکھتے ہی پیچھے کیا کچھ ہو چکا ہے تو وہ کبھی اندر داخل نہ ہوتا۔ وہ عمارت اتنی بری حالت میں نہ تھی جس طرح عموماً پرانی عمارتیں ہوتی ہیں وہ جلدی جلدی عمارت گھومنے لگا کیونکہ وہ مارتھا سے وعدہ کر چکا تھا کہ آدھے گھنٹے سے زیادہ اندر نہیں رہے گا اور تقریباً بیس منٹ بعد ہی وہ باہر نکل آیا وہ بھاگتا ہوا جوش سے باہر نکلا تاکہ رابرٹ کو بتا سکے کہ ان کے خدشات بے بنیاد ہیں اور اس عمارت کے متعلق لوگوں کی باتیں بھی۔

وہ باہر نکلا اور رابرٹ کو پکارتے پکارتے رہ گیا کیونکہ اسے کچھ عجیب سا احساس ہوا تھا اس نے حیرت سے آس پاس نگاہ دوڑائی اور اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔ کچھ تو بدل چکا تھا بلکہ سب کچھ بدل چکا تھا۔ ہاں سب کچھ بدل چکا تھا۔

وہ پہاڑی جہاں وہ رابرٹ کو چھوڑ کر گیا تھا اب اس کا نام ونشان بھی نہیں تھا بلکہ اس کی جگہ ہموار زمین تھی پہاڑوں کو کاٹنے کا سلسلہ تو کب کا جاری تھا اور اتنی صدیوں بعد تو یقیناً ایسا ہی ہونا تھا۔ ایڈی رابرٹ کے ساتھ جب اس علاقے میں آیا تھا تو یہ علاقہ بہت سرسبز اور درختوں پودوں کی نعمت سے مالا مال تھا اور اب جیسے ویران بنجر کھیت کا سا نمونہ پیش کر رہا تھا۔

ڈھائی تین سو سال کا عرصہ کم تو نہیں تھا۔

لیکن ایڈی کو ابھی معلوم نہیں تھا کہ وقت کتنا آگے بڑھ چکا ہے ورنہ وہ اسی وقت حیرت کی شدت

سے بے ہوش ہو جاتا۔ وہ بڑی مشکل سے پہاڑی سے اترا اور تیزی سے شہر جانے والی سڑک کی طرف قدم بڑھائے لیکن اس سڑک کا نام ونشان بھی نہیں تھا ہاں ایک عظیم الشان شہر ضرور اس کی نظروں کے سامنے تھا وہ آنکھیں پھاڑے حیرت سے اس شہر کو تک رہا تھا کیونکہ جب وہ آیا تھا تو سوائے پہاڑ اور جنگلات کے وہاں کچھ نہیں تھا وہ چلتا ہوا شہر کے اندر داخل ہوا۔ نہ جانے کہاں سے ایک اخبار ہوا کے تیز جھونکے کے ساتھ اڑتا ہوا آیا اور ایڈی کے قدموں سے لپٹ گیا ایڈی نے جھک کر اخبار اٹھایا اور بے اختیار ہی اس کی نظریں تاریخ پر جم گئیں اور وہیں جمی رہ گئیں۔

تاریخ ڈھائی سو سال بعد کی تھی اس وقت سے جب وہ رابرٹ کے ساتھ یہاں آیا تھا۔

ایک خدشے نے اس کے اندر سر ابھارا۔ ''تو کیا اس عمارت کے متعلق سب باتیں سچ تھیں؟''

یہ سوچ اسے اندر تک لرزا گئی وہ تیزی سے گاڑیوں کی جانب بڑھا سب لوگ اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے اس کا لباس اور پرانا اسٹائل سب کو اس کی توجہ کا مرکز بنا رہا تھا وہ ایک گاڑی میں بیٹھا جو اس کے شہر جا رہی تھی کرائے کی مد میں اس نے کرنسی جیب سے نکالی تو سب اسے حیرت سے دیکھنے لگے۔

ڈھائی سو سال پرانی کرنسی ان کے لئے نوادرات سے کم نہیں تھی بغیر کسی بات اور حیل وحجت کے وہ کرنسی رکھ لی گئی سب اس کو کوئی خبطی سمجھ رہے تھے جو اتنی قیمتی کرنسی یوں سرعام کرائے کی مد میں لٹا رہا تھا۔

اپنے شہر پہنچ کر وہ صدمے سے ساکت کھڑا رہ گیا کیونکہ سب کچھ بدل چکا تھا اسے اپنا گھر نہ ملنا تھا نہ ملا اوپر سے لوگوں کی تمسخرانہ نگاہیں۔

وہ سیدھا پولیس اسٹیشن چلا گیا اس کی بات توجہ سے سنی گئی کسی نے اس کا مذاق نہ اڑایا بلکہ کمپیوٹر میں سب اعداد وشمار چیک کئے گئے پرانے اخباروں کا مجموعہ نکالا گیا غرض ہر طرح کی چیکنگ کے بعد یہ ثابت ہوگئی کہ واقعی آج سے ڈھائی صدی پہلے ایڈمر گلٹن نامی شخص اس عمارت میں گیا تھا۔

اور پھر ہر طرف حیرانگی پھیل گئی اخبار ورسائل میں اس شخص کا خوب چرچہ ہوا جو آج سے ڈھائی صدی پہلے پیدا ہوا اور ابھی تک جوان تھا۔

اور پھر ایک آدمی اس سے ملنے آیا اس کا نام اسٹارک گلٹن تھا جو ایڈی کے پڑپوتوں کا پوتا تھا، وہ افسانہ جوان کی نظر میں محض تفریح طبع کے لئے تھا اب حقیقت کا روپ دھار چکا تھا وہ پر جوش طریقے سے ایڈی سے ملا اور اسے اپنے گھر لے آیا اور جب ایڈی نے پرانے البم میں مارتھا اور اپنے بیٹے مائیکل جو اس کا اکلوتا بیٹا تھا ان کی تصویریں دیکھیں تو آنسو اس کی آنکھوں سے بہنا شروع ہوگئے۔

''کاش میں اس وقت ضد کر کے اس عمارت میں نہ جاتا۔'' لیکن اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا وقت ڈھائی سو سال آگے بڑھ چکا تھا۔

اور دوسرے دن کے اخبارات میں پہلے صفحے پر جلی حروف میں ایک خبر موجود تھی جس نے سب کی توجہ اپنی طرف کرلی۔

ڈھائی سو سال پہلے بلیک ہول نامی عمارت میں جانے والا ایڈمر گلٹن ہارٹ اٹیک کے سبب انتقال کرگیا حیرت انگیز طور پر ایڈمر کا کہنا تھا کہ اس نے وہاں صرف بیس منٹ گزارے تھے لیکن دنیا ڈھائی صدی آگے بڑھ چکی ہے۔

اور اس خبر کو پڑھ کر مچل بروز کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''یہ اخبار والے بھی ہر خبطی کی باتوں پر یقین کر کے کچھ بھی چھاپ دیتے ہیں بھلا اس عمارت میں ایسا کیا ہے کہ وہاں کے بیس منٹ یہاں کی ڈھائی صدیاں بن گئیں۔ میں جلد ہی اس عمارت میں جا کر لوگوں کے جھوٹ کا پول کھول دوں گا۔ پاگل لوگ۔'' یہ کہہ کر مچل نے کافی کا کپ اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔

☠

کرشمہ سازیاں

این اے کاوش۔سلانوالی سرگودھا

نوجوان کنوئیں کی گہرائی میں جیسے ہی پہنچا تو اچنبھے میں پڑگیا، ایک عجیب دنیا اسے نظر آئی، کنوئیں کے تہہ میں جیسے پرستان آباد تھا، وہ آبادی جنوں کی تھی اور پھر جن شہزادی نے نوجوان کی عقل سے جب پردہ ہٹایا تو……

حرص ولالچ انسان کوتباہی وبربادی بلکہ موت سے بھی ہمکنار کردیتی ہے، اچھوتی کہانی

برصغیر پاک وہند پرعربوں کی آمد سے پہلے کچھ ہندوحکمرانوں نے اپنے نام کا سکہ جمایا۔جیسے جیسے عربوں نے برصغیر میں قدم رکھا کچھ ہندومد مقابل آئے اوراپنی موت آپ مرگئے۔ان ہندوحکمرانوں میں سے بیشترتوعربوں کے مقابلے میں آکر مارے گئے لیکن کچھ ہندوحکمران ایسے بھی تھے جنہوں نے عربوں کا پرتپاک استقبال کیا۔

یہی نہیں انہوں نے اسلام قبول کرلیااورعربوں نے ان کے تخت وتاج کوانہی کے سپرد کردیا۔ان ہندو حکمرانوں میں ایک نام راجہ بھوج کا بھی آتا ہے۔

راجہ بھوج اپنے وقت کاایک ایماندارامخلص حکمران گزراہے۔اس کے دورحکومت میں سلطنت برصغیر میں نہ صرف وسعت پیداہوئی بلکہ راجہ بھوج نے برصغیر میں بہت سے اقدامات ایسے کروائے جوآج بھی تاریخ میں یاد کیے جاتے ہیں۔

راجہ بھوج نے مغل حکمرانوں کی طرح عوامی خزانے کواپنی ملکہ یاکسی اورکی یادمیں تاج محل یاکوئی یادگاربنانے میں ضائع نہ کیا۔بلکہ اس نے عوام کا پیسہ عوام پرہی خرچ کیا۔عین اس وقت جب عربوں نے برصغیرمیں قدم رکھا توراجہ بھوج اس وقت تک اسلام کے نام سے نہ صرف آشنا ہوچکاتھا۔بلکہ اس نے اپنی سلطنت میں بسنے والے مسلمانوں کے لیےاعلیٰ اقدامات کروائے۔

مسلمانوں کے رسم ورواج کی قدرکی اوریہی نہیں اس نے صرف کلمہ نہیں پڑھاتھاوگرنہ پورا مسلمان ہوچکا تھا۔عین اس وقت جب عربوں نے اس کی ریاست میں قدم رکھااپنی ریاست میں اسلام قبول کرنے والوں میں اس کانام بھی سرفہرست آتا ہے۔

راجہ بھوج کی شادی دہلی کے راجہ سوگندرسنگھ کی دختررانی بھنبتی سے ہوئی تھی۔رانی بھنبتی سے راجہ بھوج کاایک بیٹا بھی تھا۔جس کانام دھوج تھا۔

☆……☆……☆

یہ اس وقت کی بات ہے جب رانی بھنبتی کی کوکھ میں شہزادہ دھوج تھا۔

ایک شام دونوں(راجہ بھوج اوررانی بھنبتی)محل کی چھت پہ لیٹے ہوئے تھے۔اورآپس میں گفت وشنید کررہے تھے کہ اچانک محل کی چھت کے اوپر سے دوپرندے گزرے۔

پرندے اتنی سرعت سے گزرے کہ دونوں کوایہ اندازہ لگانے میں تھوڑی وقت سے دوچار ہوناپڑاکہ آیایہ کون سے پرندے تھے۔لیکن یہ بات تومترشح تھی کہ

گزرنے والا ایک نہیں بلکہ دو پرندے تھے۔

راجہ بھوج اور رانی بھنبتی کے درمیان بحث و مباحثہ شروع ہوگیا۔ راجہ بھوج کا کہنا تھا کہ گزرنے والے "پرندے بگلے" تھے۔ جواتنی سرعت سے گزر گئے۔ جبکہ رانی بھنبتی کا کہنا تھا کہ گزرنے والے "پرندے ہنس" تھے۔

راجہ بھوج بالکل غصے سے پیچ وتاب کھا کر اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے کہا کہ صبح اس بات کا فیصلہ ہوگا۔ جو ہارے گا اسے بارہ (12) سال کے لیے دیس نکالا ہوگا۔ اگر گزرنے والے بگلے ہوئے تو رانی بھنبتی کو بارہ سالوں کے لیے سلطنت سے دیس نکالا قبول کرنا ہوگا اور اگر ہنسوں کا جوڑا ہوا تو راجہ بھوج کو سلطنت سے بارہ سالوں کا دیس نکالا ہوگا۔

راجہ بھوج اپنا فیصلہ سنا کر چلتا بنا لیکن رانی بھنبتی کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اسے یقین نہیں تھا کہ راجہ بھوج غصے میں آ کر ایسا فیصلہ لے لیں گے۔ اب حالات کے سامنے گھٹنے ٹیکنے میں ہی بہتری تھی۔ رانی بھنبتی نے فوراً ہی محل کے کچھ ملازموں کو بلایا اور انہیں سمجھا دیا کہ "صبح جب آپ لوگوں کو دربار میں بلایا جائے تو آپ نے یہی کہنا ہے کہ گزرنے والے پرندوں کو آپ لوگوں نے دیکھا تھا۔ "وہ بگلے تھے۔"

رانی بھنبتی نے خود دیس نکالے کو قبول کرلیا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اگر دیس نکالا راجہ بھوج کو بھگتنا پڑا تو وسیع سلطنت کا دارو مدار سنبھالنا اس کے بس سے باہر ہو جائے گا۔ اور ممکن ہے سلطنت کے اندر پھیلے ہوئے باغی اس کی جان لے لیں۔

رانی بھنبتی نے بروقت ایک اچھا فیصلہ کیا تھا۔ اور اس نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے وہ راجہ بھوج پر آنچ تک نہیں آنے دے گی۔

☆......☆......☆

صبح دربار میں جب پوچھ پاچھ کا سلسلہ شروع ہوا تو رانی کے سمجھائے ہوئے ملازموں نے آ کر بتایا کہ انہوں نے ان پرندوں کو دیکھا ہے اور وہ بگلوں کا جوڑا تھا۔

یہ بات سننا تھا کہ راجہ بھوج فخر سے اپنی جگہ پہ کھڑا ہوگیا۔ اور اس نے رانی بھنبتی کی طرف گردن اکڑا کر دیکھا۔ جس کا مطلب تھا کہ شرط کے مطابق رانی بھنبتی سزا کے لیے تیار ہو جائے۔

رانی بھنبتی نے ایک طائرانہ نگاہ راجہ بھوج پر ڈالی اور پھر دبے قدموں دربار سے باہر نکل گئی۔ باہر بگھی تیار کروادی گئی تھی۔ رانی کے ساتھ صرف ایک ملازم کو جانے کی اجازت تھی جس نے بگھی کو سنبھالنا تھا اور اسے حکم تھا کہ جیسے ہی سلطنت کی حدود ختم ہو رانی بھنبتی کو بگھی سے اتار کر وہ واپس آ جائے۔

بگھی میں بیٹھنے سے قبل رانی بھنبتی رکی لیکن اس نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ راجہ بھوج اس انتظار میں تھا کہ رانی بھنبتی اس کی طرف مڑ کر دیکھے گی اور اگر آ کر اس سے معافی مانگ لے گی تو راجہ بھوج اپنی شرط واپس لے لے گا۔ لیکن جب رانی بھنبتی نے معافی مانگنا تو درکنار مڑ کر دیکھنا بھی گوارہ نہ کیا تو راجہ بھوج تاؤ کھا کر رہ گیا۔ اس کا من چاہا کہ پلک جھپکتے میں رانی بھنبتی کا سر قلم کر ڈالے۔

راجہ بھوج نے غصے سے بھڑکتے ہوئے اشارہ کیا اور دوسرے ہی لمحے بگھی نے ہواؤں میں اڑنا شروع کردیا۔ بگھی دھول مٹی اڑاتی تیزی سے بڑھتی جارہی تھی۔ جیسے جیسے بگھی محل سے دور ہوتی جارہی تھی۔ ویسے ویسے رانی بھنبتی کا من ہول رہا تھا۔

اس نے کبھی تن تنہا جینے کا تصور بھی نہ کیا تھا۔ نہ ہی اس کی زندگی میں کوئی ایسا پل آیا تھا کہ اسے اپنوں سے علیحدہ اور تنہا ہو کر رہنا پڑے۔ رانی بھنبتی کی آنکھیں ساون بھادوں بنی ہوئی تھیں۔ اس کا من چاہ رہا تھا کہ فوراً بگھی رکوا کر واپس محل جائے اور راجہ بھوج کے سامنے گھٹنے ٹیک کر دیس نکالی والی سزا کو ختم کرنے کی استدعا کرے۔ لیکن وہ اس بات سے بھی آشنا تھی کہ راجہ بھوج ایک ضدی انسان تھا۔

راجہ بھوج کبھی بھی کسی صورت بھی اپنی بات سے ہٹنے والا نہ تھا۔ رانی بھنبتی کو اس کا حکم ماننا ہی تھا۔ اور اگر رانی بھنبتی اس کی حکم عدولی کرے تو ممکن ہے راجہ بھوج اسے

کوئی ایسی سزا دے جو نا قابل قبول ہو۔ وہ کسی صورت بھی راجہ بھوج سے جدا ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

اب اسے اس سزا کو قبول تو بہر صورت کرنا ہی تھا اور شاید یہی اس کا مقدر تھا۔ نہ رونے کا کوئی فائدہ تھا نہ اس کے رونے سے راجہ بھوج پر کوئی اثر ہونے والا تھا۔ رانی بھنبتی نے آنے والے وقت کے لیے خود کو تیار کر لیا تھا۔

رانی بھنبتی کو جہاں اتارا گیا تھا اس سے آگے راجہ مکیشور کی سلطنت کی حدود شروع ہو رہی تھی۔ بگھی ابھی اسے اتار کے نظروں سے اوجھل نہ ہوئی تھی کہ اتفاق سے راجہ مکیشور کی بگھی وہاں آن پہنچی اور رانی بھنبتی کو دیکھ کے بگھی روک دی گئی۔

رانی بھنبتی پلک جھپکتے میں اپنے چہار سو جمع ہونے والے سپاہیوں کو دیکھ کر گھبرا گئی۔ جلد ہی سپاہیوں نے اسے گھیر کر راجہ مکیشور کے سامنے پیش کر دیا۔

راجہ مکیشور اس کو دیکھ کر متاثر ہوا اور سمجھ گیا کہ اس کے سامنے کوئی عام عورت نہیں ہے۔ وہ یا تو ضرور کسی امیر گھرانے سے تعلق رکھتی ہے یا پھر کسی شاہی دربار سے منسلک ہے۔ لیکن جو کچھ بھی ہے بنا پوچھے سنے کچھ کہنا بے کار تھا۔

''دیوی! کون ہو تم؟'' راجہ مکیشور نے رانی بھنبتی کے سامنے شاہانہ انداز سے کہا۔

رانی بھنبتی کو راجہ مکیشور کے دیکھنے کا انداز تھوڑا برا لگا لیکن وہ کیا کر سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس وقت اس کے پاس کچھ نہیں ہے۔ اسے نہایت صبر و تحمل کام لینے کی ضرورت ہے وگرنہ حالات پیچیدگی اختیار کر سکتے ہیں۔ اور وہ تن تنہا عورت اس راجہ اور اس کے سپاہیوں کا مقابلہ کرنے کی ہمت کہاں رکھتی تھی۔

''میں راجہ بھوج کی پتنی رانی بھنبتی ہوں۔'' رانی بھنبتی نے کہا۔

''ارے واہ! زہے نصیب۔'' راجہ مکیشور اس کی بات سن کر خوشی سے پھولے نہ سما پا رہا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے اسے فرعون کا خزانہ ہتھے لگ گیا ہو۔

''ہمارے دوست، ہمارے بھائی راجہ بھوج کی پتنی اور سلطنت کی رانی ہماری سلطنت میں کیسے جلوہ گر ہوئی۔ کیا کوئی مسئلہ در پیش آیا ہے میری بہن؟''

راجہ مکیشور نے بات کرتے ہوئے رانی بھنبتی کے سر پر ہاتھ رکھا۔ جس کا مطلب یہی تھا کہ اس نے دل سے اسے بہن کہا تھا۔

رانی بھنبتی کی سانس میں سانس آئی۔ اس نے ساری بات راجہ مکیشور کو بتائی اور بتایا کہ اسے بارہ سال کے لیے دیس نکالا مل گیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ راجہ بھوج شرط ہارا ہوا ہے لیکن دیس نکالا اگر راجہ بھوج کو بھگتنا پڑتا تو سلطنت کو سنبھالنا رانی بھنبتی کے بس کی بات نہیں تھی۔

''آپ نے بروقت بہت ہی اچھا فیصلہ کیا ہے رانی جی۔ آپ چاہیں تو ایک بھائی کے پاس اس کی بہن بن کے بے شک اپنے دیس نکالے کا عرصہ بیتا سکتی ہیں۔ یہ نہ صرف ایک بھائی پر اس کی بہن کا احسان ہوگا بلکہ ایک بھائی اپنی ذہین بہن سے بہت کچھ سیکھ پائے گا۔'' راجہ بھوج نے ایک بار پھر رانی بھنبتی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تو رانی بھنبتی نے دل ہی دل میں بھگوان کا شکر ادا کیا۔

یوں رانی بھنبتی راجہ مکیشور کے ساتھ اس کے محل میں اس کی بہن بن کے رہنے لگی۔ اس بات پر راجہ مکیشور کی پتنی رانی کجراج کو بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ اس نے بھی رانی بھنبتی کو اپنی بہن کا درجہ دیا تھا۔

کہتے ہیں کہ کسی کا بازو ٹوٹا اور پہلے سے بہتر جڑ گیا تھا۔ ایسا ہی کچھ رانی بھنبتی کے ساتھ بھی ہوا تھا۔ رانی بھنبتی جو اپنے محل میں صرف راجہ بھوج کی پتنی اور اس کی سلطنت کی رانی تھی۔ لیکن یہاں اسے ایک اور عہدہ مل گیا تھا۔ راجہ مکیشور اور اس کی پتنی کے متفقہ فیصلے پر اسے وزیر اعظم کی سیٹ مل گئی تھی۔

راجہ بھوج اور رانی کجراج نے اس کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ اس کی ذہانت کے بارے میں انہوں نے کچھ زیادہ ہی سن رکھا تھا۔ اور اس بات میں کوئی

شک بھی نہ تھا۔ رانی بھنبتی ایک نہایت ہی ذہین اور عقلمند عورت تھی۔

یوں رانی بھنبتی راجہ مکیشور کی سلطنت میں وزیراعظم کی سیٹ پر فائز ہوگئی۔ اوراس کی ذہانت اب راجہ مکیشور کی سلطنت میں اجاگر ہونے لگی۔

رانی بھنبتی کو وزیراعظم کا عہدہ سنبھالے تین ماہ ہی ہوئے تھے کہ اس کے ہاں شہزادہ دھوج نے جنم لیا۔ دوسری طرف اس بات کی اطلاع راجہ بھوج کو بھی مل گئی۔ وہ خوشی سے پاگل ہوگیا۔ اس کا دل اپنے بیٹے کو دیکھنے کے لیے مچلنے لگا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس نے خود ہی ایک بہت بڑی دیوار درمیان میں کھڑی کردی ہے۔

اس نے تہیہ کرلیا تھا کہ وہ جلد ہی جا کر رانی بھنبتی کو منا کر واپس لائے گا۔ اوراسے بتائے گا کہ اس نے اپنی شرط ختم کردی ہے۔ دوسری طرف اسے یہ بھی سن کے مسرت ہوئی کہ اس کے دوست راجہ مکیشور نے نہ صرف اس کی پتنی کو عزت دی بلکہ اس کو وزیراعظم کا عہدہ دیا۔ یہ سب راجہ بھوج کے لیے بہت خوشی کی باتیں تھیں۔

دوسری طرف رانی بھنبتی بھی اپنے پتی سے ملنے کے لیے بہت بے تاب تھی۔ اس کے بس میں نہیں تھا کہ فوراً اڑ کے اس کے پاس چلی جائے۔ آتش عشق نے دونوں طرف سر اٹھانا شروع کردیا تھا۔ راجہ بھوج بھی بے تاب ہوا جارہا تھا کہ فی الفور رانی بھنبتی کو واپس لے آئے اور پھر اس نے فوراً بگھی تیار کروانے کا حکم دے دیا۔

رانی بھنبتی کو راجہ بھوج واپس لے آیا۔ وقت پر لگا کے گزرنے لگا اور شہزادہ دھوج سات برس کا ہوگیا۔ پہلے اسے شاہی درس گاہ میں داخل کروایا گیا لیکن جلد ہی اس کو محل سے باہر سکول میں داخل کروایا گیا۔ تاکہ سلطنت کے لوگوں کے بچوں کے ساتھ مل کر پڑھے۔

اس طرح اسے ان لوگوں کو سمجھنے کی شروع سے ہی عادت پڑ جائے گی اوراس وقت جب وہ بلوغت کی حدود کو چھوئے اور راجہ بھوج تخت وتاج اس کے سپرد کرے گا تب تک اسے ہر بات کا پتہ چل چکا ہوگا۔ راجہ بھوج نے بے شک ایک اچھا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن وہ اس بات سے آشنا نہ تھا کہ یہ فیصلہ اس کے بچے کو کیسے کیسے مصائب وتکالیف سے دوچار کرسکتا ہے۔

علی زمان سوداگر کا کام دن دگنی رات چوگنی ترقی کی منازل طے کرتا جارہا تھا۔ دن تو در کنار اسے رات کو آرام میسر نہ تھا۔ اس کی زندگی بہت ہی مصروف زندگی بن چکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے پاس اتنا ٹائم نہیں نکل پارہا تھا کہ وہ اپنی ازدواجی زندگی کے بارے میں کوئی ٹھوس فیصلہ لے سکتا۔

گزشتہ دوروز سے وہ بہت زیادہ پریشان تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کرے تو کیا کرے۔ اس کا بحری جہاز سامان لے کر جارہا تھا کہ اچانک اس میں کوئی خرابی پیدا ہوگئی۔ وہ تو اتفاق کہ ایک جزیرے کے پاس جا کر خراب ہوا تھا۔

علی زمان ازخود اس بحری جہاز میں تھا۔ جس جزیرے کے پاس ان کا بحری جہاز خراب ہوا تھا۔ اس جزیرے پر کافی چہل پہل تھی۔ اس نے زندگی میں کئی بار سمندر کا سفر کیا تھا لیکن یہ جزیرہ اس سے قبل اس کی نگاہوں کے سامنے سے نہ گزرا تھا۔ اس کے لیے یہ سب کچھ بہت حیران کن تھا۔ کیونکہ جزیرہ اتنا بڑا نہیں تھا لیکن چہل پہل دیکھ کے لگ رہا تھا۔ جیسے یہاں لوگوں کا جم غفیر آباد ہو۔

''سراب کیا کیا جائے؟'' علی زمان سوداگر اس وقت عرشے پر ایستادہ جزیرے کو تکتے جارہا تھا جب یکبارگی اس کی سماعت سے جہاز کے کیپٹن کی بازگشت ٹکرائی۔

علی زمان اس کی طرف مڑا اور ایک لمبا سانس خارج کیا۔ ''سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کیپٹن کہ کیا کیا جائے۔ ویسے تو ساحل بھی قریب ہے لیکن اس ساحل پر جہاز لے جانے کا مطلب خود کو کسی پریشانی میں مبتلا کرنا ہے۔ ممکن ہے اس قریبی ساحل پر ہمیں بحری قزاق یا کوئی گھیر لے لیکن اس سے پریشان کن اس جزیرے پر یہ چہل پہل ہے۔''

علی زمان نے جزیرے پر چلتے پھرتے لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ لوگ ایسے جارہے تھے

جیسے انہوں نے اس جہاز کو دیکھا ہی نہ ہو۔ حالانکہ وہ جہاز تھا کوئی سوئی تو تھی نہیں کہ انہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں کیسے عجیب لوگ ہیں کہ اس طرف دیکھنا تک گوارہ نہیں کر رہے۔'' کیپٹن نے زمان سوداگر کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

''یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔'' علی زمان سوداگر نے مضطرب لہجے میں کہا۔

''ہمیں چل کر ان سے مدد طلب کرنی چاہیے ممکن ہے کچرے کے ڈھیر سے کوئی ہیرا مل جائے۔''

زمان سوداگر کی بات سن کر کیپٹن نے اس کی طرف رشک بھری آنکھوں سے دیکھا۔ زمان کی بات ٹھیک تھی۔ اتنے چھوٹے سے جزیرے پر کسی کی مدد ملنا بہت بڑی بات تھی۔ اور اگر ایسا ہو جائے تو ان کے وارے نیارے ہو جائیں۔

دونوں جہاز سے اتر کر جزیرے کی طرف بڑھے اور جیسے ہی انہوں نے جزیرے پر قدم رکھا۔ نجانے کہاں سے کچھ جنگلی آئے اور انہوں نے ان دونوں کو گھیر لیا۔ ان جنگلیوں نے درختوں کے پتوں سے اپنی شرم گاہوں کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کے علاوہ لمبے لمبے نیزے انہوں نے سنبھال رکھے تھے۔

علی زمان اور کیپٹن کی گردنوں میں انہوں نے اپنے نیزوں کی نوکیں چبھوئیں تو درد سے دونوں کی چیخیں نکل گئیں۔

''کون ہو تم لوگ اور بنا اجازت ہمارے جزیرے پر اترنے کی ہمت کیسے کی تم لوگوں نے؟'' اچانک ان کی سماعت سے ایک رعب دار آواز ٹکرائی۔

باوجود کوشش کے دونوں اپنی بیک سائیڈ پر بولنے والے کو نہ دیکھ سکے۔ لیکن شاید بولنے والے نے اشارہ کیا تھا کہ اس کے آتے ساتھ ہی دونوں کی گردنوں پر تنے ہوئے نیزے پیچھے ہٹا لیے گئے۔

درد کی شدت سے دونوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ انہیں اپنی گردنوں پر کسی چیز کے سرکنے کا اندیشہ ہوا تو انہوں نے جھٹ سے ایک ساتھ گردنوں پر ہاتھ لگایا تو ان کے ہاتھ پر خون کے دھبے نمایاں ہو گئے۔

''یہ کیا طریقہ ہے؟'' علی زمان نے درد سے کلبلاتے ہوئے کہا۔ اور دونوں اس بولنے والے کی طرف مڑ گئے۔

ان کے سامنے ایک اپنے قد سے لمبی عصا نما تھامے بڑے بڑے سفید بالوں والا ایک باریش بزرگ کھڑا تھا۔

''ہمارا یہی طریقہ ہے جو بھی ہمارے جزیرے پر قدم رکھتا ہے اس کا استقبال اسی پرتپاک انداز سے کیا جاتا ہے۔'' بزرگ نے دونوں کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''ارے واہ استقبال کرنے کا کیا پرتپاک انداز ہے جناب آپ کا۔'' کیپٹن نے گردن کے زخموں کو چھو کر سی کی آواز میں سسکاری نکالتے ہوئے کہا۔

''کیوں آئے ہو یہاں؟'' اب کی بار اس باریش بزرگ نے چنداں غصیلے لہجے میں پوچھا۔

''وہ دیکھ رہے ہیں ناں ہمارا جہاز۔'' علی زمان نے اپنے بحری جہاز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''نجانے اس میں کیا خرابی واقع ہوئی ہے۔ کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ ہم آپ لوگوں سے مدد طلب کرنے آئے ہیں۔''

زمان کی بات سن کر اس باریش بزرگ نے جہاز کی طرف ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔

''ہوں۔'' باریش بزرگ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

''تمہارا جہاز بلی مانگتا ہے۔ ایک ایسے بچے کی جس میں پیدائشی شکتیاں ہوں۔ جو شکتی شالی ہو اور مستقبل کا بادشاہ ہو۔''

''واٹ یو مین؟'' کیپٹن نے حیرت سے بوڑھے کو تکتے ہوئے کہا۔

اس کے دیکھنے کا انداز یوں تھا جیسے بوڑھا اسے کوئی پاگل لگ رہا تھا۔ اور بوڑھے نے جو بات کی تھی اس کے حساب سے وہ تقریباً پاگل ہی تھا۔ زمان سمجھ گیا کہ بوڑھے کو کیپٹن کی انگلش کی کوئی سمجھ نہیں آئی لیکن وہ اس کے

حیرت سے کھلے منہ کو دیکھ کر ہی سمجھ جائے گا کہ اس نے انگریزی میں کیا کہا ہے۔

''میں نے ایسا کچھ نہیں کہا شہری بابو۔'' بوڑھے نے متواتر اسی لہجے میں کہا۔

''ایکچوئلی اگر آپ تھوڑی وضاحت کردیں تو بہتر ہے۔ آپ کی بات کا مطلب میں بھی نہیں سمجھا۔'' زمان نے ملتجیانہ لہجے میں بوڑھے سے کہا۔

دوسری طرف کیپٹن نے بولنا چاہا لیکن علی زمان نے اس کو ہاتھ کے اشارے سے چپ کروادیا۔

''آؤ میرے ساتھ۔'' بوڑھے نے ایک طرف چلتے ہوئے کہا تو دونوں چاروناچار اس کے پیچھے چل پڑے۔

ان کے درمیان راستے میں کوئی بات نہ ہوئی۔ تھوڑا آگے جاکر گھنے درختوں اور جھاڑیوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا پھر وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں چاروں اطراف ویسے ہی گھنے درخت اور جھاڑیاں تھیں۔ جبکہ ان کے درمیان کافی جگہ خالی تھی۔ جس میں کم وبیش چار پانچ سو مکان بنائے گئے تھے۔

''یہ ہمارا علاقہ ہے۔ یہاں سب لوگ اتفاق سے رہتے ہیں۔ ہم لوگ ہی یہاں کے باسی ہیں۔ ہم سب ہی اس علاقے کے رکھوالے ہیں۔ یہاں کے سب سے سن رسیدہ انسان کو اس علاقے کا وڈیرا منتخب کیا جاتا ہے۔ ہمارے اس علاقے میں ہر قسم کی سہولت موجود ہے۔

تم لوگ حیران ہورہے ہوگے۔ ہم لوگ تمہاری طرح انسان نہیں ہیں بلکہ ہمارا تعلق قوم جنات سے ہے۔''

اس باریش بزرگ کی پوری بات سننے کے بعد دونوں کو یوں لگا جیسے ان کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی گئی ہو۔ دونوں نے محوحیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''بے فکر ہوجاؤ ہم لوگ تمہیں نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ اب آؤ میرے ساتھ میرے گھر میں۔''

بوڑھے نے دونوں کے چہروں پر عیاں ہونے والی پریشانی کو بھانپتے ہوئے کہا اور دونوں کو لیے اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ ساتھ چلنے والے اس کے سپاہی وہیں کھڑے رہ گئے تھے۔ بوڑھا ان دونوں کو لیے ایک نہایت ہی خوبصورت مکان کے سامنے رکا۔ مکان کی فرنٹ لوکیشن دیکھ کر دونوں مبہوت رہ گئے تھے۔

بوڑھے نے نجانے منہ ہی منہ میں کیا پڑھا کہ مکان کا بڑا سا گیٹ خودبخود ہی ایک طرف سرکتا ہوا دیوار میں گھستا چلا گیا۔

''اندر آجاؤ۔''

بوڑھے نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ دونوں کے دل دھک دھک کررہے تھے۔ لیکن اب ان کے پاس کوئی اور چارہ بھی نہ تھا۔ چاروناچار انہیں اس بوڑھے کی بات ماننا ہی تھی۔ دونوں اس کے پیچھے اندر داخل ہوئے۔ جیسے ہی انہوں نے اندر قدم رکھا گیٹ یک لخت بند ہوگیا۔ گیٹ جیسے ہی پوری طرح سے بند ہوا ٹھک کی ایک آواز پیدا ہوئی۔ دونوں نے سہم کر پیچھے دیکھا اور حیران رہ گئے۔

بوڑھا اندر جاچکا تھا مجبوراً انہیں بھی اندر جانا پڑا۔ ڈیوڑھی کراس کرکے جیسے ہی وہ پہلی راہداری میں مڑے انہیں بوڑھا مل گیا۔ جس نے اشارے سے انہیں ایک کمرے میں جانے کا کہا۔ دونوں چپ چاپ اندر چلے گئے۔ جلد ہی بوڑھا بھی اس کمرے میں آگیا۔ دونوں بری طرح سے پریشانی کا شکار تھے۔

آسمان سے گرا، کھجور میں اٹکا والی بات ہوچکی تھی۔ وہ پہلے ہی مصیبت کے مارے تھے۔ اوپر سے اس بوڑھے نے رہی سہی کسر پوری کردی تھی۔ بوڑھے کے اندر داخل ہوتے ہی دونوں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے لیکن بوڑھے کے اشارے پر وہ دوبارہ بیٹھ گئے۔

''تم لوگ اتنے پریشان کیوں ہو۔ ہم ان جنات میں سے نہیں ہیں جو انسانوں کا خون کرتے ہیں۔ ہم مسلمان جنات ہیں۔ لیکن ہمارے قبیلے کے ایک نوجوان کی غلطی کی سزا ہم سب بھگت رہے ہیں۔'' بوڑھے نے دونوں کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔

قبل اس کے کہ وہ گفتگو کے اس سلسلے کو طوالت بخشتے ایک نوجوان ٹرالی دھکیلے اندر داخل ہوا۔ ٹرالی پر لوازمات

سجے ہوئے تھے۔نوجوان لوازمات اور شربت کے بڑے بڑے مگ ان کے سامنے سجا کر خود وہاں سے دبے قدموں کھسک گیا۔

''لو۔'' بوڑھے نے لوازمات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو دونوں نے فٹ سے شربت کے مگ اٹھائے۔

شربت کا ایک ایک گھونٹ دونوں نے حلق سے نیچے اتارا۔ شربت نہایت ہی لذیذ اور شریں تھا۔ اس سے قبل ان دونوں نے ایسا لذیز شربت نہیں پیا تھا۔

''بہت لذیز شربت ہے۔'' سوداگر علی زمان نے خالی مگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

''یہ شربت ہمارے علاقے کا ایک مشہور درخت ہے اس کی شاخوں کو پیس کر بنایا جاتا ہے۔ یہ شربت نہایت ہی اعلیٰ قسم کا ہوتا ہے۔ یہ بہت مفید ہے۔ اس کے علاوہ گرمی کا توڑ ہے اس کے اندر۔ یہ سب کچھ آپ لوگوں کے لیے لایا گیا ہے۔ اور لیجئے۔'' بوڑھے نے ٹیبل پر سجے لوازمات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

زمان نے بوڑھے کی بات سن کر ایک اور مگ بھر کر حلق میں انڈیلا۔ شربت اتنا لذیز تھا کہ اس نے دیگر لوازمات کو ہاتھ لگانے تک کی زحمت گوارہ نہ کی اور یکے بعد دیگرے تین مگ حلق میں انڈیل گیا۔ لیکن دوسری طرف کیپٹن نے دو مگ شربت کے پیے اور کچھ لوازمات بھی کھائے۔

''آپ بتا رہے تھے کہ کسی نوجوان کی وجہ سے آپ لوگ کسی مصیبت سے دوچار ہیں۔'' علی زمان نے خالی مگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے بوڑھے کو یاد دلاتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں۔ ایک نوجوان کی غلطی نے سب کو مصیبت میں مبتلا کر کے رکھ دیا۔'' بوڑھے نے نوجوان کے لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''لیکن اس نوجوان نے ایسا بھی کیا پاپ کیا تھا کہ اس ایک نوجوان کی وجہ سے آپ اور آپ کے علاقے کے سارے لوگ مصیبت میں مبتلا ہو گئے ہیں؟'' اب کی بار کیپٹن نے لقمہ دیا۔

''اسے شیطان نے حقیقی راستے سے ورغلا دیا تھا۔ اس نے شیطان کی پوجا پاٹ شروع کر دی تھی۔ اور ہماری بستی کے ایک نہایت ہی برگزیدہ بزرگ کو جو اس وقت اس بستی کے سردار تھے شیطان کی بلی چڑھا دیا۔ پھر اس پر خدائی قہر برپا ہوا اور وہ خدائی قہر کی لپیٹ میں آ گیا۔

اس وقت سے اس علاقے پر ایک قہر برپا ہے کہ جو بھی بحری بیڑا، جہاز یا کوئی چھوٹی موٹی کشتی اس جزیرے کی حدود میں داخل ہوتی ہے۔ اس میں ایک ایسی ان دیکھی خرابی پیدا ہو جاتی ہے جو کاریگروں کے لاکھ بار دیکھنے کے باوجود ان کی سمجھ سے بالاتر رہتی ہے۔ اور پھر تمہاری طرح ہر بھولا بھٹکا انسان چار و ناچار ہماری بستی میں آتا ہے اور پھر ہم اسے اس کے بحری بیڑے یا جو بھی ہو اس کا ایک ہی حل بتاتے ہیں۔''

بوڑھے نے اتنا کہہ کر اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ دیا جبکہ علی زمان سوداگر اور کیپٹن کی سوالیہ آنکھیں اس پر تن سی گئیں۔

''وہ حل کیا ہے؟'' علی زمان نے پوچھا۔

''اس حدود میں داخل ہونے کے بعد جب تک کسی شکتی شالی بالغ بچے کا خون اس جہاز یا جو کچھ بھی ہو نہ ڈالا جائے وہ اپنی جگہ سے ہلنے والا نہیں ہے۔'' بوڑھے کی بات سن کر دونوں حیران و ششدر رہ گئے۔

''آپ کے کہنے کا مطلب ہے کہ کسی انسان کو ذبح کیا جائے؟'' کیپٹن نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اس بوڑھے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تم ٹھیک سمجھے شہری بابو۔'' بوڑھے نے کیپٹن کی بات کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔

''امپوسی بل۔'' کیپٹن تنک کر بولا۔

''اس کے علاوہ تم لوگوں کے پاس کوئی چارہ نہیں ہے۔ تمہارا سب کچھ یہیں کھڑا رہ جائے گا۔ اور بھی تنگ آ کر تمہیں یہی طریقہ اپنانا پڑے گا۔'' بوڑھے نے پر یقین لہجے میں کہا۔

کیپٹن اس کی بات سن کر بولنے ہی والا تھا کہ علی زمان نے اسے چپ کروا دیا۔

''لیکن ہمیں ایسا بچہ کہاں سے ملے گا۔ ہمیں کیا معلوم کہ کونسا بچہ شکتی شالی ہے اور کونسا بچہ عام بچوں

جیسا ہے؟'' علی زمان نے پوچھا۔

''وٹ یو مین۔ تم اس بوڑھے کی بات پر یقین کر رہے ہو۔ جانتے ہو اس کا مطلب کیا ہے؟'' کیپٹن نے علی زمان کی بات سن کر حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہوتے ہوئے کہا۔

''تم ایک کیپٹن ہو۔ اپنی اوقات میں رہو۔ تم جانتے ہو میرا کتنا قیمتی سامان اس بحری بیڑے پر لدا ہوا ہے۔ یہ اتنا قیمتی سامان ہے کہ ان سے حاصل ہونے والی رقم تمہاری سات پشتیں دونوں ہاتھوں سے بھی لوٹاتی رہیں تو بھی ختم ہونے کا نام تک نہ لے۔ اور میں کسی طور اپنا یہ قیمتی سامان ضائع نہیں ہونے دوں گا۔ میں ایک تو کیا لاکھوں ایسے بچوں کو قربان کر سکتا ہوں۔ سمجھے تم۔'' کیپٹن کی بات سن کر علی زمان نے غصے سے بھڑک کر کہا۔

اس کا جواب سن کر کیپٹن نے چپ سادھ لی۔ لیکن اس کا انداز بتا رہا تھا کہ اسے علی زمان کی بات سے اتفاق نہیں ہے۔ اس نے بے بسی اور بے چارگی کی نگاہ سے علی زمان کو دیکھا پھر کھا جانے والی آنکھوں سے اس بوڑھے کو دیکھا۔ لیکن ان دونوں نے اس کی کسی حرکت کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ بوڑھے نے علی زمان کو اس بچے کے بارے میں بتانا شروع کر دیا اور یہ بھی بتایا کہ انہیں زیادہ دور نہیں جانا پڑے گا کیونکہ جزیرے کے قریب واقع سلطنت کے راجہ بھوج کا شہزادہ ایسا شکتی شالی بچہ ہے۔ وہی ان کی منزل ہے۔ علی زمان نے فیصلہ کن آنکھوں سے پہلے بوڑھے اور پھر کیپٹن کو دیکھا۔ کیپٹن کی آنکھوں میں اس کے لیے کوئی ایسا تاثر نہ تھا جس سے واضح ہو کہ وہ اس کی بات سے متفق ہے۔

☆......☆......☆

شہزادے دھوج کے اسکول میں علی زمان اس کا ماموں بن کے گیا۔ زمان نہایت ہی شاہانہ لباس زیب تن کر کے وہاں گیا۔ اس کے شاہانہ چال ڈھال دیکھ کر اسکول کا پرنسپل خوب متاثر ہوا۔ اس نے زمان کی آؤ بھگت کرنا چاہی لیکن علی زمان نے منع کر دیا۔

پھر علی زمان نے شہزادے کو اپنے ساتھ لے جانے کا کہا اور کہا کہ وہ شہزادے کے ساتھ اس کے محل جا رہا ہے۔ پرنسپل یہی سمجھا تھا کہ وہ واقعی اس کا ماموں ہوگا اس لیے اس نے کسی قسم کی کوئی پیش رفت کرنا مناسب نہ سمجھی۔

دوسری طرف شہزادہ دھوج متواتر یہی سوچے جا رہا تھا کہ یہ شخص کیسے اس کا ماموں بن گیا۔ اس سے پہلے کبھی اس کی والدہ نے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔

خیر شہزادے نے چپ سادھے رکھی اور پرنسپل کو کچھ بھی ظاہر نہ ہونے دیا۔ اس نے زمان سے ایسا برتاؤ کیا جس کو دیکھ کر پرنسپل یہی سمجھا کہ وہ واقعی اس کا بھانجا ہے۔

اسکول کے باہر علی زمان کی بگھی تیار تھی۔ علی شہزادے کو ساتھ لیے تیار کھڑی بگھی میں جا کر براجمان ہو گیا۔ ابھی تک ان کے درمیان کوئی گفت وشنید نہ ہوئی تھی۔ شہزادہ بڑا تھا اور اچھے برے کی سمجھ رکھتا تھا۔ اب وہ بچہ نہیں رہا تھا کہ اسے کسی بات کی سمجھ نہ ہو لیکن وہ یہ جاننے کا متمنی تھا کہ آخر یہ شخص اتنا بڑا ڈرامہ کیوں رچائے جا رہا ہے۔

بگھی میں بیٹھنے کے بعد بھی ان کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی۔ شہزادے نے بھی اس شخص کو بلانے کی زحمت گوارہ نہ کی تھی۔ وہ بس آنے والے حالات وواقعات کے لیے خود کو تیار کر رہا تھا۔

بگھی سمندر کے کنارے جا کر رکی۔ شہزادہ اور علی زمان دونوں بگھی سے نیچے اترے۔ سامنے ایک چھوٹی سی کشتی کھڑی تھی۔ دونوں اس میں سوار ہو گئے۔ جبکہ بگھی والا پیسے لے کر واپس چلتا بنا۔ شہزادہ سمجھ گیا کہ یہ شخص بہروپیہ ہے۔ لیکن شہزادے نے پھر بھی کوئی تاثر نہ دیا حتیٰ کہ کشتی ایک جزیرے کے پاس جا کر رک گئی۔

علی زمان نے شہزادے کا ہاتھ پکڑ کر اسے کشتی سے اتارا۔ پھر ملاح کو نوٹوں کی ایک گڈی تھمائی تو ملاح خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ علی زمان کے اشارے پر ملاح فوراً کشتی کو موڑ کر چلتا بنا اور ایک بار بھی اس نے مڑ کر نہ دیکھا۔

جب تک ملاح نظروں سے اوجھل نہ ہوا اس وقت تک دونوں اسی جگہ کھڑے رہے۔

''یہ میرا بحری جہاز ہے۔ اب میں تمہیں اس کی سیر کراؤں گا۔'' ملاح کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی علی

زمان نے بحری جہاز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''بہت پیارا بحری جہاز ہے یہ۔'' شہزادے نے بیڑے کی طرف دیکھ کر تعریف کرتے ہوئے کہا۔

''ابھی تو شہزادے آپ نے کچھ بھی نہیں دیکھا چلئے اس کے اندر جب آپ اندر جا کر دیکھیں گے تو حیران وششدر رہ جائیں گے۔'' علی زمان نے اپنے بیڑے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

''میرے اللہ! میری مدد فرمانا۔'' شہزادہ دل ہی دل میں رب سے دعا گو ہوا۔

اس کا دل اسے کسی ان دیکھے خطرے سے آگاہ کر رہا تھا۔ اس کی چھٹی حس اسے بتا رہی تھی کہ اس کا بحری بیڑے میں جانا کسی خطرے سے خالی نہیں ہے۔ لیکن جب اتنا بڑا ریسک اس نے لے لیا تھا تو اب پیچھے ہٹنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔

ویسے بھی اب اس کے پاس اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ اس نے ایک نگاہ جزیرے پر ادھر ادھر گھومتے لوگوں پر نگاہ ڈالی لیکن وہ سب لوگ اتنے بے پرواہ تھے کہ کسی نے بھی اس کی طرف نگاہ اٹھا کر نہ دیکھا تھا۔

شہزادے کو بہت غصہ آیا لیکن وہ کر بھی کیا کر سکتا تھا۔

بحری جہاز کے عرشے پر کھڑا کیپٹن، شہزادے کو ترحم آمیز نگاہوں سے تکے جا رہا تھا۔ اسے شہزادے پر بہت رحم آ رہا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ علی زمان کے محافظوں سے جہاز لدا ہوا ہے۔ وہ اس کی تکہ بوٹی کر کے رکھ دیں گے۔

علی زمان نہ صرف خود اس بحری بیڑے کو چلانے کی تکنیک جانتا تھا بلکہ اس کے علاوہ بھی اس کے پاس تین کیپٹن تھے۔ بچے کے چہرے کی معصومیت دیکھ کر کیپٹن کا دل خون کے آنسو رونے لگ گیا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ وہ بہر صورت شہزادے کو بچائے گا۔

☆......☆......☆

شہزادے کی گمشدگی کی بات پوری سلطنت میں جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ راجہ بھوج اور رانی بھنبتی کا شہزادے کی گمشدگی کا سن کر برا حال تھا۔ انہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کریں تو کیا کریں۔

راجہ بھوج نے پوری سلطنت میں سپاہی دوڑا دیے اور ان کے ذمہ لگا دیا کہ بگھی والے شخص کو گرفتار کر کے لائیں چاہے زندہ چاہے مردہ۔

جلد ہی بگھی والے کو سپاہی گرفتار کر کے لائے اور اس نے بتایا کہ اس شخص نے بگھی جا کر سمندر کے کنارے رکوائی بگھی وہاں سے وہ شخص اور شہزادہ دونوں ایک چھوٹی سی کشتی میں سوار ہوئے تھے اور وہ کشتی کے مالک کو اچھے سے پہچانتا ہے۔ فوراً ہی راجہ بھوج کے سپاہیوں نے کشتی والے کو پکڑ لیا اور راجہ بھوج کے سامنے حاضر کیا۔

اس نے ساری بات کہہ سنائی کہ وہ ان دونوں کو کس جگہ چھوڑ کر آیا ہے۔ راجہ بھوج کے سپاہی اس اس ملاح کو لیے اس جزیرے کی طرف چل پڑے جبکہ راجہ بھوج نے بگھی والے کا سر قلم کرنے کا حکم دے دیا۔ فی الفور حکم کی تعمیل ہوئی اور اس بگھی والے کا سر تن سے جدا کر دیا گیا۔

ادھر زمان سوداگر شہزادے کو سیر کرواتا ہوا لے کر عرشے پر آ گیا۔ اور جیسے ہی دونوں عرشے پر پہنچے زمان نے شہزادے کو زور سے دھکا دیا۔ شہزادہ اس سب کے لیے قطعاً تیار نہ تھا۔ شہزادہ عرشے پر گرا۔ شہزادہ اتنی زور سے گرا کہ اس کا سر چکرا گیا۔

نازونعم سے پلنے والا شہزادہ ایسا سختیاں جھیلنے کا کہاں عادی تھا۔ اس نے ترحم آمیز نگاہوں سے علی زمان کو دیکھا۔

''تم نہیں جانتے بہروپیے کہ تمہارا حشر کتنا برا ہوگا ایک عبرتناک موت تمہارا مقدر بنے گی۔'' شہزادے نے دھاڑتے ہوئے کہا۔

''شہزادے یہ تمہاری سلطنت نہیں میرا بحری بیڑہ ہے۔ یہاں صرف میری حکمرانی ہے۔ میرا قانون چلتا ہے یہاں۔ میری اجازت کے بغیر کسی کو اپنی زبان سے آواز نکالنے تک کی اجازت نہیں ہے۔ اس لیے دوبارہ ایسی آواز میں بات کرنے کی سعی مت کرنا۔ اور سن لو شہزادے کہ تمہاری موت میری زندگی ہے۔ جب تک تمہارا خون اس بحری بیڑے پر نہیں گرے گا اس وقت تک

یہ بحری بیڑا حرکت نہیں کرے گا۔ اس لیے مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' علی زمان نے میان میں سے اپنی تلوار نکالتے ہوئے کہا۔

''کیا میری موت ہی تمہارے بحری بیڑے کو حرکت میں لانے کا ذریعہ ہے؟'' شہزادے نے علی زمان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں تمہاری موت ہی میرے بحری بیڑے کو زندگی بخش سکتی ہے۔'' علی زمان نے شمشیر اچھی طرح تھام کر کہا۔

''اگر میں تمہارے اس بحری جہاز کو ٹھیک کر دوں تو کیا تم مجھے آزادی دے دو گے؟'' شہزادے نے علی زمان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''ہاں کیوں نہیں۔ مجھے آموں سے مطلب ہے نہ کہ گٹھلیوں سے۔ پھر تمہاری مجھے ضرورت ہی نہیں رہے گی۔'' علی زمان نے کہا۔

شہزادے نے اس کی بات سن کر اس کی طرف قدم بڑھایا۔ پھر اس کی تلوار کی تیز دھار پر اپنی انگلی پھیری تو خون فوارے کی مانند اس کی انگلی سے جاری ہو گیا۔ شہزادے کی انگلی سے نکلنے والا خون عرشے پر گرا۔ اس وقت تک کیپٹن بھی آ چکا تھا۔ علی زمان نے کیپٹن کو جہاز چلانے کا کہا۔

دوسری طرف جیسے ہی کیپٹن نے جہاز کا انجن اسٹارٹ کیا جہاز چل پڑا۔ علی زمان کا خوشی سے برا حال ہو گیا تھا۔

''اب تمہیں اپنا وعدہ پورا کرنا ہو گا بہروپیے۔'' شہزادے نے علی زمان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''تم پاگل ہو شہزادے۔ تمہیں چھوڑ کر میں اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنا نہیں چاہتا۔ ایک بار تمہیں چھوڑ دیا تو دوبارہ تمہیں کیسے اور کہاں سے ڈھونڈوں گا۔''

علی زمان سوداگر کے حکم پر اس کے محافظوں نے اسے قید کر دیا۔ شہزادے کو علی زمان پر بہت غصہ آیا کہ اس نے وعدہ خلافی کی ہے۔

شہزادے نے زندان کے باہر کھڑے محافظ کو بلایا اور کہا کہ وہ علی زمان کو اس کا جا کر پیغام دے کہ شہزادہ اس سے بات کرنے کا متمنی ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں علی زمان اس کے پاس آ گیا۔

''سنو بہروپیے! تم چاہو تو میں تمہارے سامنے ہیروں کا انبار لگا دوں اس کے عوض تم مجھے آزادی دے دو۔ میں چاہوں تو میں خود یہاں سے آزاد ہو سکتا ہوں لیکن میں تمہارے ساتھ تمہاری طرح چل نہیں کرنا چاہتا۔ اچھی طرح سوچ لو۔'' شہزادہ بات مکمل کر کے زندان میں بچھی چٹائی کی طرف جانے لگا تبھی زمان نے اسے پکارا۔

''مجھے منظور ہے شہزادے۔''

''تم جھوٹے انسان ہو مجھے یقین دلواؤ کہ تم اپنے وعدے پر پورے اترو گے۔'' شہزادے نے بے یقینی سے اسے تکتے ہوئے کہا۔

''میں اب آپ کو کیسے یقین دلا سکتا ہوں شہزادے آپ میری بات کا یقین کیجئے۔'' علی زمان نے بے بسی سے کہا۔

شہزادے نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں بے چارگی اور بے بسی دکھائی دی۔ شہزادہ جانتا تھا کہ وہ ایک نمبر کا جھوٹا انسان ہے۔ پہلے کی طرح وہ اب بھی اسے دھوکہ دے گا لیکن شہزادے نے دل ہی دل میں آنے والے وقت کے لیے بھی لائحہ عمل سوچ لیا تھا۔

شہزادے نے اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے ہاں میں سر ہلایا۔ لیکن دلی طور پر شہزادہ اس کی بات سے قطعاً متفق نہ تھا۔

شہزادے کو زندان سے جیسے ہی باہر نکالا گیا اس نے کنکریاں لانے کا کہا جو فوراً ہی جہاز کے نچلے حصے سے مل گئی۔ ایک بڑا سا برتن کنکریوں سے بھر کر شہزادے کے سامنے رکھا گیا۔ شہزادے نے ایک کنکری اٹھائی۔ اس نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھا پھر اس کنکری کو اس نے اس برتن میں پھینکا۔

کنکری کے پھینکنے کی دیر تھی کہ برتن میں موجود ساری کنکریاں ہیروں میں بدل گئیں۔ علی زمان اتنے زیادہ ہیرے دیکھ کر بے ایمان ہو گیا اور فوراً ہی اس کی نیت میں

فتور آگیا۔

''شہزادے آپ تو واقعی بہت شکی شاکی ہیں۔ ارے میں کیسے ایسی بے وقوفی کرسکتا ہوں کہ آپ کو رہائی دے دوں۔ آپ کو میں اپنے سے جدا نہیں کرنا چاہتا۔ میرے اس بھرے جہاز سے زیادہ قیمتی تو آپ ہیں۔ معذرت چاہتا ہوں شہزادے لیکن آپ کو میں رہائی نہیں دے سکتا۔'' علی زمان نے شہزادے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور دوسری طرف اپنے محافظوں کو شہزادے کو دوبارہ زندان میں ڈالنے کا حکم دیا۔

''بہروپیے انسان تو نے وعدہ خلافی کی ہے اور میں نے پہلے ہی تمہیں بتادیا تھا کہ اب کی بار اگر تم دروغ گوئی سے کام لوگے تو تمہارے لیے قطعاً بہتر نہ ہوگا۔ لیکن چونکہ تم نے اپنی فطرت عیاں کردی ہے تو اب بھگتو اپنا انجام۔'' شہزادے نے غصے سے پیچ وتاب کھاتے ہوئے کہا۔

اس کی بات سن کر علی زمان نے حیرت سے شہزادے کی طرف دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے شہزادے نے زور سے اپنا داہنا پاؤں جہاز کے فرش پر مارا۔ دوسرے ہی سے جہاز کے اندر گویا بھونچال برپا ہوگیا۔ علی زمان نے حیرت سے چاروں طرف دیکھا۔ لیکن اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت کے موافق اس کے پاس سوائے پچھتائے کے اور کوئی حل نہ تھا۔

''شہزادے خدارا ایسا مت کیجئے میں ابھی آپ کو نہ صرف رہا کرتا ہوں بلکہ باعزت آپ کی سلطنت میں پہنچانے کا انتظام کرواتا ہوں۔'' علی زمان سوداگر نے بے چارگی اور بے بسی سے کہا۔

''اب کچھ بھی نہیں ہوسکتا بہروپیے۔ اب تمہیں یہ سب بھگتنا ہے۔ ایک عبرت ناک انجام سے تمہیں دوچار ہونا ہے سمجھے۔'' شہزادے نے متواتر غصے سے لال پیلا ہوتے ہوئے کہا۔

قبل اس کے کہ دونوں کے درمیان گفتگو کا سلسلہ طول پکڑتا۔ سماعت شکن آوازوں نے دونوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ علی زمان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ دوسرے ہی لمحے جیسے جہاز میں ہلچل مچ گئی ہو۔ لوگوں کے بھاگنے اور واویلا کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔

''سر جہاز بری طرح سے کسی چٹان سے ٹکرایا ہے اور اس کے اندر بہت بڑا شگاف پیدا ہوگیا ہے۔ پانی سرعت سے جہاز کے اندر داخل ہورہا ہے۔ آپ کو بھی اوپر آنا ہوگا۔ حالات کشیدگی اختیار کرتے جارہے ہیں۔ ہم لوگ جزیرے سے بہت دور نکل آئے چاروں کیپٹن جہاز کو سنبھالنے کی ہر ممکن کوشش کررہے ہیں لیکن ان کے مطابق وقت بہت کم ہے۔ کسی بھی وقت کوئی انہونی ہونے کا اندیشہ ہے۔ کشتیاں پانی میں پھینکی جارہی ہیں۔ بطور احتیاط آپ کو بھی فی الحال کسی کشتی میں سوار ہونا پڑے گا۔'' آناً فاناً ایک محافظ اندر آیا اور اس نے علی زمان کو منحوس خبر سنائی۔

وہاں پر پہلے سے موجود محافظوں کے بھی کان کھڑے ہوگئے۔ علی زمان نے کھاجانے والی آنکھوں سے شہزادے کو دیکھا۔ لیکن شہزادے نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کی دگرگوں حالت پر طنز کررہا ہو۔

''شہزادے آپ کی قسمت میں ایک بھیانک موت لکھی ہے۔'' علی زمان گویا ہوا۔

دوسرے ہی لمحے اس نے میان میں لٹکی ہوئی تلوار نکالی اور شہزادے کی طرف لپکا۔ شہزادہ اپنی جگہ جوں کا توں کھڑا رہا۔ اس کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ تبھی یک لخت علی زمان کو رکنا پڑا۔ اس کے محافظوں نے اس کے یکدم رک جانے پر اسے حیرت سے گھورا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے جہاز دو حصوں میں بٹ گیا۔

پلک جھپکتے میں جہاز بری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگیا۔ جلد ہی جہاز زمین کی گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ کچھ لوگ کشتیوں پر چڑھ چکے تھے اور جو بچ گئے تھے وہ جہاز کے ساتھ ہی گہرائیوں کی نذر ہوگئے تھے۔

علی زمان کا سب کچھ ڈوب گیا تھا۔ جہاز کے ایک علیحدہ ہونے والے تختے پر وہ مضبوطی سے لپٹا ہوا تھا۔ اس نے نگاہ ادھر ادھر دوڑائی تو قریب ہی شہزادے کو ایک تختے پر براجمان دیکھا۔ حیرت اور غصے سے پھنکارتے ہوئے اس نے شہزادے کی طرف دیکھا اور پھر ہاتھوں سے

چیوڈں کا کام لیتے ہوئے وہ شہزادے کی طرف لپکا۔ جلد ہی اس نے شہزادے کو پالیا۔

☆......☆......☆

بادشاہ کے سپاہیوں نے ہر جگہ تلاش کیا لیکن شہزادے کو نہ ملنا تھا نہ مل سکا۔ انہیں جلد ہی کچھ مسلح افراد کشتیوں پر دکھائی دیئے۔ جنہیں فوراً سے بھی پیشتر گرفتار کرلیا گیا اور انہوں نے یہ بات بتائی کہ وہ بحری جہاز ڈوب گیا ہے۔ وہ لوگ علی زمان سوداگر کے محافظ ہیں اور انہوں نے اپنی جان بچانے کے لیے جہاز سے چھلانگ لگا کر ان کشتیوں میں بیٹھ کر اپنی جان بچائی ہے۔

ان سب کو گرفتار کرکے راجہ بھوج کے دربار میں پیش کردیا گیا۔ دوسری طرف رانی بھنبتی کو بھی خبر ہوئی کہ وہ بحری جہاز جس کے اندر اس کے بیٹے کو اغواء کرکے لے جایا جارہا تھا۔ وہ جہاز پانی میں غرق ہوگیا ہے۔ جہاز کے مالک علی زمان سوداگر کے محافظوں کو رنگے ہاتھوں گرفتار کرلیا گیا ہے۔

رانی بھبتی یہ خبر سنتے ساتھ ہی پردے کے پیچھے آکر کھڑی ہوگئی۔ وہ اپنے لخت جگر کا حال جاننے کے لیے بہت مضطرب تھی۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کرے تو کیا کرے۔ بس وہ پیہم دل ہی دل میں اپنے لخت جگر کے لیے دعائیں مانگے جارہی تھی۔ اس کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگ رہی تھی۔

اس کی دعاؤں کا نتیجہ ہی تھا کہ شہزادہ دھوج موت سے تو بچ گیا لیکن ابھی کچھ امتحانات باقی تھے۔

''یاد رکھنا ظالموں اگر تم میں سے کسی نے بھی دروغ گوئی کا مظاہرہ کرنے کی یا کسی بھی قسم کی ایکٹنگ کرنے کی سعی کی تو فوراً سے بھی پیشتر تمہارے سر قلم کروادوں گا۔ تمہارا انجام عبرتناک ہوگا۔'' راجہ بھوج نے کھڑے ہوکر دونوں ہاتھ پیچھے باندھ کر غصے سے پیچ وتاب کھاتے ہوئے کہا۔

''تم لوگ مجھے میرے شہزادے کے بارے میں بتاؤ، میں جانتا ہوں اور میرا دل کہتا ہے کہ وہ زندہ ہے۔ اب یہ تم بتاؤ کہ وہ کہاں ہے اور اسے اغواء کرنے والا تم لوگوں کا مالک کہاں ہے؟''

راجہ بھوج کی بات سن کر سب حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہوگئے۔ کیونکہ وہ کچھ بھی نہیں جانتے تھے لیکن صرف کیپٹن آگے بڑھا۔ یہ وہی بچ جانے والا کیپٹن تھا جو علی زمان سوداگر کے ساتھ جزیرے پر گیا تھا اور جس کے سامنے اس بوڑھے نے علی زمان کو بچے کی بلی چڑھانے کے لئے کہا تھا۔

کیپٹن نے ساری بات راجہ بھوج کے حضور بیان کی اور بتایا کہ کس طرح دھوکے سے علی زمان سوداگر شہزادے دھوج کو سکول سے اغواء کرکے لے گیا تھا۔

جب کیپٹن کی ساری بات رانی بھنبتی نے سنی تو ایسی اندوہناک بات سن کر اس کا دل تڑپنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں دواں ہوگئے۔ اس نے یہ بات سن کر درد سے آہ بھری سسکاری نکالی۔ راجہ بھوج کی سماعت سے اس کی سسکاری کی بازگشت ٹکرائی۔

راجہ بھوج کا دل بھی بیٹے کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کی روداد سن کر بری طرح سے پیچ وتاب کھا کر رہ گیا۔ راجہ بھوج کے حکم پر سب کو رہا کر دیا گیا۔ دربار برخاست ہوتے ہی راجہ بھوج اپنے کمرۂ خاص کی طرف بڑھا جہاں رانی بھنبتی جاکر زار و قطار روئے جارہی تھی۔

''باادب سلطان بھوج تشریف لارہے ہیں۔'' دروازے پر ایستادہ محافظ کی بازگشت سن کر رانی بھنبتی کھڑی ہوگئی۔

اسی لمحے کمرے کا دروازہ کھلا اور راجہ بھوج اندر داخل ہوا۔ راجہ بھوج کے داخل ہوتے ساتھ ہی دروازہ بند ہوگیا۔ رانی بھنبتی راجہ بھوج کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ گئی۔ راجہ بھوج کا دل بھی کرچیاں کرچیاں ہوچکا تھا لیکن وہ اس بات کو ماننے کے لیے قطعاً تیار نہ تھا کہ اس کا بیٹا موت سے ہمکنار ہوگیا ہے۔ اس کا دل کہتا تھا کہ اس کا بیٹا حیات ہے۔

''خود کو سنبھالیے رانی۔'' رانی کا غم جب کچھ ہلکا ہوا تو راجہ بھوج نے اسے علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔

''رانی آپ باہمت عورت ہیں۔ حالات کا مقابلہ

کرنے اور حقیقت کو سہنے کی عادت ڈالیں۔ اس بات پر شواس رکھ لیں کہ ہمارا بیٹا عظیم ہے۔ اسے موت بھلا کیسے چھو سکتی ہے۔ یاد رکھنا رانی وہ دن دور نہیں جب ہمارا بیٹا ہمارے پاس ہوگا جلد...... بہت جلد۔''

راجہ بھوج کی بات سن کر رانی بھنبتی نے اس کی طرف دیکھا۔ راجہ بھوج کی آنکھوں میں اسے غموں کا ایک اُمڈتا سیلاب جو تمام تر ہمت یکجا کر کے روکا گیا تھا دکھائی دے رہا تھا۔ رانی بھنبتی جانتی تھی کہ راجہ بھوج شہزادے دھوج سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ یہ ان کی محبت ہی تھی کہ انہوں نے نہ صرف اپنی شرط کو ختم کر دیا تھا بلکہ رانی بھنبتی اور شہزادے دھوج کو شاہانہ انداز سے واپس محل میں لے آیا تھا۔

''آپ میری ڈھارس بندھانے کی سعی کر رہے ہیں جبکہ دوسری طرف آپ کی حالت مجھ سے ابتر ہے۔ میں جانتی ہوں کہ اس ظالم نے ہمارے بیٹے کے ساتھ۔'' ابھی رانی بھنبتی نے اتنا ہی کہا تھا کہ راجہ بھوج نے اس کے لبوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش کر دیا۔

''ایسا سوچنا بھی مت رانی۔ ہمارا بیٹا حیات ہے اور میں جلد ہی اسے آپ کے پاس لے کر آؤں گا میں آپ کی ڈھارس نہیں بندھا رہا بلکہ حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ اور حقیقت یہی ہے کہ ہمارا بیٹا زندہ ہے۔'' راجہ بھوج نے رانی بھنبتی کے دونوں کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

اس کی بات سن کر رانی بھنبتی نے اپنے پلو سے اپنی آنکھیں صاف کیں۔ نجانے کیوں اسے راجہ بھوج کی بات پر یقین ہو گیا تھا کہ اس کا بیٹا حیات ہے۔ رانی بھنبتی نے اسی وقت کمرے میں رکھی بھگوان کی مورتی کی طرف نگاہ دوڑائی۔ قبل اس کے کہ وہ اس کی طرف بڑھتی راجہ بھوج نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''رانی یہ بت ہماری کوئی مدد کرنے کی سکت نہیں رکھتے۔ آپ بھی اس حقیقت کو سمجھ لیجئے۔'' راجہ بھوج نے رانی بھنبتی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''میرے آقا! ہمارے پرکھوں نے بھی بتوں کی پوجا کی ہے۔ اور ہم اپنے پرکھوں کے طور طریقوں سے کیسے روگردانی کر سکتے ہیں۔ ایسا کیسے ممکن ہے؟'' رانی بھنبتی نے راجہ بھوج کی بات سن کر حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر کہا۔

''ہمارے پرکھوں نے غلط راستے کا چناؤ کیا تھا اور ہم اس راستے پر قطعاً نہیں چل سکتے۔'' راجہ بھوج نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''میں کچھ سمجھی نہیں؟'' رانی بھنبتی نے آنکھیں پھاڑ کر راجہ بھوج کو تکتے ہوئے کہا۔

''سمے آنے پہ سمجھ جاؤ گی۔'' راجہ بھوج بولا۔

اس کی بات سن کر رانی بھنبتی نے منہ سے تو کوئی جواب نہ دیا لیکن دل ہی دل میں راجہ بھوج کے لیے بھگوان سے پرارتھنا کرنے لگی اور ان باتوں پر بھگوان کے شراپ سے بچنے کی دعا بھی کرنے لگی۔

☆......☆......☆

علی زمان سوداگر شہزادے کو پکڑے بالآخر ساحل پر آ گیا۔ دونوں کا سانس بری طرح سے پھولا ہوا تھا۔ علی زمان نے شہزادے کو گریبان سے پکڑ لیا تھا۔

سانس میں کچھ سانس آئی تو دونوں نے ادھر ادھر دیکھا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ دونوں کسی نہایت ہی پیارے علاقے میں پہنچ چکے تھے۔ چہار سو رنگ برنگے پھولوں کی قطاریں دکھائی دے رہی تھیں۔ فضا میں پھولوں کی خوشبو رچی بسی تھی۔

اچانک دونوں کی نگاہ ایک جگہ ٹک گئی۔ دونوں حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو کے اگلا منظر دیکھنے لگے۔

ان کے سامنے حسین و جمیل دوشیزائیں اکٹھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے دو دوشیزائیں شطرنج کی بازی لگا رہی تھیں جبکہ باقی سب اس بازی کو دیکھ رہی تھیں۔ اور انہیں داد دے رہی تھیں۔

ان دوشیزاؤں نے بھی ان دونوں کو دیکھ لیا تھا۔ وہ دوشیزائیں بجلی کی سی کوندیں اور ساتھ میں واقع ایک کنویں میں سب نے چھلانگ لگا دی۔

کھیلنے والی دوشیزاؤں میں سے ایک دوشیزا کے ہاتھ سے شطرنج کی چھ گوٹیاں گر گئیں جبکہ چھ گوٹیاں لیے اس نے بھی ان باقی دوشیزاؤں کی طرح اس کنوئیں میں چھلانگ لگادی۔

دونوں حیران وششدر یہ منظر دیکھے جارہے تھے۔ انہیں کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ یہ سب کیا ہوا ہے۔ کیوں ان لڑکیوں نے یکے بعد دیگرے اس کنوئیں میں چھلانگ لگادی ہے۔

علی زمان سوداگر نے شہزادے کا گریبان چھوڑ دیا تھا اور سختی سے تنبیہہ کی کہ اگر اس نے بھاگنے کی کوشش کی تو وہ اس کا سر قلم کردے گا۔

علی زمان اور شہزادہ دونوں مل کر پہلے اس کنوئیں کے پاس آئے اور اس میں جھانک کر دیکھا تو ورطۂ حیرت میں مبتلا ہوگئے کنواں پانی سے لبالب بھرا ہوا تھا۔

شہزادہ ساری بات سمجھ گیا تھا لیکن علی زمان کے ذہن میں یہ بات آنے والی نہ تھی۔ شہزادے کے لبوں پر مسکراہٹ جلوہ گر تھی جسے علی زمان نے دیکھ لیا تھا۔

''تم کیوں بونگوں کی طرح ہنسے جارہے ہو؟'' علی زمان نے غصے سے پیچ وتاب کھاتے ہوئے پوچھا۔

''چھوڑو اس بات کو اور وہ سامنے جو گوٹیاں گری ہیں وہ اٹھالو اتنے نایاب ہیرے ہیں کہ تمہارا غرق ہونے والا مال اس ایک ہیرے کے مقابلے میں بھی تھوڑا ہو۔'' شہزادے نے بات پھیرتے ہوئے گرنے والے گوٹیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو علی زمان نے جھٹ سے وہ اٹھالیں۔

علی زمان ان گوٹیوں کو دیکھ کر حیرت کے سمندر میں غوطہ زن رہ گیا۔ وہ گوٹیاں واقعی نہایت ہی نایاب ہیرے تھے۔ اس نے تاحیات سوداگری کی تھی اور اسے ہر چیز کے بارے میں اچھی خاصی جانکاری تھی۔ خاص کر ہیروں اور سونے کے بارے میں تو اسے بہت زیادہ جانکاری حاصل تھی۔

''تمہارا میرے ساتھ رہنا ہی میرے لیے بہت مفید ہے شہزادے۔'' علی زمان نے آنکھیں پھاڑ کر ہیروں کو تکتے ہوئے کہا۔

شہزادے نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ دونوں آگے جانا چاہتے تھے لیکن نجانے کیا سوچ کر علی زمان رک گیا۔ اس کے ذہن میں جزیرے والے بوڑھے کی بات گونج اٹھی۔ اس بوڑھے سے جب سے ملاقات ہوئی تھی پریشانیاں اس کے لیے بڑھتی ہی چلی جارہی تھیں۔ نہ صرف اس کا بحری جہاز مال سمیت سمندر میں غرق ہوگیا تھا بلکہ اس کے درجنوں محافظ بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔

☆......☆......☆

اب دونوں ساحل کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے راجہ بھوج کی سلطنت میں داخل ہوگئے۔ اس بات سے دونوں ہی بے خبر تھے کہ دونوں واپس راجہ بھوج کی سلطنت میں داخل ہوگئے ہیں۔

شہزادہ بے شک اسی سلطنت کا تھا لیکن اس نے سلطنت ٹھیک سے گھوم پھر کر نہ دیکھی تھی۔ علی زمان اسے لیے ہوئے ایک بستی میں جا پہنچا۔ اتفاق سے یہ بستی راجہ بھوج کے محل سے زیادہ دور نہ تھی۔

علی زمان نے شہزادے کے منہ پہ کالک مل کر اس کا حلیہ تبدیل کردیا تھا۔ وہ کسی طور شہزادے کو خود سے جدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اتفاق سے وہ اس بات سے بالکل ہی ناآشنا تھا کہ وہ راجہ بھوج کی سلطنت میں قدم رکھ چکا ہے۔

علی زمان بستی میں ایک دکاندار سے ملا اور اسے بتایا کہ وہ یہاں کرائے کا کوئی کمرہ لینا چاہتا ہے۔ وہ پردیسی ہے اور کچھ عرصہ یہاں قیام کرنے کا متمنی ہے۔ لہٰذا اس کی جس قدر ممکن ہو مدد کی جائے۔

دکان دار نے اسے ہاتھ کے اشارے سے سمجھایا کہ یہاں سے دو گلیاں مڑ کر دائیں طرف ایک گھر کا لکڑی کا دروازہ ہے جس پر نیلے رنگ کا پینٹ کیا گیا ہے۔ اسے جاکر کھٹکھٹانا۔ وہاں سے انیس آغا نام کا آدمی نکلے گا۔ اسے میرا بتانا وہ تمہیں رہنے کے لیے کمرہ دے دے گا۔

علی زمان شہزادے کو لیے اس دروازے کے پاس جا پہنچا۔علی زمان نے ہی دروازہ کھٹکھٹایا جلد ہی ایک تیس پینتیس برس کے شخص نے دروازہ کھولا تو علی زمان نے اسے بتایا کہ فلاں سبزی والے نے اسے ان کے پاس بھیجا ہے اور وہ کرائے پر مکان حاصل کرنا چاہتا ہے۔ساتھ میں جولڑکا ہے وہ اس کا بیٹا ہے۔

انیس آغا نے شہزادے کو بغور دیکھا اور کسی سوچ میں مبتلا ہوگیا لیکن جلد ہی سر کو جھٹک کر وہ ان دونوں کو اندر ساتھ لے آیا۔

انیس آغا نے انہیں فرسٹ فلور دکھایا جس میں دو کمروں کے لیے برآمدہ، کچن اور باتھ روم کی سہولت بھی موجود تھی۔

''اس مکان کا کرایہ آپ کیا لیں گے انیس آغا؟'' علی زمان نے مکان دیکھنے کے بعد پوچھا۔

''ویسے تو میں پانچ اشرفیاں لیتا ہوں لیکن اگر کھانے پینے کا نظام بھی میرے ذمے ہوا تو بارہ اشرفیاں۔ کیونکہ تم دو ہو دونوں کا ملا کے کہہ رہا ہوں۔آگے تمہاری مرضی۔'' انیس آغا نے کہا۔

''ٹھیک ہے آغا ہمیں منظور ہے۔ایڈوانس کتنا لوگے؟'' علی زمان نے پوچھا۔

''پوری بارہ اشرفیاں ایڈوانس لوں گا۔'' انیس آغا نے کہا۔

معاہدے کے مطابق انیس آغا کو بارہ اشرفیاں دے دی گئیں۔علی زمان اور شہزادے نے وہیں رہنا شروع کردیا۔

انہیں وہاں رہتے ہوئے دو چار روز ہی گزرے ہوں گے کہ ایک دن انیس آغا ان کے لیے ناشتہ لے کے آیا۔دونوں اس وقت خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔اتفاق سے ان کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

انیس آغا کی نگاہ فٹ سے ان چھ ہیروں پر جا ٹکی جو بیڈ کے ساتھ ٹیبل پر ایک طرف رکھے ہوئے تھے۔ انیس آغا نے ناشتہ وہیں دروازے کے ساتھ رکھے ٹیبل پر رکھا اور دبے قدموں چلتا ہوا ان ہیروں کے پاس آیا۔

ہیرے پوری آب وتاب سے چمک رہے تھے۔ انیس آغا نے ان ہیروں کو ہاتھ میں اٹھا کر دیکھا ہیرے نہایت ہی بیش قیمت تھے۔

انیس آغا انہیں اٹھائے دبے قدموں باہر نکلنے ہی والا تھا کہ علی زمان کی آنکھ کھل گئی اور اس نے انیس آغا کے ہاتھ میں وہ ہیرے دیکھ لیے۔

''آغا تم کیسے ہمارے مال کو چرا سکتے ہو۔واپس کرو مجھے؟'' علی زمان نے بیڈ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

لیکن تب تک انیس آغا نے زینہ پر قدم رکھا اور جلد ہی زینہ عبور کر کے باہر نکل گیا۔علی زمان اس کے پیچھے بھاگا۔ شور کی آواز سن کر شہزادے کی آنکھ کھل گئی۔لیکن وہ اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔

انیس آغا بازار میں آگے آگے بھاگا جا رہا تھا۔ جبکہ علی زمان اس کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگا۔جلد ہی دونوں راجہ بھوج کے محل کے سامنے جا پہنچے انیس آغا بدستور بھاگتا ہوا اندر داخل ہوگیا جبکہ علی زمان کو محافظوں نے روک لیا۔

''علی زمان'' آغا نے باہر کھڑے ہو کر شور مچایا تو جلد ہی اسے راجہ بھوج کے سامنے پیش کردیا گیا جبکہ دوسری طرف انیس آغا پہلے راجہ بھوج کے حضور پیش ہو کر انہیں وہ ہیرے دکھا چکا تھا۔

''میرے آقا!یہ ہیرے میرے ہیں۔میں آغا کے ہاں کرائے پر ٹھہرا ہوں۔میں نے ایڈوانس بھی ادا کردیا ہے باوجود اس کے آغا نے میرے مال کو چرایا ہے۔جب میں اس کے پیچھے بھاگا تو اس نے مال آپ کے حضور پیش کردیا۔خدارا میرا مال واپس کیا جائے۔'' علی زمان نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔

راجہ بھوج نے ایک بھرپور نگاہ اس پر ڈالی۔علی زمان راجہ بھوج کی نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے نگاہیں جھکا گیا۔''یہ ہیرے تمہیں کہاں سے ملے ہیں؟''

راجہ بھوج نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے الٹا اس سے سوال کیا۔راجہ بھوج کا سوال سن کر علی

زمان کا حلق خشک ہوگیا۔

''میرے آقا! میں ایک سوداگر ہوں اور سوداگری کرتا ہوں۔ یہ ہیرے مجھے میرے مال کے بدلے میں ملے تھے۔'' علی زمان نے تھوک نگلتے ہوئے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے ہم تمہیں یہ ہیرے لوٹا دیں گے یہ ہمارا وعدہ ہے۔ اور ہم وعدہ خلافی نہیں کرتے لیکن اس سے پہلے تمہیں ہمارا ایک کام کرنا ہوگا۔'' راجہ بھوج نے متواتر اسے بھرپور نگاہوں سے تکتے ہوئے کہا۔

''کیسا کام میرے آقا؟'' علی زمان نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ چھ ہیرے ہیں۔ ان کے جیسے چھ اور بھی ہیرے ہوں گے۔ اگر تم وہ چھ ہیرے لانے میں سپھل ہو جاتے ہو تو بھگوان کی سوگند یہ ہیرے بھی تمہیں لوٹا دوں گا۔'' راجہ بھوج نے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاتے ہوئے کہا۔

راجہ بھوج کی بات سن کر پہلے تو علی زمان سوچ میں پڑ گیا لیکن جلد ہی اسے شہزادے کا خیال آیا۔ شہزادہ اس کے لیے بہت قیمتی تھا۔ ہر مشکل وہ حل کر سکتا تھا۔ اس نے فوراً حامی بھر لی اور دربار سے نکل آیا۔

دوسری طرف شہزادہ ابھی تک بستر پر دراز تھا۔ پھر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اس کی نگاہ دروازے کے پاس رکھے ٹیبل پر دھرے ناشتے پر جا ٹکی۔ ہیرے ملیں نہ ملیں وہ ٹینشن تو علی زمان کی تھی۔

شہزادے نے اٹھ کے منہ ہاتھ دھویا اور سیر ہو کر ناشتہ کیا۔ ابھی وہ برتن سمیٹنے ہی لگا تھا کہ علی زمان آن دھمکا۔ برتنوں میں بچے کھچے ناشتے پر وہ ٹوٹ پڑا۔ جلد ہی دونوں تیار ہو کر اس گھر سے نکلے۔ علی زمان کو انیس آغا پر بہت غصہ تھا۔ اس کا من چاہ رہا تھا کہ وہ اس کا گلہ دبا دے۔

''اب کہاں جا رہے ہیں ہم۔ اور یہ صبح صبح کیا ادھم مچا رکھا تھا تم لوگوں نے؟'' شہزادے نے چلتے چلتے علی زمان سے پوچھا۔

جواب میں علی زمان نے پوری بات اسے کہہ سنائی جسے سن کر شہزادہ رک گیا۔

''تو اب تم مجھے کہاں لیے جا رہے ہو؟''

شہزادہ اس کی بات سن کر ورطۂ حیرت میں مبتلا رہ گیا تھا۔ جبکہ علی زمان نے اسے گھورا۔ ''تمہیں اسی کنوئیں میں اترنا ہوگا شہزادے۔ تم ہی وہ شخص ہو جو باقی کی چھ گوٹیاں لا سکتا ہے۔''

علی زمان نے شہزادے کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا تو شہزادہ کانپ کر رہ گیا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے اس کنوئیں کو لبالب بھرا ہوا دیکھا تھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے شہزادے کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ یہ چمک علی زمان کی آنکھوں سے پنہاں رہی تھی۔

دونوں چلتے ہوئے اس کنوئیں تک پہنچ گئے۔ علی زمان نے شہزادے کو وہیں ٹھہرایا اور دوسری طرف بندھی رسی کھولی۔ جس کے ساتھ ایک بڑا سا ڈول کنوئیں میں لٹکا جھول رہا تھا۔

اس نے ڈول کو اپنی طرف کھینچا پھر شہزادے کو اس میں بیٹھایا۔

''شہزادے ہمت سے کام لینا۔ اسی میں ہم دونوں کی بہتری ہے۔ اس بار میں دل سے وعدہ کر رہا ہوں اگر تم کامیاب لوٹے تو رہائی مل جائے گی۔'' علی زمان نے اسے ڈول میں بیٹھاتے ہوئے کہا۔

''تم ایک نمبر کے جھوٹے اور مکار انسان ہو۔ رہی بات لوٹنے کی تو بچوں گا تو لوٹوں گا ناں۔'' شہزادے نے اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

''تمہیں کچھ نہیں ہوگا شہزادے تم نے دیکھا نہیں تھا کہ یکے بعد دیگرے کتنی ہی دوشیزائیں اس کنوئیں میں چھلانگ مار کر غائب ہوگئی تھیں۔'' علی زمان نے اسے یاد دلاتے ہوئے کہا۔

شہزادے نے اس کی بات کے بدلے میں کوئی جواب نہ دیا۔

''شہزادے جب تم ان ہیروں کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤ تو اسی ڈول میں براجمان ہو جانا۔ جیسے ہی اس پر وزن پڑے گا میں سمجھ جاؤں گا کہ تم اس میں بیٹھ گئے ہو میں اسے اوپر کھینچ لوں گا۔''

علی زمان نے شہزادے کو سمجھاتے ہوئے کہا جبکہ

شہزادہ متواتر چپ سادھے ڈول میں براجمان رہا اور ایک اچنبھا یہ ہوا تھا کہ جب انہوں نے دیکھا دوسرے ہی لمحے علی زمان نے دھپ سے رسی ڈھیلی کی اور ڈول کنوئیں کے پانی کی گہرائیوں کی نذر ہو گیا۔

شہزادے کو یوں لگا جیسے اسے تیز ہواؤں کے سپرد کر دیا گیا ہو۔ اسے اچھی طرح سے یاد تھا کہ علی زمان نے اسے کنوئیں کے پانی میں ڈول میں بیٹھا کر اتارا تھا۔ لیکن اتنی تیز اور ٹھنڈی ہوائیں کنوئیں میں کیسے آ گئیں اور پانی غائب۔

ڈول ایک دم کنوئیں کی تہہ سے جا کر ٹکرایا تو شہزادے نے آنکھیں کھولیں اور اگلا منظر دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گیا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے دل کو موہ لینے والا منظر تھا۔

ہر طرف ہریالی ہی ہریالی تھی۔ ایک طرف اونچے اونچے پہاڑ جن پر لدے ہوئے درخت جن کی ٹہنیاں پھلوں سے لدی ہوئی تھیں دکھائی دے رہے تھے۔ جبکہ ان پہاڑوں کے سامنے سے شفاف اور ٹھنڈے پانی کی چھوٹی سی ندی گزر رہی تھی۔

فضا میں پھولوں کی دل موہ لینے والی خوشبو رچی بسی تھی۔ شہزادہ اس ماحول میں کھویا ہوا تھا جب اچانک اس کی سماعت سے لڑکیوں کے ہنسنے کی آواز ٹکرائی۔ اس نے جھٹ سے سر جھٹکا اور اس طرف دیکھا جس طرف سے آواز آئی تھی۔ اور یہ دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا وہ ساری لڑکیاں جنہوں نے کنویں میں چھلانگ لگائی تھی اس کے سامنے کھڑی اسے تکے جا رہی تھیں۔

''شہزادے آخر آپ ہی آ گئے۔'' ایک دوشیزہ نے شہزادے کے بالکل سامنے آ کر اسے مخاطب کیا۔

''کیا مطلب؟'' شہزادہ سہم کر بولا۔

''کیا آپ جانتے ہیں کہ آپ جس سلطنت سے واپس آ رہے ہیں وہی آپ کی سلطنت تھی۔ شہزادے جس بادشاہ کے پاس ہماری چھ گوٹیاں ہیں وہ تمہارا پتا راجہ بھوج ہی ہے۔ افسوس کہ تم اپنی ہی سلطنت میں رہ کر کچھ نہ جان سکے۔'' اس دوشیزہ نے دوبارہ بات مکمل کی تو اس کی بات سن کر شہزادہ ورطۂ حیرت میں مبتلا رہ گیا۔

گویا وہ اپنی سلطنت میں تھا۔ جہاں اس کے پتاجی اور ماتاجی تھے۔ اس نے کتنی بڑی بے وقوفی کی تھی۔ وہ انیس آغا اور علی زمان سوداگر کے پیچھے کیوں نہ گیا تھا۔ اگر وہ ان کے پیچھے چلا جاتا تو آج ایک نئی افتاد سے دوچار نہ ہونا پڑتا۔

''شہزادے۔ آپ چنتا مت کریں۔ ہم نے جان بوجھ کر وہ چھ گوٹیاں باہر پھینکی تھیں۔ ہم جانتی تھیں کہ آپ کا ستارہ زوال پذیر ہے۔ شروع سے لے کر اب تک کے حالات سے ہم آشنا ہیں۔ آپ نہیں جانتے شہزادے لیکن آپ کے شریر میں ایسی شکتیاں پنہاں ہیں کہ اگر آپ کو بھی ان کے بارے میں علم ہو جائے تو آپ دنیا کو اپنی ہتھیلی پر رکھ کر پھونک مار کر اڑا دیں۔ لیکن ایسا ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ آپ کے پاس جو شکتیاں ہیں وہ نیکی کی شکتیاں ہیں۔ حق کی شکتیاں جو آپ کو وراثت میں ملی ہیں۔ انہی شکتیوں کی بنا پر جلد ہی آپ کو بہت بڑی شکتی ملنے والی ہے۔ جانتے ہیں کونسی شکتی؟''

اس دوشیزہ نے بات مکمل کرنے کے بعد بغور شہزادے کو دیکھا تو شہزادے نے نفی میں سر ہلایا۔

''ایمان کی روشنی۔''

دوشیزہ نے دھیمے سے لہجے میں جواب دیا۔ اس کی بات شہزادے کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ شہزادے کو فکر لاحق تھی کہ کسی طرح وہ اپنی سلطنت میں واپس پہنچے اور اپنے ماتا پتا کا دیدار کرے۔ اور اس ظالم انسان کو عبرتناک سزا دلوائے۔

''آپ مضطرب نہ ہوں شہزادے۔ اب اس ظالم کا انجام نزدیک آ گیا ہے۔ آپ یہ گوٹیاں لے جایئے اور اسے دیجئے۔ وہ ایک بار پھر وعدہ خلافی کرے گا لیکن اس کے ساتھ ساتھ بے وقوفی بھی کرے گا اور آپ کو اپنے ساتھ لے جائے گا اور یوں آپ اپنوں کے پاس پہنچ جائیں گے۔''

اس دوشیزہ نے باقی کی چھ گوٹیاں شہزادے کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے کہا۔

''اب آپ دیر مت کیجیے شہزادے کیونکہ وہ ظالم انسان مضطرب ہورہا ہے کہ کہیں آپ پانی میں ڈوب تو نہیں گئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ڈول کو اوپر کھینچ لے اس سے پہلے ہی آپ ڈول میں براجمان ہو جاؤ۔''

''میں آپ کا بہت مشکور ہوں، اے میری محسن کہ آپ ایک ظالم انسان سے مجھے نجات دلانے میں مدد کررہی ہیں۔'' شہزادے نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

جواباً وہ دوشیزہ مسکرادی۔ اس کے دیکھا دیکھی اس کے ساتھ والی لڑکیاں بھی مسکرادیں۔ شہزادہ دوڑ کر ڈول میں براجمان ہوگیا۔ سب نے ہاتھ ہلا کر اسے الوداع کیا۔ جواب میں شہزادے نے بھی ہاتھ ہلا کر ان کا جواب دیا۔ عین اسی لمحے ڈول اوپر کی طرف اٹھنے لگا اور ایک بار پھر شہزادے نے آنکھیں موندلیں۔

☆......☆......☆

علی زمان سوداگر خوشی سے پھولے نہ سما پارہا تھا۔ شہزادے کو ساتھ لیے وہ راجہ بھوج کی سلطنت میں داخل ہوا تو اس نے پہلی بے وقوفی یہ کی کہ پہلے کی طرح اس نے شہزادے کے منہ پر کالک نہ ملی۔ جیسے ہی وہ بادشاہ کے محل کے پاس پہنچا محافظوں نے شہزادے کو پہچان لیا۔ اس وقت علی زمان سوداگر کو گرفتار کرلیا گیا۔

علی زمان اس آفت کے لیے قطعاً تیار نہ تھا۔ اس کے تو وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اپنے پیروں پر کلہاڑی مار رہا ہے۔ شہزادے کے مل جانے کی خبر محل میں تو کیا پوری سلطنت میں جنگل میں آگ کے جیسے پھیل گئی۔

لوگ جوق درجوق راجہ بھوج اور رانی بھنبتی کو مبارکباد دینے کے لیے جمع ہونے لگے۔ دوسری طرف راجہ بھوج نے علی زمان سوداگر کو سمندر میں پھینکوادیا۔ کافی دیر تک وہ ہاتھ پیر چلاتا رہا لیکن سمندر کی موجیں اسے بہا کر دور لے گئیں۔ جلد ہی ایک بڑے مگرمچھ نے اسے دیکھ لیا اور اس کی طرف لپکنا شروع کردیا۔ علی زمان سوداگر نے مگرمچھ کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ لیا تھا۔ لیکن اب اس کے ہاتھ پیر شل ہوچکے تھے۔ اس کے اندر سکت باقی نہ بچی تھی کہ وہ اس مگرمچھ سے خود کو بچا پائے۔

''میں نے کہا تھا ناں کہ جلد ہی ہمارا بیٹا ہمارے پاس ہوگا کیونکہ میرا دل اس بات کو تسلیم کرنے سے انکاری تھا کہ میرا لخت جگر ابدی نیند سو گیا ہے۔'' راجہ بھوج نے شہزادے دھوج کو سینے سے چپکاتے ہوئے رانی بھنبتی کی طرف دیکھ کر کہا۔

''آپ نے ٹھیک کہا تھا کہ ہمارا بچہ ہم سے ضرور ملے گا۔ میں بھگوان کا شکرادا کرتی ہوں۔ میں اب کالی ماتا اور بھگوان کی مورتیوں کے چرنوں میں تیل کے دیے جلاؤں گی۔'' رانی بھنبتی نے خوشی سے پھولے نہ سماتے ہوئے کہا۔

''بالکل نہیں۔'' راجہ بھوج نے اس کی بات سن کر غصے سے کہا۔

''ہم سلطنت کے غریبوں کو کھانا کھلائیں گے۔ ہمارا بچہ ان بتوں کی کرپا سے نہیں بلکہ ہم سے محبت کرنے والی ہماری عوام کی دعاؤں سے دوبارہ ہمیں ملا ہے۔''

راجہ بھوج کی بات سن کر رانی بھنبتی نے چپ سادھ لی۔ وہ راجہ بھوج سے بحث نہیں کرنا چاہتی تھی۔

کہتے ہیں کہ راجہ بھوج اور شہزادے دھوج نے اکٹھے ہی دولت اسلام کو سمیٹا تھا۔ پہلے تو رانی بھنبتی نے ان سے اختلاف کیا لیکن جب اسلام کی کرشمہ سازیاں دیکھیں تو بے تاب ہوگئی۔ اور راجہ بھوج نے اسے کلمہ پڑھا کر مسلمان کیا۔

راجہ بھوج نے اسلام قبول کرنے کے بعد اپنی رانی بھنبتی کا نام زینب بی بی جبکہ بیٹے کا نام نگاہ مصطفیٰ رکھا۔ جبکہ عالم دین خیرالدین سرکار نے راجہ بھوج کا نام اللہ دتہ رکھا۔ راجہ بھوج کو یہ نام شروع سے بہت پسند تھا۔ جب خیرالدین سرکار نے اس کا نام اللہ دتہ رکھا تو خوشی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

دھڑکتا دل

فلک زاہد۔ لاہور

کیا یہ ممکن ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایک طویل عرصہ گزرنے کے باوجود آج بھی ریلی کورٹ سٹی ایم ڈی میں ہارٹ بیٹ بیرج پر کھڑے ہوں تو قدموں میں دل دھڑکنے کی واضح اور صاف آواز سنائی دیتی ہے۔

دل کو مسوستا ہوا ایک دل کا عجیب وغریب شاخسانہ، دل والوں کے لئے انوکھا تحفہ

کچھ تو ضرور تھا جسے جان اندر ہی اندر بڑی شدت سے محسوس کررہا تھا اور بیلا اپنی جگہ خوش تھی..... بہت ہی زیادہ خوش..... بقول جان کے کوئی بھی عورت اپنے شوہر سے اتنی خوش اور وفادار نہیں ہوتی جتنی بیلا آج کل تھی۔ ہر رات کھانے کی میز پر جان کو گرما گرم اور مزیدار کھانا کھانے کو ملتا..... یہاں تک کہ اکثر اوقات اس نے برتن دھوتے ہوئے بیلا کو گنگناتے ہوئے بھی سنتا تھا..... ”کیا کوئی عورت برتن دھوتے ہوئے بھی اس قدر خوش ہوسکتی ہے؟؟“

جان نے اپنے طور طریقے سے ہر طرح کی جانچ پڑتال کی مگر وہ بیلا کے متعلق ایسا کچھ نہ سن سکا جو خفیہ عشق یا کسی سے وقتی میل جول کی جانب اشارہ کرتا ہو۔ اس نے مقامی علاقے کے تمام لڑکوں کے بارے میں چھان بین کی۔ مگر ایسا کوئی نہیں تھا جس پر شک کا شبہ تک کیا جاتا۔ اسی پر بس نہیں ہوا بلکہ اس نے مقامی علاقے کے سبزی والے اور اپنے گھر دودھ لانے والے پر بھی شک کرنے سے گریز

نہیں کیا کیونکہ کسی بھی طرح سے اس کی تسلی نہیں ہو رہی تھی اور وہ ہر حال میں اپنے ذہن میں ابھرتے شک کی تردید یا پھر تصدیق چاہتا تھا۔

دن بہ دن جیسے وہ پاگل ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی زندگی ہر آنے والے وقت کے ساتھ مزید الجھتی جائے گی۔ مرد ہونے کے باعث بیلا کو اس قدر خوش دیکھ کر اس کا شک جڑ پکڑتا جا رہا تھا۔ طرح طرح کے عجیب و غریب خیالات اس کے ذہن میں سر اٹھاتے رہتے تھے، جنہیں وہ چاہ کر بھی اپنے ذہن سے جھٹک نہیں پاتا تھا۔

بہرحال جب پہلی بار جان نے اس دودھ والے کو دیکھا جو صبح صبح ان کے گھر دودھ دیا کرتا تھا تو اسے دیکھ کر جان کو مایوسی کے سوا کچھ نہ ملا...... دودھ والا بیچارہ سر سے پاؤں تک یوں معلوم ہوتا تھا جیسے نجانے کتنی صدیاں پہلے پیدا ہوا ہو۔

خیر جان نے اپنا سر جھٹکا اور بازار سے سبزیاں لانا بھی خود شروع کردیں۔ اس نے تمام سبزیوں کے اسٹور کھنگال ڈالے مگر وہاں بھی اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا...... ہر شخص یا تو اسی دودھ والے کی طرح بوڑھا تھا یا پھر ایسا تھا گویا ابھی بھی ڈائپرز میں ہو۔

بیلا نے جان کی اس تبدیلی کو محسوس تو کیا مگر کچھ خاص دھیان نہ دیا۔ دن پر دن گزرتے رہے اور ان تمام دنوں میں جان کا شک جوں کا توں برقرار رہا کیونکہ بیلا ہنوز بہت خوش تھی۔ جان مسلسل اس پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھا۔

ایک ماہ بعد جان اپنے باس کے ساتھ اس کے گھر کے گیراج میں کام کروا رہا تھا۔ جب ہی اس نے اپنے باس کو ہینک سے بات کرتے ہوئے سنا جو کچھ دنوں بعد ان کے گھر آ رہا تھا۔ بیلا کے اسکول کے زمانے کا ہینک دوست تھا۔ جان کا ماتھا ٹھنک گیا۔ اب اس کی سمجھ میں ساری بات آگئی تھی کہ کیوں بیلا آج کل اتنی خوش تھی۔ ضرور اس کے والدین نے اسے ہینک کے آنے کی اطلاع دی ہوگی اور وہ اسی خوشی میں اس کے ساتھ بھاگ جانے کی منصوبہ بندی میں ہوگی۔

غم و غصے سے جان کا برا حال ہوگیا۔ بقول جان کے وہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ بیلا سچ میں اس کی پیٹھ پیچھے چھرا گھونپ رہی تھی، اس کے شک کی تصدیق ہوگئی تھی، بیلا نے جان کی وفاداری اور محبت کو گالی دی تھی جو جان سے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ہر حال میں بیلا کو اس کے کیے کی سزا دینا چاہتا تھا۔

آج رات جان کسی شکاری بھیڑیے کی طرح کچن میں ٹہلتا ہوا بیلا کا انتظار کر رہا تھا...... بیلا نجانے کب سے گھر میں موجود نہیں تھی۔ آج جب جان اپنے باس کے گھر سے لوٹا تو بیلا کو گھر میں موجود نہ پا کر اس کے اندر بھڑکتی آگ کے شعلے مزید تیز ہو کر بھڑک رہے تھے اور اب جان تقریباً آدھے گھنٹے سے پاگلوں کی طرح اس کا انتظار کر رہا تھا...... ادھر سے ادھر ٹہلتے ہوئے بار بار اس کی نگاہیں اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کی جانب اٹھ رہی تھیں جس پر گزرتا ایک ایک لمحہ جان کو سانپ بن کر ڈس رہا تھا۔ اس وقت وہ کس قدر اذیت میں تھا۔

یہ تو وہی جان سکتا ہے جس کی بیوی نے اس کے ساتھ بیوفائی کی ہو۔ جان کی حالت ایک شکاری بھیڑیے کی سی تھی جو کسی کے بھی سامنے آنے پر اسے چیر پھاڑ دیتا ہے۔ بالآخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوگئیں اور بیلا ہمیشہ کی طرح اپنے چہرے پر خوب صورت مسکراہٹ سجائے گھر میں داخل ہوئی۔ وہ بے بی پنک کلر کی فراک میں ملبوس بہت دلکش لگ رہی تھی۔ جان کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے جب وہ کچن میں آئی تو وہاں جان کو اپنا منتظر پایا۔ جان نے جو اس کے لبوں پر پھیلی دلنشیں مسکراہٹ دیکھی تو اس کا انگ انگ جیسے جھلس کر رہ گیا۔

بیلا ابھی ابھی دعا کر کے چرچ سے واپس آئی تھی لہٰذا اسے کچھ بھی معلوم نہ تھا کہ جان کے دماغ میں کیا چل رہا ہے اور اس نے اس کی قسمت کے متعلق کیا فیصلہ کر رکھا ہے۔ بیلا نے جان کو اپنی جانب غصے سے یوں گھورتا پایا تو اس کے چہرے پر پھیلی خوب صورت مسکراہٹ غائب ہوگئی اور وہ نرمی سے جان سے مخاطب ہوئی۔ ''کیا بات ہے جان؟''

جان فیصلہ کر چکا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے بیلا کا چہرہ

اس کا وجود اور اس کی مسکراہٹ اب جان سے برداشت سے باہر ہوگئی تھی۔ اس نے شیلف سے تیز دھار گوشت کاٹنے والی چھری اٹھائی اور حقارت سے بیلا سے بولا۔ ”تم نے میرے سینے سے میرا دل نکالا ہے، اب میں تمہارے سینے سے تمہارا دل نکال کر پھینک دوں گا۔“

بیلا کو جان کے یہ الفاظ کچھ سمجھ میں نہ آئے مگر وہ سہم ضرور گئی کیونکہ وہ جان کے چہرے کے بگڑے تیوروں سے اس کے خطرناک ارادوں کا اندازہ کرچکی تھی۔ ”یہ کیا کررہے ہو جان؟“ بیلا نے خوفزدہ لہجے میں ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

”وہی کررہا ہوں جو مجھے بہت پہلے کردینا چاہئے تھا۔“ جان نفرت سے کہتا ہوا ایک قدم آگے بڑھا جبکہ بیلا ایک قدم پیچھے ہٹی۔

”میں بے قصور ہوں، میں نے کچھ نہیں کیا۔“ آنسوؤں کا سیلاب اب بیلا کی آنکھوں سے بہہ رہا تھا۔ وہ بالکل نہیں جانتی تھی کہ اسے کس بات کی سزا دی جارہی ہے۔

جان بیلا کے آنسوؤں سے بے نیاز اس کی جانب قدم بڑھاتا جارہا تھا۔ وہ انتقام میں پاگل ہوچکا تھا۔ اسے اگر کچھ دکھائی دے رہا تھا تو صرف اور صرف بیلا کی بے وفائی۔

بیلا نے دس سال کی رفاقت کا یہ صلہ دیا تھا تو وہ اسے کیسے معاف کردیتا؟ اس نے اس کے دل کو کرچیوں میں بدل دیا تھا، تو وہ کیوں سینے میں آزادی کے ساتھ اس کا دل دھڑکنے دیتا؟ کتنا چاہا تھا جان نے کہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہے، مگر بیلا نے کیا دیا، صرف دھوکہ؟ تو وہ جان کیسے بخش دیتا بیلا کو؟...... جان آہستگی سے آگے قدم بڑھاتا جارہا تھا جبکہ بیلا روتے ہوئے پیچھے کو ہٹتی جارہی تھی۔ اس کی آنکھیں جان کی آنکھوں میں پیوست تھیں جہاں وہ اپنی موت صاف دیکھ سکتی تھی۔ جان کے نزدیک بیلا کے آنسو پچھتاوے کے نہیں تھے بلکہ موت کے خوف سے یا پھر ہینک کے ساتھ زندگی نہ گزارنے کے دکھ سے تھے۔ ہینک کے معاملے میں جان نے کوئی تصدیق تو نہ کی تھی۔ مگر بقول جان کے اس کو پورا یقین تھا کہ بیلا کی خوشی کا سبب ہینک ہی ہے۔

بیلا نے کچن سے بھاگنا چاہا مگر جان نے جھٹ سے اسے دبوچ لیا۔ وہ چیخنا چاہتی تھی مگر جان نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ جان کی گرفت مضبوط تھی۔ بیلا خود کو کسی بند پنجرے میں قید پرندے کی طرح جان کی گرفت سے آزادی حاصل کرنے کی ناکام کوشش کررہی تھی مگر جان نے ایک لمحے کی بھی تاخیر کئے بغیر تیز دھار نوکیلی چھری بیلا کے ٹھیک دل میں اتار دی۔ بیلا کی آنکھیں ساکت ہوگئیں اور ایک آخری ہچکی کے ساتھ اس کی زندگی کا سفر تمام ہوگیا۔ اس کا بے جان جسم فرش پر پڑا تھا جس میں سے بہتا سرخ خون تیزی سے فرش پر تالاب بناتا جارہا تھا۔

”تمہیں کیا لگتا تھا کہ مجھے پتہ نہیں لگے گا کہ تم میری پیٹھ پیچھے کیا گل کھلا رہی ہو...... جہنم میں جاؤ...... یہی تھا تمہارا مقدر۔“ جان نے غصے سے کہہ کر بیلا کے منہ پر تھوک دیا اور اس کی زندگی سے بے نور آنکھیں اپنی ہتھیلی سے بند کردیں، جان کا کلیجہ اب بھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا، وہ ہنوز انتقام کی آگ میں بھڑک رہا تھا، وہ بیلا کو اس سے بھی بدترین موت سے ہمکنار کرنا چاہتا تھا۔

جان نے تیز دھار چھری دوبارہ اٹھائی اور اس کی مدد سے بیلا کا دل سینے سے باہر نکال لیا، گاڑھے سرخ رنگ کا وہ دل جان کی ہتھیلی پر جیسے دھڑک رہا تھا، اس میں سے ابھرتی ”دھک دھک“ کی آوازیں وہ صاف سن سکتا تھا۔ جان اس دھڑکتے دل کو لے کر گھر کے پچھلے دروازے سے باہر نکل گیا۔ اب اس کا رخ بیرج کی طرف تھا جو اس کے گھر سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔

رات گہری تاریک تھی، ہر طرف ہو کا عالم تھا، دور دور تک کسی ذی روح کا نام ونشان نہیں تھا، جان نے ایک طائرانہ نگاہ اپنے گردونواح میں ڈالی اور چاروں طرف سے مطمئن ہونے کے بعد بیلا کے دھڑکتے دل کو بیرج کے نیچے بہتے پانی میں پھینک دیا۔

چھپاک کی آواز کے ساتھ دریا کا پانی بیلا کے دل کو بہا لے گیا۔

جان تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا واپس آیا اور بیلا کے مردہ جسم کو پلاسٹک کی بڑی تھیلی میں ڈال کر بہ مشکل

اپنے گیراج میں کھڑی گاڑی تک آیا۔ پسینے کی ننھی ننھی بوندیں جان کے چہرے کو بھگو رہی تھیں۔ وہ ہر دو منٹ بعد اپنے گردونواح کا جائزہ بھی لیتا جارہا تھا۔ اس نے بہ مشکل بیلا کے بھاری وجود کو اٹھا کر گاڑی کی ڈگی میں ڈالا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ کچھ ہی لمحوں میں اس کی گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ جان کے ہاتھ اسٹیئرنگ ویل پر تھرک رہے تھے جبکہ پاؤں ایکسیلیٹر پر تھے۔ ایکسیلیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھتا ہی جارہا تھا اور گاڑی ہوا سے باتیں کررہی تھی۔

آبادی بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ یہ ایک طویل ترین سڑک تھی۔ جس کے دونوں اطراف جنگل تھا۔ سڑک تاحد نگاہ ویران تھی۔ آسمان پر سے چاند اور ستارے غائب تھے۔ گہرا سناٹا اور خاموشی ہر چیز پر مسلط تھی۔ جان وقتاً فوقتاً اپنے چہرے پر بہتے پسینے کے قطروں کو ٹشو پیپر کی مدد سے صاف کرتا جارہا تھا۔ جتنی تیز رفتاری سے گاڑی اپنا سفر طے کررہی تھی۔ اسی تیز رفتاری سے جان کا ذہن کام کررہا تھا۔

بالآخر جان نے ایک جگہ سڑک کی سائیڈ پر گاڑی کو بریک لگائے، گاڑی رک گئی اور جان گاڑی سے باہر آ گیا۔ اس نے ڈگی سے بیلا کی لاش کو اپنے کندھوں پر اٹھایا اور چلتا ہوا خاردار جھاڑیوں کے جھنڈ کے پاس آیا۔ جھاڑیوں کے بیچ بیلا کی لاش کو چھپادیا اور ایک بھاری پتھر کی مدد سے اس کے چہرے پر زوردار ضرب لگائی تاکہ بیلا کا چہرہ شناخت کے قابل نہ رہے۔

جان کا کام ہوچکا تھا۔ اس نے اپنے چاروں طرف نگاہ دوڑائی ہر طرف ویرانے کے سوا کچھ نہ تھا، وہ تیزی سے چلتا ہوا گاڑی تک آیا اور اس میں بیٹھ کر واپس گھر کی جانب گاڑی دوڑانے لگا۔ کچھ ہی لمحوں میں جان کی گاڑی گیراج میں کھڑی تھی اور خود وہ کچن کے فرش پر سے ایک گیلے کپڑے کی مدد سے بیلا کے خون کے دھبے صاف کررہا تھا، اسے یہ سب کرتے ہوئے تقریباً ایک گھنٹے سے زائد لگ گیا تھا، مگر وہ خوش تھا اپنے پہلو سے ایک کانٹے کو نکال کر بقول اس کے ایک بدکار کو مار کر زمین پاک کردی تھی جس پر اسے خود پر فخر محسوس ہورہا تھا۔ اس کے نزدیک اس نے جو کیا تھا ٹھیک کیا تھا، اسے غلط کہنا گویا گناہ تھا، ایسی عورتوں کو جینے کا کوئی حق نہیں ہوتا جو اپنے شوہروں کے ساتھ بے وفائی کرتی ہیں۔

اس تمام کام سے فراغت پانے کے بعد جان نے سکون بھری سانس لی جو اس سے پہلے یعنی جب سے اپنے ذہنی خلفشار میں مبتلا تھا اس وقت سے شاید ہی اسے ایسی آئی ہوگی...... اس کے سینے پر کسی قسم کا کوئی بوجھ نہیں تھا۔ وہ ایک دم مطمئن اور پرسکون ہوگیا تھا۔

اگلی صبح جان نے نہایت احتیاط سے بیلا سے ملتی ہوئی رائٹنگ میں کئی خطوط لکھے جنہیں اس نے اپنے نام تو کچھ اس کے والدین کے نام ارسال کیے، خطوط میں درج تھا کہ ''میں ایک آزاد اور خود مختار لڑکی ہوں مجھے اپنی زندگی جینے کا پورا حق ہے، لہٰذا میں اپنی مرضی سے اپنے شوہر اور اپنے گھر کو چھوڑ کر اپنے کسی پرانے دوست کے ساتھ بھاگ رہی ہوں۔ میرے اس فیصلے پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔''

یہ سارا کام جان نے نہایت ہنرمندی اور صفائی سے کیا تھا کہ کسی کو شک تک کا گمان نہیں ہوسکتا تھا۔ چند دنوں میں آس پاس کے پڑوسیوں اور مقامی لوگوں میں یہ بات خاصی مشہور ہوگئی کہ بیلا اپنے شوہر سے چھپ کر کسی اور سے پیار کی پینگیں بڑھا رہی تھی اور اب وہ اپنے شوہر کو چھوڑ کر اس شخص کے ساتھ فرار ہوچکی ہے۔

جان کے گھر مہمانوں کی قطار لگ گئی رات دن لگاتار اس کے قریبی دوست اور ہمدرد اسے تسلیاں دینے اور اس کا دل بہلانے آتے رہے اس پورے ڈرامے میں جان نے کسی مظلوم جیسی صورت بنائے رکھی، وہ نہ کھانے کے برابر کھانا کھاتا تاکہ اس پر نقاہت اور افسردگی چھائی رہے، گویا وہ واقعی ہمدردیوں کا حقدار تھا، مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں تھا کہ اسے واقعی بیلا کی بے وفائی سے ٹھیس پہنچی تھی لیکن کیا صحیح تھا کیا غلط یہ جاننے میں شاید اس سے بھول ہوگئی تھی۔

خیر ٹھیک ایک ہفتے بعد ایک شام جان اکیلا ہی اس بیرج کی جانب چلا جارہا تھا۔ جس کے نیچے بہتے پانی میں اس نے بیلا کا دھڑکتا دل پھینکا تھا۔ جان کی سوچوں کا محور بیلا ہی تھی۔

بقول جان کے ''وہ اپنی موت کی خود ذمہ دار تھی اور جان نے بیلا کو زندگی سے محروم کرکے کچھ غلط نہیں کیا تھا'' انہی سوچوں میں وہ بیرج تک آن پہنچا۔ شام کی سرمئی چادر نے پورے آسمان کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ بیرج کے سامنے کی جانب ڈوبتے سورج کا منظر بہت ہی دلفریب تھا۔

جان اپنی کہنیاں بیرج کی گرل سے ٹکائے نیچے بہتے پانی کو دیکھنے میں محو تھا کہ اس نے اپنے قدموں کے نیچے تھرتھراہٹ محسوس کی تو اس نے بے اختیار اپنے قدموں کی جانب دیکھا تو اسے پورے کا پورا بیرج لرزتا ہوا محسوس ہوا۔

جان گھبرا گیا...... اسی لمحے ہوا کے دوش پر لہراتی ہوئی آواز جان کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ ''دھک دھک'' جان ساکت رہ گیا وہ اس آواز کو بخوبی پہچانتا تھا۔ وہی آواز تھی جو بیلا کے دل سے ابھری تھی جب جان نے بیلا کے دھڑکتے دل کو اپنی مٹھی میں پکڑا تھا۔ ''دھک دھک'' دھڑکتے دل کی آواز ایک بار پھر ابھری اس بار آواز قدرے اونچی تھی کہ جان بوکھلا گیا کہ کہیں آس پاس کے لوگ یہ سن کر یہاں نہ آجائیں۔

اب کی بار ''دھک دھک'' کی آوازیں لگاتار ابھرنے لگیں جو کسی طور بھی جان کی جان چھوڑنے کو تیار نہ لگتی تھیں۔ جان کو اپنے کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ اس نے بے اختیار اپنے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ کر گھر کی جانب دوڑ لگادی۔ وہ دیوانہ وار بھاگتا ہوا گھر آیا مگر یہاں بھی جان، دل کی دھڑکنوں سے پیچھا نہ چھڑا سکا۔ مسلسل ابھرتیں ''دھک...... دھک'' کی آوازیں اسے پاگل کیئے دے رہی تھیں۔ اسے اپنا دل کن پٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ سب اس کے ساتھ کیا اور کیوں ہو رہا ہے، اب تو جان کو اپنے گھر کے در و دیوار بھی بیلا کی دل کی دھڑکنوں کی آواز سے لرزتے محسوس ہو رہے تھے۔

بیلا چیخ چیخ کر اپنی بے گناہی کا ثبوت دے رہی تھی۔ جان کی برداشت جواب دیتی جارہی تھی۔ وہ اس منحوس آواز سے جان چھڑانے کے لئے حلق پھاڑ کر چلایا۔ اس نے اپنے ذہن سے بیلا کے خیال کو ہٹانے کی کوشش کی مگر وہ ایسا کرنے میں ناکام رہا اور پھر اس نے ایک فلک شگاف چیخ ماری اور بے اختیار ایک بار پھر گھر سے باہر بیرج کی طرف بھاگتا چلا گیا۔

جتنی تیزی سے وہ بھاگتا جارہا تھا اسی تیزی سے دھڑکنوں کی آوازیں بلند ہوتی جارہی تھیں۔

بالآخر وہ بیرج پر پہنچا اور اس کی آہنی گرل کو تھام کر نیچے بہتے پانی کی طرف چہرہ کرکے نفرت سے چلایا۔ ''لعنت ہو تم پر بیلا'' اسی لمحے ''دھک دھک'' کی اس قدر بلند آواز ابھری کہ پورے کا پورا بیرج لرز کر رہ گیا۔

جان اپنا توازن برقرار نہ رکھنے کے باعث بے اختیار آہنی گرل پر جھک گیا۔ اب اس کا سر سیدھا نیچے بہتے پانی کی جانب تھا اور ٹانگیں ہنوز برج پر ہی تھیں کہ معاً دھڑکنوں کا طوفان ایک بار پھر اٹھا۔ جس کے باعث پورے کا پورا بیرج تھرتھرا اٹھا اور جان سیدھا بیرج کے نیچے بہتے پانی میں جا گرا۔

چھپاک کی آواز کے ساتھ دریا کی بے رحم لہریں جان کو اپنے ساتھ بہا لے گئیں، اس سے پہلے کہ اسے سنبھلنے کا موقع ملتا، موت اسے اپنی آغوش میں لے چکی تھی۔

اس دن کے بعد سے ایلی کوٹ سٹی ایم ڈی میں واقع اس برج کا نام ''دھڑکتا دل برج'' رکھ دیا گیا۔ کیونکہ بیلا اور جان کی موت کے بعد سے وہ دل آج بھی دل کی دھڑکنوں سے تھرتھراتا ہے اور تھرتھراتا رہے گا۔

قارئین یہ کہانی آس پاس کے مقامی لوگوں میں خاصی مشہور ہے کہ کیوں یہ بیرج دل کی دھڑکنوں کی آواز سے لرزتا ہے۔ اگر آپ بھی یہ جاننا چاہتے ہیں تو ایلی کوٹ سٹی ایم ڈی میں واقع اس ''ہارٹ بیٹ بیرج'' کا دورہ ضرور کیجئے گا، جس پر کھڑے ہوتے ہی آپ کو اپنے قدموں کے نیچے بیرج دل کی دھڑکنوں کی آواز سے لرزتا ہوا دکھائی اور سنائی دے گا۔

انگارے

شہزادہ چاندزیب عباسی

قسط نمبر: 02

دل گرفتہ دل شکستہ ناقابل فراموش ناقابل یقین سے دو چار عجیب و غریب حیرت سے روشناس کراتی تحیر انگیزی میں سب سے آگے خوفناک وادی کے نشیب و فراز میں دندناتی اور ذہن سے محو نہ ہونے والی شاہکار کہانی۔

حیرت وخوف کے گرداب میں غوطہ زن اپنی مثال آپ تحیر انگیز ایڈونچر کہانی

ابرش چیخی۔ ”سلمان یہ بالا ہے اسے پکڑو عفریت کی جان اس کے اندر ہے، اس کے مرتے ہی وہ عفریت بھی ختم ہو جائے گا۔“

یہ سنتے ہی سلمان پنجوں کے بل اچھلا اور فضا میں قلا بازی کھاتے ہوئے ایک ہاتھ سے سیڑھی تھامی اور دوسرے ہاتھ سے اوپر چڑھتے بالا کی ٹانگ پکڑلی تو بالا نے دوسرے پاؤں کی ٹھوکر سلمان کے چہرے پر رسید کی، سلمان نیچے گرنے لگا مگر گرتے گرتے بھی اس نے دوبارہ سیڑھی پکڑی اور تیزی سے بالا کے پیچھے اوپر چڑھنے لگا۔

بالا اوپر چڑھ کر ایک کمرے میں پہنچ چکا تھا اور سرنگ کی طرف لپکا ہی تھا کہ سلمان نے جست لگائی اور پے در پے تین چار گھونسے اس کے چہرے پر رسید کئے۔

بالا نے جب دیکھا کہ سلمان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہے تو وہ بھی اس کے مقابلے پر ڈٹ گیا اور کسی وحشی سانڈ کی طرح سلمان پر ٹوٹ پڑا۔ اس کے ہاتھ ہتھوڑے کی طرح سخت تھے۔ سلمان کو کئی ضربات اپنے جسم پر سہنا پڑیں۔ اور پھر ایک موقع پر اس نے بالا کی دونوں ٹانگوں کے بیچ اسٹریٹ کک رسید کی تو وہ تکلیف کی شدت سے رکوع کے انداز میں جھکا تو سلمان نے اس کے چہرے پر گھٹنا رسید کیا وہ چیختا ہوا پشت کے بل گرا بالا کے ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔

سلمان پنجوں کے بل فضاء میں اچھلا اور بالا کے جسم پر گرتے وقت اپنے دونوں گھٹنے موڑ لئے۔ بالا اذیت کے مارے چیخا اور ذبح کئے ہوئے جانور کی طرح تڑپنے کے بعد ساکت ہو گیا۔

ادھر انسپکٹر عادل پولیس کی بھاری نفری کے ساتھ عمارت کے دروازے پر پہنچا ہی تھا کہ اچانک ایک طرف سے وہ عفریت عمارت کی طرف آتا دکھائی دیا پولیس اہلکاروں نے پوزیشن سنبھال لی اور فائر کیا گئی گولیاں عفریت کے جسم میں پیوست ہو گئیں اور اس کے جسم کو جھٹکا سا لگا۔ لیکن اس کے باوجود وہ پولیس اہلکاروں تک جا پہنچا اور چشم زدن میں دو پولیس اہلکاروں کو اپنے ہاتھوں میں کھلونے کی طرح اٹھا کر اس طرح زمین پر پٹخنے لگا جیسے دھوبی، گھاٹ پر کپڑا دھوتے ہوئے کپڑے کو پٹختا ہے۔

پولیس اہلکاروں میں کھلبلی مچ گئی اور ان میں سے کچھ ڈر اور خوف سے بھاگتے چلے گئے جبکہ انسپکٹر عادل سمیت کچھ نے پیچھے ہٹ کر عفریت کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ اور انسپکٹر کے حکم پر فائر کھول دیئے گولیاں لگنے

سے عفریت کے جسم میں بننے والے زخم تیزی سے بھر رہے تھے یہ انسپکٹر کی زندگی کا پہلا ناقابل یقین کیس تھا جب اس کے مقابل کوئی عام انسان نہیں عفریت جیسی ماورائی قوت تھی۔

پھر اچانک عفریت بھیانک انداز میں چیختا ہوا گرا اور ساکت ہوگیا، یہ وہی وقت تھا جب بالا زیر ہوکر گرا تھا۔ اور سمان گھٹنوں کے بل اس کے جسم پر کودا تھا۔

ادھر بالا کے جسم کو بے حس و حرکت ہوتا دیکھ کر سمان نے رسی کی سیڑھی چڑھتی ابرش کا ہاتھ تھام کر اسے اوپر آنے میں مدد دی وہ سمان سے لپٹ کر رونے لگی۔

اسی وقت بالا کے جسم میں جنبش ہوئی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا بلاشبہ وہ زبردست اسٹمنا کا مالک تھا اس سے پہلے کہ سمان کو اس کا احساس ہوتا وہ سرنگ میں دوڑتا ہوا کنوئیں میں جا پہنچا سمان کو جب تک پتہ چلا بالا رسی کی سیڑھی پر نصف راستہ عبور کر چکا تھا۔ وہ سیڑھی چڑھتا ہوا منڈیر پر جا پہنچا۔

ادھر بالا کے اٹھتے ہی عفریت بھی اٹھ کھڑا ہوا اور دو تین مزید پولیس اہلکاروں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

پولیس اہلکار جان چکے تھے کہ عفریت پر کسی بھی قسم کا آتشیں ہتھیار اثر نہیں کرتا اس لئے اب وہ ادھر ادھر جان بچانے کے لئے بھاگ رہے تھے جبکہ انسپکٹر عادل ایک طرف حیران و پریشان کھڑا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اس صورتحال میں کیا کرے۔

ادھر سمان منڈیر پر پہنچا تو بالا عفریت کی طرف دوڑ لگا چکا تھا۔ سمان نے پنڈلی سے بندھا خنجر نکالا اور عفریت کی طرف دوڑتے بالا کو اس کا نام لے کر للکارا، بالا بھاگتے ہوئے لمحہ بھر کے لئے رکا اور جیسے ہی مڑ کر دیکھا سمان نے اس کا نشانہ لے کر خنجر پھینک دیا جو سرسراتا ہوا بالا کے عین دل کے مقام پر پیوست ہوگیا وہ بنا کوئی آواز نکالے گرا اور ساکت ہوگیا۔

بالا کے مرتے ہی عفریت بھی خود بخود گر گیا۔

انسپکٹر عادل اور دیگر پولیس اہلکار ڈرتے ڈرتے عفریت کی لاش کے قریب پہنچے اور یہ دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا کہ عفریت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔

"جتنی جلدی ہوسکے اس عفریت کی لاش کو آگ لگادو۔" سمان چلایا، اسے ڈر تھا کہ کہیں دوبارہ پرتاب بھوش عفریت کی لاش حاصل کرکے اسے زندہ نہ کردے۔

انسپکٹر کے حکم پر ایک سپاہی پولیس جیپ سے پیٹرول نکال لایا اور عفریت کی لاش پر پیٹرول چھڑکنے کے بعد لائٹر سے آگ لگادی جیسے جیسے عفریت کا جسم جل رہا تھا عجیب سی ناگوار بو پھیلتی جارہی تھی اور سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ عفریت کے جسم میں آگ لگتے ہی بالا کے مردہ جسم میں بھی خود بخود آگ لگ چکی تھی۔

انسپکٹر نے سمان کے شانے پر تھپکی دے کر کہا۔ "تم نے بڑی بہادری سے اس عفریت کا مقابلہ کیا ہے بلاشبہ عفریت کے خاتمے کا کریڈٹ تمہیں جاتا ہے۔"

"نہیں انسپکٹر صاحب یہ جنگ ہم سب نے مل کر جیتی ہے اور برائی کے خاتمے کے لئے طاقت یا ہتھیاروں کی نہیں جذبے کی ضرورت ہوتی ہے۔" سمان نے جواب دیا۔

ابرش بھی کنوئیں سے باہر آچکی تھی۔ عفریت اور بالا کے جلتے ہوئے جسم راکھ میں تبدیل ہوچکے تھے۔ عفریت کے مسکن کا معائنہ کرنے کے بعد انسپکٹر نے ابرش اور سمان کا بیان بھی لیا۔ پولیس اہلکار دو پولیس جیپوں میں آئے تھے، مارے جانے والے پولیس اہلکاروں کی ادھڑی ہوئی لاشیں ایک جیپ کی پچھلی نشست پر ڈال دی گئیں پھر وہ سب جیپ میں سوار ہوگئے۔

عفریت کے ساتھ معرکہ آرائی میں فجر کا وقت ہو چکا تھا دور دراز کی کسی مسجد سے اذان کی آواز آرہی تھی۔ سمان اور ابرش کو گاؤں سے کچھ فاصلے پر اتار کر پولیس جیپیں آگے بڑھ گئیں۔

سمان نے ابرش کی طرف مسکراتی نظروں سے

دیکھتے ہوئے اس کا نرم و گداز ہاتھ تھاما اور آگے بڑھنے لگا ابرش چلتے چلتے اسے بتا رہی تھی کہ ”عفریت جب اسے اپنے مسکن میں لے گیا تو اس پر کیا گزری۔“

ابھی انہیں چلتے ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ وہ ٹھٹک کر رک گئے۔ ان کے سامنے ایک دبلا پتلا پجاری نہ جانے سے کہاں سے نمودار ہو چکا تھا اور انگاروں کی دہکتی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں گویا قہر برسا رہی تھیں۔ ”کون ہو تم؟ اور ہمارا راستہ کیوں روکا ہے؟“ سمن نے پوچھا۔

”میں پرتاب بھوش ہوں پاپی۔ میں ان دنوں کٹھن جاپ کر رہا تھا اسی کارن تم سپھل ہو گئے پرنتو میں تمہیں ایسا شراپ دوں گا کہ تمہاری آتما صدیوں بیاکل رہے گی۔“ اس کی جسامت کی نسبت آواز بھاری اور گونج دار تھی۔

”پرتاب بھوش تم انتہائی ذلیل اور کمینے انسان ہو۔ عفریت جیسے درندے کی وجہ سے نہ جانے کتنی انسانی جانوں کا نقصان ہوا۔ یہ سب تمہاری ہی کارستانی تھی۔ اب خود بھی مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ تاکہ آئندہ پھر تم کوئی شیطانی حرکت نہ کر سکو۔“ سمن غصے سے بولا۔

پرتاب بھوش اس کا جواب سن کر ہکا بکا رہ گیا اس کی آنکھیں ایک لمحے کو پٹ پٹائیں پھر ان میں غصے کی سرخی چھا گئی اس نے حقارت سے سمن کی طرف دیکھا اور کوئی منتر پڑھ کر ان پر پھونکا۔ سمن نے طیش میں آ کر آگے بڑھنا چاہا مگر اس کے قدموں نے چلنے سے انکار کر دیا ایسا لگ رہا تھا کہ زمین نے اس کے قدم جکڑ لئے ہوں۔ ابرش کی حالت بھی اس سے مختلف نہ تھی ان کے چہروں پر خوف و ہراس چھا گیا۔ اور ہاتھ پیر کپکپانے لگے اور حلق خشک ہو گیا۔ ”تم نے اس عفریت کو مار کر میری آتما کو بیاکل کیا ہے مورکھ، اب تم آوارہ کتے کی طرح جھاڑیوں میں پڑے سسکتے رہو گے۔ اور کوئی بھی تم پر دیا نہیں کرے گا۔“ اس کی آواز میں کچھ اس طرح کی کڑک گرج تھی کہ جیسے بہت سی بدروحیں گرج اٹھی ہوں۔

سمن اور ابرش کے چہرے کی رنگت زرد پڑ چکی تھی اور چہرے پر موت کے سائے لہرا رہے تھے۔ انہیں اس بے رحم شیطان صفت شخص سے کسی بھی قسم کی رعایت کی امید نہ تھی پھر سمن چیخنے لگا اور نیچے گر کر پانی سے نکلی مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ وہ اس وقت زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہو چکا تھا اور اس کے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں مفقود ہو چکی تھیں اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اس کے سارے جسم میں آگ لگ چکی ہو۔ جبکہ ابرش کھڑی متوحش نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کا جسم بھی بے حس و حرکت ہو چکا تھا اور قوت گویائی تو جیسے سلب ہو چکی تھی وہ خود کو اس وقت ایک سنگی مجسمہ تصور کر رہی تھی۔ پرتاب بھوش ان دونوں کی بے بسی سے لطف اندوز ہو رہا تھا پھر اس نے کوئی منتر پڑھتے ہوئے سمن کی طرف ہاتھ جھٹکا تو اس کے چاروں طرف دھندی چھا گئی ایسی دھند کہ کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا جب یہ دھند چھٹی تو نہ وہاں پرتاب بھوش تھا اور نہ ہی ابرش، سمن اسی طرح تپتے کیچوے کی طرح زمین پر پڑا تھا۔ ہاں البتہ اس کے جلتے ہوئے جسم کو آرام آ چکا تھا اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو انکشاف ہوا کہ اٹھنا تو درکنار وہ ہلنے جلنے کے قابل بھی نہیں تھا۔ اس کے اعضاء اینٹھ چکے تھے اور پرتاب بھوش کے جادو نے اسے فالج زدہ کر دیا تھا اب وہ ہلنے جلنے اور بولنے چالنے سے قاصر تھا۔ نہ جانے کتنی دیر وہ سردی میں اسی طرح راستے کے بیچ پڑا رہا۔ اس دوران راستے سے گاؤں کے چند کتے بھی گزرتے ہوئے لمحہ بھر کے لئے اس کے قریب رکے تو ڈر اور خوف سے اس کی حالت غیر ہونے لگی اسے یہی دھڑکا لگا کہ کہیں یہ کتے اسے بھنبھوڑ نہ ڈالیں لیکن خیریت گزری وہ اسے سونگھ کر غراتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

کچھ دیر بعد راستے سے گزرنے والے دو کسانوں نے راستے میں پڑا اس کا جسم دیکھا تو قریب آ گئے وہ اسے پہچان چکے تھے یہ ان ہی کے گاؤں کے رہائشی راحیل احمد کا مہمان تھا۔ وہ اسے اٹھا کر گھر لے

گئے۔ وہ راحیل احمد مرحوم کے پڑوسی تھے۔ بریرہ اب تک ابرش کے گھر پر تھی اس کی تنہائی کی وجہ سے گاؤں کی ایک عورت اس کے ساتھ ٹھہری ہوئی تھی۔

سلمان کو اس حال میں دیکھ کر بریرہ کی تو جیسے چیخ ہی نکل گئی اور آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں وہ روتے ہوئے بولی۔ ''سلمان بھائی یہ تمہیں کیا ہو گیا ابرش کہاں ہے؟''

''وہ بے چارا بول نہیں سکتا تھا پھر بھلا کیا جواب دیتا۔'' بے بسی سے اس کے بھی آنسو نکل آئے اس گاؤں میں چھوٹا سا سرکاری اسپتال تھا اسے چارپائی پر ڈال کر اسپتال لے جایا گیا ادھیڑ عمر ڈاکٹر اس کا معائنہ کرنے کے بعد بولا۔ ''اس پر فالج کا سخت ترین اٹیک ہوا ہے میرے خیال کے مطابق اس کا علاج مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے آگے اللہ بہتر جانتا ہے۔''

مقامی لوگ سادہ لوح اور مخلص تھے سلمان کو چارپائی پر پڑے پڑے بیس روز گزر گئے ان بیس پچیس دن میں اسے نرم غذا کھلائی گئی دودھ اور پانی چمچ سے پلایا گیا اس کی دیکھ بھال کا فریضہ بریرہ نے سنبھال رکھا تھا وہ اسے بھائی سمجھتے ہوئے ایک بہن ہی کی طرح خیال رکھ رہی تھی۔ بریرہ نے ان دنوں اپنا سیل فون آف رکھا ہوا تھا اور سلمان کی حالت کے پیش نظر اس کا موبائل بھی آف کر دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے ، سلمان اور عدنان کے گھر پر فی الحال کوئی بری خبر پہنچے۔ اس کا ارادہ تھا کہ سلمان کی صحت یابی پر وہ اپنے اپنے گھر لوٹ جائیں گے اور پھر دیکھی جائے گی۔

ایک روز گاؤں کی مسجد کے پیش امام صاحب سلمان کی تیمارداری کے لئے آئے وہ کچھ دیر تک اس کی آنکھوں میں دیکھتے رہے پھر اس کے جسم کو ٹٹولنے کے بعد بولے۔ ''اس نوجوان پر کالے جادو کا مہلک ترین وار کیا گیا ہے۔ قریبی گاؤں سہالہ میں کچھ دن پہلے ایک اجنبی شخص وارد ہوا ہے گاؤں کے لوگوں کا کہنا ہے کہ اس کی دعا سے بہت سے ضرورت مندوں کی حاجت پوری ہوتی ہے اس شخص کا قیام سہالہ کی محمدی مسجد میں ہے اسے آپ سہالہ لے جائیں اللہ بہتر کرے گا۔''

بریرہ نے گاؤں کے دو نوجوانوں کو ساتھ لئے اور سلمان کو تانگے میں سوار کروا کر سہالہ پہنچ گئی یہاں ایک مقامی شخص سے محمدی مسجد کا پتہ پوچھ کر وہ اس مسجد تک جا پہنچے، اس وقت دن کے دو بج رہے تھے مسجد کے احاطے میں درجنوں لوگ موجود تھے۔ جو باری باری احاطے میں بنے کمرے میں جا رہے تھے سلمان کو احاطے میں لٹا دیا گیا اس کا نمبر سب سے آخر میں تھا پھر ایک شخص کے اشارے پر سلمان کو دونوں دیہاتی نوجوانوں نے اٹھایا اور کمرے میں لے جا کر چٹائی پر لٹا دیا۔

بریرہ کمرے میں داخل ہوئی تو اندر موجود خوبصورت نوجوان کو دیکھ کر چونک پڑی کیونکہ وہ شاہ زین تھا چھوٹی چھوٹی نفاست سے تراشی ہوئی داڑھی اس کے چہرے کے وقار میں اضافہ کر رہی تھی۔ وہ بھی بریرہ کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پھر وہ سلمان کی طرف بڑھا اس کا چہرہ دوسری طرف تھا اس لئے شاہ زین اسے دیکھ نہ سکا تھا اس نے آگے بڑھ کر سلمان کا چہرہ اپنی طرف کیا تو اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

ادھر بریرہ یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی اسے شاہ زین پہلی ہی ملاقات میں اچھا لگا تھا۔ اب دوبارہ ملتے ہی اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور وہ بے خودی سے اسے دیکھتی جا رہی تھی۔

بریرہ کی حالت شاہ زین بے خبر سلمان کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا کچھ دیر بعد وہ اٹھا اور بریرہ کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ ''اس پر جادو کا خطرناک ترین وار کیا گیا ہے اس کے توڑ میں کافی وقت لگے گا اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں آپ کو گاؤں کے کسی گھر میں بھجوا دوں؟''

''نہیں میں یہیں بیٹھوں گی۔'' وہ سلمان سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی جبکہ شاہ زین نگاہیں جھکائے کمرے سے باہر نکل گیا کچھ دیر بعد اس کی واپسی ہوئی تو اس کے ہاتھ میں کسی درخت کی پتلی سی ٹہنی تھی۔ جسے اس نے دونوں کناروں سے تھوڑا تھوڑا چھری سے کاٹا اور قرآنی

آیات کا ورد کرنے لگا۔

بریرہ سر جھکائے بیٹھی تھی البتہ وہ گاہے بہ گاہے نظر اٹھا کر شاہ زین کی طرف دیکھتی اور پھر نظریں جھکا لیتی۔ جبکہ شاہ زین قرآنی آیات پڑھتے ہوئے ٹہنی کا ایک سرا اس کے دائیں پاؤں سے پھیرتا ہوا ناف تک لایا۔ پھر وہاں سے قطع کرتا ہوا سینے تک پہنچا اور پھر گردن پر لے آیا۔ پھر گردن سے دوبارہ ناف تک ٹہنی پھیری اور پھر دائیں ٹانگ کے بعد بائیں ٹانگ پر ٹہنی پھیرتے ہوئے ٹہنی کو توڑ کر دو ٹکڑے کر دیا اس کے بعد ایک بار پھر اسی طرح اس کے پورے جسم پر ٹہنی پھیر کر عمل پڑھتے ہوئے ٹہنی کے مزید دو ٹکڑے کر کے ایک طرف رکھ کر آنکھیں بند کرنے کے بعد قرآنی آیات پڑھتے سلمان کی آنکھوں پر پھونکا اور اس کے ہونٹوں پر شہادت کی انگلی پھیری۔

سلمان کو اپنے جسم میں تبدیلی کا احساس ہوا تو اس نے اپنے ہاتھ پیر ہلائے۔ ''شاہ زین بھائی میں بول سکتا ہوں۔'' وہ چلا کر بولا اور اٹھ کر شاہ زین سے لپٹ گیا تو شاہ زین اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے مسکرا دیا۔

سلمان نے اس سے الگ ہو کر بریرہ کو تشکر آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ وہ اس کی نگاہوں کا مفہوم سمجھ کر مسکرا دی۔ ''کب تک کھڑے رہو گے اب بیٹھ بھی جاؤ۔'' شاہ زین نے ایک طرف بیٹھتے ہوئے کہا۔

وہ شاہ زین کے قریب جا بیٹھا اور بولا۔ ''میں بہت بدقسمت ہوں میں اس عفریت کو تو مارنے میں کامیاب ہو گیا تھا مگر اپنے مخلص ساتھیوں سے بھی محروم ہو گیا۔'' سلمان نے اسے برفانی پہاڑ کے غار سے واپسی کے بعد کی روداد سنا ڈالی۔

''اس کا مطلب ہے۔ پرتاب بھوش اب تک زندہ ہے۔'' شاہ زین بڑبڑایا۔ اور دونوں ہاتھ اپنے گھٹنوں پر دھر کر کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ اور پھر بولا۔ ''سلمان بہت برا ہوا۔ وہ شیطان پرتاب بھوش اپنے جاپ میں کامیاب ہونے کے بعد بہت طاقتور ہو چکا ہے۔ اور تم اس لئے اس عفریت کو با آسانی مارنے میں کامیاب ہو گئے کہ پرتاب بھوش ان دنوں جاپ میں مصروف تھا۔ وہ تمام حالات سے بخوبی واقف تھا لیکن اگر جاپ ادھورا چھوڑتا تو اس کی جان کو بھی خطرہ تھا اس نے جاپ کے ساتھ ساتھ کچھ خطرناک آتما اپنے قابو میں کر لئے ہیں۔ ان آتماؤں کا تعلق کالے قبیلے سے ہے اور ابرش ان دنوں ان آتماؤں کے قبضے میں ہے، پرتاب بھوش آنے والی نوچندی کی رات کو ابرش کو کالی کے قدموں میں بلی چڑھا دے گا۔ اس طرح اس کی شیطانی طاقتوں میں مزید اضافہ ہو گا اور تم سے انتقام کا مقصد بھی پورا ہو جائے گا۔''

سلمان سسک پڑا۔ ''کچھ کرو شاہ زین بھائی ابرش میری زندگی کا حاصل ہے، میں اس کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔''

''گھبراؤ نہیں۔ اللہ بہتر کرے گا، ویسے بھی ابھی نوچندی جمعرات میں چھ دن باقی ہیں ابھی تو رات ہونے والی ہے انشاء اللہ کل صبح سے ہم ابرش کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے۔'' شاہ زین نے اسے تسلی دی۔

''شاہ زین تم نے غار میں ہمیں اپنی روداد سنائی تھی اس میں تم نے بتایا تھا کہ پرتاب بھوش کی عمر اس وقت تقریباً سو سال سے زائد تھی اب سینکڑوں برسوں بعد بھی وہ زندہ ہے؟ اور پھر وہ عفریت جو منچو کے ہاتھوں سینکڑوں برس پہلے ہلاک ہوا تھا یہاں کیسے آ گیا؟'' بریرہ نے پوچھا۔

شاہ زین نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر اپنی طرف دیکھتے پا کر نظریں جھکا لیں۔ ''جادو برحق ہے قرآن پاک میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔ جادو کرنے اور کرانے والے دونوں پر لعنت کی گئی ہے اور یہ گناہ پرتاب بھوش کی طویل عمر شیطان اور کالے جادو کی وجہ سے ہے۔ اس جیسے شکتی شالی جادوگر کے لئے عفریت کو زندہ کرنا کوئی مشکل نہ تھا۔ لیکن اس کے لئے اسے مناسب آدمی کی تلاش تھی جو اسے برسوں بعد بالا کی صورت میں ملا۔ اور پھر اس نے جادو کے ذریعے عفریت کی محفوظ کی گئی لاش ظاہر کر لی۔

سمان نے سب سے اچھا کام یہ کیا کہ عفریت کی لاش کوجلا کر راکھ کردیا اگر وہ ایسا نہ کرتا تو پرتاب بھوش پھر اسے جادو سے کسی نہ کسی زندہ کر دیتا۔ اس کام میں شیطان اور خبیث ارواح اس کی معاون ہیں۔"

"آپ تو ہمیں بھول ہی گئے تھے۔" بریرہ نے اسے شکوہ کناں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں آپ لوگوں کو بھولا نہیں تھا۔ لیکن میری زندگی کا ایک مقصد تھا مجھے مرشد نے جو حکم دیا تھا۔ اس کی تکمیل ضروری تھی دوسرے روز جب آپ لوگ غار سے رخصت ہوگئے تو بابا شاہ حسین کے بتائے ہوئے بزرگ محمد الیاس غار میں تشریف لائے، میں نے خزانے کے ٹرنک ان کے حوالے کردیئے۔ پھر انہوں نے مجھے مزید تعلیم دی، میں نے ان کے حکم پر وظیفہ پڑھا مراقبہ کیا، ان کی روحانی شخصیت کا کمال تھا کہ میں نے مختصر مدت میں اتنا علم یعنی روحانیات میں کمال حاصل کرلیا کہ جتنا کوئی برسوں میں بھی نہ کرپائے۔

پھر ایک روز انہوں نے مجھے حکم دیا کہ سہالہ چلا جاؤں اور محمدی مسجد میں قیام کروں وہاں ایک شناسا ضرورت مند آئے گا جس کی مدد کرنی ہے مجھے یہاں آئے ہوئے چند ہی روز ہوئے ہیں کہ آپ لوگ آگئے۔

گویا بابا جی نے آپ لوگوں کے بارے میں ہی کہا تھا۔

بریرہ نے اسے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا اور پوچھا۔

"شاہ زین منچو سے پھر آپ کی کبھی ملاقات ہوئی۔"

شاہ زیب مسکرایا اور بولا۔ "وہ شرارتی بونا اب بھی میرے کندھے پر موجود ہے۔ پرتاب بھوش کے بارے میں ساری معلومات مجھے اس نے ہی تو فراہم کی ہے۔ اس غار سے باہر نکلتے ہی یہ مجھ سے آملا تھا۔" شاہ زین نے باتیں کرتے ہوئے بدستور نگاہیں جھکا رکھی تھیں اسے بریرہ کی شوخ نظروں سے گھبراہٹ ہورہی تھی جو محویت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"پلیز! ہمیں بھی منچو سے ملوائیں ناں۔" بریرہ نے اصرار کیا۔

شاہ زین نے لمحہ بھر کے لئے سوچا پھر اپنے ہونٹوں کو حرکت دی۔ اچانک بریرہ کو اپنے دائیں کندھے پر کسی کے لمس کا احساس ہوا اسے ایسا محسوس ہورہا تھا کہ جیسے کوئی شے اس کے کندھے پر رینگ رہی ہو۔

اس نے سر گھما کر دیکھا تو ششدر رہ گئی تین انچ کا بونا اپنے ننھے منے سے بازو اس کی گردن سے لپٹائے کھڑا تھا۔ "اوہ تم واقعی کتنے چھوٹے ہو؟" وہ بے اختیار بولی۔

"اور تم کتنی سندر ہو۔" منچو نے شریر لہجے میں کہا اور وہ جھینپ گئی۔

پھر شاہ زین کے حکم پر منچو سمان کے کندھے پر گیا۔ "مجھ سے دوستی کرو گے۔" سمان نے پوچھا۔

"نہیں میں صرف سندر ناریوں سے دوستی کرتا ہوں۔" منچو نے برجستہ جواب دیا اور کچھ دیر گپ شپ لگانے کے بعد غائب ہوگیا۔

"آتماؤں نے ابرش کو کہاں رکھا ہے؟" سمان نے پوچھا۔

"تم لوگ جس برفانی پہاڑ کے غار میں مجھ سے ملے تھے وہ انڈین بارڈر کے قریب ہے، دوسری طرف ہندوستان کی حدود شروع ہوجاتی ہے اس سے پچاس کوس دور پہاڑی علاقہ ہے جہاں انگریزوں کے دور کا بنا ہوا ایک قدیم قلعہ موجود ہے جہاں آتماؤں کا مسکن سینکڑوں سال سے موجود ہے ان سرکش آتماؤں نے اس قلعہ میں ابرش کو قید کر رکھا ہے۔" شاہ زین نے جواب دیا۔

"وہ ہندوستان میں کیسے پہنچ گئی؟" سمان نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

"پرتاب بھوش اور آتماؤں کے لئے یہ کون سا مشکل کام ہے۔" شاہ زین نے کہا۔

صبح ناشتہ کرتے ہی وہ سہالہ سے نکلے۔ اور پیدل چلتے ہوئے کچھ دیر بعد سڑک پر پہنچے دو بسوں اور ایک جیپ میں مسلسل سفر کے بعد وہ اس بلند و بالا پہاڑ پر پہنچ چکے تھے جو انڈین بارڈر سے متصل

تھا رات گزارنے کے لئے انہوں نے پہاڑ کے دامن میں خیمہ گاڑا اور صبح دوبارہ روانہ ہوگئے، منچو مسلسل ان کی رہنمائی کررہا تھا۔ دوپہر کے قریب وہ ایک غار کے قریب جا پہنچے۔ ''اس غار کا دوسرا دہانہ ہندوستانی علاقے میں نکلتا ہے۔'' منچو نے شاہ زین کو بتایا۔ یہ غار شیطان کی آنت کی طرح لمبا تھا وہ رکتے چلتے آگے بڑھتے رہے۔

جب وہ غار کے دوسرے دہانے پر پہنچے تو شام ہوچکی تھی کچھ فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد انہیں دور سے ایک چیک پوسٹ دکھائی دیا جس پر انڈین ترنگا لہرارہا تھا۔ گویا وہ انڈین سرزمین پر قدم رکھ چکے تھے۔

سمان بخوبی واقف تھا کہ اگر وہ انڈین آرمی کے ہتھے چڑھے تو ساری زندگی جیلوں میں گلتے سڑتے گزر جائے گی۔

خیر انہوں نے مناسب یہی سمجھا کہ راستہ تبدیل کرکے لمبا چکر کاٹ کر دوسرے راستے سے آگے بڑھیں۔

وہ مطلوبہ پہاڑی علاقے میں داخل ہوئے تو شام ہوچکی تھی یہ دشوار گزار پہاڑی علاقہ تھا۔ وہ اس وقت جس پگڈنڈی پر سفر کررہے تھے اس پر ایک وقت میں ایک ہی آدمی چل سکتا تھا اس لئے وہ تینوں ایک دوسرے کے پیچھے قطار بنائے چل رہے تھے۔

''بہتر یہی ہے کہ کسی آبادی کے آتے ہی رات بسر کی جائے اور پھر صبح آگے بڑھیں۔'' سمان چلتے ہوئے بولا۔

شاہ زین نے اس کی تائید کی منچو حسب معمول اس کے کندھے پر موجود تھا۔

اچانک اس نے محسوس کیا کہ منچو بے چین اور مضطرب ہے۔ ''کیا بات ہے تم مجھے پریشان دکھائی دے رہے ہو۔؟'' شاہ زین نے پوچھا۔

''مجھے ایسا محسوس ہورہا ہے کہ جیسے اس راستے میں کوئی خطرہ ہے لیکن میں یہ نہیں جان پارہا کہ خطرہ کس قسم کا ہے؟ نظروں کے سامنے دھند حائل ہے، ایسا میرے ساتھ پہلی بار ہورہا ہے ضرور کوئی بڑی شکتی میرے آڑے آرہی ہے اور بہتر یہی ہے کہ اس وقت تم لوگ اس راستے پر آگے بڑھنے کے بجائے واپس مڑ جاؤ۔'' منچو نے جواب دیا۔

''نہیں ہم واپس پلٹ نہیں سکتے جو ہوگا دیکھا جائے گا۔'' شاہ زین نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

کچھ دیر آگے چلنے کے بعد انہیں سامنے ایک ہیولہ سا دکھائی دیا وہ اس سے بیس قدم دور رک گئے۔ شاہ زین نے احتیاطاً سمان، بریرہ اور اپنے گرد حصار باندھ دیا۔

''ہم تمہارا اپنے دیش میں سواگت کرتے ہیں پرنتو تم اب تک جیوت کیسے ہو'' پرتاب بھوش کی تحیرزدہ آواز ابھری وہ شاہ زین سے مخاطب تھا۔

''پرتاب بھوش زندگی اور موت اللہ کے اختیار میں ہے۔ تم تو اپنے آپ کو مہان شکتی کہلاتے ہو پھر میرے بارے میں کیوں نہیں جان سکے۔'' شاہ زین نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

''مورکھ، جیون کی آشا ہے تو ترنت یہاں سے بھاگ جا۔ میں نے بھاڑ نہیں جھونکا برسوں گیان دھیان اور تپسیا کی ہے اور مجھے یہ بھی جانکاری ہے کہ تم اس ناری کے کارن آئے ہو۔'' پرتاب بھوش کی آواز دوبارہ ابھری۔

''پرتاب بھوش لگتا ہے تم ڈر گئے ہو اس لئے خود سامنے نہیں آئے ہمت ہے تو خود سامنے آکر دیکھو'' شاہ زین نے ہیولے کو دیکھتے ہوئے للکارا اور پرتاب بھوش کا قہقہہ سنائی دیا۔

''میں اگر سامنے آگیا تو تم تینوں جل کر بھسم ہوجاؤ گے اب بھی میرا وچار یہی ہے کہ ترنت واپس لوٹ جاؤ۔'' پرتاب بھوش کی آواز ابھری اور ان کے سامنے سے ہیولہ غائب ہوگیا۔

وہ تینوں دوبارہ آگے بڑھنے لگے کچھ دیر بعد وہ ایک چھوٹی سی بستی میں داخل ہوئے۔ سمان نے شاہ زین کے اشارے پر ایک مکان کے دروازے پر دستک دی دروازہ ایک معمر شخص نے کھولا جو حلیے اور لباس سے ہندو دکھائی دے رہا تھا۔ ''بابا ہم پردیسی ہیں صرف

رات گزارنے کے لئے جگہ چاہئے۔'' سمان نے شائستہ لہجے میں اپنا مدعا بیان کیا۔

''اندر آ جاؤ بالک۔'' بوڑھے نے انہیں اندر آنے کا راستہ دیا۔ یہ دو میاں بیوی اور ایک بیٹی پر مشتمل مختصر فیملی تھی بوڑھا راج ورما ایک اچھا انسان تھا جس نے یہ جاننے کے باوجود کہ وہ مسلمان ہیں ان کی خاطر مدارت کی۔ رات انہوں نے اسی گھر میں گزاری شاہ زین نے صبح فجر کی نماز کمرے میں پڑھی اور اپنے میزبان سے جانے کی اجازت طلب کی۔ مگر اس میزبان شخص نے انہیں ناشتے کے بغیر نہیں جانے دیا ناشتہ کرکے باہر نکلنے تک سورج نکل چکا تھا۔ یہ راستہ واقعی دشوار تھا اور پھر ڈھلان بھی تھی دن گیارہ بجے کے قریب وہ اس قدیم قلعہ کے دروازے پر جا پہنچے۔

شاہ زین چند لمحوں کے لئے وہاں رکا۔ ''میرے خیال میں اندر جانا نقصان دہ ثابت ہوگا۔ یہاں ہمارا سامنا ایک دو نہیں آتماؤں کے پورے قبیلے سے ہوگا بہتر یہی ہے کہ اس وقت واپس لوٹ جاؤ اور پھر کسی وقت مناسب تیاری کرکے یہاں آؤ۔'' منچو نے مشورہ دیا۔

''نہیں اس طرح پرتاب بھوش کو مزید وقت مل جائے گا اور ہوسکتا ہے اس دوران ابرش پرتاب بھوش کے پاس پہنچادی جائے۔ اس صورت میں مشکلات مزید بڑھ جائیں گی۔'' شاہ زین نے اس کی تجویز کی مخالفت کی۔

''اچھا تو پھر خود کو حصار میں محفوظ کرلو۔'' منچو نے کہا اور چوکنا ہوکر اس کے کندھے پر کھڑا ہوگیا۔

شاہ زین نے بریرہ کا ہاتھ تھاما تو اس کے چہرے پر مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی پھر بریرہ نے اس کے کہنے پر دوسرے ہاتھ سے سمان کا ہاتھ تھام لیا اور پھر شاہ زین نے خود اور ان دونوں پر حصار باندھا اور چلتے ہوئے بولا۔ ''ایک دوسرے کا ہاتھ کسی بھی صورت مت چھوڑنا۔'' وہ انہیں تنبیہ کرکے قرآنی آیات پڑھتے ہوئے آگے بڑھا۔

ایک راہ داری میں قدم رکھتے ہی ایک خونخوار سیاہ رنگ کی جسیم بلی ان کے سامنے آگئی جس کی غضب ناک نگاہیں ان پر جمی ہوئی تھیں، وہ رک گئے شاہ زین نے بلی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تمہیں پہچان لیا ہے اور تمہیں تنبیہ کرتا ہوں کہ ابرش کو ہمارے حوالے کردو، ویسے بھی یہ جنگ میرے اور پرتاب بھوش کے بیچ ہے۔ میرا تمہارے قبیلے سے کوئی لینا دینا نہیں۔ اور اگر تم لوگوں نے میری بات نہ مانی تو پھر میرا تم سے فیصلہ کن معرکہ ہوگا اور تمہارے لئے کوئی راہ فرار نہ رہے گی۔''

اگلا ہی لمحہ حیرت انگیز تھا۔ بلی نے ایک دیو ہیکل خوف ناک عورت کا روپ دھار لیا۔ بہت طویل قامت تھی۔ وہ لوگ اس خوف ناک آتما کے سامنے بونے لگ رہے تھے۔

سمان اور بریرہ تو اس ہیبت ناک مخلوق کو دیکھتے ہی کانپنے لگے تھے بریرہ کو تو ایسا لگ رہا تھا کہ کسی بھی لمحے بے ہوش ہوکر گر جائے گی۔ ویسے بھی انسانی آبادی سے دور زمانہ قدیم کی اس شکستہ عمارت کو دیکھتے ہی انسان کو خوف آتا تھا۔ اور پھر یہاں یہ غیر انسانی مخلوق ان کے سامنے ایستادہ تھی۔ پھر اس آتما کی آواز اس عمارت کے در و دیوار میں بازگشت کرتی ہوئی گونجی۔ ''ہم جانتے ہیں کہ اس بونے کے علاوہ تم بھی تھوڑا بہت علم جانتے ہو، پرنتو تم ہماری شکتی سے واقف نہیں۔ یہاں ہمارے قبیلے کے بہت سی آتمائیں موجود ہیں ویسے تمہارے لئے میں بھی کافی ہوں میں اپنے قبیلے کی بہت شکتی شالی ہوں تم یہاں سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔ بہتر یہی ہے کہ اپنی اور اپنے ساتھیوں کی زندگی بچا کر واپس لوٹ جاؤ۔''

وہ چند لمحوں تک اس ہیبت ناک آتما کو دیکھتا رہا پھر پرسکون لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔ ''تم بھی مجھے نہیں جانتی بہتر یہی ہے کہ اپنے آقا پرتاب بھوش سے پوچھ لو کہ میں کون ہوں۔ تم چاہے تعداد میں کتنے ہی کیوں نہ ہو اپنی ضد سے نقصان اٹھاؤ گے۔'' ان دونوں میں کچھ دیر تلخ و ترش جملوں کا تبادلہ ہوتا رہا۔

پھر آتما نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا۔

جو دراز ہوتا ہوا ان کی طرف بڑھا۔ حالانکہ آتما ان سے دس بارہ قدم کے فاصلے پر تھی اس کے باوجود اس کا ہاتھ دراز ہوتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

وہ شاہ زین کی گردن دبوچنا چاہتی تھی پھر جیسے ہی اس کا ہاتھ بدن سے ٹکرایا آتما کو زوردار جھٹکا لگا وہ گھبرا کر کئی قدم پیچھے ہٹ گئی۔

اچانک منچو نے اس کی طرف اپنا دایاں ہاتھ جھٹکا تو کوئی گیند نما چیز اس کے ہاتھ سے نکل کر آتما کے سینے سے ٹکرائی تو وہ چیخی اور ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔

''میں نے تمہیں مداخلت سے منع کیا تھا ناں مگر تم پھر بھی باز نہیں آئے۔'' شاہ زین نے منچو کو ڈانٹا لیکن اس کے چہرے پر ناراضگی کا شائبہ تک نہیں تھا یہ ان کی آتماؤں کے مسکن میں پہلی فتح تھی گویا وہ پہلے ہی مرحلے میں معمولی ہی سہی لیکن اس آتما کو شکست دے کر نفسیاتی برتری حاصل کر چکے تھے لیکن شاہ زین جانتا تھا کہ آگے کے مرحلے مزید خوف ناک ہیں کیوں کہ اس قلعہ میں کوئی ایک آتما نہیں بلکہ آتماؤں کا غول آباد تھا۔ جو آتما کی درگت بننے پر یقیناً اشتعال میں آچکے ہوں گے اور انہیں ہرگز معاف نہیں کریں گے۔

وہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے دھیرے دھیرے آگے بڑھتے ایک دوسری راہداری میں آگئے کچھ آگے جا کر شاہ مین رک گیا اور سر گھما کر منچو سے پوچھا۔''اب وہ کہاں ہوں گے۔''

''انہیں پکارتے ہوئے اسی راستے پر چلے جاؤ وہ نزدیک ہی ہیں۔'' منچو نے مشورہ دیا۔

اور شاہ زین با آواز بلند بولا۔''میں جانتا ہوں تم لوگ یہیں کہیں ہو اور مناسب موقع کی تاک میں ہو۔ لیکن یاد رکھو تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ ابرش کو ہمارے حوالے کردو، میں تمہیں کچھ کہے بنا خاموشی سے یہاں سے چلا جاؤں گا۔ دوسری صورت میں، میں تمہیں بھاگنے کا موقع بھی نہیں دوں گا۔'' وہ بولنے کے ساتھ ساتھ آگے بھی بڑھتا جا رہا تھا۔

ابھی وہ چند قدم ہی مزید چلے ہوں گے کہ آندھی کی طرح تیز ہوا چلنے لگی یہ اس قدر تیز تند اور گرم ہوا تھی کہ ان کے قدم اکھڑنے لگے اور جسم اس طرح جلنے لگا جیسے وہ آگ کے شعلوں میں گھر گئے ہوں۔ سمان اور ابرش کی تو چیخیں نکل گئیں۔

''گھبراؤ مت یہ سب دھوکہ فریب یا سراب ہے۔ اس میں حقیقت کچھ نہیں ان حرکتوں سے آتماؤں کا مقصد ہے کہ ہم ڈر کر بھاگ جائیں۔'' شاہ زین نے انہیں تسلی دی۔ اور بائیں طرف مڑنے والی راہداری سے ہوتے ہوئے ہال میں پہنچے ہی تھے کہ ایک طرف ایک ستون گڑگڑاہٹ کی گونج دار آواز سے ان کے اوپر گرنے لگا تو یہاں منچو نے پھرتی اور حاضر دماغی سے کام لے کر منوں وزنی اس ستون کی طرف دائیں ہاتھ کی انگلی سے اشارہ کیا اس کی انگلی سے ایک شعاع نکلی اور گرتے ہوئے ستون سے ٹکرائی تو ستون کے گرنے کا رخ تبدیل ہوگیا اور وہ دوسری طرف جا گرا۔ ستون کے گرتے ہی وہ چھجا بھی گر پڑا تھا جسے ستون نے سہارا دے رکھا تھا آتماؤں سے پے در پے حملوں نے جہاں سمان اور بریرہ کے خوف میں اضافہ کیا تھا وہاں شاہ زین کا اشتعال بھی بڑھتا جا رہا تھا وہ انجام سے بے پرواہ آگے بڑھتے ہوئے ایک ہال نما کمرے کے دروازے پر جا پہنچا۔ یہ شیشم کی لکڑی کا مضبوط دروازہ تھا جو مقفل تھا۔''ابرش اسی کمرے میں قید ہے۔'' منچو نے پرجوش لہجے میں کہا۔

شاہ زین نے دروازہ دھکیلنے کی کوشش کی مگر اسے کھولنے میں ناکام رہا۔

''بہتر یہی ہے کہ ہم اس دروازے کو توڑنے کی کوشش کریں۔'' سمان نے مشورہ دیا۔

''یہ ناممکن ہے ایک تو دروازہ مضبوط ہے دوسرا آتماؤں نے اس پر بندش کر رکھی ہے۔'' شاہ زین نے جواب دیا اس بار بھی منچو ہی ان کے کام آیا اس کی انگلی کی ایک ہی جنبش سے دروازہ دھڑا دھڑ جلنے لگا۔''اندر چلو۔'' شاہ زین چلایا اور ایک ہی جست میں اندر جاتے ہی اس نے حصار مزید مضبوط کر لیا بلکہ احتیاطاً دروازے

پر بھی مضبوط نادیدہ دیوار کھڑی کر دی تا کہ ابرش کو لے کر آتمائیں راہ فرار نہ اختیار کر لیں۔

جلتے ہوئے دروازے کی روشنی میں صاف دکھائی دے رہا تھا کہ کمرے میں کوئی بھی ذی نفس موجود نہیں ۔ ''یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔'' سمان نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''انہوں نے روپوشی کی چادر اوڑھ رکھی ہے۔''

شاہ زین نے جواب دیا اور وظیفہ پڑھتے ہوئے چاروں طرف انگلی کا اشارہ کیا۔ ہال نما کمرے میں موجود آتمائیں ظاہر ہوگئیں وہ تعداد میں آٹھ تھیں جو اپنی اصل شکل وصورت میں تھیں ان میں کالی نامی وہ آتما بھی تھی جس سے پہلے بھی اس کا واسطہ پڑ چکا تھا۔

ابرش کمرے کے ایک کونے میں بے ہوش پڑی تھی ۔ جسے دیکھتے ہی سمان نے بریرہ کا ہاتھ چھوڑا اور حصار سے باہر نکلنا چاہا۔ ''رک جاؤ حصار سے باہر نکلتے ہی تم جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔'' شاہ زین چیخا۔ تو اسے ہوش آیا اور اس نے بریرہ کا ہاتھ دوبارہ تھام لیا۔ لیکن اب بھی اس کی نظریں ابرش پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر شاہ زین آتماؤں کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ''تم سب نے دیکھ لیا کہ میں تمہارے مسکن میں تمام تر رکاوٹوں کے باوجود تم تک آ پہنچا ہوں۔ اب یہ کمرہ میرے حصار میں ہے اور باہر جانے والے تمام راستوں پر میں رکاوٹیں کھڑی کر چکا ہوں اب بھی میں سب کچھ بھول کر تمہیں یہاں سے نکلنے کا راستہ دے سکتا ہوں، شرط صرف اتنی ہے کہ تمہیں اس معصوم لڑکی سے دستبردار ہونا پڑے گا اور تمہیں یہ بھی یقین دلاتا ہوں کہ تمہیں پرتاب بھوش سے تحفظ دوں گا۔''

''لگتا ہے تم کچھ زیادہ ہی خوش فہمی کا شکار ہو۔ تمہاری مکتی اسی میں ہے کہ یہاں سے ترنت بھاگ جاؤ۔ میں تمہیں بچنے کا ایک اور موقع دیتا ہوں۔'' ان میں سے ایک آتما گونج دار آواز میں بولی۔

اور شاہ زین مسکرایا۔ ''لگتا ہے تم لوگ ایسے نہیں مانو گے۔''

آتما نے ایک قدم آگے بڑھایا اور بولی۔ ''اب تک ہم نے تم پر معمولی حملے کیے تھے جن کا مقصد محض تمہیں ڈرانا تھا۔ لیکن تم نے اس سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ ہمت ہے تو کنڈل (حصار) سے باہر آ کر دیکھو میں تمہیں نشٹ کر دوں گی۔''

شاہ زین نے اس کی بکواس پر کوئی توجہ نہ دی اور مسلسل قرآنی آیات پڑھتا رہا۔ آتما نے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی ان کی طرف سیدھی کی اگلا ہی لمحہ حیرت انگیز اور خوف زدہ کر دینے والا تھا سمان اور بریرہ سرتاپا لرز گئے اور ان کے ہوش حواس جاتے رہے ان کا سارا جسم خوف کے مارے تھرتھرا رہا تھا اور پیشانی سے بہنے والا پسینہ پیروں تک پہنچ رہا تھا۔ شاید وہ ڈر اور خوف سے حصار سے باہر نکل پڑتے لیکن کسی ان دیکھی قوت نے جیسے ان کے پاؤں میں نہ نظر آنے والی بیڑیاں ڈال رکھی تھیں۔

یہ منچو کی کرشماتی قوت کا کمال تھا جو ان پر نظر رکھے ہوئے تھا کہ کہیں وہ نادانی میں حصار سے باہر نکل نہ جائیں آتما کے ہاتھ سے فٹ بال سے مشابہ ایک آگ کا گولا نکلا اور تیزی سے ان کی طرف بڑھا۔ اور اسی طرز کے آگ کے گولے ان آتماؤں نے چاروں طرف سے ان کی طرف پھینکے۔ چاروں طرف سے برسنے والے آگ کے گولے حصار سے ٹکراتے ہی غائب ہو جاتے پھر آتماؤں نے مل کر چاروں اطراف سے ان پر حملہ آور ہونا چاہا۔ مگر جو بھی حصار کے قریب آتا چیختا ہوا پیچھے ہٹ جاتا۔

شاہ زین نے آتماؤں کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھا اور غصے سے کہا۔ ''آتماؤ! میں نے بہت چاہا کہ تصادم سے بچوں مگر تم نے میری ایک نہ سنی اب تمہارے فرار کی ساری راہیں مسدود ہو چکی ہیں۔ تمہیں اپنے کیے کی سزا بھگتنی پڑے گی۔'' اس نے ایک جلالی وظیفہ پڑھتے ہوئے ایک طرف کھڑے دو آتماؤں کی طرف دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے اشارہ کیا ان دونوں آتماؤں کے جسموں میں آگ بھڑک اٹھی اور وہ لمحوں

میں جل کر خاک ہوگئیں۔ کمرے میں بھگدڑ مچ چکی تھی۔ آتمائیں جان بچانے کے لئے چیختی چلاتے ہوئے کمرے میں بھاگنے لگیں۔ ان کے بھاری قدموں کی گونج اور چیخ و پکار سے کمرہ گونج رہا تھا۔

سمان اور بریرہ کو ایسا لگ رہا تھا کہ اس شور شرابے سے ان کے کان کے پردے پھٹ جائیں گے آتماؤں نے راہ فرار کے لئے دروازے کا رخ کیا۔

مگر وہاں بھی شاہ زین نادیدہ حصار کی صورت میں رکاوٹ کھڑی کر چکا تھا۔ پھر مزید تین آتمائیں اس کے انتقام کا نشانہ بن گئیں اپنے پانچ ساتھیوں سے محروم ہونے کے بعد بچ جانے والی آتماؤں کے حوصلے پست ہوگئے اور ان کی عقل ٹھکانے آچکی تھی ان میں وہ سرکش آتما بھی تھی۔

''اے آدم زاد ہمیں شما کردو ہم وچن دیتے ہیں کہ آئندہ تم لوگوں کو کشٹ نہیں دیں گے۔'' ایک آتما چیختی ہوئی بولی۔

شاہ زین نے ان پر قہر آلود نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''سوچ لو اگر پھر کوئی ایسی حرکت کی تو تمہیں معاف نہیں کروں گا اب تم لوگوں کے لئے بہتر یہی ہے کہ یہ علاقہ چھوڑ کر کہیں دور چلے جاؤ ورنہ پرتاب بھوش تمہیں با آسانی نکلنے نہیں دے گا۔ خیر اس لڑکی کو میں کسی محفوظ مقام پر پہنچا کر میں اس کا بھی علاج کرتا ہوں۔'' شاہ زین نے دروازے پر سے نادیدہ حصار ہٹادیا اور آتمائیں پلک جھپکتے میں وہاں سے غائب ہوگئیں۔

سمان بے تابی سے ابرش کی طرف بڑھا منچو نے مسکراتے ہوئے ابرش کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور سہمی ہوئی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ ''گھبراؤ مت وہ خبیث شکست کھا کر پسپا ہوچکے ہیں۔'' سمان نے اسے تسلی دی اور وہ اس قلعہ سے باہر نکلنے لگے۔

راستے میں سمان ابرش کو شاہ زین سے متعارف کرواتے ہوئے ابرش کے غائب ہونے کے بعد کے واقعات بتاتا رہا۔

وہ جس راستے سے آتماؤں کے مسکن کی طرف آئے تھے اسی سے واپس لوٹ رہے تھے۔ ان کا ارادہ اسی بستی میں قیام کا تھا۔ جس میں انہوں نے رات بسر کی تھی کیوں کہ دن ڈھلنے ہی والا تھا پھر وہ مسلسل سفر اور آتماؤں کے ساتھ معرکہ آرائی سے تھک چکے تھے۔ سمان اور ابرش ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے آگے جارہے تھے جب کہ بریرہ اور شاہ زین ان سے پیچھے تھے۔

بریرہ مسلسل شاہ مین کے بارے میں سوچ رہی تھی جبکہ شاہ زین منچو سے محو گفتگو تھا جو مسلسل اس کے کان کھا رہا تھا۔ بولتے بولتے منچو نے اپنی گفتگو کا رخ بریرہ کی طرف موڑ دیا۔ ''شاہ زین ایک خاص بات بتاؤں بریرہ مسلسل تمہارے ہی بارے میں سوچ رہی ہے ویسے ایک بات ہے کہ وہ خوبصورت لڑکی ہے اور تمہیں دل سے چاہتی ہے۔''

''بکواس بند کرو، تم جانتے ہو کہ عائشہ کے بعد میں نے کسی دوسری لڑکی کے بارے میں اس طرح نہیں سوچا اور میں سوچنا بھی نہیں چاہتا کیوں کہ میں اپنی زندگی انسانیت کی خدمت اور عبادت میں بسر کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے منچو کو جھڑک دیا۔

بریرہ نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ سمان کے ساتھ چلتی ابرش نے اس کا ہاتھ جھٹکا اور اسے ایک طرف دھکیل کر نیچے گری اور تڑپنے لگی۔ ''کیا ہوا ابرش خیریت تو ہے؟'' سمان نے ہاتھ بڑھا کر اسے سہارا دینا چاہا وہ سمجھ رہا تھا کہ ابرش ٹھوکر لگنے کے باعث گری ہے، ابرش نے اس کا ہاتھ جھٹکا اور اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ ''پیچھے ہٹ جاؤ، مورکھ ورنہ تمہارا جیون نشٹ ہوجائے گا۔'' اس کی آنکھیں جلتے ہوئے انگاروں کی طرح سرخ ہورہی تھیں اور آواز غراہٹ آمیز تھی۔

شاہ زین اور بریرہ بھی ان کے قریب پہنچ چکے تھے اب وہ شاہ زین پر نظریں جمائے کھڑی تھی۔ ''شاہ زین اب بول اسے کیسے بچائے گا؟'' وہ ہذیانی انداز میں ہنسی اور شاہ زین چونک پڑا۔

یہ آواز اسی آتما کی تھی جس نے انہیں آتماؤں کے مسکن میں ناکوں چنے چبوائے تھے اب وہ ایک بار پھر ابرش کے جسم پر قابض ہو چکی تھی۔ ''تم لوگوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آئندہ تنگ نہیں کرو گی۔'' حیرت کے ابتدائی جھٹکے سے سنبھلتے ہی شاہ زین نے کہا۔

میرے قبیلے کی دیگر آتمائیں بزدل تھیں جنھوں نے تم سے وچن کیا تھا لیکن میں تمہیں نرک میں جھونک کر چھوڑوں گی۔ اور تم میں شکتی ہے تو مجھے اس کے سندر بدن سے باہر نکالو۔'' آتما نے نفرت انگیز لہجے میں جواب دیا۔

شاہ زین نے اس کی بات کا جواب دیئے بغیر عمل پڑھنا شروع کر دیا ابرش جھٹکا کھا کر دوبارہ گر پڑی اور تڑپنے لگی۔ اس کے ہاتھ پاؤں مڑ چکے تھے اور جسم کو جھٹکے لگ رہے تھے۔

''اسے کیا ہو رہا ہے شاہ زین بھائی؟'' سلمان تڑپ اٹھا۔ ابرش کی غیر ہوتی حالت دیکھ کر اس کے چہرے کا رنگ اڑ چکا تھا اور دل پر تو جیسے چھریاں چل رہی تھیں۔

شاہ زین نے اسے اشارے سے تسلی دی اور اپنا عمل جاری رکھا اچانک ابرش نے اپنا لباس نوچنا شروع کر دیا تو سلمان چیخ پڑا مجبوراً شاہ زین کو اپنا عمل روکنا پڑا۔

''رک کیوں گئے پڑھو عمل اور نکالو مجھے اس کے جسم سے لیکن اتنا یاد رکھو اب اگر تم نے مجھے اس ناری کے جسم سے نکالنے کی کوشش کی تو میں اس کی ہتھیا کردوں گی اور ہو سکتا ہے اس سے پہلے تم لوگوں کو اسے بے لباس دیکھنا پڑے مصیبت سے بچنا چاہتے ہو تو کیول ایک ہی راستہ ہے مجھے اسے لے جانے دو۔ تاکہ میں اسے مہاراج پرتاب بھوش تک پہنچا دوں۔''

آتما نے شاہ زین کو مشکل میں ڈال دیا تھا اگر اسے ابرش کے جسم سے نکالنے کے لئے عمل پڑھتا تو ابرش کی زندگی کو خطرہ تھا اور پھر وہ شیطانیت پر اتر آئی تھی۔

''کیا وچار کر رہے ہو۔ تم لوگوں کی مکتی کا صرف یہی راستہ ہے۔'' آتما دوبارہ بولی۔

جبکہ منچو خاموشی سے شاہ زین کے کندھے سے اتر کر ابرش کے سر پر چڑھ گیا اور اس کے بالوں میں روپوش ہو گیا پھر منچو کی آواز سنائی دی۔ ''شاہ زین اپنا عمل جاری رکھو۔ ابرش کا دماغ اب میرے قابو میں ہے یہ آتما اب اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی کیوں کہ جسم دماغ کے تابع ہوتا ہے۔'' شاہ زین مسکرا اٹھا۔ ''یہ ننھا دوست اس کٹھن مرحلے میں بھی پہلے کی طرح اس کے کام آیا تھا'' اس نے دوبارہ عمل پڑھنا شروع کر دیا وہ مطمئن تھا اب آتما ابرش کو کسی بھی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتی تھی کیونکہ انسانی جسم دماغ کے تابع ہوتا ہے اور ابرش کا دماغ منچو کے قبضے میں تھا آتما بھی اس بات سے آگاہ تھی اور سمجھ چکی تھی کہ بساط کا رخ پلٹ چکا ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے ابرش کے جسم سے ہیولہ سا نکلا اور غائب ہو گیا شاہ زین نے وظیفہ مکمل کر کے دونوں ہاتھ ابرش کی طرف جھٹکے تو ابرش آنکھیں کھول کر اٹھ بیٹھی۔ ''مجھے کیا ہوا تھا؟'' اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر کہا۔

''کچھ نہیں شاید کمزوری سے چکر آ گئے تھے۔'' شاہ زین نے جواب دیا اور ابرش اسے الجھی ہوئی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

آبادی میں پہنچتے تک رات ہو چکی تھی ادھیڑ عمر راج ورما نے خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کیا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ محو خواب ہو گئے، رات کا پچھلا پہر تھا جب شاہ زین نے خواب میں نورانی چہرے والے بابا محمد الیاس کو دیکھا جو کہہ رہے تھے۔ ''شاہ زین اب تمہیں راجستھان کا سفر کرنا ہے۔ میں تمہیں وہیں ملوں گا۔'' اس کے ساتھ ہی وہ غائب ہو گئے۔

صبح وہ اپنے میزبان کا شکریہ ادا کر کے گھر سے نکلے ابھی وہ بارڈر سے تین کلو میٹر دور تھے کہ شاہ زین رک گیا اور سلمان کو گلے لگا کر بولا۔ ''اچھا دوست زندگی رہی اور اللہ کو منظور ہوا تو انشاء اللہ پھر ملیں گے۔''

''کیا مطلب آپ ہمارے ساتھ نہیں چلیں

گے؟“ بریرہ نے پوچھا۔ اس سے جدا ہونے کے تصور سے ہی جیسے اس کا سانس رکنے لگا تھا۔

”نہیں بابا جی نے مجھے راجستھان پہنچنے کا حکم دیا ہے وہ بھی مجھے وہیں ملیں گے پھر جو حکم ملا اس پر عمل کروں گا۔“ وہ مسکرایا اور انہیں الوداع کہہ کر مخالف سمت چل دیا۔ جبکہ وہ تینوں اداس چہرہ لئے اس پہاڑی غار کی طرف روانہ ہوگئے جہاں سے وہ انڈیا میں داخل ہوئے تھے ان کی کوشش یہی تھی کہ سیکورٹی فورسز کی نظروں میں آئے بغیر غار تک پہنچ جائیں۔

ابھی وہ ایک کلومیٹر ہی چلے ہوں گے کہ کسی کی گونج دار آواز سنائی دی۔ ”ہالٹ۔“ وارننگ دینے کا یہ انداز آرمی کا ہی تھا۔

ان کے دل ڈوبنے لگے۔ یہ نصف درجن فوجی اہلکار تھے جو انڈین آرمی کی وردی میں ملبوس تھے۔ انہیں گھیرے میں لے لیا گیا۔ درمیانے قد وقامت کا ایک صحت مند کیپٹن رینک کا افسر آگے بڑھا اور سر سے پاؤں تک تنقیدی نظر سے ان کا جائزہ لے کر بولا۔ ”کون ہو تم لوگ اور ممنوعہ علاقے میں کیا کر رہے تھے؟“

سلمان نے لمحہ بھر کے لئے سوچا پھر سچ بولنے کا فیصلہ بھی کرلیا ویسے بھی جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا کیونکہ اس کی جیب میں پاکستانی شناختی کارڈ موجود تھا۔ ”سر میرا نام سلمان ہے یہ بریرہ اور ابرش ہیں، ہمارا تعلق پاکستان کے مختلف علاقوں سے ہے۔“ اس نے تعارف کروانے کے ساتھ ساتھ اپنی روداد بھی سنا ڈالی۔

کیپٹن کے چہرے پر بے یقینی کے تاثرات صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ”مسٹر سلمان میں تمہاری اس بے سروپا دیومالائی داستان سے متاثر ہونے والا نہیں یقیناً تم تینوں پاکستانی جاسوس ہو۔“

”نہیں سر یہ غلط ہے ہم جاسوس نہیں۔“ سلمان نے احتجاج کیا کیپٹن کو ان کی تلاشی لینے کا حکم دیا سلمان کے پاس سوائے پنڈلی سے بندھے خنجر کے کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ جسے تلاشی کے دوران لے لیا گیا اس کا شناختی کارڈ بھی فوجی اہلکار نے کیپٹن کے حوالے کردیا

اور پھر کیپٹن کے حکم پر وہی اہلکار ابرش کی تلاشی لینے آگے بڑھا تو سلمان نے احتجاج کیا۔ ”خواتین کی تلاشی کے لئے لیڈی اہلکار بلائی جائے۔“

کیپٹن آگے بڑھا اور زوردار تھپڑ سلمان کے چہرے پر رسید کیا چٹاخ کی زوردار آواز فضاء میں ابھری۔ ”خاموش اب اگر تم نے کسی بھی قسم کی بکواس کی تو گولی سے اڑا دوں گا۔ تم پولیس کے کسی اہلکار کے سامنے نہیں بلکہ انڈین آرمی کے کیپٹن شیکھر کے سامنے کھڑے ہو۔“ وہ بولا۔

احساس توہین سے سلمان کا دماغ سلگ اٹھا اور جسم کا سارا خون سمٹ کر آنکھوں میں اتر آیا مگر وہ مصلحتاً خاموش رہنے پر مجبور تھا۔ مزاحمت یا احتجاج دونوں ہی صورتوں میں انڈین آرمی کے اہلکار اسے موت کے گھاٹ اتار دیتے اس نے انڈین آرمی کی سفاکی اور درندگی کی ان گنت داستانیں سن رکھی تھیں خاص طور پر وہ مسلمان اور پھر پاکستانیوں کے لئے تو انڈین آرمی کی درندگی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔

ابرش اور بریرہ کی تلاشی لینے کے بعد وہ انہیں گن پوائنٹ پر لئے ہوئے چیک پوسٹ پر پہنچے۔ وہاں پانچ چھ مزید فوجی اہلکار بھی موجود تھے۔ ان تینوں خاص طور پر بریرہ اور ابرش کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں شیطانی چمک لہرائی جو سلمان سے مخفی نہ رہ سکی اس کا خون کھول اٹھا مگر خود پر ضبط کرکے خاموش رہا ان تینوں کو ایک طرف بیٹھا کر کیپٹن شیکھر نے یہاں بھی ان سے پوچھ گچھ کی مگر ان کے جوابات وہی تھے جو سلمان پہلے ہی دے چکا تھا۔

اسی وقت دو فوجی جیپیں چیک پوسٹ کی طرف آتی دکھائی دیں۔ کیپٹن شیکھر چونک پڑا۔ ”میجر رام پرشاد۔“ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا دونوں جیپیں چیک پوسٹ پر رکیں اور ان میں سے آٹھ نو افراد اترے۔ ان میں سے ایک سادہ لباس میں تھا جبکہ دیگر آرمی کی وردی میں ملبوس تھے باڈی بلڈر ٹائپ کے ایک شخص کی وردی پر بہت سے اسٹارز لگے ہوئے تھے یہی

میجر رام پرشاد تھا۔ وہ سادہ لباس شخص کے ساتھ ان کے قریب آکر رکا کیپٹن شیکھر اور دیگر اہلکاروں نے اسے فوجی انداز سے سلیوٹ کیا۔

میجر رام اور سادہ لباس شخص کچھ دیر تک سمن بریرہ اور ابرش کو ٹٹولتی نگاہوں سے دیکھتے رہے پھر سادہ لباس شخص نے میجر رام کے کان میں کوئی سرگوشی کی اس نے اثبات میں سرہلا کر کیپٹن شیکھر کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''انہوں نے کچھ بتایا۔''

کیپٹن شیکھر نے سمن کی بتائی ہوئی سرگزشت اسے سناڈالی اور بولا۔ ''سر میرے خیال سے یہ تینوں پاکستانی جاسوس ہیں۔''

میجر رام ان تینوں کی طرف مڑا اور بولا۔ ''یہ لڑکیاں میرے اور بنسی لال کے ساتھ جائیں گی۔''

بنسی لال غالباً سادہ لباس شخص کا نام تھا۔ اور اسے اس نے سمن کی طرف اشارہ کیا۔

''تلسی داس کے حوالے کردو۔'' پھر وہ بنسی لال کی طرف مڑا۔

''ٹھیک ہے ناں بنسی لال تمہیں ویسے بھی یہ لڑکیاں پسند آئی ہیں۔''

''بکواس بند کرو۔'' سمن بھڑک اٹھا ہی تھا کہ کیپٹن شیکھر کے اشارے پر ایک فوجی نے سمن کے سر پر رائفل کا دستہ رسید کیا۔ اور وہ ہوش وخرد سے محروم ہوگیا۔

اسے ہوش آیا تو وہ بارہ بائی بارہ کے کمرے کے فرش پر پڑا تھا۔ کمرے کا دروازہ پولیس لاک اپ کی طرح سلاخوں والا تھا اس کمرے کے دروازے کے سامنے بھی اسی طرف کا ایک لاک اپ بنا ہوا تھا جس میں دو قیدی دیوار سے ٹیک لگائے کراہ رہے تھے۔ لاک اپ اور کوریڈور میں بلب روشن تھے جس سے اس نے اندازہ لگایا کہ رات کا وقت ہے۔ گویا اسے بے ہوش ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے تھے، ادھر نہ جانے اس شیطان صفت میجر رام اور بنسی لال نے ان دونوں لڑکیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا یہ سوچتے ہی اس کی بے چینی اور اضطراب میں اضافہ ہوگیا وہ سلاخوں والے دروازے کے قریب گیا اور سلاخوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر چیخنے چلانے لگا۔ ''کوئی ہے یہاں تو سامنے آؤ۔'' اس کی چیخ وپکار رائیگاں نہیں گئی۔

کچھ دیر بعد ایک سیاہ اور شخص کوریڈور میں چلتا ہوا آیا اور سلاخوں کے قریب کھڑا ہو کر غصے سے اسے دیکھنے لگا وہ جینز کی پینٹ پر ہاف آستین کی شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ ''دھیرج رکھ بالک ابھی کچھ سمے میں تلسی داس آنے والا ہے پھر وہ تمہارے مکتی کا کوئی اپائے کریں گے پراتھنا کرو کہ اسے آنے میں کچھ دیر ہوجائے بہت سے لوگ اسے راون کے نام سے بھی پکارتے ہیں۔''

''تم لوگوں نے مجھے کہاں قید کر رکھا ہے کیا یہ کوئی پولیس اسٹیشن ہے؟'' سمن نے پوچھا۔

وہ شخص ہنسا اور اپنے مخصوص لب و لہجے میں جواب دیا۔ ''مہاشے یہ سمجھ لے کے کہ راون کا ٹھکانہ ہے جہاں آنے سے یمراج بھی ڈرتا ہے اب تو بھی کچھ سمے کے لئے شانت ہوجا پھر تو جیون بھر بولنے کے لائق نہیں رہے گا۔'' وہ واپس مڑا اور کوریڈور میں چلتا ہوا ایک طرف نکل گیا جبکہ سمن بے چینی سے لاک اپ میں ٹہلنے لگا۔

کچھ دیر بعد کسی شخص کی دردناک چیخیں سنائی دیں ایسا لگ رہا تھا کہ قریب ہی کہیں کسی قیدی پر وحشیانہ تشدد کیا جارہا تھا۔ یہ چیخ وپکار کافی دیر تک جاری رہی پھر خاموشی چھاگئی تقریباً آدھے گھنٹے بعد کوریڈور میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ یہ تین افراد تھے دو نے جدید ساخت کی رائفلیں اٹھا رکھی تھیں جبکہ تیسرا خالی ہاتھ تھا۔ اس کا سر انڈے کی طرح صاف شفاف تھا اور گینڈے کی سی جسامت کا مالک تھا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں سفاکیت تھی اور چہرے کے تاثرات درشت تھے۔ اس کی شخصیت کسی پہلوان سے مشابہت رکھتی تھی ایک نے لاک اپ کے دروازے کا تالا کھولا اور وہ تینوں اندر داخل ہوگئے گنجے نے اندر آتے ہی سر سے پاؤں تک اسے گھور کر اس طرح دیکھا جیسے کوئی قصائی بکرے کو دیکھتا

ہے پھر غراہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ”بالک بہت سے لوگ مجھے راون کہتے ہیں اور میں بھی خود کو راون کہلوانا پسند کرتا ہوں میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ کون ہو تم؟ اور کس طرح انڈیا میں داخل ہوئے؟“ وہ لمحہ بھر کے لئے رکا اور پھر قدرے توقف سے کہا۔ ”اگر تمہیں اپنا جیون پیارا ہے تو سیدھی طرح اقرار کرلو کہ تم پاکستانی جاسوس ہو اور دہشت گردی کے ارادے سے انڈیا میں داخل ہوئے تھے۔“

”نہیں یہ جھوٹ ہے میں جاسوس نہیں۔“

سلمان چلا اٹھا۔

راون نے مسکرا کر اسے دیکھا اور کہا۔ ”اسے الٹا لٹکا دو۔“ حکم ملنے کی دیر تھی چھت کے ہک سے لٹکی زنجیر سے سلمان کو باندھ کر الٹا لٹکا دیا گیا راون کے حکم پر اس کا ایک ساتھی ایک موٹا سا ڈنڈا لے آیا اور سلمان کے جسم پر بے دردی سے برسانے لگا کچھ دیر تو سلمان دانت بھینچے تکلیف برداشت کرتا رہا لیکن آخر کب تک اذیت سہنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے جب وہ حد ختم ہوئی تو لاک اپ سلمان کی چیخوں سے گونج اٹھا بالآخر وہ مار کھاتے کھاتے بے ہوش ہوگیا۔

راون کے اشارے پر اس کے ساتھیوں میں سے دوسرے نے باہر سے پانی کا بھرا ہوا جگ لایا اور سلمان کے چہرے پر پانی پھینکا سلمان نے ہوش میں آکر اپنے سامنے تن کر کھڑے راون کو دیکھا اور کراہنے لگا اس کے پورے جسم میں درد اور اذیت کی شدید ترین لہریں دوڑ رہی تھیں اور جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ ”اسے نیچے اتار دو۔“ راون نے حکم دیا اور ان دونوں نے سلمان کی ٹانگوں سے لپٹی زنجیریں کھولیں اور اسے اتار کر بے رحمی سے فرش پر پھینک دیا راون آگے بڑھا اور اپنا دایاں پاؤں اس کے رخسار پر رکھ کر بولا۔ ”یہ ہلکا سا ٹریلر تھا میں تجھے سوچنے کے لئے صبح تک کا وقت دیتا ہوں اچھی طرح سوچ لے لیکن اتنا یاد رکھنا پھر بھی اگر تو نہیں مانا تو تجھے پوری فلم دکھاؤں گا۔“ وہ جوتے سے اس کے رخسار کو مسلتے ہوئے بولا اور پھر وہ تینوں لاک اپ سے باہر نکل گئے۔

جب کہ سلمان فرش پر پڑا کراہتا رہا۔ اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اٹھ کر بیٹھ سکے درد اور تکلیف کی کیٹلی

چغل خور

ایک دن ایک شخص امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ ایک گزارش ہے مگر تنہائی میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

امیر المومنین نے تخلیہ کرا کے ان سے کہا۔ ”کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔ اگر تمہاری بات سچ ہوئی تو تم تعریف کے مستحق ہوگے اور جھوٹ ہوئی تو ملامت کے قابل سمجھے جاؤ گے۔“

اس شخص نے عرض کی۔ ”فوج کا ایک شخص جو فلاں مقام پر متعین تھا، رخصت لئے بغیر اپنے گھر آیا ہوا ہے۔ مجھے اس طرح معلوم ہوا کہ وہ میرے پڑوس میں رہتا ہے۔“

امیر المومنین نے جواب دیا۔ ”یہ چغلی کھا کر تم نے اپنے خلیفہ کی عزت اور وفاداری کا حق تو ادا کردیا لیکن ہمسائیگی کے حقوق کی گردن پر کند چھری پھیر دی ہے۔ اگر تمہاری بات سچ نکلی تو تمہیں اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا اور اگر غلط ثابت ہوئی تو تمہیں سزا ملے گی کیونکہ تم نے جھوٹ بولنے کی جرأت کی ہے۔ خیر میں اس مرتبہ تمہیں معاف کرتا ہوں۔ لیکن اتنا یاد رکھو کہ میرے نزدیک چغل خور سے زیادہ برا آدمی کوئی نہیں ہے کیونکہ اگر وہ سچ کہتا ہے تو بے ضرورت ثابت ہوتا ہے اور جھوٹ بولتا ہے تو مصیبت میں پھنستا ہے۔“

امیر المومنین کی ان باتوں سے لوگوں کے دلوں پر ان کی محبت کا سکہ بیٹھ گیا۔

(عمیرہ، کراچی)

لہریں پورے بدن میں سرایت کر چکی تھیں۔
اتنی سخت اذیت سہنے کے باوجود بھی وہ بریرہ اور ابرش کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ نہ جانے ان پر کیا بیتی۔ کچھ دیر بعد لاک اپ کا دروازہ کھلا سلمان نے گردن گھما کر دیکھا راون کے دو ساتھی کسی شخص کو لاک اپ میں پھینک کر جا چکے تھے اس شخص کا سفید کرتا شلوار جگہ جگہ پھٹا ہوا تھا اور جسم کے تقریباً ہر حصے سے خون بہہ رہا تھا وہ منہ کے بل بے حس و حرکت پڑا تھا۔
سلمان کچھ دیر بعد کہنیوں کے بل رینگتا ہوا اس شخص تک پہنچا اور اسے جیسے ہی سیدھا کیا اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اسے ایسا لگا کہ جیسے آسمان پھٹ کر زمین پر آ گرا ہو، وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے سکتہ زدہ سا اسے دیکھ رہا تھا اس کے بدن سے جیسے جان ہی نکل گئی تھی شاید وہ پھانسی کے تختے پر کھڑا ہوتا تو اس کی ذہنی وہ قلبی کیفیت وہ نہ ہوتی جو اس وقت تھی اسے اس قدر شدید ذہنی شاک لگا تھا کہ شدید ترین تکلیف کے اثرات غائب ہو چکے تھے اور وہ اٹھ بیٹھا تھا اسکے سامنے اس کے والد کرنل توحید بے حس و حرکت پڑے تھے وہ قسمت کی بے حسی پر کراہ اٹھا اور روتے ہوئے کرنل کو جھنجھوڑ نے لگا۔ ''اٹھئے ابوجی آپ کو کیا ہوا۔ یہ ظالموں نے کیا کر دیا ہے؟''
اس کی آہ وزاری سے کچھ ہی دیر میں کرنل توحید کے جسم میں تحریک ہوئی اور انہوں نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں اور بے تاثر نگاہوں سے اس نے دیکھا ان کی آنکھوں میں شناسائی کی ہلکی سی رمق بھی نہیں تھی۔ ان درندوں نے بڑی بے رحمی سے کرنل توحید کو تارچر کیا تھا سر سے بہنے والا خون چہرے کو رنگین کر چکا تھا۔
ناک کی ہڈی گھونسے مار مار کر پچکا دی گئی تھی بدن میں جگہ جگہ شاید ڈرل مشین سے چھید کئے گئے تھے ہاتھوں اور پاؤں کے سارے ناخن ٹوٹے ہوئے تھے اور شاید جسم کی کئی ہڈیاں بھی ٹوٹی ہوئی تھیں۔ یہ سفاکی اور بربریت کی انتہا تھی۔ ''ابوجی میں سلمان ہوں آپ کا بیٹا۔'' وہ ان کا سر اپنی گود میں رکھ کر بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ ''سلمان میرا بیٹا۔'' وہ بڑبڑائے اور آنکھوں میں ہلکی سی چمک دوڑ گئی۔
''تم کیسے...... ہو بیٹا...... اور یہاں کیسے پہنچے؟؟''
''آپ ان باتوں کو چھوڑیں اور بتائیں آپ تو پاکستان میں تھے پھر ان درندوں کے ہتھے کیسے چڑھے۔''
کرنل توحید نے اٹکتے ہوئے رک رک کر جو سرگزشت سلمان کو سنائی وہ خاصی ہولناک تھی کرنل توحید کے بارے میں سب جانتے تھے کہ ان کا تعلق آرمی سے ہے لیکن اس بات سے کوئی بھی واقف نہیں تھا کہ وہ آرمی کے اسپیشل فورس ایس ایس جی سے تعلق رکھتے تھے جو ہمیشہ ملک دشمنوں سے برسر پیکار رہتی ہے پاکستان کی تاریخ گواہ ہے کہ پاکستان آرمی نے پیارے وطن پاکستان کے لئے انمٹ قربانیاں دیں۔
بولتے بولتے کرنل توحید ہانپنے لگے تھے اور سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا تھا ان کے جسم کو جھٹکے سے لگ رہے تھے اور نزع کی سی کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ ''ابوجی ابوجی۔ سلمان چیخنے لگا اسی وقت کرنل توحید کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی تھی۔ اور وہ چیختے ہوئے کرنل توحید کے سینے پر سر رکھ کر رونے لگا۔''
رات نصف سے زائد بیت چکی تھی وہ تیس سالہ نوجوان بچوں کی طرح سسک رہا تھا بلک رہا تھا رات کے سناٹے میں سلمان کے رونے بلکنے اور سسکیوں کی آواز کچھ زیادہ ہی گونج رہی تھی جس کا ردعمل کچھ دیر بعد سامنے آیا اور را کے دو کارندے لاک اپ کے دروازے پر پہنچے ایک نے اسے گالیاں دیتے ہوئے کہا۔ ''سالے کی قسمت اچھی ہے جو کچھ دیر پہلے راون صاحب گھر جا چکے ہیں ورنہ اسے اس طرح شور مچانے کی پاداش میں جان سے مار ڈالتے۔''
انہوں نے لاک اپ کا دروازہ کھلوایا اور اندر داخل ہو گئے سلمان ان سے بے پرواہ کرنل توحید کی لاش سے لپٹا رو رہا تھا ان میں سے ایک نے لاپرواہی سے رائفل پکڑ رکھی تھی جبکہ دوسرے نے

شانے سے رائفل لٹکا رکھی تھی۔

''ابے سالے کیوں شور مچا رکھا ہے، آتنک وادی سے لپٹا، بین تو ایسے کر رہا ہے کہ جیسے یہ کمینہ اس کا باپ ہے۔'' اس نے رائفل کا دستہ سلمان کو رسید کرتے ہوئے لڑکھڑاتی زبان میں کہا غالباً وہ دونوں ہی شراب کے نشے میں دھت پڑے تھے۔ سلمان کی چیخ و پکار پر تنگ آ کر اسے خاموش کروانے آئے تھے۔

ابھی اس نے رائفل کا دستہ سلمان کو رسید کیا ہی تھا کہ ان کی نظروں کے سامنے بجلی سی کوندی۔ زخموں سے چور چور سلمان نے اس کی رائفل پر ہاتھ ڈالا اور دوسرے کے سینے پر زوردار سائیڈ کک رسید کی۔ وہ اڑتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔ رائفل بردار نے رائفل پر قابو پانے کی کوشش کی تو سلمان نے کہنی کا بھرپور وار اس کے چہرے پر کیا۔ اس کی ناک کی ہڈی اور سامنے کے چند دانت ٹوٹ گئے۔ وہ چیختا ہوا گرا رائفل سلمان کے ہاتھ میں آ چکی تھی دوسرا دیوار سے ٹکرا کر ابھی سنبھلا بھی نہ تھا کہ سلمان نے لاک پن ہٹا کر فائر کر دیا رائفل سنگل موڈ پر تھی گولی اس شخص کی گردن میں لگی سلمان نے برق سرعت سے مڑ کر دوسرے کے سر میں بھی گولی اتار دی۔

اب سوچنے یا سمجھنے کا وقت نہیں تھا اسے معلوم تھا کہ گولیوں اور چیخوں کی آواز اس عمارت میں گونج چکی ہے اور کچھ ہی دیر میں یہاں موجود موت کے ہرکارے اس لاک اپ کی طرف دوڑ پڑیں گے اس نے کرنل توحید کی لاش کندھے پر ڈالی اور لاک اپ سے باہر نکل آیا۔

اچانک عمارت گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور انسانی چیخوں سے گونج اٹھی۔ سلمان چونک پڑا اور سوچنے لگا گولیوں اور انسانی چیخوں کا مطلب ہے کہ کسی منظم گروپ نے اس ٹھکانے پر حملہ کر دیا ہے پھر دوطرفہ فائرنگ شروع ہو گئی۔

سلمان کوریڈور کے آخری سرے پر پہنچا ہی تھا کہ ایک طرف سے اچانک ایک رائفل بردار دوڑتا ہوا سامنے آ گیا اس سے پہلے کہ وہ گولی چلاتا سلمان نے پہل کر دی گولی رائفل بردار کے سینے میں عین دل کے مقام میں پیوست ہو گئی۔ وہ کوریڈور سے نکل کر باہر پہنچا ہی تھا کہ ایک طرف سے تڑتڑاہٹ کی آواز کے ساتھ گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی مگر بروقت ایک ستون کی آڑ میں چھلانگ لگا کر اس نے جان بچائی۔ پھر ایک طرف دو مسلح افراد کو بھاگتے دیکھ کر اس نے ان کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ وہ دونوں بھی چیختے ہوئے ڈھیر ہو گئے کچھ دیر بعد خاموشی چھا گئی تو وہ ستون کی آڑ سے نکل کر برآمدے میں پہنچا یہاں بھی پانچ چھ افراد کی گولیوں سے چھلنی لاشیں پڑی تھیں وہ مین گیٹ کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ایک طرف سے اچانک تین مسلح افراد نکلے اور اسے گھیر لیا۔

ان تینوں نے چہروں پر نقاب چڑھائے ہوئے تھے دو شلوار قمیص اور ایک پینٹ شرٹ میں ملبوس تھا پینٹ شرٹ والا آگے بڑھا۔ ''تمہاری حالت سے پتہ چلتا ہے کہ تم بھی یہاں قیدی ہو لیکن یہ تم نے کسے اٹھا رکھا ہے؟'' وہ آگے بڑھا اور کرنل توحید کا چہرہ دیکھا۔ ''اوہ یہ تو کرنل صاحب ہیں لیکن یہ تو؟'' نوجوان کی آواز بھرا گئی۔

جس سے سلمان نے اندازہ لگایا کہ وہ کرنل توحید کا کوئی ہمدرد ہے۔ ''میں کرنل توحید کا بیٹا سلمان ہوں۔'' اس نے کہا تو نوجوان چونک پڑا۔ اس نے کہا یہ وقت ان باتوں کا نہیں جلدی یہاں سے نکلو اس سے پہلے کہ پولیس یا ایجنسیاں یہاں کا رخ کریں۔ اس کا ایک ساتھی بولا اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

باہر ایک بڑے ٹائروں والی جیپ کھڑی تھی یہ آبادی سے دور کوئی ویران علاقہ تھا دور دور تک راکے اس ٹھکانے کے علاوہ کوئی دوسری عمارت نہیں تھی راستے میں انہوں نے اپنے نقاب اتار دیئے تھے نصف گھنٹے بعد جیپ ایک قبرستان کے قریب رکی تو سلمان چونک پڑا، حیدر نے اس کی طرف دیکھا اور کہا سلمان ہم اس مشن پر حکومت کی طرف سے نہیں آئے یہ ہمارا ذاتی فیصلہ تھا جو ملک اور قوم کے مفاد میں ہم نے کیا۔ اور ہم سر پر کفن باندھ کر انڈیا کی سرزمین میں داخل ہوئے اپنے وطن کے لئے، جب ہم فوجی جسم پر گولیاں کھاتے

ہیں تو اس وقت ہماری سوچ کوئی تمغہ یا داد وصول کرنے کی نہیں ہوتی اب ظاہر ہے ان حالات میں کرنل توحید کی میت پاکستان نہیں لے جائی جاسکتی بہتر یہی ہے کہ انہیں یہیں سپرد خاک کردیا جائے یہ مسلمانوں کا قبرستان ہے اس قبرستان میں کرنل توحید کی قبر بے نام ونشان تو رہے گی لیکن اس کا اجر اللہ انہیں دے گا اور وہ ہمارے دلوں میں زندہ رہیں گے۔''

وہ اسلحہ جیپ میں چھوڑ کر کرنل توحید کی لاش لے کر قبرستان میں داخل ہوئے گورکن کا کچی اینٹوں سے بنا مکان قبرستان کے ایک گوشے میں تھا جسے رات کے اس پہر انہوں نے بمشکل جگایا وہ ادھیڑ عمر باریش شخص تھا کشادہ پیشانی پر سیاہ رنگ کا سجدے کا نشان صاف نظر آرہا تھا جو یہ ظاہر کررہا تھا کہ وہ پانچ وقت کا نمازی ہے۔

''باباجی ہمارے پاس وقت بالکل نہیں دشمن ہمارے پیچھے ہے اور کسی بھی وقت آسکتا ہے اس کے باوجود ہم آپ سے جھوٹ نہیں بولیں گے مختصراً اتنا سمجھ لیں کہ توحید صاحب دشمن کے اہلکاروں کے ہاتھوں شہید ہوچکے ہیں اور شہید کو کفن یا نہلانے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہوتی اور ویسے بھی ہم حالت جنگ میں ہیں برائے مہربانی ان کو ان کی آخری آرام گاہ میں پہنچادیں اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔'' گورکن نیک اور مخلص انسان تھا اور پھر حیدر کے لہجے میں سچائی کی جھلک تھی۔ گورکن نے جلدی ہی قبر تیار کردی۔ حیدر اور اس کے ساتھیوں نے بھی گورکن کا ہاتھ بٹایا۔ غلام مصطفیٰ نے نماز جنازہ پڑھائی پھر انہوں نے کرنل توحید کی میت کو فوجی انداز سے سلیوٹ کیا انہیں دفن کرنے کے بعد وہ گورکن سے رخصت ہوگئے حیدر اور اس کے ساتھیوں کے ذہن میں ملی نغمے کے بول گونج رہے تھے۔ (اے راہ حق کے شہیدو، وفاؤں کی تصویرو، تمہیں وطن کی ہوائیں سلام کہتی ہیں)

جبکہ سمن کے دل ودماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں وہ دربدر ہونے کے ساتھ ساتھ ماں کی ممتا اور باپ کے سائے سے محروم ہوچکا تھا۔

ابرش اور بریرہ نہ جانے کہاں اور کس حال میں تھیں دشمن نے ٹھکانے پر حملے اور دشمن اہلکاروں کے مارے جانے کے بعد شہر میں ہائی الرٹ تھا پولیس مختلف مقامات پر گشت کرتی پھر رہی تھی اس لئے حیدر نے سڑک چھوڑ کر آبادی کا رخ کرلیا اسے معلوم تھا کہ پولیس کا گشت سڑکوں تک محدود ہے اور وہ زیادہ توجہ شہر سے نکاسی کے راستے پر رکھے ہوں گے چنانچہ گلی محلوں سے گزرتی ہوئی جیپ نہایت سکون سے ایک پوش علاقے میں داخل ہوئی اور ایک بنگلے کے سامنے جارکی، سمن، غلام مصطفیٰ اور ناصر حیدر کے اشارے پر جیپ سے اترے جبکہ حیدر جیپ تیز رفتاری سے دوڑتا ہوا ایک طرف نکل گیا۔ ''حیدر کہاں جارہا ہے؟'' سمن نے پوچھا۔

''گاڑی چوری کی ہے۔ اسے یہاں سے دور چھوڑنے گیا ہے۔'' غلام مصطفیٰ نے جواب دیا۔

کال بیل بجانے پر دروازہ ایک ادھیڑ عمر شخص نے کھولا وہ اس کے ہمراہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ ''یہ سلیمان بھائی ہیں اور بھائی یہ سمن ہے پولیس کی حراست سے بھاگا ہوا ملزم اور ہمارا دوست کچھ دن اسے یہاں چھپا کر رکھنا ہے۔'' وہ ان دونوں کا آپس میں تعارف کرواتے ہوئے بولا۔

''تمہارا دوست ہے تو ہمارا بھی بیلی ہوا ناں تم فکر مت کرو اپن اس کے لئے جان دے دے گا مگر اس پر آنچ نہ آنے دے گا۔'' وہ اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ان کی گپ شپ کے دوران حیدر علی بھی لوٹ آیا۔ ناصر اس دوران چائے بنالایا تھا حیدر علی نے چائے کا کپ اٹھایا اور بولا۔ ''سمن ہم سب کے نام تو تم جان ہی چکے ہو۔ ناصر اور غلام مصطفیٰ ہمارے اس مشن میں شریک اور ہمارے ساتھی ہیں۔ جب کہ سلیمان بھائی کا تعلق انڈر ورلڈ سے ہے محاصرے کے دوران کرنل توحید کے حکم سے بھاگنے کے بعد ہماری حادثاتی طور پر ان سے ملاقات ہوگئی۔

واقعہ کچھ اس طرح پیش آیا کہ ہم پناہ کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے کہ اس دوران سلیمان

بھائی اپنی کار پر وہاں سے گزرے اس دوران مخالفت سمت سے دو موٹر سائیکل سوار اس کے سامنے آگئے اتفاق سے ہماری نظر موٹر سائیکل سواروں پر پڑگئی پیچھے بیٹھے شخص نے سلیمان بھائی کی طرف پسٹل کا رخ کیا ہی تھا کہ غلام مصطفیٰ برقی سرعت سے حرکت میں آیا اور اپنے نیفے میں اڑسا پسٹل نکال کر ان دونوں کو اڑا دیا۔ سلیمان بھائی ہمیں اس بنگلے میں لے آیا ہم نے اسے احتیاطاً اپنی اصلیت نہیں بتائی اور خود کو جرائم پیشہ ظاہر کیا۔ سلیمان بھائی کو اپنے گروہ میں نمبر دو کی پوزیشن حاصل ہے۔ یہ انڈرورلڈ کے ڈان رحیم یار خان کے دست راست ہیں اس بنگلے میں سلیمان بھائی کبھی کبھار آتا ہے دن رات مسلسل اس ٹھکانے کی تلاش میں کوشاں تھے جہاں کرنل توحید قید تھے آج دشمن اس ٹھکانے کا پتہ چلتے ہی ہم مکمل تیاری کے ساتھ وہاں حملہ آور ہوگئے اور وہاں موجود اہلکاروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ کچھ کو غالباً تم نے لڑھکا دیا مگر افسوس کرنل توحید جب تک شہید ہوچکے تھے خیر یہ نصیب کی بات ہے۔ شہادت کا اعزاز ان کے مقدر میں لکھا جاچکا تھا۔ ہمیں کرنل توحید پر فخر ہے۔

اب تم بتاؤ تم انڈیا میں کیسے پہنچے؟'' سلمان نے اپنی داستان حیات سنا ڈالی جسے حیدر علی اور اس کے ساتھی حیرت سے سنتے رہے۔

''حیرت انگیز بلکہ ناقابل یقین کہانی ہے ایسا لگ رہا ہے کہ تم کوئی الف لیلیٰ طرز کی ماورائی کہانی سنا رہے ہو۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ قدرت کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ شاہ زین کا تم سے ملنا پھر عفریت کا خاتمہ اور ابرش کی تلاش میں انڈیا پہنچ کر آرمی کے ہاتھوں گرفتار ہو کر دشمن کی قید میں جانا پھر کرنل توحید سے تمہاری آخری ملاقات یہ سب اس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ شاید قدرت نے تمہیں کسی خاص مقصد کے لئے چن لیا ہے۔ یہ ہماری ذاتی جنگ نہیں، ہم عظیم مقصد کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں دہشت گردی کے اس ٹریننگ سینٹر کے خاتمے سے ہمارا ملک بہت بڑے خطرے سے محفوظ ہو جائے گا اور بہت سے مظلوم انسانوں کی زندگی محفوظ ہو جائے گی۔'' حیدر علی نے کہا اور اٹھ کر کمرے میں ایک طرف رکھا ٹی وی آن کیا یہ کوئی نیوز چینل تھا۔

بریکنگ نیوز چل رہی تھیں نیوز کاسٹر کی چیختی چلاتی آواز سنائی دے رہی تھی خبر سے متعلق سلائیڈنگ نیوز بیلٹ بھی چل رہی تھی پاکستانی جاسوس کی ویڈیو کلپ آشکارہ ہوگئی۔ ''اس ویڈیو کلپ میں آپ قاتل کا چہرہ صاف دیکھ سکتے ہیں جو اپنے ساتھیوں کی مدد سے را کی حراست سے فرار ہوگیا اور سات اہلکاروں کو قتل کر دیا اس ویڈیو کلپ میں آپ اس آتنک وادی کا چہرہ صاف دیکھ سکتے ہیں۔''

ٹی وی چینل نے سلمان کا چہرہ واضح کر رکھا تھا اس نے کرنل توحید کی لہولہان لاش اٹھا رکھی تھی دوسری طرف حیدر علی، غلام مصطفیٰ اور ناصر کی تصویر تھی ان کے ہاتھوں میں رائفلیں اور چہروں پر نقاب تھے سر نشان بار بار سلمان کی تصویر پر بلنک کر رہا تھا غالباً یہ را کی عمارت میں نصب کیمروں سے حاصل کی گئی فوٹیج تھیں۔

حیدر علی نے ٹی وی آف کیا اور گھمبیر لہجے میں بولا۔ ''اس کا مطلب ہے اب تمہیں باہر نکلنے میں احتیاط برتنی ہوگی بلکہ مناسب یہی ہے کہ میک اپ سے تمہارا رنگ وروپ اور حلیہ تبدیل کر دیا جائے۔''

''نہ جانے ابرش اور بریرہ کہاں ہوں گی اور کس حال میں ہوں گی؟'' سلمان کو خود سے زیادہ ان دونوں کی فکر تھی۔

''فکر مت کرو اللہ بہتر کرے گا ہمیں سب سے پہلے راجستھان میں واقع دہشت گردی کا وہ مرکز ٹریننگ سینٹر تباہ کرنا ہے جہاں سے ہمارے ملک میں دہشت گرد اور مہلک ہتھیار بھیجے جا رہے ہیں۔ اب سو جاؤ ہمیں کل یہاں سے روانہ ہونا ہے تاکہ جلد از جلد دہشت گردی کے اس مرکز کو ٹریس کر سکیں۔'' حیدر علی جمائی لیتے ہوئے بولا اور آنکھیں موند لیں۔

دوسرے روز صبح ناشتہ کرتے ہی حیدر علی اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ نکل گیا۔ جبکہ سلیمان بھائی سلمان کے ساتھ وہیں موجود تھے رات آٹھ بجے کے قریب وہ دونوں ٹی وی کے سامنے بیٹھے ایک کامیڈی شو

دیکھ رہے تھے۔ حیدر علی اور اس کے ساتھی اب تک واپس نہیں لوٹے تھے۔

اچانک فضاء پولیس موبائل کے ہوٹرز سے گونج اٹھی ان کے چہروں کا رنگ فق ہوگیا خاص کر سمان سخت خوف زدہ تھا۔ وہ دونوں ہی اچھی طرح جانتے تھے کہ پولیس کی آمد کا کیا مطلب ہے پولیس کے ساتھ ہوسکتا ہے را کے شکاری کتے بھی ہوں اور گھر گھر تلاشی لی جائے۔ سمان کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور کنپٹیاں سائیں سائیں کر رہی تھیں۔ پھر بھاری بوٹوں کی آواز گلی میں گونجنے لگی۔

''بہتر یہی ہے کہ تم چھت پر چلے جاؤ اور خیال کرنا جھکے ہوئے انداز میں چلنا ورنہ تم دیکھ لئے جاؤ گے یہاں اکثر گھروں کی چھتیں آپس میں ملی ہوئی ہیں تم ان چھتوں سے فرار ہونے کی کوشش کرو۔'' سلیمان بھائی تھوک نگلتے ہوئے بولے۔

وہ مقامی فرد تھا اور پھر اس کا تعلق انڈرورلڈ سے بھی تھا۔ مقامی پولیس سمیت اعلیٰ افسران کو رحیم یار خان کی طرف سے بھاری رقم بطور نذرانہ پیش کی جاتی تھی اس لئے اسے اپنا ڈر نہیں تھا لیکن اگر سمان کو اس کے بنگلے سے گرفتار کرلیا جاتا تو وہ کسی بڑی مشکل میں پھنس سکتا تھا اس سے پہلے وہ حیدر علی اور اس کے ساتھیوں کو عام جرائم پیشہ ہی تصور کرتا تھا مگر رات کو ٹی وی کے نجی چینل پر سمان کی تصویر اور خبر سن کر اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا تھا وہ تصور ہی تصور میں پھانسی کا پھندا اپنے گلے میں پڑتا دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ پولیس سے جان چھڑانے کے بعد حیدر علی اور اس کے ساتھیوں سے قطع تعلق کرلے گا۔

کال بیل کی آواز سن کر وہ مرے مرے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھا جب کہ سمان جھکے ہوئے انداز میں سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر جا پہنچا۔ یہاں تین فٹ کے قریب باﺅنڈری وال کی دیوار تھی اور سلیمان بھائی کے کہنے کے مطابق اکثر بنگلوں کی چھتیں آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ وہ پانچ چھ گھروں کی چھتیں پھلانگتا ہوا اس بنگلے کی چھت پر جا پہنچا تو سرد آہ بھر کر رہ گیا ساتھ والا بنگلہ تین منزلہ تھا جس پر چڑھنا مشکل تھا اور اگر وہ کوشش کرتا تو بھی سڑک سے دیکھ لیا جاتا۔ لہٰذا جھکے ہوئے انداز میں سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچا، حیرت انگیز طور پر اس گھر میں خاموشی تھی وہ لاؤنج سے ہوتا ہوا ایک کمرے میں داخل ہوا۔ ایک طرف بیڈ پڑا تھا اور دیوار کے ساتھ دو طرف گاؤں تکئے پڑے تھے بیڈ کے بالکل سامنے والی دیوار پر چھ فٹ لمبا اور چوڑا آئینہ ایک ڈریسنگ ٹیبل کا حصہ تھا لیکن بیڈ کا پورا منظر دکھاتا تھا۔ فرش پر قالین بچھا ہوا تھا اٹیچ باتھ روم کا دروازہ ہلکا سا کھلا ہوا تھا اور اندر سے پانی گرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی اور گنگنانے کی مترنم نسوانی آواز سنائی دے رہی تھی وہ خاموشی سے بیڈ کے نیچے گھس کر لیٹ گیا اگرچہ یہ جگہ بھی چھپنے کے لئے مناسب نہ تھی وہ گھر گھر تلاشی کے دوران یقیناً پکڑا جاتا۔

اس وقت اس پر یہی مثال صادق آرہی تھی کہ'' ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔'' وہ بیڈ کے نیچے لیٹا باہر دیکھ رہا تھا کہ پانی گرتا بند ہوگیا اور گیلے بالوں کو تولئے میں لپیٹے باتھ روم سے ایک حسین وجمیل چوبیس پچیس سالہ لڑکی برآمد ہوئی دلکش متناسب جسم اور قیامت خیز نشیب وفراز اور عریاں جسم دیکھتے ہی اس کی حالت غیر ہونے لگی اور جسم پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں وہ کوشش کے باوجود اس کے سراپے سے اپنی نظریں نہ ہٹا سکا۔ لڑکی نے بڑی بے نیازی سے الماری کا ایک پٹ کھولا اور اپنے لئے لباس منتخب کرنے لگی۔

اس نے لباس پہنا اور اپنے مقابل آئینے میں اپنے سراپے کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی نظر سمان پر پڑی۔ وہ چونکی لیکن ڈری نہیں چند لمحے کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر اسے دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''اے مسٹر باہر نکلو۔''

وہ ایک گہرا سانس لے کر باہر نکلا۔ ''تم کون ہو؟ اور بیڈ کے نیچے کیوں چھپے ہوئے تھے؟'' لڑکی نے اطمینان سے پوچھا اس کا یہی اطمینان سمان کو حیرت میں مبتلا کر رہا تھا۔

''تفصیل بتانے کا میرے پاس وقت نہیں بس

اتنا جان لو کہ میرے پیچھے پولیس پڑی ہے اور میری تلاش میں ہر گھر کی تلاشی لی جارہی ہے۔'' سمان نے جواب دیا۔ اسے اس لڑکی پر حیرت تھی جو اس سے خوف زدہ ہونے کے بجائے اس قدر اطمینان سے سوال وجواب کررہی تھی اس کی جگہ اگر کوئی عام لڑکی ہوتی تو اسے دیکھتے ہی چیخ پڑتی۔

''تمہیں مالنی نے کمرے میں آتے ہوئے تو نہیں دیکھا؟'' لڑکی نے پوچھا۔

''کون مالنی؟'' سمان نے پوچھا شاید وہ دوسرے کمرے میں کلدیپ کے ساتھ ہوگی، تم یہیں بیٹھو میں اسے سمجھا کر آتی ہوں۔'' وہ کمرے سے باہر نکلی اور دو منٹ میں ہی واپس لوٹ آئی۔ اس نے کمرے کا دروازہ بھیڑ دیا اور بولی۔

''کلدیپ سو رہی تھی۔ مالنی اس کے پاس تھی پھر اس نے لباس اتارا اور بیڈ پر لیٹ کر کمبل اوڑھ لیا سمان اس کی اس حرکت پر ہکا بکا رہ گیا اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ یکا یک اسے کیا ہوا جو اتنی گھمبیر صورتحال میں ایک اجنبی شخص کی موجودگی میں بے لباس ہو کر بیڈ پر جا لیٹی ہے وہ ساتھ ہی ساتھ خود کو کوس بھی رہا تھا جو جان بچانے کے لئے اس گھر میں گھس آیا تھا اسے جان کے لالے پڑے تھے جبکہ اس لڑکی کو ہری ہری سوجھ رہی تھی۔

اچانک کال بیل کی آواز سنائی دی اور وہ لرز اٹھا گویا پولیس اہلکار اس بنگلے تک پہنچ چکے تھے۔ اسی وقت لڑکی نے اسے مخاطب کیا۔'' بچنے کی ایک ہی صورت ہے تم بھی کپڑے اتار کر کمبل میں گھس جاؤ۔''

سمان تذبذب میں مبتلا ہو گیا اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ لڑکی کیا چاہتی ہے۔ موت سمان کے سر پر کھڑی تھی جبکہ وہ اس کے ساتھ رنگ رلیاں منانا چاہتی تھی یہ سوچتے ہی اس کا خون کھولنے لگا اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس لڑکی کا گلا دبا دے۔'' سوچو مت میں جو کہہ رہی ہوں وہ کرو ورنہ تم پکڑے جاؤ گے۔'' لڑکی نے کہا۔

ادھر کال بیل مسلسل بج رہی تھی اسے مجبوراً لڑکی کی ہدایت پر عمل کرنا پڑا وہ کمبل میں گھسا ہی تھا کہ اس آفت کی پرکالہ نے اسے اپنے اوپر گھسیٹ لیا۔ اور پے در پے کئی بوسے لے کر لپ اسٹک سے اس کا چہرہ لال کر دیا اس کے سلگتے ہوئے جسم کی آنچ سے خود سمان کی حالت بھی غیر ہو چکی تھی۔

پھر شاید مین گیٹ کھول دیا گیا تھا بوٹوں کی آواز سنائی دی پھر ایک بھاری بھرکم مردانہ آواز گونجی۔'' یہاں کون رہتا ہے؟''

''جی گوپی صاحب اور ان کی پتنی رادھا اور ان کی پانچ سالہ بیٹی کلدیپ۔'' کرخت نسوانی آواز میں جواب دیا گیا۔

سمان سمجھ گیا جواب دینے والی اس لڑکی کی ملازمہ مالنی تھی۔'' ہم ایک خطرناک آتنک وادی کی تلاش میں ہیں۔ کوئی اجنبی تو یہاں نہیں آیا۔؟''

''نہیں جی یہاں تو کوئی نہیں آیا۔'' ملازمہ نے جواب دیا۔

''تمہارے صاحب اور بیگم صاحبہ کہاں ہیں؟''

''جی وہ اپنے بیڈ روم میں ہیں۔''

''ان کا بیڈ روم کہاں ہے؟'' تحیر زدہ لہجے میں یہ سوال پوچھا گیا۔

دروازے کی طرف آتے قدموں کی چاپ سن کر وہ دھک سے رہ گیا۔ ادھر رادھا نے اسے اپنی مرمریں بانہوں میں جکڑ لیا اور اپنے لب اس کے ہونٹوں میں پیوست کر دیئے اسی وقت دروازہ کھلا اور دو افراد نے اندر جھانکا ان میں سے ایک پولیس کی وردی میں ملبوس تھا جب کہ دوسرا سادہ لباس تھا۔ ان کی نظریں قالین پر پڑے لباس سے ہوتی ہوئی بیڈ پر پڑیں کمرے کے اندر کا ہیجان خیز منظر دیکھتے ہی وہ بوکھلا گئے اور واپسی کے لے مڑے رادھا غضب کی اداکاری کرتے ہوئے کسمسا کر سمان سے الگ ہوئی۔

''ہائے رام تم نے روم کا دروازہ بھی اندر سے لاک نہیں کیا'' پولیس اہلکار جاتے ہوئے دوبارہ بھیڑ چکے تھے۔

سمان نے بیڈ سے اترنا چاہا تو رادھا نے اسے

دوبارہ دبوچ لیا۔ ''ہلنا مت۔'' وہ سرگوشی میں بولی اور اپنی پیش قدمی جاری رکھی۔ ''اب میرا انعام بھی دیتے جاؤ ورنہ میں چیخ کر انہیں بلالوں گی۔'' وہ اس کے لبوں کو چومتے ہوئے بولی تو مجبوراً سمان کو بھی پیش قدمی کرنا پڑی۔ ویسے بھی اس کے اپنے جذبات بھی مشتعل ہوچکے تھے بھری ہوئی ندی کی تند و تیز لہروں میں وہ ڈوبتے رہے ابھرتے رہے جب طوفان تھما تو سمان اپنے آپ سے شرمندہ تھا جبکہ رادھا آسودہ ہوچکی تھی۔

پولیس اہلکار تلاشی لے کر جاچکے تھے وہ نظریں جھکا کر بولا۔ ''تم نے مجھے مجبور کرکے اچھا نہیں کیا۔''

''اس میں برا ہی کیا ہے۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے کام آئے اور اگر میں ایسا نہ کرتی تو تمہارا بچ نکلنا مشکل تھا۔'' اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''اچھا اب میں چلتا ہوں۔'' وہ بیڈ سے اترنے لگا تھا کہ رادھا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ اپنے قریب بیٹھا لیا۔

''ابھی کچھ دیر تک یہاں سے جانے کا سوچنا بھی مت۔ وہ اسی علاقے میں ہوں گے اتنا تو میں جان ہی چکی ہوں کہ وہ پولیس والا تمہیں آتنک وادی کہہ رہا تھا اور کل رات ایک نیوز چینل پر تمہارے بارے میں بتایا گیا تھا اور تصویر بھی دکھائی گئی تھی تم پر پہلی نظر پڑتے ہی میں تمہیں پہچان چکی تھی مگر تمہارے چہرے کی معصومیت دیکھ کر مجھے یقین نہیں آیا کہ تم آتنک وادی ہوسکتے ہو اور سچی بات تو یہ ہے کہ تم مجھے پہلی ہی نظر میں اچھے لگے تھے اب تم سچ بتاؤ کیا کہیں واقعی تم جاسوس یا آتنک وادی تو نہیں؟''

''نہیں یہ جھوٹ ہے میں جاسوس یا دہشت گرد نہیں ہاں البتہ یہ سچ ہے کہ میں پاکستانی ہوں ایک شیطان صفت پجاری پرتاب بھوش میری منگیتر ابرش کو اغوا کرکے انڈیا لے آیا۔ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ سرحد پار کرکے انڈیا پہنچا۔ اور ابرش کو اس پجاری کی قید سے آزاد کروا کر واپس لوٹ رہا تھا کہ انڈین آرمی کے ہتھے چڑھ گیا۔

ابرش اور بریرہ کا کوئی پتہ نہیں کہ وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں مجھ پر قید کے دوران انسانیت سوز تشدد کیا گیا ان کا مطالبہ تھا کہ میں اپنے ناکردہ گناہ قبول کرلوں، اتفاق سے مجھے بھاگنے کا موقع مل گیا۔

''سمان نے بہت سی باتیں اس سے چھپالی تھیں۔

''سمان انسان کا چہرہ اور آنکھیں جھوٹ نہیں بولتیں تمہاری آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ تم سچ بول رہے ہو۔ ہاں البتہ ہوسکتا ہے کہ تم نے مجھ سے کچھ باتیں چھپائی ہوں۔''

سمان اس کی قیافہ شناسی پر دنگ رہ گیا دونوں لباس پہن چکے تھے وہ کچھ دیر تک سمان کی آنکھوں میں جھانکتی رہی پھر بولی۔ ''میرا تعلق اترپردیش کی ایک ریاست سے تھا۔ اسکرین پر اداکاراؤں کے جگمگاتے چہروں کو دیکھ کر میری آنکھوں میں بھی بہت لڑکیوں کی طرح خواب ابھرے کہ میں بھی بولی ووڈ کی سپراسٹار بن جاؤں۔۔ یہی سوچ کر گھر چھوڑا۔ ہیروئن تو بن نہیں سکی البتہ ایکسٹرا گرل ضرور بن گئی پروڈیوسر، ڈائریکٹر، کیمرہ مین غرض کہ ہر ایک نے بہتی گنگا میں ہاتھ دھوئے۔ اور میری مثال کٹی پتنگ کی سی ہوگئی ان ہی دنوں سیٹھ راکشی ورما کی نظر مجھ پر پڑی وہ پچپن سالہ کروڑپتی شخص تھا اور فائیواسٹار ہوٹل، گارمنٹس فیکٹریز امپورٹ ایکسپورٹ غرض کہ انڈیا کے علاوہ انٹرنیشنل سرکل میں بھی اس کا ایک نام تھا وہ دو جوان بیٹیوں کا باپ تھا اس کے باوجود وہ مجھ پر مرمٹا پہلے تو اس نے دوسروں کی طرح مجھے ٹشو پیپر سمجھ کر ہاتھ صاف کرنا چاہا مگر میں ٹھوکریں کھا کھا کر سنبھل چکی تھی مجبوراً اس نے مجھے شادی کی پیش کش کردی میں نے بھی تابناک مستقبل کے لالچ میں حامی بھرلی مگر شادی سے پہلے ایک گارمنٹس فیکٹری یہ گھر اور اچھی خاصی رقم بھی اپنے نام کروالی وہ شادی کے صرف دو سال تک زندہ رہا۔

اس کی موت ٹریفک حادثے میں ہوئی تھی بہت سے لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ ٹریفک حادثہ نہیں بلکہ قتل تھا۔ جو چالاکی سے بیٹوں نے کروایا۔ انہیں یہ ڈر تھا کہ کہیں ان کا باپ اپنا سب کچھ میرے نام نہ کردے۔

اور پھر جب تک راکیش درما زندہ رہتا وہ اس کے محتاج رہتے۔ ویسے بھی وہ صحت مند تھا ہوسکتا تھا مزید کئی سال زندہ رہتا۔ اس لئے انہوں نے باپ کا پتہ صاف کروادیا۔ میں مجبور عورت تھی ان سے ٹکر لے کر اپنا ہی نقصان کرتی اس لئے خاموش رہی۔

میں اپنی پرانی روش چھوڑ چکی تھی کیوں کہ میں نہیں چاہتی تھی کہ میری بیٹی میرا بویا ہوا کاٹے۔ شیر خوار کلدیپ باپ سے محروم ہوگئی تھی اب میں ہی اس کا سب کچھ تھی میں نے گارمنٹس فیکٹری میں ایک ایماندار منیجر رکھ لیا ہے بینک میں بھی اچھی خاصی رقم ہے اس لئے اچھی گزر بسر ہورہی ہے۔

کپڑے پہنتے سے تمہارا عکس دیکھتے ہی میں تمہیں پہچان چکی تھی کیوں کہ گزشتہ روز نیوز چینل پر تمہاری تصویر دیکھ چکی تھی نہ جانے کیوں تم مجھے بے ضرر لگے شاید یہ تمہارے چہرے کے بھولپن کا کمال تھا تمہیں پولیس سے بچانے کے لئے وہ ناٹک ضروری تھا اور اسی ناٹک کی وجہ سے وہ تمہارا چہرہ صحیح طور پر نہیں دیکھ پائے اور بوکھلا کر چلے گئے لیکن ناٹک کرتے سمے میں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی سچ تو یہ ہے کہ میں تمہیں من ہی من میں اپنا دیوتا مان چکی ہوں۔

مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اب تم سے دوبارہ جیون میں کبھی ملاقات نہ ہوگی لیکن آج کا دن اور یہ سندر لمحے مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے۔''

سلمان نے دیکھا رادھا کی آنکھوں کے گوشے بھیگ رہے تھے سلمان نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا اور اس کا بوسہ لیتے ہوئے بولا۔ ''میں بھی تمہارا احسان زندگی بھر نہیں بھلاسکوں گا اگر آج تم نہ ہوتیں تو یہ درندے نہ جانے میرے ساتھ کیا سلوک کرتے۔'' رادھا مسکرائی اور اس کے گلے میں بانہوں کا ہار ڈال دیا۔ وہ تقریباً دو گھنٹے رادھا کے ساتھ مزید اس کمرے میں رہا اور حسین لمحات گزار کر جس راستے سے آیا تھا اسی راستے سے لوٹ گیا۔

پولیس علاقے کا محاصرہ ختم کرکے جاچکی تھی سلیمان بھائی نے اسے دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا اور بولا۔ ''میں تو تمہاری وجہ سے ڈر رہا تھا کہ کہیں تم پولیس کے ہتھے تو نہیں چڑھ گئے۔ کیوں کہ انہوں نے پورے علاقے کو گھیر رکھا تھا اور پھر حیدر علی بھی اب تک واپس نہیں لوٹا۔ پولیس کے ساتھ را کے افسران بھی تھے اور وہ تمہیں پاکستانی جاسوس بتا رہے تھے۔'' سلیمان بھائی اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''نہیں سلیمان بھائی یہ جھوٹ ہے مجھ پر بے بنیاد الزام ہے۔'' سلمان نے تردید کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھو سلمان بھی اپن جیسا بھی ہے منہ پر کھری بات کرتا ہے مانا کہ رحیم یار خان بھائی بہت طاقتور ڈان ہیں لیکن کبھی اس طرح کے معاملات میں ان کا پولیس یا ایجنسیوں سے کوئی لفڑا نہیں ہوا اگر پولیس کو ذرا بھی اس بات کی بھنک لگ گئی کہ ہم نے تمہیں پناہ دی تو وہ ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑجائیں گے۔'' وہ گھمبیر لہجے میں بولا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

''سلیمان بھائی صبح سات بجے ناشتہ کئے بغیر ہی چلا گیا ابھی اسے گئے ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ کال بیل بجی سلمان نے دروازہ کھولا یہ حیدر علی اور اس کے ساتھی تھے۔'' سوری یار، ہم رات کو نہ آسکے۔'' حیدر علی نے کہا۔

سلمان کی زبانی پولیس کے آنے کی خبر سن کر ان کے چہروں کا رنگ اڑ گیا۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں فوراً یہ ٹھکانہ چھوڑ دینا چاہئے سلیمان بھائی ہماری طرف سے مشکوک ہوچکا ہے ویسے بھی ہم راجستھان کے اس دہشت گردی کے مرکز کے بارے میں تمام تفصیلات جان چکے ہیں۔'' حیدر علی نے کہا اور اٹھ کر کمرے سے باہر نکلا کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی ایک بوتل تھی جس میں کوئی محلول تھا۔

''سلمان باتھ روم میں جاؤ اور اس محلول کو اپنے پورے جسم پر مل کر آجاؤ۔''

سلمان باتھ روم سے دس پندرہ منٹ بعد نکلا تو حیدر علی نے آئینہ اس کے سامنے کردیا تو وہ ششدر رہ گیا۔

(جاری ہے)

آتش حسد

طاہرہ آصف۔ساہیوال

ایک طویل عرصہ پہلے پانی میں ڈوبی ہوئی خوبرو جوان حسینہ کی لاش اچانک پانی کے سطح پر ابھری تو دیکھنے والوں کی آنکھیں پتھرا کر رہ گئیں لوگوں کو یقین نہیں آرہا تھا کہ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی لاش بالکل تازہ کیسے ہے۔

سوچ کے افق پر جھلمل کرتی دل ودماغ کو مبہوت کرتی دل کش دل فریب، انمٹ کہانی

بچپن نام ہے حسین یادوں کا، زندگی کی ساڑھے چھ دہائیاں گزار کر یہ یادیں اور بھی خوبصورت لگتی ہیں مگر ان حسین بھول بھلیوں میں ایک اسرار بھی پوشیدہ ہے ایک دلگیر اسرار، ہم شہر میں رہتے ہیں مطلب قیام پاکستان سے قبل اماں اور ابا اسی محلے میں رہتے تھے جہاں میرا اور دیگر بہن بھائیوں کا جنم ہوا۔ ہمارا شہر اگرچہ بہت بڑا اور نامی گرامی شہر نہیں مگر بہر حال شہر ہی تھا ریلوے لائن سے کچھ فاصلے پر ہمارا علاقہ تھا ہمارے محلّہ میں قیام سے قبل ملی جلی آبادی تھی چونکہ میری پیدائش قیام پاکستان کے تین سال بعد ہوئی سو یہ سب باتیں اماں ابا سے معلوم ہوئیں ہمارے گھر کے بالکل سامنے والا گھر تقسیم سے قبل ایک ہندو خاندان کا تھا جو محلے میں سب سے خوشحال تھے ان کا گھر پختہ بہترین طرز تعمیر والا تھا۔

محلے کے تمام گھرانے ایک مشترک بڑے کنویں

سے پانی حاصل کرتے جبکہ اس گھر میں انہوں نے ذاتی کنواں بنوا رکھا تھا میل جول اور اخلاقی لحاظ سے بھی یہ لوگ بہت معقول تھے پھر تقسیم کا اعلان ہوتے ہی یہ لوگ باقی ہندوؤں کے ساتھ چلے گئے اور یہ گھر بند ہوگیا مقامی لوگوں میں سے ہر ایک کی کوشش تھی کہ یہ گھر ان کے قبضے میں چلا جائے مگر کچھ ہی عرصہ کے بعد دہلی سے تعلق رکھنے والا ایک مہاجر خاندان آکر اس میں آباد ہوگیا یہ اردو بولنے والے اور دہلی طرز معاشرت والے لوگ تھے۔ جو جلد ہی ہم میں گھل مل گئے، میں نے جب شعور میں آکر ہوش سنبھالا اپنے گھر والوں اور سامنے والوں کا کھلا آزادانہ اور محبت بھرا میل جول دیکھا۔

میں کھیلنے اکثر ان کے گھر جاتی اور ان کے بچے ہمارے ہاں آجاتے اس گھر میں دو بزرگ تھے اماں بی اور ان کے شوہر مرزا رحیم، آگے ان کی اولادوں میں صرف ایک بیٹا سلیم مرزا تھے اور تین بیٹیاں ایک بہو جسے ہم رفعت خالہ کہتے تھے سب سے بڑی ایک بیٹی وہ بیاہتا تھی وہ ہندوستان میں ہی تھی باقی کا کنبہ یہاں آکر آباد ہوا۔ اس گھر کی انفرادی خصوصیات اس کا دومنزل ہونا اور وسیع صحن تھا مضبوط لکڑی کے خوبصورت دروازے کھڑکیاں اور ستون اسے باقی گھروں سے یکسر مختلف بناتے، صحن میں نیم کا گھنا درخت اور اس کے بالکل مقابل دیوار کے ساتھ کنواں سب کا سب قابل رشک تھا اماں بی اور ان کے اہل خانہ یہاں آکر بہت خوش تھے وطن اور اپنوں سے دوری کے غم کا ازالہ اس گھر کی صورت میں کافی حد تک ہوگیا۔

میری اماں اور ابا اماں کو اماں بی اور ان کے شوہر کو خالو کہہ کر مخاطب کرتے اور ان کی دیکھا دیکھی ہم سب بہن بھائی بھی انہیں یہی کہتے، سلیم مرزا کے چار بچے تھے دو بیٹے دو بیٹیاں جو کم وبیش میرے ہم عمر اور کچھ بڑے چھوٹے بھی تھے اماں بی اور رحیم خالو کے اچھے اخلاق کی وجہ سے یوں تو سب اہل محلہ سے اچھا تعلق تھا مگر ہمارے گھرانے کے ساتھ تعلقات کی بات ہی کچھ اور تھی جس کی وجہ سے میرے والدین کا پابند صوم وصلوٰۃ ہونا اور اماں کا سلیقہ اور صفائی ستھرائی کی عادت اور حسن سیرت تھا۔

ہماری اماں کو ادھر ادھر کی باتیں سننے سنانے اور غیبت چغلی قطعی پسند نہیں تھا اور یہی بات اس مہاجر خاندان سے مضبوط تعلق کی بنیاد بنی ورنہ اگر دیکھا جاتا تو ہم ٹھہرے سادہ سی بود وباش والے اور وہ رکھ رکھاؤ وضع داری اور تکلف کو لے کر چلنے والے پھر زبان کا بھی فرق مگر محبت تمام تر تضادات کے باوجود بھی پنپ گئی۔ میں نے شعور میں آنے کے بعد دونوں خاندانوں کو یکجا دیکھا ابا، رحیم خالو اور سلیم مرزا کی سمجھ داری کے قائل تھے اور وہ دونوں ابا کے مشورے کے بغیر چلنا محال سمجھتے اور یہی حال خواتین کا تھا اگرچہ اس گاڑھی چھننے کی وجہ سے محلہ کے کچھ لوگ حسد بھی کرتے تھے مگر سب بخیر چل رہا تھا۔

اماں بی کے کہنے پر ابا نے مجھے اور مجھ سے بڑے بھائی کو اسکول بھیجا ورنہ اس سے قبل کوئی بھائی یا بہن اسکول نہیں گیا تھا مگر اماں بی تعلیم کی قائل تھیں، رفعت خالہ نے مجھے ابتدائی تعلیم دی اور پھر اسکول جانے کی عمر ہونے پر ہمیں اسکول بھیجا جانے لگا۔

یہ سب میں اس لئے بتا رہی ہوں کہ کسی بھی کہانی کو مکمل طور پر سمجھنے کے لئے پس منظر اور تمام کرداروں کا تعارف ضروری ہوتا ہے تبھی کسی سرگزشت کا احاطہ ہو پاتا ہے۔

اچھا دوست اور اچھا ہمسایہ رحمت باری تعالیٰ ہوتا ہے اور یہ دونوں خوبیاں اس خانوادے میں تھیں اس قصے کا آغاز اس وقت ہوا جب یہ لوگ اس گھر میں آئے تو پانی کے لئے انہوں نے محلے کے مشترکہ کنویں سے رجوع کیا۔ تب بہت سارے لوگوں کو تعجب ہوا کہ جب گھر میں کنواں موجود ہے تو یہ باہر سے پانی کیوں لے رہے ہیں مگر بے تکلفی اور راہ مراسم نہ ہونے کی وجہ سے باز پرس نہ ہوسکی بعد میں جب آہستہ آہستہ ہمارے گھرانے سے تعلق استوار ہوا تو اماں نے یہ سوال کیا، اس پر اماں بی نے کہا۔ ''اے لو بی بی ہم نے تو اس کنویں کو دیکھ کر شکر منایا کہ پانی کا وسیلہ گھر پھر ہی ہے مگر جب پانی لینا چاہا، ہزار جتن کر لئے مگر پانی ہے کہ نکل کر نہ دیا۔

تمہارے خالو کو روحانیات سے تھوڑا بہت شغف ہے انہوں نے جب معلوم کرنا چاہا تو پتہ چلا کہ اس کنویں کے ساتھ کچھ گمبھیر مسئلہ ہے، مسئلہ تو کھل کر سامنے نہ آیا مگر انہوں نے اسے استعمال کرنے سے منع کر دیا، اب یہ لکڑی کے تختوں سے ڈھکا رہتا ہے اور ہم باہر سے پانی لے لیتے ہیں۔"

اس بات سے اماں حیران تو ہوئیں مگر خاموش ہوگئیں وقت گزرتا رہا کھیل کود پڑھائی یہ سب ہماری زندگی کا معمول تھا آج کل قرب قیامت کا زمانہ ہے بڑے بوڑھوں اور دانش وروں کے قول کے مطابق وقت میں برکت ختم ہوگئی ہے مگر تب برکت تھی۔

اسکول جانے گھر آکر کھانا کھا کر آرام کرنے شام کو سپارہ پڑھنے اور بہت سارا وقت کھیل کود میں بتانے کے باوجود وقت بچ رہتا، رات کو کھانے اور عشا کی نماز سے فراغت کے بعد مردوں کی محفل جمتی اور ہم بچے بھی بہانے بہانے سے بڑوں کی گفتگو سنتے کیا، سہانا ماضی تھا خالص غذائیں اور خالص محبتیں اور رشتہ داریاں۔

میری عمر دس برس تھی، جب اماں بی نے اپنی دونوں آخری بیٹیوں کو نمٹانے کا فیصلہ کیا اور شادی کے دن طے کر کے تیاریوں کا آغاز کر دیا مگر ہم بچوں کو تیاریوں کا کیا لینا دینا، بس کھیل میں دل اٹکا رہتا۔

غالباً اپریل کا مہینہ تھا عصر کے وقت ناظرہ کی تعلیم سے فارغ ہو کر ہم خالو رحیم کے آنگن میں کھیلنے آگئے رفعت خالہ کے چاروں بچے ہم دو بہن بھائی اور محلے کے دیگر بچے مل کر آنگن میں لگے نیم کے تلے بے فکری سے کھیل رہے تھے، ہمارے پڑوس میں رہنے والی لڑکی زرینہ بھاری ڈیل ڈول اور جارحانہ مزاج کی تھی وہ کھیل میں اکثر دوسروں کو نقصان پہنچا دیتی، اس وقت بھی ایسا ہی ہوا کھیل کے دوران بے ایمانی پر میرا اس سے جھگڑا ہو گیا اور اس نے غصہ سے مجھے اس قدر زور سے دھکا دیا کہ میں اڑتی ہوئی پشت کی جانب جا گرنے کو تھی کہ جب میرا سر کنوئیں سے ٹکرانے سے قبل دو مہربان ہاتھوں نے مجھے تھام لیا اور ٹکرانے سے لمحہ بھر قبل مجھے سیدھا کھڑا کر دیا۔

پہلے تو میرے اوسان بحال ہونے میں چند لمحے لگے کیونکہ دھکا ایسا شدید تھا کہ اگر میں کنوئیں کی پختہ دیوار سے ٹکراتی تو کھوپڑی چیخ جانا یقینی تھی پھر خیال آیا کہ مجھے کس نے بچایا ہے؟

میں نے گھوم پھر کے اطراف میں دیکھا تو کوئی بھی نہیں تھا، سامنے کھڑے بچے بھی حیرانی سے دیکھ رہے تھے کہ میں کیسے بچی حالانکہ اس جگہ پر کوئی بھی بڑا یا چھوٹا موجود نہیں تھا۔ اس حادثے سے بال بال بچ جانے پر میں نے مزید کھیلنے کا ارادہ ترک کر دیا اور واپس گھر آگئی مگر ذہن میں ہنوز یہ خیال اٹکا رہا کہ مجھے کس نے بچایا؟ جبکہ دکھائی تو کوئی بھی نہیں دیا مگر ہاتھوں سے پکڑ کر کھڑا کرنے والے کے لمس کا احساس بالکل واضح تھا۔ مگر یہ سوچ کر کسی بڑے سے اس کا ذکر نہیں کیا کہ کوئی بھی یقین نہیں کرے گا۔

خیر دو چار روز یہ واقعہ ذہن میں رہا پھر محو ہو گیا کہ بچوں کی نفسیات بڑوں سے مختلف ہوتی ہے۔

ادھر رحیم خالو کے ہاں شادی کی تیاریاں زور پکڑ چکی تھیں، مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا، خالو بزرگ تھے ان سے کام ہونا ممکن نہ تھا اور سلیم چاچا اکیلے ہونے کی وجہ سے ابا اور دونوں بڑے بھائی ہر کام میں پیش پیش تھے۔

باقی شہروں میں مقیم اور ہندوستان سے آنے والے مہمان رفتہ رفتہ آرہے تھے۔

بہر حال ہمارے ساتھ ساتھ ہمارے بڑوں کے لئے بھی یہ تقریب عجوبہ تھی کیونکہ ہندوستان سے تعلق ہونے کی وجہ سے ان کے رسم ورواج بہت منفرد تھے، ہماری سیدھی سادی شادیوں کے برعکس ان کے یہاں رسوم کی بھرمار تھی، ہر رسم اور تقریب میں جاتے اور بغور دیکھتے اماں بی کی ہندوستان سے آنے والی بیٹی کے بچے کچھ مجھ سے بڑے تھے جبکہ ایک لڑکی میری ہی ہم عمر تھی وہ آتے ہی ہم سب سے مانوس ہوگئی تھی۔

اسے سبھی پیار سے منی کہتے اصل نام نجانے کیا تھا

وہ اپنے ماموں زادوں سے زیادہ میرے ساتھ رہتی شادی کی سبھی رسموں کے بارے میں مجھے بتاتی اور اپنے گھر اور شہر کے متعلق بھی، ہم بہت اچھی سہیلیاں بن گئیں مجھے بہت اچھی طرح سے یاد ہے کہ بارات کا دن تھا صبح سے تیاری ہو رہی تھی ڈھڑا دھڑ دیگیں چڑھ رہی تھیں محلے کے میدان میں قناتیں لگا کر بیٹھنے کا انتظام ہو رہا تھا۔

بارات کی آمد سے قبل سب ہی تیار ہو گئے منی کی بڑی بہن نے گلابی گھاگھرا اور کرتی پہنی اور ہندو طرز کا سنگھار کیا وہ سولہ سترہ برس کی خوش شکل لڑکی تھی اس کے علاوہ بھی ان کے خاندان کی بہت سی لڑکیاں ایسے ہی تیار ہوئیں اور میں ہر ایک کو غور سے دیکھتی پھر بارات کی آمد ہوئی تو مرد قناتوں میں چلے گئے پھر مقیم اور مہمان عورتیں گھر میں رہ گئیں۔

تبھی میں نے کنوئیں کے قریب ایک گھاگرا چولی والی لڑکی دیکھی جس کی چولی نصف تھی جبکہ باقی تمام مہمان خواتین نے مکمل لباس پہنا ہوا تھا، مجھے اچنبھا ہوا اور میں اسے قریب سے دیکھنے کے لئے وہیں چلی آئی، وہ دیوار کی جانب رخ کئے کھڑی تھی میں نے قریب آ کر دیکھا تو وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی، وہ سانولی رنگت کی بے حد حسین لڑکی تھی۔

میں اب تک مہمان عورتوں کو دیکھ چکی تھی مگر یہ لڑکی پہلے دکھائی نہیں دی میں نے کہا۔ ''باجی آپ یہاں کیوں کھڑی ہیں اندر دلہن کے پاس آ جائیں۔''

وہ پھر سے مسکرائی اور بولی۔ ''ضرور دلہن بھی دیکھوں گی اس دلہن کو دیکھنے کی خواہش ہی مجھے یہاں سے باہر لائی ہے۔'' اس نے انگلی سے کنوئیں کی جانب اشارہ کر کے کہا۔

مجھے ہنسی آ گئی کہ غالباً یہ مہمان لڑکی مجھے بچی سمجھ کر مذاق کر رہی ہے میں اسے ایک بار پھر دیکھنے لگی وہ موجودہ تمام لڑکیوں سے بڑھ کر خوبصورت تھی اس کے ہاتھ میں ایک نیلا رومال تھا جس کے اندر غالباً کوئی چیز رکھ کر ڈوری لپٹی ہوئی تھی اتنے میں منی کی آواز سنائی دی وہ میری جانب آ رہی تھی، منی کی آواز سے لڑکی کے بدن میں حرکت ہوئی اور اس نے بھی پلٹ کر دیکھا تو ہاتھ میں پکڑی پوٹلی میں جنبش سے اس میں موجود چیز کھڑکھڑائی۔

منی میرے قریب آ کر بولی۔ ''تم دیوار سے کیا کھسر پھسر کر رہی ہو؟''

میں نے کہا۔ ''نہیں میں تو باجی سے بات کر رہی ہوں'' اور سامنے دیکھا مگر وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

مجھے بہت حیرانی ہوئی کہ ایک لمحہ قبل تو وہ لڑکی یہاں تھی ابھی کہاں چلی گئی جبکہ جاتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔ منی نے کہا۔

''اری آمنہ یہاں کون سی باجی ہے مجھے تو تم کب سے اکیلی یہاں نظر آ رہی تھی اسی لئے تو آئی ہوں۔ چل خالہ جانی دونوں تیار ہیں چل کر دلہنیں دیکھتے ہیں میری باجی تو اندر ہیں تم نے دیکھا کتنی اچھی لگ رہی ہیں ہر کوئی ان کی ہی تعریف کر رہا ہے، میں بھی امی سے کہہ کر ایسے کپڑے بنواؤں گی۔'' اور ہاتھ پکڑ کر کھینچ کر لے جانے لگی میں بھی حیران سی چل پڑی۔

شادی کے ہنگامے میں وقت گزرنے کا پتہ ہی نہ چلا اور ساری تقریبات نمٹ گئیں اور دور کے مہمان بھی رخصت ہوتے گئے جب کچھ غلغلہ کم ہوا تو میں نے منی سے پوچھا کہ۔ ''شادی میں آئی وہ لڑکی کون تھی جس نے ہلکی نیلی ساڑھی آدھی قمیض کے ساتھ پہن رکھی تھی۔''

وہ بہت حیران ہوئی۔ ''اری آمنہ تمہیں نانا کا تو پتہ ہے وہ بھلا کسی کو ایسے کپڑے پہننے کی اجازت دیں گے ہمارے یہاں تو سبھی پوری آستین کی کرتی اور قمیض پہنتی ہیں کجا کمر اور پیٹ نظر آئے، نانا، جان نہ نکال دیں، پوری شادی میں ایسی لڑکی کوئی نہیں تھی چھوڑ یہ باتیں، پچھلی گلی میں سبزی والا کیری آم بیچ رہا ہے چل کر لیتے ہیں سب سے چھپ کر کھائیں گے۔'' اور میں بھی سب بھول بھلا کر اس کے ساتھ چل پڑی۔

ایک مہینہ قیام کے بعد منی کے گھر والوں نے واپسی کا قصد کر لیا سبھی افسردہ ہونے لگے کیونکہ ان کی وجہ سے بہت رونق تھی، مجھے بھی منی سے بچھڑنے کا غم ہو رہا تھا لیکن انہیں جانا تھا سو چلے گئے، جاتے ہوئے منی

نے مجھے ایک ہار جیسی چیز دی، سیاہ ڈوری میں پتھر کے تین نیلے موتی تھے، اس نے مجھے محبت سے دیا تو مجھے بہت اچھا لگا شفاف پتھر کے چکنے چکنے تین موٹے موتی دیکھنے میں بہت بھلے لگتے، پھر وہ چلی گئی پھر بھی دوبارہ آنے کے وعدے پر۔

شروع کے کچھ روز بہت قنوطیت طاری رہی پھر رفتہ رفتہ یہ یاد معدوم ہوتی گئی اور دن معمول پر آ گئے میں ان دنوں اسکول کی چھٹیاں ہونے کی وجہ سے گھر پر ہی ہوتی، صبح سویرے ناشتے کے بعد میں اور میرا بھائی رفعت خالہ کے پاس پڑھنے چلے آتے، ان کے چاروں بچے بھی، ہم تمام مل کر دوپہر تک پڑھتے، ظہر سے پہلے گھر آ کر کھانا کھا کر سو جاتے اور پھر شام میں کھیل کود۔

ایک روز ہم معمول کے مطابق رفعت خالہ کے پاس پڑھ رہے تھے کہ اماں کسی کام سے آئیں اماں بی وہیں صحن میں نیم تلے اپنا پاندان لے کر آ بیٹھیں تینوں خواتین دوسری چارپائی پر بیٹھی اپنی باتیں کر رہی تھیں کہ رفعت خالہ نے کہا۔ ''اماں جان مجھے آپ کو ایک ضروری بات کہنا تھی گھر کے کاموں میں الجھ کر بھول گئی۔'' بات کرتے کرتے انہوں نے آواز مدھم کر لی اور اماں کے قریب ہو گئیں مگر میری توجہ ادھر ہی تھی سامنے کتاب دھری تھی لیکن کان ان کی باتوں پر تھے مدھم آواز ہونے کے باوجود مجھے بات سنائی دی۔ ''آپا میں نے کل کنویں کے اوپر رکھے لکڑی کے تختوں پر ایک نیلی پوٹلی دیکھی مجھے اچنبھا ہوا کہ یہ پوٹلی کیسی اور کس نے رکھی؟ میں نے ڈوری کھول کر دیکھی تو میری آنکھیں پھٹنے لگیں اس میں بہت سارا زیور تھا خالص سونے کا کنگن بھاری ہار انگوٹھیاں اور پازیبیں۔''

میں گھبرا کر اماں کو آواز دینے والی تھی کہ خود بخود میری نظر نیم کے درخت پر چلی گئی وہاں ایک سترہ اٹھارہ برس کی ہلکی نیلی ساڑی میں خوبصورت لڑکی بیٹھی تھی اس نے انگلی ہلا کر اشارہ کیا کہ ''ناں۔''

میں نے جب دوبارہ پوٹلی دیکھی تو غائب اور درخت کی شاخ پر بیٹھی لڑکی پر نظر گئی تو وہ بھی غائب

میں نے فوراً آیت الکرسی پڑھنا شروع کر دی بھلا ایک دو لمحوں میں سب کا سب کیسے غائب ہو گیا جبکہ میں آنگن میں بالکل اکیلی تھی پھر مغرب کی اذان ہونے لگی تو میں جلدی سے وضو کر کے اندر آ گئی رات میں سب کے سامنے بات کرنا مناسب نہ لگا تو اب بتا رہی ہوں۔

اماں بی نے کہا۔ ''اے دلہن تمہارے ابا نے یونہی تو کنوئیں کو بند نہیں کروایا کوئی نہ کوئی بات تو تھی مگر سوچتی ہوں کہ ہمیں تو اب گھر میں آئے کئی برس ہو رہے ہیں پہلے تو کچھ نہ دکھا۔''

میری اماں جو گہری سوچ میں تھیں انہوں نے پوچھا۔ ''رفعت لڑکی کی شکل حلیہ یاد ہے کیسا تھا۔''

رفعت خالہ بولیں۔ ''آپا میں نے اسے شاخ پر بیٹھے دیکھا تھا وہ دبلی پتلی لمبی سی مگر بہت زیادہ خوبصورت تھی ساڑھی سے نظر آتے اس کے پاؤں بہت پیارے تھے ایک پاؤں کی پازیب پاؤں سے اتر کر ساڑھی کے کپڑے سے اٹکی لٹک رہی تھی اس کے گلے میں موٹی سی زنجیر تھی۔''

اماں بہت دیر تک سوچتی رہیں پھر کہنے لگیں۔ '' آپ لوگوں کے آنے سے قبل یہاں لالہ مرلی دھر رہتے تھے ان کی سب سے چھوٹی لڑکی ایسی ہی تھی جیسی تم نے اس لڑکی کا حلیہ بتایا ہے مگر وہ لوگ تو اعلان کے پندرہ روز بعد ہی چلے گئے تھے دن میں وہ سب سے ملے اور رات کو خاموشی سے اندھیرے میں نکل گئے۔''

بی اماں نے قیافہ لگایا کہ کہیں ہجرت کرتے ہوئے وہ لڑکی ماری گئی ہو اور اس کی روح ہمیں اس گھر میں نظر آ رہی ہے۔

رفعت خالہ نے کہا۔ ''اماں ڈرانے والی باتیں نہ کرو۔'' پھر کچھ دیر مزید گفتگو کے بعد اماں گھر چلی گئیں اور یہ نشست ختم ہو گئی اماں بی کروشیا لے کر شغل فرمانے لگیں، خالہ نے ہمیں کچھ دیر پڑھا کر گھر بھیج دیا۔

اب عورتوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ وہ دکھائی دینے والی لڑکی کوئی روح ہے، اس وقت مجھے روح کے بارے میں علم نہ تھا کہ روح کیا ہوتی ہے؟

رات کو ابا بستر پر سونے کے لئے آئے تو میں ان کی چارپائی پر آ کر بیٹھ گئی، ابا مجھے پیار کرنے لگے، میں نے سرگوشی میں پوچھا۔ "ابا روح کیا ہوتی ہے؟"

ابا نے چونک کر میری جانب دیکھا اور کہا۔ "آمنہ تم کیوں پوچھ رہی ہو۔؟"

میں نے جواب دیا۔ "ابا ویسے ہی میں نے کسی کو روح کی باتیں کرتے سنا تو آپ سے پوچھ لیا۔"

ابا نے ایک طویل سانس لی اور سیدھے ہو کر لیٹ گئے۔ "بیٹا ہمارا یہ جسم گوشت پوشت کا بنا ہے اس جسم کو چلانے والی شے کو روح کہتے ہیں روح ہوتی تو بالکل اپنے جسم کے جیسی ہے مگر جسم کی طرح ٹھوس مادی وجود نہیں رکھتی بلکہ ہوا یا پرچھائیں کے مثل ہوتی ہے، جب روح جسم سے نکل جاتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ فلاں انسان دنیا سے چلا گیا یعنی فوت ہو گیا، روح رب کی طرف لوٹ جاتی ہے اور جسم زمین میں دفن کر دیا جاتا ہے۔"

ابا نے یہ سب اتنی تفصیل سے بتایا کہ مجھے سمجھ آ گیا کہ روح کی حقیقت کیا ہے۔

میں کچھ دیر کے بعد اپنے بستر پر آ کر لیٹ گئی اور اپنے گلے میں پہنی ڈوری میں پروئے نیلے پتھروں پر ہاتھ پھیرنے لگی ساتھ ساتھ گہری سوچ میں ڈوبی روح کے فلسفے پر غور کرتی رہی عجیب یہ تھا کہ بچی ہونے کے باوجود مجھے ڈر نہیں لگا بلکہ تجسس زیادہ ہو گیا اور یونہی میں سو گئی۔

رات میں نے ایک عجیب خواب دیکھا، میں نے خواب میں خود کو رحیم خالو کے گھر میں پایا وہاں رحیم خالو کے گھر کے افراد کے بجائے انجانے چہرے دیکھے ایک بے حد سانولی رنگت کا ادھیڑ عمر مرد نیم کے درخت کے نیچے بچھے تخت پر بیٹھا ہوا تھا اس نے کسی کو آواز دی اس کی آواز پر بڑے کمرے سے ایک لڑکی نکلی جو بہت واجبی سی صورت کی تھی، وہ برآمدے میں آ کر ستون کے ساتھ کھڑی ہو گئی پہلے آنے والی لڑکی پہلے تو اس آدمی سے لپٹی پیار کرتی رہی، میں نے غور سے دیکھا یہ وہی لڑکی تھی جو شادی کے روز اماں بی کے آنگن میں کنوئیں کے پاس نظر آئی تھی۔

"باپو تم اتنے روز کے بعد آ رہے ہو معلوم ہے میں تمہیں تین دن کے بعد دیکھ رہی ہوں جلدی آ جاتے۔"

وہ آدمی ہنستے ہوئے بولا۔ "ابھی کام تو اور بھی تھا مگر جانتا تھا کہ کچھ دن اور رکا تو، تو ناراض ہو جائے گی، یہ دیکھ میں تیرے لئے کچھ لایا ہوں۔"

اتنے میں ستون کے پیچھے کھڑی لڑکی بھی خاموشی سے ان دونوں کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس آدمی نے قریب رکھے کپڑے کے تھیلے سے ایک مالا نکالی وہی کالی ڈوری میں پروئے تین نیلے پتھروں والی مالا اور اپنی بیٹی کے ہاتھ پر رکھ دی مالا دیکھ کر وہ لڑکی جو خوبصورتی کا حسین مجسمہ تھی اور بھی خوشی سے حسین ہو گئی۔ "باپو کتنی پیاری ہے یہ میرے لئے لائے ہو۔" یہ کہتے ہوئے اس نے گلے میں ڈال لی۔

"باپو میں ماں اور بھائیوں کو دیکھا کر آتی ہوں اور تمہارے لئے پانی گرم ہونے کو رکھتی ہوں نہا کر کھانا کھانا۔" یہ کہہ کر وہ جھومتی ہوئی اٹھی تو سامنے کھڑی بہن کا چہرہ غصے سے سیاہ پڑ گیا، وہ کھولتی ہوئی آواز میں بولی۔ "باپو تمہاری ہر اچھی چیز اپنی اس راجکماری کے لئے ہوتی ہے، میں تو تمہاری بیٹی ہی نہیں۔"

اس پر اس آدمی نے کہا۔ "غصہ کیوں کرتی ہے دیکھ میں تیرے لئے کتنے خوبصورت زیور بنوا کر لایا ہوں آخر کو تیرے لئے ہی گیا تھا اب اتنی سی بات پر بگڑتی کیوں ہے۔" یہ کہہ کر اس نے تھیلا اس کو پکڑایا تو اس نے تھیلا تو پکڑ لیا مگر پاؤں پٹختی ہوئی اندر چلی گئی۔

اسی لمحے میری آنکھ کھل گئی، بیدار ہونے پر میری سماعت سے اذان کی آواز ٹکرائی۔

خواب اتنا واضح تھا کہ اس کے تمام جزئیات ذہن پر جیسے نقش ہو گئے، کم سن ہونے کے باوجود یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ میرے پاس موجود یہ مالا اس خواب والی لڑکی کی تھی جو غالباً اس دنیا میں نہیں تھی، بیدار ہونے پر بھی خواب والی لڑکی کی بڑی بہن کا جلالی انداز ایک

خاموش طوفان کے جیسا محسوس ہوا سہادینے والا۔

پھر دن کا آغاز ہوا اور وہی لگے بندھے معمول بس اب فرق یہ آیا کہ میں جب بھی رحیم خالو کے گھر پڑھنے یا کھیلنے جاتی تو میرا دھیان کنوئیں اور اس کے اطراف پر رہتا، میں اب منتظر رہنے لگی تھی اس دلنشین سے دوبارہ ملاقات ہو، حسن میں کشش ہوتی ہے جو بڑا ہو یا چھوٹا سب پر اثر انداز ہوتی ہے اس کے روح ہونے نے اس کشش کو دوآتشہ کر دیا تھا۔

پھر ایک روز یہ گھڑی آ ہی گئی محلے میں ایک عورت کا انتقال ہوگیا اماں بی رفعت خالہ کے ہمراہ وفات پانے والی کے ہاں چلی گئیں اور خالو طبیعت ناساز ہونے کی وجہ سے سو رہے تھے جبکہ سلیم چاچا اپنے کام پر تھے ہم بچے آنگن میں کھیل رہے تھے رفعت خالہ ہمیں گھر کے اندر رہنے اور شور نہ کرنے کی تاکید کر کے چلی گئیں عصر سے پہلے کا وقت تھا بادل گھر آنے کی وجہ سے موسم بھی بہت خوشگوار تھا رفعت خالہ کے دونوں بیٹے تو چھت پر چلے گئے اور بڑی بیٹی کلثوم باورچی خانے میں سبزی بنا کر رکھنے کے حکم کی تعمیل کرنے چلی گئی اور صرف میں اور صفورا رہ گئے ہم دونوں اپنے مٹی کے برتنوں سے کھیل رہی تھیں کہ کھیلتے کھیلتے صفورا کے پیٹ میں درد اٹھا اور وہ بیت الخلا جانے کا کہہ کر بھاگ گئی اور میں آنگن میں اکیلی بیٹھی اپنے برتن ترتیب دے رہی تھی کہ مجھے کسی نے پکارا، میں نے بے ساختہ آواز کی سمت دیکھا تو کنوئیں پر رکھے لکڑی کے تختوں پر وہ بیٹھی دکھائی دی۔

میں تیر کی طرح اپنے ہدف تک پہنچی اور چھوٹتے ہی کہا۔ ''باجی آپ روح ہیں ناں۔''

وہ دھیرے سے مسکرائی اور کہا۔ ''ہاں میں ایک روح ہوں مگر کیا تمہیں مجھ سے ڈر نہیں لگ رہا۔''

میں نے کہا۔ ''آپ اتنی خوبصورت ہیں کہ آپ جیسی کوئی دیکھی ہی نہیں پھر ڈر کیوں لگے گا۔''

وہ میری جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ ''سنو لڑکی تمہاری اماں مجھے بہت اچھی طرح جانتی تھیں بلکہ سبھی گھر والوں کو بھی میں نے بہت انتظار کیا کہ میرے گھر والوں میں سے کوئی نہ کوئی آئے گا مگر سالوں گزر گئے کوئی نہیں آیا میں اس قید و بند سے تھک چکی ہوں تم میرا ایک کام کروں گی۔؟'' اس لمحے اس کے چہرے پر کرب اور اضمحلال جھلک رہا تھا۔

مجھے بہت ہمدردی محسوس ہوئی میں نے کہا۔ ''کہو میں ضرور کروں گی۔''

اس نے ہاتھ میں پکڑی پوٹلی میری طرف بڑھائی اور کہا۔ ''یہ میرے ماتا پتا کے زیورات ہیں تم یہ سب ان بڑے میاں کو دینا جن کو تم سب رحیم خالو کہتے ہو اور یہ کہنا کہ یہ زیورات الہ آباد میں میرے باپو مرلی دھر رہتے ہیں انہیں پہنچا دیں اور کہیں کہ آ کر وہ میری آخری رسومات بھی کر جائیں۔''

میں نے کہا۔ ''رحیم خالو تو اسی گھر میں رہتے ہیں تو آپ انہیں خود کیوں نہیں کہتیں۔''

اس نے کہا۔ ''ضرور کہتی لیکن یہ سبھی لوگ خصوصاً بڑے میاں ہر وقت اپنے دھرم کے کلمات پڑھتے رہتے ہیں ایسے میں میں چاہ کر بھی ان کے سامنے نہ آ پائی اور جانے کیوں تم سے مجھے اپنا پن محسوس ہوتا ہے پھر جب سے تمہارے گلے میں یہ مالا آئی ہے جو میری ہی ہے تب سے تم سے بات کرنا اور بھی آسان ہوگیا ہے جاؤ اور فوراً یہ کام کرو تا کہ میں بھی جا سکوں۔''

آخری جملہ اس نے خود کلامی کے انداز سے ادا کیا، اس کے بعد اگلا منظر نا قابل یقین تھا کہ وہ میرے سامنے بیٹھے بیٹھے غائب ہوگئی اور میرے ہاتھ میں رہ گئی اس کی دی ہوئی زیورات کی پوٹلی، میں چلتی ہوئی رحیم خالو کے کمرے کی طرف گئی میری دانست میں یہ بات بہت اہم تھی جو فوراً سے قبل رحیم خالو کے علم میں آ جائے تا کہ کوئی اور میرے پاس زیورات دیکھ کر نہ لے لے، میں نے ان کے کمرے کے دروازے پر جا کر دستک دینے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ خالو نے خود ہی دروازہ کھول دیا مجھے کھڑا دیکھ کر بولے۔ ''بیٹا یہاں کیوں کھڑی ہو خیریت تو ہے۔''

میں نے کہا۔ ''خالو اندر آ کر میری بات سن لیں۔''

اس وقت میری عمر میں ازخود اضافہ ہوگیا اور میرے انداز میں بھی سنجیدگی آگئی یہ سب غیر اختیاری تھا خالو بھی غالباً میرے انداز پر ٹھٹک گئے تھے وہ الٹے قدموں واپس ہولئے اور پلنگ پر بیٹھ کر بولے۔ ''کہو بیٹا کیا بات ہے۔''

میں نے ہاتھ میں پکڑی پوٹلی جو خاصی بھاری تھی خالو کی گود میں رکھ دی اور ساتھ ہی فراٹے سے کنوئیں والی لڑکی کی تمام کتھا بیان کردی ہر چھوٹی بڑی بات کہہ دی جو ذہن میں تھی، اس کے پیغام کے ساتھ خالو کا چہرہ متغیر ہوگیا انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے پوٹلی کھولی تو وہ خالص سونے کے زیورات سے بھری ہوئی تھی ہر نوع کا زیور جسے میں بغور دیکھ رہی تھی۔

خالو نے چند ثانیے خاموشی سے غوروفکر کرنے کے بعد میرے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''بیٹا تم میرا کہا مانوگی۔''

میں نے اثبات میں سرہلایا تو کہنے لگے۔ ''تم اس بارے میں کسی سے کوئی بات نہ کرنا اس مرحومہ لڑکی نے کچھ سوچ کر ہی تمہیں رابطے کا ذریعہ بنایا ہے تو تمہارا بھی فرض ہے کہ اس کا اور ہمارا بھرم رکھو کیونکہ ہمارے اپنے اور بزرگ ہیں، باقی جو معاملہ ہے وہ میں دیکھے لیتا ہوں۔''

میں نے وعدہ کرتے ہوئے کہا۔ ''خالو مجھے آپ کی بات سمجھ میں آگئی ہے میں کسی اور تو کیا اپنی اماں کو بھی نہیں کہنے والی، بس آپ اس کی مدد کردیں۔'' اس کے بعد میں گھر آگئی پھر اس کے بعد کے مراحل ناقابل یقین تیزی سے طے ہوئے۔

رات جب ابا دکان بند کر کے گھر آئے تو سلیم چاچا ہمارے گھر پر پہلے ہی سے موجود تھے رحیم خالو کے پیغام کے ساتھ کہ ابا کھانا کھا کر فوراً انہیں ملیں ابا نے اس بات پر عمل کیا نہا دھو کر کھانا کھایا اور عشاء کی اذان سے بہت قبل سلیم چچا کی بیٹھک میں چلے گئے جہاں ان کے رحیم خالو اور بیٹے کے ہمراہ طویل نشست ہوئی پھر عشاء کی ادائیگی کے بعد ابا گھر چلے آئے، اماں نے بہت پوچھا کہ ''خالو جی

ھمہ صفت

ایک صاحب ایمپلائمنٹ ایکسچینج گئے اور بولے۔ ''مجھے ایسی نوکرانی چاہیے جو خوب صورت ہو۔ پچیس سال کے قریب عمر ہو، تعلیم یافتہ ہو، کھانا پکانا، کپڑے دھونا، استری کرنا جانتی ہو۔ گھر کی صفائی کی ماہر ہو، اچھے اخلاق کی مالک ہو اور بڑے گھر سے تعلق رکھتی ہو۔''

دفتر کے افسر نے جو بڑے سکون سے یہ باتیں سن رہا تھا۔ بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''لیکن یہ تو آپ نے بتایا نہیں کہ وہ نوکرانی کتنا جہیز لے کر آئے اور آپ حق مہر کتنا ادا کریں گے۔''

(کنیزہ-نواب شاہ)

نے کس وجہ سے طلب کیا تھا؟'' مگر ابا ٹال گئے۔

اس بات سے ایک دن چھوڑ اگلے روز شام کو میں اماں بی کے ہاں جا کر کھیلنے کا ارادہ کررہی تھی کہ اماں نے منع کردیا کہ آج میں نہ جاؤں کیونکہ ان کے یہاں کوئی بزرگ مولانا مہمان آئے ہوئے ہیں بہتر ہے کہ بچوں کا شوروغل نہ ہو، میں خاموش ہو کر بیٹھ رہی اگرچہ دل میں کھد بد مچی ہوئی تھی کہ جا کر دیکھوں کہ کیا معاملہ ہے۔

انہی دنوں گرمی کی چھٹیوں کا اختتام تھا دوروز کے بعد اسکول جانے کا معمول پھر سے شروع ہونے کو تھا اگلے روز ناشتے کے بعد وہ مہمان رخصت ہوگئے میں نے جب اپنی چھت سے خالو کو مہمان کے ہمراہ جاتے دیکھا تو فوراً نیچے آگئی کہ سامنے والے گھر جا کر صورتحال جان سکوں مگر اماں کی نظروں کو نگراں پا کر دبک کر بیٹھ گئی البتہ صفوراً خود آگئی میرے ساتھ کھیلنے، اس کے آنے پر میں سب بھول کر کھیل میں لگ گئی۔

پھر اسی شب معلوم پڑا کہ رحیم خالو ہندوستان جارہے ہیں اور انہوں نے ابا کو ساتھ چلنے کے لئے تیار

کیا تھا اماں ابا کی گفتگو سے یہ بات میرے علم میں آ گئی خالو نے غالباً اس سارے معاملے میں میرا ذکر نہیں کیا تھا جب ہی ابا یا اماں دونوں نے مجھ سے کوئی سوال نہ کیا، ورنہ یہ محال تھا کہ اس واقعہ کے ساتھ میرا ذکر آ تا اور گھر والوں میں سے کوئی مجھ سے بات نہ کرتا۔

بہر حال چھ روز کے بعد ابا جو کبھی شہر سے باہر نہ گئے تھے رحیم خالو کے ہمراہ ہندوستان چلے گئے یہ سفر انہوں نے ٹرین سے کیا رحیم خالو اور بی اماں نے اس بات کو بہت سمجھ داری اور راز داری سے رکھا ہوا تھا اور تا حال میرے والدین کے علاوہ کسی کو بھی ذرا برابر بھنک نہ تھی۔

ٹھیک ایک ہفتے بعد دونوں کی واپسی ہوئی پہلا دن تو ابا نے سفر کی تھکان اتارنے پر لگا دیا، اگلے روز وہ معمول کے مطابق دکان پر چلے گئے اور میرے علم میں کوئی بات نہ آ سکی اب مجھ سے صبر نہ ہو سکا، اسکول سے آنے کے بعد میں دوپہر کا کھانا کھا کر اماں کے لیٹنے کے بعد چپکے سے اماں بی کے گھر چلی آئی یہاں بھی سب کھا پی کر قیلولے کے لئے لیٹ چکے تھے میرا سامنا سب سے پہلے اماں بی سے ہوا جو ظہر کی نماز کچھ تاخیر سے پڑھ کر دعا مانگ رہی تھیں۔

انہوں نے دعا سے فراغت کے بعد میری جانب دیکھا تو مسکرائیں اور کہا۔ ''اری آمنہ بیٹا اتنی دوپہر میں سوئی نہیں کیوں صفورا سے ملنے آئی ہو۔''

میں نے کہا۔ ''اماں بی خالو کہاں ہیں مجھے ان سے دم کروانا ہے میرے سر میں درد ہے اور رحیم خالو دم وغیرہ بھی کیا کرتے تھے اور ان کے دم سے عموماً شفا ہو جاتی تھی۔ اس وقت مجھے یہی بہانہ سوجھا انہوں نے بیٹھک کی طرف اشارہ کیا تو میں نے تیزی سے بیٹھک کا رخ کیا خوش قسمتی کہ خالو سو نہیں رہے تھے بلکہ نیم دراز ہو کر تسبیح پڑھ رہے تھے، میں شرماتے ہوئے سلام کر کے اندر آ گئی انہوں نے مسکرا کر سلام کا جواب دیا اور بیٹھنے کو کہا۔

''میں سنجیدہ صورت لئے خاموشی سے بیٹھ گئی، کم سنی کے باعث سمجھ نہ آیا کہ مالنی کے بابت سوال کیسے کروں مجھے اپنی اماں کی باتوں سے مرحومہ کا نام معلوم ہوا تھا کہ وہ مالنی نام کی سترہ سالہ لڑکی تھی۔

خالو نے خود ہی بات کا آغاز کیا۔ ''بیٹا ہمیں معلوم ہے کہ تمہیں کس بات کا تجسس ہے سو بتائے دیتا ہوں کہ مجھے اس گھر میں سکونت پذیر ہوتے ہی اس کنویں سے وابستہ کسی غیر معمولی بات کا ادراک ہوا تھا مگر زیادہ تحقیق مناسب نہ سمجھی لیکن افسوس مجھے معاملے کی تہہ تک جانا چاہئے تھا کسی ناگوار امر سے بچنے کے لئے میں نے جو غفلت برتی وہ کسی کے لئے طویل انتظار کا باعث بنی، میں نے تمہارے زبانی ملنے والے پیغام کی انجام دہی کے لئے ایک بہت قابل اور روحانی معاملات میں عمل دخل رکھنے والے حضرت سے رابطہ کیا اور انہیں گھر پر بلایا انہوں نے رات تنہائی میں اس مظلوم و معصوم بچی مالنی کی روح کو طلب کیا اور اس کی یہاں موجودگی کی وجہ دریافت کی تب یہ معلوم ہوا کہ وہ اس مکان کے اولین مکین مرلی دھر کی آخری اولاد اور غضب کا حسن رکھتی تھی اور اپنے والد کی از حد لاڈلی اور حقیقی معنوں میں لخت جگر تھی۔

مالنی کو گھر میں والد سے پذیرائی ملی اور باہر والوں سے اس کے حسن کی وجہ سے پذیرائی ملی تھی یہ بات اس کی کم صورت بڑی بہن شالنی کے لئے باعث حسد تھی وہ اپنی بہن سے بہت زیادہ نفرت اور حسد کرتی تھی۔

ازل سے اولاد کے درمیان والدین کی محبت یا ان کی قابلیت وجہ نزع رہی ہے یہاں بھی حالات ایسے ہی تھے تقسیم سے قبل اس محلہ میں اکثریت ہندوؤں کی تھی مرلی دھر کے اس گھر سے ایک گھر چھوڑ اگلے گھر میں اس کی بہن رہتی تھی جس کا بیٹا بھی نہایت خوبرو تھا بڑی بہن اس کی پسندیدگی میں مبتلا ہوگئی مگر یہ معاملہ یک طرفہ تھا وہ پھوپی زاد شالنی کی پسندیدگی سے آگاہ نہ تھا بلکہ ذاتی طور پر مالنی میں دلچسپی رکھتا تھا مگر کم عمر ہونے کی وجہ سے باقاعدہ اظہار نہیں کیا کیونکہ جب تک شالنی کا رشتہ نہیں ہوتا جاتا وہ والدین کو باخبر نہیں کر سکتا تھا البتہ اس کے ہر عمل سے مالنی کے لئے اس کی دلچسپی ظاہر ہوتی تھی۔

میں انہماک سے خالو کی جانب متوجہ تھی اور خالو

بھی مھ سے ایسے مخاطب تھے کہ جیسے وہ ایک دس گیارہ برس کی بچی سے نہیں بلکہ کسی سمجھ دار سامع کو یہ سرگزشت سنا رہے ہوں ایک گہرا سانس لے کر انہوں نے سلسلہ کلام جوڑا۔

''شالنی نے اپنے پھوپی زاد کو اپنی جانب راغب کرنے کے لئے بہت جتن کئے مگر اس نے رتی برابر اثر نہ لیا پھر مرلی دھر نے اپنے ہی رشتہ داروں میں کسی جگہ بڑی بیٹی کی بات طے کردی اور ساتھ ہی تیاری بھی شروع کردی کہ شادی بھی جلد ہوجائے کیونکہ تحریک پاکستان زوروں پر تھی، وہ صاحب حیثیت بندہ تھا سو اس نے اپنی بیٹی کے لئے بہت سارا زیور تیار کروایا اور تمام تر جلدی کے باوجود تقسیم کا اعلان ہوگیا۔

اب طے یہ ہوا کہ لڑکی کی شادی وہ ہندوستان جاکر ہی کریں گے اور پھر ہجرت کی تیاری شروع کردی، ادھر شالنی کے دل میں آگ بھڑک رہی تھی وہ جسے چاہتی تھی وہ بھی اس کی بہن کا شیدائی تھا اب تو اس کا رشتہ ہوجانے سے ان دونوں کے لئے راہ اور بھی ہموار ہوگئی تھی، اس نے اپنی معصوم بہن جو کہ پھوپھی زاد کی پسندیدگی سے ذرا بھی آگاہ نہ تھی اسے نابود کرنے کا بھیانک منصوبہ سوچا۔

جس رات انہوں نے ہجرت کے لئے نکلنا تھا سب تیاری مکمل تھی اس کی ماں نے تمام قیمتی اور ضروری اشیاء ساتھ لے جانے کے لئے باندھ لی اور گھر میں موجود تمام زیورات مع بیٹی کی شادی میں دینے والے زیور سمیت ایک نیلے کپڑے میں رکھ کر باندھ لئے جانے سے کچھ پہلے ماں نے مالنی کو کہا کہ وہ ساتھ لے کر جانے کے لئے کنویں سے پانی بھر لے کہ نہ معلوم راستے میں پانی میسر آئے یا نہ۔ مالنی فوراً پانی لانے چلی گئی اس وقت تمام افراد خانہ مع دیگر رشتہ داروں کے گھر کے سب سے آخری کمرے میں تھے۔''

جیسے ہی مالنی پانی لینے کنوئیں پر آئی شالنی چپکے سے زیورات والی تھیلی چھپا کر اس کے پیچھے آگئی اور کنوئیں پر بہن کے پاس کھڑی ہوگئی، چھوٹی بہن اس کے عناد سے بے خبر اس سے باتیں کرتے ہوئے کنوئیں میں بالٹی پھینکنے کے لئے جھکی تو شالنی نے جلدی سے دھکا دے دیا، وہ اچانک اور بے خبری میں واقع ہونے والی افتاد سے سنبھل نہ پائی اور کنوئیں میں گرگئی، اس کے گرنے کے بعد اس نے پوٹلی بھی کنوئیں میں پھینک دی، بالٹی اور رسی باہر نکال لی تاکہ وہ باہر کا راستہ نہ پاسکے۔

اس کی تقدیر میں موت لکھی تھی سو کہ اس سے قبل گھر والوں کو خبر ہوتی کنوئیں کا پانی تاریکی اور خوف سبھی مل کر اس کی موت کی وجہ بن گئے اس کے والد کے کچھ رشتہ دار الٰہ آباد میں رہتے تھے، ہجرت سے قبل انہوں نے مرلی دھر سے خط و کتابت کے ذریعے انہیں اہل خانہ سمیت وہاں آباد ہونے کی دعوت دی تھی۔

بیٹا تمہیں اس مظلوم لڑکی کی روح دکھائی اس لئے دیتی ہے کہ وہ بے نام ونشان موت مری ہے اس کے گھر والوں کو سوائے بڑی بہن کے کسی کو اس کی موت کا علم نہیں اور نہ ہی اس کی آخری رسومات ان کے مذہب کے مطابق ہوئی ہیں، یہ ساری کہانی اس کی روح نے سید صاحب کو سنائی ہے اور تقاضہ کیا ہے کہ الٰہ آباد جاکر اس کے والد کو خبر کی جائے تاکہ وہ بیٹی کی موت سے آگاہ ہوں اور آکر کنوئیں سے اس کا جسد برآمد کر کے جلادیں اور رسم کے مطابق اس کی راکھ کو دریا برد کیا جائے، ساتھ ہی اس نے وہ امانت بھی لوٹائی جو زیورات اس کے ساتھ ہی کنوئیں میں گئے تھے۔

سید بابا نے لڑکی سے تفصیلی بات چیت کے بعد مجھے تمام حالات سے حرفاً حرفاً آگاہ کردیا اور تاکید کی کہ جاکر اس کے والد کو خبر کروں۔ اس بڑھاپے میں ایسا طویل سفر کچھ آسان نہیں مگر کندھوں پر پڑنے والی ذمہ داری سے منہ نہیں موڑ سکتا تھا، تمہارے ابا کو ساتھ لے کر گیا اور سیدھا پہلے اپنی بیٹی کے پاس ٹھہرا، پھر اتنے بڑے شہر میں ایک آدمی کی دستیابی آسان نہیں تھی مگر جب پروردگار جس کام کا ہونا مقدر کردے اسے ہونے سے کوئی روک نہیں سکتا، اس مظلومہ کی بے نشان موت کی راز افشائی کی گھڑی آگئی ہے اس لئے ہمیں کسی لمبے

چوڑے تردد کے بغیر لالہ جی مل گئے۔
بیٹا تم نہیں جانتی جب میں نے اس غم زدہ بوڑھے کو اس کی مرحوم بیٹی کا پیغام دیا تو اسکی حالت کیا ہوئی، تمہارے ابا بھی وہیں تھے کہ بیٹی کی کہانی سن کر وہ غریب غش کھا گیا اور بہت مشکلوں سے اسے سنبھالا گیا، ہماری بات کی سچائی کی گواہی ان زیورات نے دے دی جو میں نے پیغام کے ساتھ دیئے تھے، باپ کے ساتھ ساتھ ماں اور بھائی بھی اشکبار تھے، انہوں نے ہمارا شکریہ ادا کیا کہ ہم مذہب نہ ہونے کے باوجود ہم نے ان کے لئے اتنی تکلیف اٹھائی، اب وہ عنقریب یہاں آنے والے ہیں، وہ جب بھی آئے میں ان سے تمہاری ملاقات ضرور کرواؤں گا۔'' یہ کہتے ہوئے انہوں نے شفقت سے میری پیٹھ تھپتھپائی اور مجھ پر پھونک ماری۔
خالو میاں کی پھونک نے بہت راحت آفریں اثر کیا مجھ پر پھر انہوں نے مجھے گھر جا کر آرام کرنے کو کہا اور خود بھی تکیہ سیدھا کر کے دراز ہو گئے اور میں گھر کو آ گئی۔
بچپنا ہونے کے باوجود مرنے والی کی کہانی نے میرے دل ودماغ پر بہت دکھ بھرا اثر ڈالا، ایسا بوجھل پن طاری ہوا کہ دل کئی دن تک اداس رہا، اس اداسی کا خاتمہ اس روز ہوا کہ جس دن ہندوستان سے آئے مہمانوں کی آمد ہوئی۔
وہ جمعرات کا دن تھا اسکول سے آنے کے بعد پتہ چلا کہ سلیم چاچا کے ہاں مالنی کے گھر والے آئے ہیں، اماں ان کے گھر جانے لگی تو میں بھی ساتھ ہولی، جب ان کے ہاں پہنچے تو آنگن میں نئے چہرے دکھائی دیئے اماں تو ان سے واقف تھیں مگر میرے لئے سبھی اجنبی تھے آنے والوں میں مالنی کے والدین ایک بڑا بھائی اور ایک پنڈت جی تھے جن کا حلیہ بظاہر مخصوص تو نہیں تھا لیکن وہ ایک قابل پنڈت تھے اور لالہ جی انہیں بطور خاص ہمراہ لائے تھے کہ معاملہ ایک ایسی میت کا تھا جو تیرہ برس سے زیادہ عرصہ قبل دنیا سے گزری تھی۔
پہلے تو ان کی خاطرداری کی گئی اور پھر بیٹھ کر باتوں کا سلسلہ جاری ہوا، ان کی اچانک آمد کے سبب محلے کے وہ تمام افراد جو قدیمی جاننے والے تھے ملنے آرہے تھے خالو نے غالباً انہیں پہلے ہی سمجھا رکھا تھا سو انہوں نے قطعی اپنی بیٹی کا ذکر نہیں کیا بس اتنا کہتے رہے کہ۔ ''انہیں یہاں سے کچھ امانتیں لے جانی تھیں اس لئے اتنے برس بعد آنا پڑا۔''
لوگ مطمئن ہوئے یا نہیں مگر بہرحال میل ملاپ کا سلسلہ مغرب کے بعد تک جاری رہا، خالو نے لالہ جی کو سمجھا دیا کہ بات گھر کی عزت کی ہے اس لئے عجلت سے کام نہ لیا جائے بلکہ وہ صبر سے کام لیں لاش کی برآمدگی کا کام رات کے اندھیرے میں انجام دیا جائے تو بہتر ہے ورنہ اجالے میں افشائے راز کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔
میں یہاں رکنا چاہتی تھی تاکہ ساری کارروائی دیکھ سکوں مگر جانتی تھی کہ نہ تو اماں ابا ان حالات میں یہاں رکنے دیں گے اور نہ ہی خالو یہاں کیونکہ یہ معاملہ میری عمر سے بہت آگے کا تھا۔ ناچار مغرب کی اذان ہوئی تو واپس آ گئی۔
رات سونے تک بے چینی رہی رہ رہ کر ذہن میں مالنی اور اس کے گھر والوں کے اگلے قدم کی کارروائی مچلتی رہی یہاں تک کہ میں سو گئی، اگلی صبح جمعہ تھا اسکول سے چھٹی تھی صبح بہت جلد آنکھ کھل گئی اٹھنے کے بعد یہاں وہاں بیٹھ کر وقت گزاری کرتی رہی تاکہ دن چڑھے تو خالو کے ہاں جا سکوں۔
حالات ایسے بنے کہ میں خالو رحیم کے ہاں تو جاتی رہی مگر پھر دوبارہ ان سے اس موضوع پر بات کی نوبت نہ آ سکی میں نے محسوس کیا کہ وہ اس بات سے دانستہ گریز کر رہے ہیں وہ بزرگ آدمی تھے لہٰذا میں بھی سوال کی جرأت نہ کر سکتی کلثوم اور صفورا سے میں نے گھما پھرا کر بہت پوچھا مگر انہیں اس واقعہ کا قطعی علم نہ تھا سو کچھ عرصہ کی بے چینی کے بعد خود ہی قرار آ گیا اور وقت گزرتا رہا اماں سے کئی بار بات کرنی چاہی مگر وہ اس کے علاوہ کچھ نہ بتاتیں کہ ہندوستان سے آنے والے مہمان جس غرض سے آئے تھے وہ کام بخیر وخوبی ہو گیا، تفصیل ندارد رہتی پھر ایسا وقت آیا کہ میں سب کچھ فراموش کر کے معمول کی زندگی پر آ گئی، میں نے سوچنا چھوڑ دیا یہاں تک کہ پانچ برس بیت گئے،

اب خالو میاں اکثر بیمار رہنے لگے تھے، عمر ضعیفی کی جانب مائل تھی، طبیعت اکثر ناساز رہتی، اپنے اخلاق اور کردار کی وجہ سے وہ محلے کی ہر دلعزیز شخصیت تھے میرے والد سے خاص طور پر سلیم چاچا اور خالو میاں کی گاڑھی چھنتی تھی۔

نصف صدی قبل لوگوں میں میل جول محبت اور اخلاق کے انداز ہی اور تھے، ہر کوئی ان کی مزاج پرسی کے لئے چلا آتا، خالو کا ٹھکانہ مستقلاً بیٹھک میں ہوگیا جس کا بیرونی دروازہ ہمہ وقت کھلا رہتا تاکہ ملنے والے آزادانہ آجاسکیں۔

میں اور صفورا ایک جماعت میں تھیں اور ان دنوں آٹھویں کے سالانہ امتحان کی تیاری میں جتی رہتی ایک روز صفورا نے بتایا کہ ''دادا میاں کی طبیعت رات میں بہت بگڑ گئی تھی انہیں اسہال کا مرض بھی لاحق ہوگیا ہے۔''

یہ سن کر میرا دل بے چین ہوگیا کیونکہ ہم سب بچے ان سے حقیقی معنوں میں محبت کرتے تھے اسکول سے آکر میں نے اماں سے کہا کہ ''میں آج اماں بی کے ہاں جارہی ہوں خالو کی عیادت کے لئے اور کچھ دیر سے ہی آؤں گی۔''

اماں کو بتا کر میں صفورا کے گھر آگئی سب سے سلام دعا حال احوال کے بعد خالو کے پاس جا کر بیٹھ گئی، طبیعت میں خرابی کے باعث ان کی چارپائی دالان میں سلیم چاچا کے کمرے کے سامنے رکھی گئی تھی تاکہ رات میں حاجت کے لئے جانا ہو تو وہ با آسانی والد کو پکڑ کر لے جاسکیں۔

میں ان کی چارپائی پر جا کر پائنتی بیٹھ گئی اور ان کے پاؤں دبانے لگی، ساتھ ساتھ ان سے گفتگو کئے گئی وہ گاؤ تکئے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھے اور مجھے دھیمی آواز میں پندو نصیحت کررہے تھے کہ میں دل جمعی سے گھرداری سیکھوں سلائی کڑھائی کھانا پکانا اور دیگر امور خانہ داری پر توجہ دوں پھر وہ میری پڑھائی کے بارے میں پوچھتے رہے مجھے تاکید کی کہ کبھی تعلیم ادھوری نہ چھوڑوں، کم از کم گریجویشن لازمی کروں اور میں ان کی ہر بات پر سر تسلیم خم کرتی رہی، وہ بچیوں بیٹیوں سے اسی انداز میں بات کرتے تھے۔

پھر بات کرتے کرتے وہ چند ثانیوں کے لئے خاموش ہوگئے مجھے لگا کہ وہ تھک گئے ہیں اس لمحاتی خاموشی کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا۔ ''آمنہ بیٹا میں جانتا ہوں کہ مالتی کے انجام سے متعلق بہت سے سوالات تمہارے ذہن میں تشنہ ہیں، دل ہی دل میں مجھ سے یہ شکوہ بھی ہوگا کہ میں نے تمہیں بعد کے حالات سے آگاہ نہیں کیا لیکن بات یہ تھی کہ تم بہت چھوٹی اور نادان تھی میں تمہارے ذہن پر ایسا ماورائی سچائی کا بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا تھا ہاں اب تم کسی حد تک باشعور ہوگئی ہو تمہاری تربیت میں تمہارے والدین کے ساتھ ساتھ ہمارا بھی حصہ ہے امید ہے کہ تم اس قصے سے مثبت سبق لوگی۔

ہوا ہوں کہ مالتی کے والدین اس کے بڑے بھائی اور اپنے مذہب کے ایک قابل رہنما کے ساتھ یہاں آئے، طے ہوا کہ رات گہری ہونے پر اس کا جسد کنوئیں سے نکالا جائے، یہی رائے ان کے پنڈت نے بھی دی، اگرچہ رات میں ایک متروک کنوئیں میں اترنا اور کسی کی ہڈیاں تلاش کرنا صحیح معنوں میں نہایت کٹھن اور دل گردے کا کام تھا جبکہ تاریکی بھی حائل ہو۔

مگر مالتی کے بڑے بھائی نے یہ ذمہ داری لی کیونکہ ایک بار بہن کی موت سے جو کلنک لگ گیا تھا وہ اسے بمشکل جھیل پائے تھے وہ کسی تیسرے کو اس معاملے میں داخل کرکے مزید سوالات پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا قدرت کی طرف سے بہتری یہ ہوئی کہ یہ مکمل چاند کی رات تھی۔

رات گہری ہونے پر پنڈت جی نے جب کنوئیں کے اطراف کا حصار باندھنے کے بعد اسے پانی میں اترنے کی اجازت دی تو اس وقت چاند بالکل کنوئیں کے مقابل تھا اور چاندنی کنوئیں میں اجالا کررہی تھی۔ مضبوط رسوں کا انتظام میں نے پہلے ہی کررکھا تھا گیس لیمپ روشن کرکے رسہ اس کی کمر کے گرد باندھا اور اسے لیمپ دے کر کنوئیں میں اتارنے لگے۔ تو سلیم نے کہا کہ وہ بھی اترے گا تاکہ اس کا ہاتھ بٹا سکے، پنڈت جی سے مشورہ کرکے ہم نے دھڑکتے دل سے اسے بھی ساتھ بھیج دیا لیمپ پکڑنے کا کام سلیم نے لے لیا۔

خیال یہ تھا کہ ان تیرہ برسوں کے بعد صرف ہڈیاں ہی دستیاب ہوں گی مگر بیٹا میری عمر اب پچھتر سے

بھی متجاوز ہے مگر ایسا معجزہ ہوا کہ ان دونوں کو پانی میں اترتے ہی پانی کی سطح پر مالنی کی صحیح وسالم لاش تیرتی نظر آ گئی، اس کے بھائی کو چند منٹ تک اپنی آنکھوں پریقین نہ آیا پھر جب حواس قائم ہوئے تو اس نے جھپٹ کر بہن کی لاش کو سینے سے لگالیا۔

سلیم کے ہاتھ میں پکڑے لیمپ کی روشنی سے سب بخوبی نظر آ رہا تھا پھر ان دونوں کو نکالا گیا کنوئیں کے قریب تمہاری اماں بی نے چار پائی اور سفید چادریں رکھ دی تھیں۔

مالنی کی لاش صحیح حالت میں دیکھ کر تو ہم سب کو سکتہ ہوگیا، وہ بالکل ایسے تھی کہ ابھی چند منٹ قبل پانی میں گری ہو اور ابھی نکال لی ہو حتیٰ کہ اس کی ساڑھی بھی بالکل ٹھیک حالت میں تھی گلے میں پہنی سونے کی زنجیر بدستور موجود تھی البتہ ایک پاؤں کی پازیب پاؤں سے نکل کر ساڑھی کے کنارے سے اٹکی ہوئی تھی۔

اس سے قبل کہ فرط غم سے اس کی ماں کی چیخیں نکل جاتیں، تمہاری اماں بی نے فوراً دوپٹہ ان کے منہ پر جما کر روک لیا کہ مبادا پڑوسیوں تک ان کی آواز آ جاتی، آنسو تو ہم سب کے بہہ رہے تھے میں نے دھیمے سے لالہ جی سے سوال کیا کہ ''آپ تو کہتے ہیں کہ آپ کی بیٹی کلنکنی تھی پھر یہ کیا ہے؟''

انہوں نے کہا۔ ''میاں جی میں خود یقین نہ کرسکا مگر شالنی نے مالنی کے غائب ہونے پر کہا کہ 'وہ پڑوس کے مسلمان لڑکے سے ملتی تھی اس کے ساتھ شادی رچانے کے شوق میں عین وقت پر زیور چرا کر اس کے ساتھ بھاگ گئی تاکہ ہم ساتھ نہ لے جاسکیں۔''

وقت ایسا تھا کہ تحقیق ممکن نہ تھی اور اس کی بات پر یقین بھی نہ آتا تھا مگر سارا زیور غائب ہونے نے اس بات کو ماننے پر مجبور کردیا۔

میں نے کہا ''لالہ جی جان لیں یہ آپ کی بڑی بیٹی نے اس معصوم پر تہمت لگائی اور اوپر والے نے اس کی سچائی اور پارسائی برسوں بعد آپ پر عیاں کردی۔''

پنڈت جی نے بھی یہی کہا کہ ''وہ ہوش سنبھالنے سے اب تک دھرم کے کام کرتے آئے ہیں یہ بات اٹل ہے کہ ان کے حساب سے لڑکی بے قصور ہے بے موت مارے جانے کے بعد سے اب تک وہ آپ کا انتظار کرتی رہی تاکہ آپ کے ہاتھوں ہی اس کا آخری سفر شروع ہو۔''

ہم سب بہت افسردہ تھے آہوں اور سسکیوں نے رات کے اس پہر ساری فضا غم زدہ کردی، ہم اس کی چار پائی لے کر کمرے میں آ گئے تمام شب جاگ کر کٹی ان لوگوں کا رکنا ممکن نہ تھا، سو صبح تابوت میں میت ڈال کر وہ روانہ ہوگئے جاتے ہوئے مالنی کی ماں نے بتایا کہ

''اس کی بڑی بیٹی شالنی کی شادی وہاں جا کر کردی گئی تھی مگر سالوں گزرے اولاد نہ ہوئی اور ایک حادثے میں اس کے دونوں ہاتھ بیکار ہوگئے تو سسرال والوں نے گھر سے نکال دیا پھر کچھ عرصہ بعد اس کا انتقال ہوگیا۔''

اس پر اماں بی نے کہا۔ ''جن ہاتھوں سے اس نے بہن کو بے موت مارا وہ بیکار ہی ہونا تھے۔'' پھر وہ تمام لوگ چلے گئے ایک دکھ بھری کہانی چھوڑ کر، میں نے بھی کچھ عرصہ کے بعد یہ کنواں مستقلاً بند کروادیا۔'' یہ سب بتاتے ہوئے خالو میاں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

میں نے کہا۔ ''خالو میں نے اس کے والدین کے یہاں ہوکر جانے کے بعد اسے خواب میں دیکھا تھا اس نے میری پیشانی پر بوسہ دیا اور میرے گلے موجود مالے کے پتھروں پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔ ''تم مجھے یاد رکھنا جیسے میں تمہیں اس دنیا میں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔''

تب مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ اپنے مقام پر پہنچ چکی ہے۔

بہرحال ایک بات تو واضح ہوگئی کہ حسد کی آگ سب سے زیادہ بہن بھائیوں کے مابین ہوتی ہے جیسے قابیل اور ہابیل کا واقعہ اور جیسے برادران یوسف کا قصہ۔

الغرض جب تک دنیا قائم ہے یہ آگ جلتی رہے گی اور پھر بالآخر آخرت میں جا کر آتش جہنم میں بدل جائے گی۔

بھیانک موت

عثمان غنی۔ پشاور

دیکھتے ہی دیکھتے نوجوان کے گلے میں موجود سونے کی چین کا گھیرا تنگ ہونے لگا اور پھر چشم زدن میں وہ گھیرا اتنا تنگ ہوگیا کہ نوجوان کی آنکھیں باھر کو ابلنے لگیں اور آنکھیں بے نور ہو کر پتھرا گئیں پھر......

انتقامی کارروائی کی ایک اندوہناک، خوفناک، وحشت ناک اور دہشت ناک خونی کہانی

گرمی عروج پر تھی جس نے ناک میں دم کر رکھا تھا دل کی دھڑکن عجیب تھی اور کسی انہونی کا احساس دلا رہی تھی۔

جونہی اس نے اپنی بڑی سی حویلی کے صحن میں قدم رکھا اس کا چکراتا ہوا سر مزید چکرا گیا اس کے ہاتھوں میں پکڑا ہوا اٹیچی کیس نیچے فرش پر گرتا چلا گیا۔

حویلی کے وسیع صحن میں بے شمار عورتیں اور مردوں کا جم غفیر تھا جو سب کے سب سفید لباس زیب تن کئے ہوئے تھے جو بھی ہجوم کے درمیان جاتا کانوں کو ہاتھ لگاتا ہوا واپس آتا۔ وہ پوری قوت سے بے جان قدموں سے چلتا ہوا ہجوم کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔

جونہی وہ درمیان میں پہنچا اس کی زوردار چیخ نکلی۔ اس کے چہرے پر زمانے بھر کا خوف اور پریشانی عود کر آئی۔ دن کے وقت اسے تارے نظر آنے لگے اس نے

کانپتے ہوئے ہاتھوں سے گلے میں موجود ٹائی اتار پھینکی آنکھوں سے چشمہ اتار کر دونوں ہاتھوں سے آنکھوں کو ملنا شروع کر دیا کہ شاید یہ خواب ہو سراب ہو نظر کا کوئی دھوکہ ہو مگر نہ تو یہ کوئی خواب تھا، جو ٹوٹ جاتا، نہ سراب تھا، جو ختم ہو جاتا، اور نہ نظر کا کوئی دھوکہ تھا۔

وہ حقیقت تھی ایک تلخ حقیقت جسے ہر قیمت اسے قبول کرنا تھا۔ یہ اس کی سب سے قیمتی سرمائے کا ڈوب جانا تھا، اس کے پتا کی لاش، جو سفید کپڑے میں سرخ خون میں ڈوبی پڑی تھی۔

لاش انتہائی مسخ شدہ اور ہیبت ناک تھی اس کی ماتا بھی اپنے پتی کی لاش کے پاس دھاڑے مار مار کر رو رہی تھی لاش انتہائی بھیانک حالت میں تھی۔ دونوں ہاتھ کہنیوں سے کٹے ہوئے تھے اور دونوں آنکھیں غائب تھیں۔

''کس نے پتا جی کو مارا ہے؟'' وہ پوری سے چیختا ۔''کس نے میرے پتا کا خون کیا ہے؟ بتاؤ۔'' سرخ آنکھوں اور کرخت چہرے سے وہ پوری قوت سے چیخا بتاتے کیوں نہیں تم سب خاموش کیوں ہو، یہ غصے کا شدید ترین ردعمل تھا۔

لیکن اسے کون بتاتا چند آدمی حویلی کے باہر سڑک پر سے چندر کمار کی لاش کو اٹھا کر گھر لائے تھے۔

''رام یہ سب تیری وجہ سے ہوا ہے صرف تیری وجہ سے، تو نے کتنا ظلم کیا ہے اپنے پتا پر، مار دیا اپنے پیارے پتا کو، تو..... کتنا سنگدل ہے۔''

''تیری بے رحمی نے تجھے پتا سے محروم کر دیا ہے۔''

رام نے اپنے بال دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں میں جکڑ لیے۔

''اناث کر دیا ہے تیری خودغرضی نے تجھے۔ تو ہے اپنے پتا کا قاتل، تو ہی ہے ان کا مجرم۔'' یہ آواز کسی اور کی نہیں تھی اس کے اپنے ضمیر کی تھی جو اس نازک موقع پر اس کے دماغ پر ہتھوڑے برسا رہا تھا اور یہی وہ لمحہ تھا جب اسے اپنے ضمیر کی آواز سننی چاہیے تھی مگر اس نے ان سنی کر دی۔

ضمیر بہت کم انسان کو روکتا ہے اور خوش قسمت ہوتا ہے وہ انسان جو ضمیر کی آواز پر سدھر جاتا ہے۔ ضمیر کے پکار پر بدل جاتا ہے مگر وہ رام تھا شیطان کا پیروکار۔ اور یہی وہ لمحہ تھا جب اسے اپنے ضمیر کی آواز کا کوئی دکھ نہ تھا۔ اس کا رحم دل، پیار کرنے والا باپو مر چکا تھا وہ اپنے پتا کے سرہانے بیٹھا اپنے تلخ ماضی کو یاد کرنے لگا۔

اس کا پتا، گاؤں کا جاگیردار تھا، چندر کمار نہ صرف خوش اخلاق بلکہ بہت رحم دل تھا اور محبت کرنے والا تھا۔ جاندار چاہے وہ حیوان ہوں یا پھر انسان وہ ہر ایک سے محبت کرتا تھا، جبکہ رام کمار اس کا چھوٹا بیٹا بچپن سے ایک سفاک، نہایت بے رحم اور نفرت کرنے والا انسان تھا۔

جب رام چھوٹا تھا اپنے بڑے بھائی سورج کمار سے حسد میں مبتلا تھا اسے یہ دکھ تھا کہ ''پتا جی سورج کمار کو مجھ سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔''

اور اسی نفرت نے ہی بچپن میں ہی رام کو قتل جیسے سنگین جرم کروانے پر مجبور کر دیا رام نے قتل کسی اور کا نہیں بلکہ اپنے بڑے بھائی سورج کمار کا کیا تھا اور وہ بھی تیز دھار چھری سے، اس کی دونوں آنکھیں نہایت سفاکی سی نکال دی تھیں اور غصے سے اس کے دونوں ہاتھ کاٹ دیئے تھے اور اب بڑا ہو کر وہ برے برے دوستوں اور بری سوسائٹی کا شکار ہو گیا تھا، اس میں غصہ، انا، جذباتی پن، حسد، نفرت، اور برائی کوٹ کوٹ کر بھری تھی باپو چندر کمار کی لاکھ کوششوں کے باوجود وہ سیدھے راستے پر چل نہ سکا۔ دولت کی ریل پیل تھی کسی بھی چیز کی کمی نہ تھی تبھی تو وہ بگڑ گیا تھا۔

☆......☆......☆

وہ ایک بھیگا بھیگا دن تھا۔ بوندا باری خوب ہو رہی تھی چندر کمار اور رام کی ماتا، ضروری کام سے دور دراز کے کسی قصبے میں گئے ہوئے تھے اور جب بھی رام کمار گھر میں تنہا ہوتا وہ رات کو تمام نوکروں کو چھٹی دے دیتا تھا وہ اکیلا رہنا پسند کرتا تھا اور انسانوں سے اسے نفرت تھی رات گئے تک دوستوں کے ساتھ شراب کا دور چلتا۔

دوستوں کے جانے کے بعد وہ بالکل اکیلا رہ گیا۔ بارش کی بوندوں نے خوب برسنا شروع کیا، رام بستر پر لیٹ گیا، ابھی وہ نیند کے خمار میں ڈوبا نہیں تھا کہ حویلی کی گھنٹی بج اٹھی۔

رام اٹھا اور حویلی کے مین گیٹ پر پہنچ گیا مگر مین گیٹ پر کوئی نہیں تھا۔ رام کے جیب میں لوڈ پستول موجود تھا گھنٹی کی آواز حویلی کے باہر بڑے پھاٹک پر لگی کال بیل کی تھی رام نے ٹارچ روشن کی اور بارش کی بوندوں میں بھیگتا ہوا بڑے پھاٹک پر پہنچ گیا۔ جب کنڈی ہٹائی اور پھاٹک کھولا تو باہر بارش میں ایک جوڑا کھڑا تھا ایک مرد اور ایک عورت۔ عورت کے کھلے بال بارش کی وجہ سے بھیگ کر شانوں کی طرح اس کے بدن پر لپٹے ہوئے تھے وہ دونوں سردی سے ٹھٹھر رہے تھے وہ خوبصورت جوڑا رام کو دیکھ کر سکھ کا سانس لینے میں کامیاب ہوگیا۔ دونوں پھاٹک سے اندر آدھمکے۔ لڑکے نے براؤن کلر کا اسکن ٹائٹ پہن رکھی تھی جبکہ خوبصورت شاداب لڑکی نے سفیر رنگ کی ساڑھی باندھ رکھی تھی جو بھیگنے کی وجہ سے اسے دوآتشہ بنا رہی تھی اور گیلی ہونے کی وجہ سے اس کے جسم سے چپک کررہ گئی تھی رام کی تیز نظریں بار بار لڑکی کے ابھرتے نقوش اور حسین بدن کا طواف کررہی تھیں۔

''کیا ہم آپ کے گھر میں رات بتا سکتے ہیں؟'' لڑکی نے پوچھا۔

''ضرور..... مگر تم نے یہ ایک ہاتھ چھپا کیوں رکھا ہے۔'' رام نے لڑکی کا جائزہ لیتے ہوئے کہا، لڑکی کے ہاتھ میں کپڑا سا دبا ہوا تھا جسے اس نے پیچھے کی جانب چھپا رکھا تھا۔

''اوہ یہ یہ میرا طوطا ہے۔ جو مجھے جان سے عزیز ہے۔'' لڑکی نے پشت والا ہاتھ سامنے کیا۔ وہ ایک بہت چھوٹا سا پنجرہ تھا جو کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔

رام نے دونوں کو اندر بلایا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں کافی سے لطف اندوز ہورہے تھے۔ انہیں کپڑے میسر آچکے تھے۔

رام ان کی میزبانی کررہا تھا مگر وہ نشے میں تھا۔

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں رات کے ایک بجے آپ دونوں تیز بارش میں کہاں جارہے تھے آئی مین کہیں آپ دونوں گھر سے بھاگ کر تو نہیں آئے؟'' رام نے چند لمحے توقف کے بعد پوچھ لیا۔

''میرا نام وجے ہے اور یہ میری پتنی گیتا ہے۔ ہم بمبئی سے آئے ہیں قریبی ریسٹورنٹ جارہے تھے مگر بدقسمتی سے ہماری گاڑی خراب ہوگئی، آپ کی حویلی دور سے صاف دکھائی دی تو پناہ لینے یہاں آگئے آپ بہت مہربان ہیں جو ہمیں رات بتانے کے لئے جگہ دی۔''

''آپ کا طوطا کیا میں دیکھ سکتا ہوں؟ رام نے گیتا کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

''جی ضرور، خاص انمول طوطا ہے جو باتیں بھی کرتا ہے، یہ گیتا کی جان ہے۔'' وجے نے بتایا۔

گیتا نے طوطے کے پنجرے سے ڈھکا ہوا کپڑا ہٹایا اور پنجرہ رام کی طرف کردیا۔ رام نے ہاتھ بڑھا کر پنجرہ لے لیا۔ اور پھر اس نے طوطے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ طوطا ایک دم سہم سا گیا اپنے پر پھڑ پھڑانے لگا اور باریک سی آواز میں بولا۔

''اس سے بچنا، اس سے بچنا، یہ دھوکے باز ہے۔'' طوطے کی بات رام کو بہت بری لگی اس نے جیب سے چاقو نکالا طوطے کی بات، پر وجے اور اس کی پتی گیتا ہنس رہے تھے اور رام کو ان دونوں کی ہنسی سخت زہر لگ رہی تھی۔

رام نے پنجرہ کھول کر طوطا نکالا اور چاقو اس کی گردن پر پھیردی۔ رام کے ہاتھ طوطے کے خون سے سرخ ہوچکے تھے۔

''یہ آپ نے کیا کردیا۔'' وجے نے مرے ہوئے طوطے کو دیکھ کر بولا اور گیتا باقاعدہ بلند آواز سے رونے لگی۔

''یہ میری آنکھوں میں کھٹک رہا تھا۔ ہمیں جو چیز کھٹکتی ہے وہ ہم ختم کردیتے ہیں آپ گیتا جی سے کہئے کہ خاموش ہوجائیں ہمیں رونا دھونا سخت ناپسند ہے۔''

مگر گیتا پر رام کی بات کا کوئی اثر نہ ہوا وہ باقاعدہ رورہی تھی۔

''وجے ہمارے جان سے پیارے طوطے کو اس خونی نے مار ڈالا۔ چلو ہم یہاں ایک پل نہیں رک سکتے۔'' گیتا تیز آواز سے روتے ہوئے بولی۔ گیتا کو کھڑے ہوتے دیکھ کر وجے بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

''آپ لوگ نہیں جاسکتے۔'' رام چیختے ہوئے بولا۔

''آپ ہمیں روکنے والے کون ہوتے ہیں۔'' گیتا چیخی۔ وجے اور گیتا دروازے کی سمت بڑھے مگر رام کا غصے سے برا حال تھا۔ اس نے وجے کو مکا مارا۔ اور گیتا کو پلنگ پر دھکیل دیا، وجے کی ناک سے بہتے خون کو دیکھ کر دونوں پریشان ہوگئے۔

رام نے دھکا مار کر وجے کو گرایا اور خود اس کے سینے پر چڑھ کر اسے زمین سے رگڑنے لگا مگر وجے بہت طاقتور تھا اس نے رام کو اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا اور اپنی کک سے رام کی تواضع کرنے لگا رام نے دونوں ہاتھوں سے وجے کے پاؤں کو پکڑا اور اسے مروڑا تو وجے منہ کے بل زمین پر آ گرا رام کھڑا ہوگیا۔

گیتا نے پھولوں کا گلدستہ اٹھایا اور اسے رام کی طرف پھینکا رام نے گلدستہ ہوا میں ہی اچک لیا اور تیزی سے گیتا کے سر کا نشانہ لے کر گلدستہ پھینکا نشانہ ٹھیک لگا تھا گیتا کے سر پر گلدستہ لگتے ہی وہ بے ہوش ہوگئی اور اس کے سر سے خون بہنے لگا، وجے گیتا کی سمت بڑھا مگر رام نے اسے پکڑ لیا اور اس کا گلہ پکڑ کر دیوار سے پے در پے ٹکرا دیا اور جنون میں آ کر اسے اس وقت تک دیوار سے ٹکراتا رہا جب تک وہ ٹھنڈا نہ ہوگیا پھر رام نے وجے کی لاش کو گھسیٹ کر نیچے لے گیا اور ایک بوسیدہ صندوق میں بند کر دیا۔

صندوق انسانوں کی بے شمار آنکھوں اور دیگر اعضاء سے بھرا ہوا تھا، بے شمار آنکھیں سوکھے پنجے صندوق میں موجود تھے۔

چاقو نکال کر رام نے وجے کی دونوں آنکھیں نکالیں اور اس کے دونوں ہاتھ کلائیوں سے کاٹ کر صندوق میں پھینک دیئے۔ رام ایک جنونی قاتل تھا اچانک اسے گیتا کا خیال آیا وہ جلد اوپر جانے لگا اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تیر گئی۔ ''ایک اور شکار۔''

مگر جب وہ اوپر پہنچا۔ تو گیتا نہیں تھی۔ خون کی باریک لکیر کمرے کے دروازے کی سمت گئی تھی۔ ''تو گیتا بھاگ گئی۔''

رام کے ابرو تن گئے۔ ''گیتا میرے لئے مصیبت لائے گی کہیں پولیس کو نہ بلا لے۔'' رام کے پیروں میں پہیے لگ گئے اس نے جلدی سے وجے کی لاش جلادی اور خون کے چھینٹے صاف کر دیئے۔

رام نے گیتا کو بہت تلاش کیا۔ مگر وہ کہیں نہ ملی وہ گیتا کو ہر حال میں ڈھونڈنا چاہتا تھا مگر وہ مل کے نہیں دے رہی تھی۔ یوں تلاش کے دوران ایک مہینہ گزر گیا۔ اور رام کی پریشانی دور ہوگئی۔ کیونکہ اگر گیتا پولیس کو بتاتی تو کب کی بتا چکی ہوتی۔ مگر گیتا نے پولیس کی مدد نہیں لی تھی، رام نے اسے ڈھونڈ کر وجے کے پاس اسے پہنچانا چاہتا تھا اور پھر کئی مہینوں کے بعد گیتا کو بھول گیا۔

وہ ایک سہانی شام تھی کلب میں رام موجود تھا رام کلب کا سب سے بڑا جواری تھا۔ وہ لاکھوں کا جوا کھیلتا تھا وہ اپنے لئے ایک پارٹنر کی تلاش میں تھا ایک میز کے گرد ایک نفیس تھری پیس سوٹ زیب تن کئے خوبصورت سا نوجوان بالکل اکیلا بیٹھا تھا۔ رام اس کے پاس گیا۔ ''کیوں دوست کھیلو گے۔؟''

''ہاں...... کیوں نہیں...... بازی تو ہونی چاہئے۔'' نوجوان خوشی سے بولا۔

رام نوجوان کے سامنے بیٹھ گیا اور میز پر پتے بکھرا دیئے۔ نوجوان نے بھی تاش کے پتے بکھرا دیئے دونوں اب کھیلنے لگے چند لمحوں کے بعد نوجوان پتے سمیٹ چکا تھا رام کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا وہ بری طرح سے ہار چکا تھا رام کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔

وہ نوجوان اٹھ گیا اور کلب سے باہر جانے لگا رام بھی اٹھا اور نوجوان کا پیچھا شروع کر دیا نوجوان خوش تھا رام سے وہ لاکھوں جیت چکا تھا۔

وہ ایک ویران شاہراہ تھی سفید رنگ کی ہنڈا اکارڈ نے گاڑی کے آگے بریک لگائیں اور رام اپنی گاڑی سے باہر نکلا، اس نے جلدی سے کالی رنگ کی گاڑی سے اس نوجوان کو گھسیٹ کر نکالا اور اس کی کنپٹی پر پستول رکھ دیا۔

''سالے تو ایک شاطر ہے مجھ سے شاطرپنگ کر کے بازی جیت کے جا رہا ہے۔'' رام نے نوجوان کے

سر پر پستول کا دستہ مارا دستہ لگتے ہی نوجوان بے ہوش ہوگیا رام نے بے دردی سے نوجوان کے سینے میں گولی اتار دی۔ پھر جیب سے چاقو نکال کر، بے رحمی سے اس کی آنکھیں نکال دیں اور دونوں ہاتھ کلائیوں سے کاٹ کر بریف کیس یں رکھ دیئے۔ نوجوان کی لاش کو گاڑی میں ڈال کر اس پر پیٹرول چھڑک کر گاڑی سمیت اسے آگ لگادی بریف کیس اٹھا کر وہ جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گیا اور وہاں سے نو دو گیارہ ہوگیا۔

حویلی پہنچ کر رام نے کپڑے تبدیل کئے اور رات گزار کر صبح گاؤں کے لئے نکل گیا اور پھر جب دن چڑھے وہ حویلی پہنچا تو اس کے باپو کی چتا اس کی منتظر تھی۔ اس کا دل آج عجیب طرح دھڑک رہا تھا جب وہ بڑی حویلی جا رہا تھا اس کے بریف کیس میں نوجوان کی آنکھیں اور ہاتھ تھے جنہیں وہ جلد سے جلد پرانے صندوق میں منتقل کرنا چاہتا تھا۔

☆......☆......☆

کسی کے جھنجھوڑنے پر وہ ماضی سے نکل آیا۔ یہ اس کا نوکر تھا۔ ”صاحب جی بڑے صاحب کی چیتا کو آگ لگانے کے لئے آجائیں۔“ سفید لباس وہ کب کا پہن چکا تھا، بریف کیس ابھی تک کمرے میں رکھا تھا وہ بریف کیس کو نظر انداز کر کے کمرے سے باہر نکلا اور شمشان گھاٹ جانے لگا جہاں اس نے اپنے پتا کی چتا کو آگ لگاتے ہوئے رو پڑا۔ روتے ہوئے اچانک اس کے ذہن میں گیتا کی شبیہہ ابھری۔ ”نن...... نہیں۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا گیتا...... تت...... تو نے میرے باپو کو مار کر اچھا نہیں کیا۔“

روتے ہوئے وہ بڑبڑانے لگا۔ جیسے کے اسے یقین ہو کہ یہ قتل گیتا نے ہی کیا ہے...... اسے اب گیتا کو ڈھونڈنا ہی تھا۔

انتم سنسکار سے فارغ ہوکر رام نے اس نوجوان کے اعضاء بریف کیس سے نکالا کر پرانے صندوق کی نذر کر دیئے۔ اس کی یہ خونی پیاس صرف اور صرف اس صورت میں پوری ہوسکتی تھی جب وہ کسی انسان کی ہتھیا کر کے ان کے اعضاء کاٹ نہ لیتا۔

چندر کمار کے موت کے 15 دن بعد رام گیتا سے ملا۔ مگر کیسے......؟

چندر کمار کو مرے ہوئے کئی دن بیت گئے رام پھر سے پرانا رام کمار بن چکا تھا۔ پتا کی موت نے اس پر کوئی اثر نہیں کیا تھا ان دنوں اسے صرف اور صرف گیتا کی تلاش تھی اسے گیتا کا جسم چاہئے تھا اور اسے بہت بھیانک موت دینا چاہتا تھا۔

گیتا کو اس نے ہر لمحہ ہر جگہ ڈھونڈا۔ مگر اسے نہ ملنا تھا نہ ملی وہ آج خود کو ریلیکس کرنے کلب آیا تھا۔

سوئمنگ پول کے قریب کرسی پر وہ بیٹھ گیا ویٹر لڑکی اس کے قریب آئی۔ ”جی سر آپ کا آرڈر؟۔“

”یس! دو پیگ لا دو۔“ ویٹر گرل مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

سوئمنگ پول کے قریب سے پانچ لڑکیوں کا ٹولہ چل رہا تھا۔ ان لڑکیوں کے درمیان ایک نہایت ہی الٹرا ماڈرن لڑکی تھی۔ جس نے شارٹس پہن رکھی تھی۔ وہ لڑکی سنہرے بالوں والی اسے جانی پہچانی سی لگی۔ وہ ساتھی لڑکیوں سے کسی بات پر بحث مباحثہ کر رہی تھی۔

رام کے ارد گرد دھماکے سے ہونے لگے۔ وہ الٹرا ماڈرن لڑکی کوئی اور نہیں گمشدہ گیتا ہی تھی۔ رام اسے دیکھ کر اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔

لڑکی بار کلب میں چلی گئی۔ رام بھی اٹھ کر کلب میں چلا گیا۔ اندر کلب میں لاؤڈ میوزک چل رہا تھا اور گیتا اب اسٹیج کے رنگین بے شمار رنگا رنگ روشنیوں میں انتہائی ہیجان خیز رقص پیش کر رہی تھی۔

دیوانے انجانے، مستانے، او بے خبر میرے
تجھے میں مار دوں آج میں اپنے پیار سے
ذرا تو پاس میرے آجا، میرے دل میں بس جا رے

سن گلاسز اتار کر وہ اسٹیج کے سامنے والے رو میں بیٹھ گیا، ویٹر گرل چلتی ہوئی اس کے پاس آئی...... اور دونوں پیگ اس کے سامنے رکھ دیئے۔

لڑکی جانے لگی...... رام نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا
۔''سنو سویٹ گرل؟'' ویٹر لڑکی نے نا سمجھی سے رام کو دیکھا۔
''وہ لڑکی جو ناچ رہی ہے وہ کون ہے؟''
''سر! یہ لڑکی اس کلب میں نئی ہے۔ اس کا نام گیتا ہے۔'' ویٹر لڑکی نے وضاحت دی۔
''بس...... اتنا ہی کافی ہے۔'' رام اس کلب کا پرانا ممبر تھا۔ مگر گیتا کو اس نے پہلی بار یہاں دیکھا تھا۔ رام نے پرس سے ہزار کا نوٹ نکال کر ویٹر گرل کو دے دیا جسے اچک کر ویٹر گرل نے اپنے گریبان میں اڑس لیا۔
ناچتے ناچتے گیتا کی نظر رام پر رک گئی اور پلٹنا بھول گئی وہ رام کو پہچان چکی تھی مگر چند لمحوں میں ہی وہ سنبھل گئی۔
شو ختم ہونے کے بعد گیتا خود رام کی جانب چلی آئی کیونکہ وہ سمجھ چکی تھی کہ رام کی نظریں اس سے بالکل بھی نہیں ہٹ رہی تھیں۔
''لگتا ہے کسی کی تلاش ہے؟'' گیتا نے گہرا طنز کیا۔
''ہاں تھی تلاش مگر آج ختم ہوگئی۔''
رام نے زہریلی مسکراہٹ چہرے پر سجالی۔
''ویسے ہم نے آپ کو پہچانا نہیں۔'' گیتا بھولی بنی۔
''ہم پہلے مل چکے ہیں۔ مگر وہ ملاقات کچھ خوشگوار نہیں تھی۔ اور لگتا ہے آپ نے بھلا دیا ہے۔'' رام زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔
''شاید۔'' گیتا مسکرانے لگی۔ اور اس کے پاس بیٹھ گئی۔ رام بھی مسکرا دیا۔
گیتا اب بھولی بالی نادان گیتا نہیں تھی جتنے دن وہ غائب رہی تھی۔ وہ سیدھا اپنے ایک دور دراز کے رشتے کے چچا جو جادوگر تھا اس سے ملنے گئی تھی اور گیتا نے اس سے جادو سیکھنے میں کئی مہینے لگا دیئے تھے۔
اور اب وہ اس شہر میں صرف اور صرف رام کے لئے آئی تھی اپنے شوہر اور جان سے پیارے طوطے کا انتقام لینے، جادو کے زور پر ہی گیتا نے رام کی زندگی کی معمولات کے بارے میں پتہ چلا لیا تھا کہ ''وہ کیا کیا کرتا ہے اور کیا کیا کر رہا ہے کہاں جاتا ہے کہاں دن گزارتا ہے؟''
''کیا ہم کچھ وقت ساتھ بتا سکتے ہیں؟'' گیتا مسکراتے ہوئے پوچھ بیٹھی۔
''لیس......'' رام نے اس کا دودھیا ہاتھ پکڑ لیا۔
''چلو...... تمہیں شاپنگ کرا دوں۔'' رام نے گیتا کو پیار سے کہا۔ وہ خبطی تھا جنونی تھا۔ ''میں تمہیں حاصل کر کے تمہارے پتی دیو کے پاس جلد بھیج دوں گا۔'' رام دل ہی دل میں گویا ہوا۔
گیتا رام کے ساتھ دل پر جبر کر کے مارکیٹ میں گھوم پھر رہی تھی رام نے گیتا کے لئے ڈائمنڈ ہار خریدا اور اپنے ہاتھ سے گیتا کو پہنا دیا۔
گیتا نے اس کے لئے مردانہ چین خریدا اور اسے پہننے کو کہا اور اس کے لئے دو عدد بریسلٹ خریدے جو گیتا نے خود باری باری اس کے دونوں ہاتھوں میں پہنا دیئے۔
حالانکہ رام ایک ہاتھ میں بریسلٹ پہننے کا خواہاں تھا۔
مارکیٹ سے نکل کر گاڑی کا رخ حویلی کی طرف تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ ''اسی جگہ گیتا کو ماروں گا جہاں سے یہ کتیا بچ کر بھاگ گئی تھی تاکہ اپنے ادھورے کام کو پورا کردوں۔''
ادھر گیتا وجے کی موت نہ بھولی تھی وہ گاڑی میں بیٹھ کر مسلسل کوئی منتر پڑھ رہی تھی اور رام دل ہی دل میں گیتا پر ہنس رہا تھا۔ ''آج تو جتنی بھی پرارتھنا بھگوان سے کرلے تو بچے گی نہیں، آج تجھے بھگوان بھی نہیں بچا پائے گا۔''
مگر گیتا اپنی جگہ برابر منتر پڑھے جا رہی تھی۔
حویلی پہنچ کر رام نے گیتا کو اپنے کمرے میں لے گیا اور اسے کندھے سے پکڑ کر کہا۔
''بیٹھو گیتا اور پہچانو مجھے میں وہی رام ہوں جس نے تمہارے پتی وجے اور تمہارے جان سے پیارے طوطے کا خون کر دیا تھا۔''
''جانتی ہوں کیسے بھول سکتی ہوں اس رات کو۔ اسی لئے تو یہاں آئی ہوں۔ تاکہ تم سے حساب بے باک

کرسکوں۔“ گیتا بولی۔

”بدذات تو نے میرے پتا کو کیوں مارا؟“ پوری قوت سے رام نے گیتا کو تھپڑ مار دیا۔

”اس رات جب میں ہوش میں آئی تو تم اور میرے پتی کمرے میں نہیں تھے میں نیچے گئی تو ایک کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور اس میں تم میرے پتی کی لاش کے اوپر بیٹھے اس کی آنکھیں نکال رہے تھے میں وہاں سے بھاگنے میں کامیاب ہوئی اور 15 دن قبل تمہارے پتا کو بالکل اسی طرح مارا۔ جیسے تم نے میرے وجے کو مارا تھا اور اب باری تمہاری ہے، تمہارے خون سے میں اپنی پیاس بجھانے آئی ہوں۔

”ہاہا.....ہاہا.....“ گیتا ہنسی۔

”یہ تیری خام خیالی ہے۔“ رام گیتا پر جھپٹا اور اس کی عزت پامال کرنے لگا وہ مرد تھا زور آور تھا۔

”وحشی انسان چھوڑ مجھے۔“ گیتا چیخی۔

”جتنا چیخوں گی اتنا مجھے مزہ آئے گا۔“ گیتا کو رام نے کپڑوں کی قید سے آزاد کر دیا، گیتا نے لاکھ بچنے کی کوشش کی مگر رام نے اسے نہ چھوڑا اسے حاصل کرلیا رام نے پستول نکالا اب گیتا کو وہ موت سے دوچار کررہا تھا۔

پستول رام نے گیتا کے سینے پر رکھ دی مگر ہلکی سی کلک کی آواز آئی۔ گیتا نے گولی پہلے ہی نکال دی تھی اپنے جادو سے۔“

”رام جب پرندہ زندہ ہوتا ہے تو کیڑے کھاتا ہے مگر جب مرجاتا ہے تو کیڑے اسے کھاتے ہیں۔ تمہارا وقت بدل چکا ہے۔ ہاہا.....ہاہا.....“ گیتا ساری گولیاں پوری قوت سے رام کے چہرے پردے ماریں اور بھاگتی ہوئی کھڑکی سے چھلانگ لگادی ہلکی سی چیخ کے ساتھ خاموشی چھاگئی۔ چوتھی منزل سے گر کر کوئی خوش قسمت ہی بچ سکتا ہے مگر گیتا خوش قسمت نہیں تھی۔

رام نے جلدی سے کپڑے پہنے وہ گیتا کی لاش لینے کے لئے نیچے جانا چاہتا تھا تاکہ اس کی کلائیاں اور آنکھیں نکال لے۔

مگر رام کا سر چکرانے لگا وہ گر گیا اس کا گلا تنگ پڑنے لگا جو چین گیتا نے رام کو پہنائی تھی وہ تنگ ہونے لگیں اس کے دونوں کلائیوں میں گیتا کی پہنی ہوئی بریسلٹ تنگ ہوگئیں گیتا کا جادو اثر کرنے لگا بریسلٹ تنگ سے تنگ ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اس کے دونوں ہاتھ کٹ چکے تھے وہ درد کی انتہا پر تھا چیخ اٹھا اگلے لمحے اس کے کٹے ہوئے ہاتھ ہوا میں اڑتے ہوئے اس کی آنکھوں سے ٹکرائے اور انگلیوں نے پوری قوت سے اس کی دونوں آنکھیں باہر نکال دیں اس کی دونوں آنکھیں سنگی فرش پر گرگئیں۔

رام پوری قوت سے چیخ چلا رہا تھا، چین اس کے گلے میں تنگ ہورہی تھی وہ اس کے لئے پھانسی کے پھندے سے زیادہ اذیت ناک بن گئی تھی رام کی چیخوں سے حویلی لرزنے لگی۔

دروازہ دھڑ ادھڑ پیٹا جارہا تھا تھوڑی دیر بعد دروازہ توڑ دیا گیا رام کی ماتا نوکروں کی فوج سمیت اندر کمرے میں داخل ہوئی اندر کا بھیانک منظر دیکھ کر سبھی حلق پھاڑ کر چیخ اٹھے فرش پر رام کی بھیانک لاش پڑی تھی۔

اس کا دھڑ سے سر جدا تھا۔ آنکھیں دونوں آنکھیں حلقوں سے باہر نکل پڑی تھیں اور اس کے ہاتھ کٹے ہوئے تھے جو سر کے ساتھ پڑے تھے۔

صبح کے اخبارات میں مین سرخیاں تھیں جاگیردار چندر کمار کا بیٹا رام کمار اپنے کمرے میں نہایت بھیانک حالت میں مردہ پایا گیا جس کی گردن دھڑ سے الگ تھی آنکھیں باہر نکالی گئی تھیں اور دونوں کلائیوں سے ہاتھ کٹے ہوئے تھے اس کے کمرے کے عین نیچے سڑک پر ایک برہنہ لڑکی کی لاش پڑی تھی پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق لڑکی کے ساتھ زیادتی کی گئی تھی اور اس نے خودکشی کی تھی۔

اپنی جنونی خواہشات کے تحت دوسروں کو اذیت دینے والا خود بھیانک موت سے دوچار ہوگیا تھا۔

قوسِ قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

میرے بس میں ہوتا اگر ہٹا کر چاند تاروں کو
میں نیلے آسمان پر بس تیری آنکھیں بنادیتا
شجر ہوتا تو لکھ لکھ کر تیرا نام پتوں پر
تیرے گھر کی جانب ہواؤ میں اڑا دیتا
(عثمان غنی۔پشاور)

اب تک پیار کا صلہ ملا کوئی نہیں
اندھیری راہ میں دیپ جلا کوئی نہیں
کھائی ہے چوٹ تو یہ احساس ہوا مجھے
مجھ سا دنیا میں پھر تنہا کوئی نہیں
(محمد اسلم جاوید۔فیصل آباد)

مرجائے تو قدر بڑھتی ہے انسان کی
زندہ رہے تو جینے کی سزا دیتی ہے دنیا
اپنوں کا ڈسا ہوا ہوں شاید
سانپوں کے نگر میں جی رہا ہوں
(شمس الحق۔کراچی)

میری پیاس کو دنیا میں کوئی سمجھ نہ پایا
روتا تھا جب تنہا تو کوئی میرے پاس نہ آیا
فنا کردی تھی زندگی جس کے لئے میں نے
وہ کہتی ہے تجھے پیار کرنا نہ آیا
(شاہد محمود۔فیصل آباد)

کاش کے ملو پھر دوبارہ
محبت کی کہانی دہرائیں دوبارہ
پیار کے غم میں اپنا ہی مزا ہے
چلو محبت کی چوٹ کھائیں دوبارہ
(وثیقہ زمرہ۔سمندری)

دل کو کسی آہٹ کی آس رہتی ہے
ان نظروں کو تیری صورت کی پیاس رہتی ہے
میرے پاس کسی چیز کی کمی تو نہیں
بس تیرے بغیر یہ زندگی اداس رہتی ہے
(شرف الدین جیلانی۔کراچی)

حسن نہ مانگ نصیب مانگ اے ساگر
حسن والے اکثر نصیب والوں کو ہی ملتے ہیں
(محمد علی۔کراچی)

چاند اگر روشن ہے تو وہ روشنی تم ہو
پھول میں خوشبو ہے تو وہ خوشبو تم ہو
برف اگر ٹھنڈی ہے تو وہ ٹھنڈک تم ہو
دوست اگر سچا ہے تو وہ سچائی تم ہو
(ذیشان علی۔حیدرآباد)

جو اداس ہیں تیرے ہجر میں جنہیں بوجھ لگتی ہے زندگی
سر بزم یوں انہیں دیکھ کر تیرا منہ چھپانے کا شکریہ
جو زمانے بھر کا اصول تھا وہ اصول تو نے نبھادیا
یہی رسم ٹھہرے گی معتبر مجھے بھول جانے کا شکریہ
(عابد حسین۔لاہور)

اداس شامیں اجاڑ رستے کبھی بلائیں تو لوٹ آنا
کسی کی آنکھوں میں رتجگوں کے عذاب آئیں تو لوٹ آنا
(طارق ملک۔نواب شاہ)

آندھی نے توڑ دی ہیں درختوں کی ٹہنیاں
کیسے کٹے گی رات پرندے اداس ہیں
ممکن ہے ان کا باپ کھلونے نہ لاسکے
محرومیوں کے خوف سے بچے اداس ہیں
(سونیا بلال۔نواب شاہ)

تیرے بعد دل کی اداس گلیوں میں
عجیب سا حشر برپا دکھائی دیتا ہے
کتاب کھول کر بیٹھوں تو آنکھ روتی ہے
ورق ورق پر تیرا چہرہ دکھائی دیتا ہے
(عبدالحلیم بھٹی۔کوٹھا کلاں)

ہمارے کچے گھروں کی سلامتی کا راز
بس اس قدر ہے کہ بارش ابھی نہیں آئی
(محسن عزیز حلیم۔کوٹھا کلاں)

☆☆

جھومو جھومو خوشیاں مناؤ کہ آج ڈر کی سالگرہ ہے
دشمنی رنجش نفرتیں مٹاؤ کہ آج ڈر کی سالگرہ ہے
شام اداس محفل مشاعرے
تخلیق زمزمہ پرواز اڑاؤ کہ آج ڈر کی سالگرہ ہے
کہانیاں، لطیفے، ناول اور افسانے
آج ہی پڑھ کر سناؤ کہ آج ڈر کی سالگرہ ہے
سارے ادیبوں کو عزت بخشی شاہد علی نے
ان ہی کی روشنی پھیلاؤ کہ آج ڈر کی سالگرہ ہے
شاعر کی کتاب لکھنے کو من چاہا آج
آج ہی ساحل گنگناؤ کہ آج ڈر کی سالگرہ ہے
(ساحل ابڑو۔ڈیرہ اللہ یار بلوچستان)

خوفناک رات بھیانک آواز
ڈراؤنا نظارہ، تپتا سورج
گرم صحرا، ٹھنڈی چھاؤں
پیار، عشق اور محبت
اے ڈر ڈائجسٹ
سارے حصے تیرے
رنگ برنگے پھول، ستارے روشن سارے
وہ قیدی لمحے، خوبصورت باتیں
وہ ستارے روشن اور بھیانک بادل
حال ماضی اور مستقبل
اے ڈر ڈائجسٹ
سارے حصے تیرے
تیرے ہی دم سے ہم روشن
تیری ہی دم سے نئے نام روشن
تیری چمک ہوا ایسی کہ سب حیران
ہم سب اور آنے والے وہ نام
اے ڈر ڈائجسٹ
سارے حصے تیرے
(عثمان غنی..... پشاور)

میری چاہت پہ جفاؤں کو فدا کرتے رہے
میں انہیں چاہتا رہا اور وہ کیا کرتے رہے
زندگی بھر کی محبت کا صلہ کچھ نہ ملا
کتنے نادان تھے پتھر سے وفا کرتے رہے
ایسے بچھڑا کہ وہ پھر لوٹ کر آیا ہی نہیں
روز اشکوں سے چمن دل کا ہرا کرتے رہے
آئینہ بن کے ملے شہر کے جب لوگوں سے
غیر تو غیر ہیں اپنے بھی گلہ کرتے رہے
زخم پوشاک بدن پر جو سجا کر نکلے
میرے جینے کی مرے یار دعا کرتے رہے
اپنے اس شوخ مسیحا کی رفاقت کے لئے
دل کے زخموں کو شب و روز ہرا کرتے رہے
آخری وقت میں کرلیں گے خدا کو راضی
بس یہی سوچ کے ہر روز گناہ کرتے رہے
(حکیم خان حکیم۔کامل پور موسیٰ)

نفس جو خواہشوں سے ہی آزاد ہے
وہ حقیقت میں مضبوط، فولاد ہے
جو ہے گندم کے اب تک نشے میں ہی گم
ابن آدم کی ساری یہ اولاد ہے
قتل کرتا ہے وہ معصوم بچوں کو جو
آدمی وہ نہیں کوئی جلاد ہے
سنگ دل ہے نکالے کوئی نہر اب
آج زندہ اگر کوئی فرہاد ہے
جو دعائیں نہیں لے گا ماں باپ کی
دین دنیا میں انسان وہ برباد ہے
اے خدا! میرے دل میں ترا ڈر رہے
ہر گھڑی بس یہ خانم کی فریاد ہے
(فریدہ خانم۔لاہور)

اتنا تو میرے حال پہ احسان کیا کر

آنکھوں میں چھپے درد کو پہچان لیا کر
کچھ ساتھ دے سفر میں بہت تھک گئی ہوں میں
کچھ پل ہوں تیرے ساتھ میری مان لیا کر
افسانے محبت کے ادھورے نہ چھوڑ تو
جرم وفا کا مجھ سے ہر بیان لیا کر
مدت سے اسی آس پر ٹھہری ہوئی ہوں میں
بھولے سے کبھی تو بھی میرا نام لیا کر
اپنی ہی ذات سے وابستہ کر مجھے
ہو کر نہ خفا مجھ سے نہ میری جان لیا کر
(انعم شہزادی۔ گجرات)

گلشن دل کو جو تیری یاد مہکانے لگی
تب شب فرقت میں ہم کو نیند سی آنے لگی
چار سو ماحول میں چھانے لگا کیف و سرور
ان کے شانوں پر معطر زلف لہرانے لگی
دل کے آنگن میں کھلائے عجز کے میں نے گلاب
کامرانی بڑھ کر خود میری طرف آنے لگی
عزم و ہمت کا جو ہم بن کے رہے کوہ گراں
گردش ایام آخر ہم سے گھبرانے لگی
آگیا ہے زندگی میں کس طرح کا انقلاب
آج خود انسانیت انس سے شرمانے لگی
اب طلوع ہونے کو ہے خوشیوں کی صبح تابناک
اب غم دنیا کی لمبی رات ڈھل جانے لگی
مے پرستی سے کنارا کرلیا میں نے قمر
جھوم کر اٹھی گھٹا اور دل کو بہکانے لگی
(ریاض حسین قمر۔ منگلا ڈیم)

سرشوریدہ پہ ہر بار جو ستم ٹوٹا
تمہارے فیضِ تغافل سے پھر بھی کم ٹوٹا
تڑپ دلا تو کچھ اس محور دنیا کہہ اٹھے
ہر ایک گیسوئے ہجراں کا پیچ و خم ٹوٹا
تھا جس کے فیض سے باقی جہاں میں حسن شعور
خرد کے ہوش اڑے جب سے تار غم ٹوٹا
امیر سیر سماوات کی نہ بر آئی
غضب سے ہاتھ میں آتے ہی جام جم ٹوٹا
وہ مہر گور کھلی پھر آشفتہ سر اٹھے
خیر ہے دیدہ تر حیران کیا بھرم ٹوٹا
رواں ہے سیل لہو ہر طرف جدھر دیکھو
کوئی تو پارۂ دل آج چشم نم ٹوٹا
جو دل پہ گزری ہے قمر آپ کیا جانیں
رقم نہ ہوگا کبھی حال غم قلم ٹوٹا
(چوہدری قمر جہاں علی پوری۔ ملتان)

اس نے کہا کہ مجھ سے تمہیں کتنا پیار ہے
مین نے کہا ستاروں کا کہاں کوئی شمار ہے
اس نے کہا کون ہے تمہیں عزیز بہت
مین نے کہا کہ دل پہ جسے اختیار ہے
اس نے کہا کون سا تحفہ ہے من پسند
مین نے کہا وہ شام جو اب تک ادھار ہے
اس نے کہاں خزاں میں ملاقات کا سبب
مین نے کہا قرب کا نام بہار ہے
اس نے کہا سینکڑوں غم زندگی میں ہے
میں نے کہا غم نہیں جب غمگسار ہے
اس نے کہا ساتھ کہاں تک نبھاؤ گے
میں نے کہا جتنی یہ سانسوں کی تار ہے
(بلقیس خان۔ پشاور)

بات نکلے گی تو پھر دور تلک جائے گی
لوگ بے وجہ اداسی کا سبب پوچھیں گے!
یہ بھی پوچھیں گے کہ تم اتنی پریشان کیوں ہو؟
انگلیاں اٹھیں گی سوکھے ہوئے بالوں کی طرف!
اک نظر دیکھیں گی گزرے ہوئے سالوں کی طرف
چوڑیوں پہ بھی کئی طنز کئے جائیں گے
کانپتے ہاتھوں پر فقرے بھی کستے جائیں گے
لوگ ظالم ہیں ہر اک بات کا طعنہ دیں گے
باتوں باتوں میں میرا ذکر بھی لے آئیں گے
ان کی باتوں کا ذرا سا بھی اثر مت لینا
ورنہ چہرے کے تاثر سے سمجھ جائیں گے
چاہے کچھ بھی ہو سوالات نہ کرنا ان سے
میرے بارے میں کوئی بات نہ کرنا ان سے
بات نکلے گی تو پھر دور تلک جائے گی
(انتخاب: محمد علی چغتائی۔ خیر پور ٹامیوالی)

میں نظر سے پی رہا ہوں یہ سماں بدل نہ جائے
نہ جھکاؤ تم نگاہیں، کہیں رات ڈھل نہ جائے
میرے اشک بھی ہیں اس میں یہ شراب ابل نہ جائے
میرا جام چھونے والے، تیرا ہاتھ جل نہ جائے
ابھی رات کچھ ہے باقی، نہ اٹھا نقاب ساقی
تیرا رند گرتے گرتے کہیں پھر سنبھل نہ جائے
میری زندگی کے مالک میرے دل پہ ہاتھ رکھے
تیرے آنے کی خوشی میں میرا دم نکل نہ جائے
مجھے پھونکنے سے پہلے میرا دل نکال لینا
یہ کس کی ہے امانت میرے ساتھ جل نہ جائے
(شرف الدین جیلانی۔ٹنڈوالہ یار)

محبت ہوتی ہے وفا کرنے کے لئے تیار کر جاتے ہیں
شاید کسی کو حقیقت نہ ہو معلوم ہوشیار کر جاتے ہیں
محبت میں ملتے ہیں دکھ ہمیشہ صنم یہ یاد رکھنا
پھر بھی اس کا اکثر عاشق لوگ اظہار کر جاتے ہیں
ہوتی نہیں وفاؤں کی شنوائی کہیں بھی کسی کی جدائی پر
پھر بھی تم سے اے جان جاناں ہم پیار کر جاتے ہیں
جدائی کے زخموں کو ہمیشہ سہہ کر جیا نہیں جاتا
چلو تمہیں جدائی سہہ کر جینے کے لئے تیار کر جاتے ہیں
اپنوں ہی سے دکھ ملتے ہیں ہمیشہ اے جانِ جاں
ورنہ محبت میں تو جان قربان بھی اغیار کر جاتے ہیں
جو سمجھتے نہیں حبیب محبت، عشق، دوستی کو زمانے میں
کر کے بے وفائی وہ لوگ زندگی ہی بے زار کر جاتے ہیں
(رانا حبیب الرحمٰن.....سینٹرل جیل لاہور)

میں نے تم کو چاہا ہے دل و جان سے بڑھ کر چاند
ورنہ دیکھے تھے حسن کے جلوے ہزاروں
پر کوئی نہ دیکھا تم جیسا
پتا نہیں کیا خاص بات تھی تم میں
کے لگتے تھے اپنوں جیسے
اب ہم بھی سو جاتے ہیں راتوں کو جلدی شاید
جو حقیقت میں نہیں ملا
وہ مل جائے خوابوں میں حقیقت جیسا
(ضخیم الحسن.....ہڈالی)

جانوں کا نذرانہ دے کے اپنی جانیں ہارے لوگ
نام محبت سے ڈرتے ہیں بستی کے اب سارے لوگ
رسموں کے رنگین سمندر میں جب کشتی ڈوب گئی
حسرت کے ساحل پر بیٹھے دیکھیں روز کنارے لوگ
اپنی قسمت ڈھونڈ رہے ہیں تاریکی کے جنگل میں
بھر کے اپنی آنکھوں میں اب جگنو اور شرارے لوگ
رزق کی خاطر روپ یہ دھارے پھرتے ہیں بنجاروں کا
قریہ قریہ بستی بستی ہم جیسے بنجارے لوگ
وقت کا جوگی یادوں کی جب جھول پٹاری بیٹھے تو
اکثر یادو یاد بھی آ جاتے ہیں عامر آنکھ کے تارے لوگ
(عامر زمان عامر.....بورے والا)

کبھی سوالوں پر چوٹ کھائی کبھی جوابوں نے مار ڈالا
ہم وہ مسافر ہیں جنہیں زندگی کے رنگین خوابوں نے مار ڈالا
ہم تو آسمان کو چھونے کا عزم رکھتے تھے
کیا پتہ کہ ہم کو تو زندگی کی بند کتابوں نے مار ڈالا
شاخوں سے پتے گرتے ہیں خزاں کے موسم میں
کس کے شانے سے لگ کر آنسو بہا لے سارے اے مانو
پتہ چلا کہ ہم کو تو زندگی کی بہار رت نے مار ڈالا
(رابعہ عباس.....بستی فتے والی)

تیرے در سے ٹھکرایا تو جا چکا ہوں
اب میرے پاس یاد تو اپنی رہنے دے
کب کیا ہے شکوہ میں نے قسم لے لو
شکایت نہ سن دل کی بات تو کہنے دے
ہزار ٹکڑے ہوا بدن پھر بھی ہے یہ صدا میری
دو چار زخم جو باقی ہیں وہ بھی سہنے دے
تیری زلفیں ہی میرا خزانہ ہیں صنم
میں کب کہتا ہوں مجھے اپنے ہاتھوں کے گہنے دے
رلا کے مجھے اب خود کیوں روتے ہو.....؟
مت کر صاف آنسو میرے بہتے ہیں تو بہنے دے
مت روکو اب انہیں رکنے والا صائم
مجھے مجبور نہ کر بات حق کی کہنے دے
(ظہور احمد صائم.....بانگا منڈی لاہور)

☆☆

کوئی ملا ہے رفتہ رفتہ
پیار بڑھا ہے رفتہ رفتہ
میرے آنگن میں حسرت کا
پھول کھلا ہے رفتہ رفتہ
مری یادوں کو وہ ظالم
بھول گیا ہے رفتہ رفتہ
شام ہجر کا اس نے ہم کو
درد دیا ہے رفتہ رفتہ
رانا اپنے دل کا قصہ
میں نے لکھا ہے رفتہ رفتہ
(قدیر رانا۔راولپنڈی)

رات کو چاند کا جمال بھی دیکھ
پو پھٹنے پر اس کا زوال بھی دیکھ
جیت کب ہار میں بدل جائے
وقت جو چل رہا ہے چال بھی دیکھ
میرے لفظوں کی تلخیوں پر مت جا
میری سوچیں میرا خیال بھی دیکھ
رونقوں میں حسین دنیا کی
خواہشوں کے سنہرے جال بھی دیکھ
میرے چہرے کو دیکھنے والے
میری سیرت کے خدو خال بھی دیکھ
بند ماضی کے اب واجد دریچے کر
واجد اب اپنا کبھی تو حال بھی دیکھ
(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی۔کراچی)

صدیوں سے انتظار تھا جس کا
اب تم مجھے اس عصر میں ملی ہو
مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اس طرح
اچانک راہ چلتے میں مجھے ملی ہو
کہا کسی نے ہے دل کو دل سے راہ
مجھے تو تم انجانی راہ میں ملی ہو
اب تو ہم ہیں اور ہمارے بچے
تو تم ان بچوں کے لئے تو ملی ہو
حالات کیسے بھی ہوں اگرچہ سلیم
تم تو زندگی سنوارنے کے لئے ملی ہو
(سلیم بیگ ہمدانی۔کراچی)

تمہیں ایک بات کہنی ہے
مگر ناراض مت ہونا
کہ تم جو ہر گھڑی مجھ کو
یوں اتنا یاد آتے ہو
ہمیں اتنا ستاتے ہو!
کہ ہم تم دور ہیں دونوں
بہت مجبور ہیں دونوں!
نہ اتنا یاد آؤ تم!
نہ یوں اتنا ستاؤ تم
کہ اتنا یاد آ کر یوں
ہمیں پاگل بنا کے تم!
فقط اتنا بتا دو کے
ہماری جان لو گے کیا
مگر یہ بھی حقیقت ہے
تمہاری یاد ہی تو ہے
جو ہر پل ساتھ رہتی ہے
خوشی میں بھی غمی میں بھی
اداسی کے پل میں بھی
تمہاری یاد ہی تو ہے
جو ہر پل یہ بتاتی ہے
مجھے احساس دلاتی ہے کہ
ہم تم بن ادھورے ہیں
(صبا محمد اسلم۔گوجرانوالہ)

راستے کھو گئے ہیں
مقدر سو گئے ہیں
دوستیاں بانٹتے بانٹتے
سچ عداوت بو گئے
اچھے دن جیسے نایاب موتی
جانے کہاں کھو گئے ہیں
انا پرست لوگ جان کر
مٹی کے ڈھیر پر رو گئے ہیں
ہماری بدنصیبی کے گڑھے
بہت گہرے ہو گئے ہیں
(سنبل ماہین۔راولپنڈی)

بازی دل کی ہار گئے ہیں
ہم اب محبت سے ڈر گئے ہیں
لہو لہو تھا ہمارا خاکی
کہ دل پہ آرے سے چل گئے ہیں
بہت ہی سوچا بہت تلاشا
مگر کوئی بھی نہیں تھا اپنا
یہ سوچ کر ہم رو دیئے اب
کہ دشمنوں میں گھر گئے ہیں
ان پر بس اپنا چلا نہیں تو
ہم رقیبوں سے لڑ گئے ہیں
کہ اب تو ہیں ہم زندہ لاش
وہ کام ایسا ہی کر گئے ہیں
راج کر کے ہمارے دل پر
وہ ایسے کیوں بدل گئے ہیں
(سید عبادت راج۔ڈیرہ اسماعیل خان)

یادوں کے گلاب کھلتے ہیں
بچھڑے ہوئے لوگ ملتے ہیں
ٹکڑے ہوئے دل کے ہزاروں
غم آنسو میں ڈھلتے ہیں
دوست بھی بدل گئے نظریں
پھر سے آنسو میرے سلگتے ہیں
بجھے ہیں چراغ روشنی کوئی نہیں
دکھ اپنا کسی کو سناتے ہیں
سحر ہوگئی کسی کے انتظار میں
پاس رہ کے بھی وہ ستاتے ہیں
روز ذکر ہوتا ہے کسی کی وفا کا
پہلو یوں بھی لوگ بدلتے ہیں
چھوڑ گزرے دنوں کی یادوں کو جاوید
جانے والے کب لوٹ کے آتے ہیں
(محمد اسلم جاوید۔فیصل آباد)

☆☆

خون آشام

خالد شاہان لوہار۔ صادق آباد

بارہ بور کی دو نالی سے نکلی ہوئی دو گولیاں جیسے ہی عجیب الخلقت بلا کی کھوپڑی میں پیوست ہوئیں تو وہ بلا اچھلی مگر ایک لمحہ گزرے بغیر ہی وہ بلا اپنی جگہ کھڑی تھی اور پھر……

انسانی عقل سے ماورا، رائٹر کے زورِ قلم کا شاہکار، اپنی مثال آپ شاخسانہ

خون کو منجمد کر دینے والی وہ لرزہ خیز چیخ جنگل کے وسط سے اٹھی تھی۔ سکندر کے ہاتھ سے بندوق چھوٹ کر گھاس میں گر پڑی۔ ایک لمحے کے لئے اسے یوں لگا جیسے چیخ کسی درندے کی ہو۔ ایسی دل کو دہلاتی آواز اس نے پہلے کبھی نہ سنی تھی۔ جو اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ بن کر اتر گئی۔ اور اس کے اعصاب شل کر گئی۔ پتھر کے بے جان بت کی مانند وہ نہ جانے کتنی دیر تک وہاں کھڑا رہا۔ اس نے یکا یک جھرجھری سی لی اسے احساس ہوا کہ وہ آواز شاید خوفناک بھڑیا کی ہے۔ مگر نہیں بھیڑیئے اس طرح چلایا نہیں کرتے ، ہاں ممکن ہے کوئی آدمی کوشش کر کے بھیڑیا کی آواز حلق سے نکالے تو شاید وہ آواز ایسی ہوگی۔ جیسے ابھی چند لمحے پہلے ابھری تھی۔

''خدا رحم کرے۔'' اس تصور کے ساتھ ہی سکندر

کے رونگٹے کھڑے ہوگئے وہ ڈرنے والا نوجوان ہرگز نہیں تھا۔ دنیا کا کوئی درندہ کوئی بھیانک سے بھیانک چیز اسے خوف زدہ نہ کرسکتی تھی اس کے اعصاب فولادی تھے اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا تو اپنے آپ کو جنگل میں پایا۔ سینکڑوں خطرے ہزاروں حادثے ان گنت بلائیں اس نے دیکھی تھیں اور وہ کبھی خوف زدہ نہ ہوا۔ لیکن آج اسی جانے پہچانے جنگل میں ایک پراسرار آواز کو سن کر اس پر لرزہ طاری ہوگیا تھا۔ آخر اس کی تمام حسیات یکلخت جاگ اٹھیں، اب وہ ہر قیمت پر جاننا چاہتا تھا کہ جنگل کے وسط میں سے اٹھنے والی یہ نئی ہولناک آواز کس کی تھی۔؟

آسمان پر چودھویں کا چاند روشن تھا اس کی تیز چمکیلی دودھیا روشنی میں سکندر دور تک دیکھ سکتا تھا یوں بھی اسے جنگل کے چپے چپے کا اچھی طرح علم تھا۔ کون سا درخت کہاں اور کون سی جھاڑی کدھر ہے۔ جنگل کس طرف زیادہ گھنا اور کدھر آسانی سے راستہ مل سکتا ہے۔ جس حصے میں وہ آدھی رات کے وقت تن تنہا موجود تھا وہاں درخت کچھ زیادہ ہی ایک دوسرے کے قرب تھے۔ اتنے قریب کہ شاخیں ایک دوسرے میں الجھی ہوئی اور جب تیز ہوا کا جھونکا آتا تو سب درختوں کے پتے مل کر زور زور سے آواز پیدا کرتے جیسے وہ خوف ناک عفریت ہوں۔

اس سے آدھ فرلانگ دور زیادہ گھنا اونچے نیچے درختوں کا جھنڈ تھا اس جھنڈ کے اوپر اس نے دیکھا کہ بہت سی چمگادڑیں فضا میں چکر کاٹ رہی تھی ایک اور دائرے میں بڑی بڑی چمگادڑیں ایک دوبار اس کی طرف بھی آئیں۔ لیکن ڈر کر آگے نکل گئیں۔ اس نے چمگادڑوں کی آنکھیں بھی چاندنی رات میں چمکتی دیکھی تھی عجیب رنگ تھا ان آنکھوں کا کبھی سرخ کبھی زرد جیسے ہیرے چمک رہے ہوں۔ یا سرخ ننھی ننھی قندیلیں روشن ہوں۔

آج سکندر کو یہ سب کچھ نہایت عجیب سا لگ رہا تھا۔ ایسا کیوں تھا یہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا گردو پیش میں ہیبت ناک سناٹا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے جنگل میں کوئی جاندار شے نہیں، یکایک اس نے محسوس کیا، ہوا بھی تھم گئی ہے، درختوں کے وہ پتے جو چند لمحے پیشتر تیز ہوا سے جھوم رہے تھے یکلخت گم صم ہوگئے۔

سکندر اپنی بارہ بور کی بندوق جھک کر گھاس سے اٹھائی، ابھی سیدھا بھی نہ ہوا تھا کہ ایک بار پھر جنگل کی فضا اسی بھیانک چیخ سے لرز اٹھی تو اس کا لہو رگوں میں دہشت سے جمنے لگا۔ جھکی کمر اور بندوق کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ جیسے پتھر کا ہوگیا تھا اس کی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے پھوٹنے لگے۔ اس مرتبہ آواز زیادہ گونج دار واضح اور صاف تھی...... جیسے...... کہ بہت سے بھیڑیئے بیک وقت چلائے ہوں۔

سکندر نے یہ بھی محسوس کیا کہ آواز کچھ اور قریب آگئی ہے یا ممکن ہے کہ یہ اس کا وہم ہو، اس نے پوری قوت ارادی سے کام لے کر بندوق مضبوطی سے تھام لی اور تن کر کھڑا ہوگیا اس کی نگاہوں کے سامنے درختوں کا گھنا جھنڈ تھا۔ ہر ایک درخت برسوں سے اس کا جانا پہچانا تھا۔ وہ اس طرف کافی بار آیا تھا مگر اس کو آج تک کوئی حادثہ پیش نہ آیا تھا، وہ نہایت قوی ہیکل اور بہادر تھا کم از کم اردگرد کی بستیوں کے لوگ اس کے بارے میں یہی سوچتے تھے کہ ’’اس سے زیادہ طاقتور اور نڈر شخص کوئی نہیں۔ خطروں سے کھیلنا اس کی عادت ہے۔‘‘

مگر آج یہ بھیانک آوازیں سن کر اس کی جو حالت ہوئی اسے خود شرم آنے لگی پھر اس نے اپنی انتہائی مضبوط وفادار دونالی بندوق پر نظریں جمادیں۔ جس کا سیفٹی پن کھلا ہوا تھا۔ صرف لبلبی دبانے کی دیر تھی اور دو گولیاں......

سکندر بے دھڑک درختوں کی جھنڈ کی طرف بڑھا۔ اس کا خیال تھا کہ کوئی نہ کوئی آدمی یا درندہ انہی درختوں کی جھنڈ میں چھپا ہوا ہے۔ اور پھر اس نے دیکھ لیا۔

صنوبر کے بہت پرانے درخت کے قریب جس کے اردگرد لمبی گھاس اگی ہوئی تھی، سفید سفید سی کوئی شے حرکت کررہی تھی۔ ایک لمحے کو سکندر کو اپنی آنکھوں میں

دھوکا ہوا۔ لیکن ایسا نہیں..... وہاں ضرور کوئی موجود تھا اور تب اسے یاد آیا کہ اس حصے کے بارے میں لوگوں میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور ہیں اور سب کا مرکزی خیال یہی ہے کہ ''صنوبر کا یہی درخت آسیب زدہ ہے ''ادھر سے کوئی گزرتا نہیں۔

چاندنی کی تیز روشنی میں سکندر نے صنوبر کے اس قدیم درخت کو دیکھا۔ وہ اس درخت کے معائنہ میں ہی لگا رہتا۔ کہ اچانک گھاس میں دو چمکتی ہوئی آنکھیں ابھریں۔ عین اسی لمحے ایک آوارہ بادل کا ٹکڑا آیا جس نے چاند کا روشن چہرہ ڈھانپ دیا۔ اور وہ اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑا رہ گیا۔ وہ چمکدار آنکھیں جن کا رنگ گہرا زرد تھا۔ برابر اسے گھور رہی تھیں پھر اس نے اسے اچھی طرح دیکھ لیا شاید وہ کوئی زبردست بھیڑیا تھا یا مکار چیتا یا جنگلی بلا، وہ فیصلہ نہ کر سکا کہ ان میں سے کون سا درندہ ہے۔

گھاس میں دبکا ہوا اس کو صرف اس درندے کا سر پیشانی اور پیشانی کے نیچے دو زرد زرد بڑی آنکھیں نظر آئیں۔ بادل کا ٹکڑا چاند کے چہرے سے ہٹ گیا ۔اب سکندر نے خوب غور سے درخت کی طرف دیکھا۔ تھوڑی دیر پہلے جو دہشت اس پر طاری تھی وہ دور ہو چکی تھی۔ وہ چند قدم اور آگے بڑھا اس درندے کا بقایا جسم بھی وہ دیکھ سکتا تھا۔ ادھر اس درندے نے بھی اپنی جگہ سے معمولی سی جنبش کی اور سرک کر سکندر کے نزدیک آنے کی کوشش کی، اس کے جسم پر لمبے لمبے بال تھے

سکندر نے سوچا۔ ''ممکن ہو کہ ریچھ کی کوئی ایسی نسل ہو جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھی ہو مگر اس کا جسم اس کے ہاتھ پیر ریچھ یا بھیڑیئے کے بجائے کسی آدمی سے ملتے جلتے تھے۔''

یکا یک اس بلا نے اپنا منہ اوپر اٹھایا اور سکندر کے حلق سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ ''خدا کی پناہ اس کا چہرہ انسانی چہرے سے کس قدر مشابہت رکھتا تھا'' فرق صرف اتنا تھا کہ منہ کی جگہ لمبی سی تھوتھنی تھی جیسے بھیڑیوں کی ہوتی ہے، اس کی آنکھیں تو بالکل انسانوں جیسی

سوائے اس کے کہ ان میں بے پناہ چمک تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ''کوئی درندہ نما انسان ہے یا انسان نما درندہ۔''

''اس کا مطلب تھا کہ وارث کی کہانی درست تھی۔'' سکندر نے سوچا۔ ''یہ کیونکر ممکن ہے کہ آدمی مرنے کے بعد بھیڑیا بن جائے۔''

سکندر جیسا شخص جو بدروحوں یا آسیب پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ آخر کیسے مان لے کہ وارث کے بیان کردہ واقعات بالکل درست تھے۔ وہ اس کی کہانی سن کر دل ہی دل میں بہت ہنسا تھا۔

لیکن اب......اب آدھی رات کے اس لمحے ......جنگل میں صنوبر کے پرانے درخت کے قریب وہ جو کچھ دیکھ رہا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وارث سچ کہہ رہا تھا۔ یہ تمام خیالات بجلی کی مانند ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے کے اندر سکندر کے ذہن میں آئے اور نکل گئے۔

اچانک وہ زرد چمکیلی آنکھیں ایک دم سرخ ہوگئیں جیسے آگ کے دو دہکتے انگارے، پھر ہلکی سی غراہٹ کی آواز سکندر کے کانوں تک پہنچی مگر اب وہ پوری طرح چوکنا تھا۔ اس نے اطمینان سے بندوق کو سنبھالا اور انسانی بھیڑیا کی پیشانی کا نشانہ لیا اور لبلبی دبا دی۔ بندوق کی دونوں نالیوں سے دو بیک وقت شعلے نکلے اور سکندر کو محسوس ہوا کہ دونوں گولیاں نشانے پر لگیں۔ بارہ بور کی یہ دونالی...... بندوق نہایت طاقتور تھی۔ جو ہاتھی کا بھیجا بھی توڑ دیتی، یہ انسانی بھیڑیا اس کے آگے کیا تھا۔

سکندر نے دیکھا کہ بھیڑیا گولیاں کھا کر فضا میں اچھلا اور ایک ہولناک چنگھاڑ نما چیخ اس کے منہ سے نکلی مگر وہ دوسرے ہی لمحے دوبارہ اچھلا اور گھاس کو چیرتا ہوا جارحانہ انداز لئے اس کی طرف بڑھا۔ اب اس کے لمبے لمبے تیز نوکیلے دانت پوری طرح نظر آرہے تھے۔

سکندر نے اب بھی اپنے اوسان خطا نہ ہونے دیئے۔ کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اور بندوق میں پھر سے جلدی سے کارتوس بھرنے لگا۔ اور دو فائر اور کیئے

بلاشبہ دو گولیاں اس مرتبہ بھی انسانی بھیڑیا کی کھوپڑی میں لگیں مگر وہ نہ گرا، نہ ڈرا اور نہ زخمی ہوا۔ بلکہ مزید غیظ وغضب میں غراتا اور چلاتا ہوا سکندر کی طرف لپکا۔ ایک لمحہ کے لئے اس کو اپنے دل کی حرکت بند ہوتی محسوس ہوئی۔

وارث کی بیان کردہ حقیقت صحیح ثابت ہورہی تھی۔ درندہ جو گولیوں سے مرنے والا نہ تھا۔ اس سے پیشتر کہ وہ کچھ سوچ سکے۔ بھیڑیا نے دل ہلا دینے والی گرج کے ساتھ اس پر جست لگائی اور دائیں پنجے سے اس کا منہ نوچنا چاہا۔ لیکن سکندر نے بندوق الٹی کر کے پوری قوت سے درندے کی کھوپڑی پر مارا، یہ ضرب اتنی شدید تھی اگر شیر پر پڑتی تو وہ بھی لڑھکنیاں کھا کر دور جا گرتا مگر اس بھیڑیا پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ سکندر نے ایک بار پھر بندوق بھیڑیا کے منہ پر ماری۔ اور جب دیکھا کہ یہ وار بھی بے کار گیا تو پلٹ کر بے تحاشہ بھاگا۔ اس کے پیروں میں جیسے پر لگ گئے۔ وہ نوجوان تھا پر اس وقت وہ اپنی جان بچانے کے لئے جس برق رفتاری سے بھاگا۔

بھاگتے بھاگتے صرف ایک بار رکا اور پلٹ کر دیکھا انسانی بھیڑیا اچھلتا کودتا اس کے تعاقب میں آرہا تھا سکندر بھی اندھا دھند دوڑنے لگا راستے کی ناہموار اور اونچی نیچی جھاڑیوں کو پھلانگنے میں اس کے کپڑے تار تار ہوگئے۔ بندوق وہیں پھینک آیا تھا اس کا جسم بھی زخمی ہوگیا تھا اور چہرے پر بھی جھاڑیوں سے گزرنے کے باعث گہری خراشیں آئی تھیں لیکن وہ رکا نہیں برابر بھاگتا رہا۔

کافی دور جا کر ایک لمحہ کے لئے رکا لیکن پھر دوڑ پڑا، انسانی بھیڑیا اب بھی اس کے پیچھے آرہا تھا۔ اور دم بہ دم اس کی رفتار بڑھتی جارہی تھی سکندر کو اپنی موت بہت ہی قریب نظر آئی۔ دوڑتے دوڑتے اس نے سوچا کہ ''وارث کی بیان کردہ کہانی حرف بہ حرف صحیح ہے۔''

مگر اب جان بچانے کا مسئلہ۔ تب اسے یاد آیا کہ دریا قریب ہی ہے اور قدیم داستانوں کے مطابق کوئی شخص انسانی بھیڑیا یا کسی آسیبی بلا سے جان بچانے کا خواہش مند ہو تو اسے فوراً پانی کے اندر کودنا چاہئے۔

بھیڑیا خون آشام چمگادڑیں یا بدروحیں چلتا ہوا پانی عبور نہیں کرسکتیں۔ خوش قسمتی سے وہ دریا کے رخ پر ہی بھاگا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے اسے بتایا کہ دریا زیادہ دور نہیں۔ اس کا سانس بری طرح پھول گیا تھا۔ مگر وہ ہر قیمت پر اپنی جان بچانا چاہتا تھا، اسے معلوم تھا کہ ''اگر وہ اس خون آشام بھیڑیا کے ہاتھوں مارا گیا تو وہ خود بھی بھیڑیا بن جائے گا۔''

سکندر اسی سوچ میں بھاگا جارہا تھا کہ اچانک بھیڑیئے کا پنجہ اس کے دائیں شانے میں پڑا اور اس کے شکاری کوٹ کا آدھا حصہ ادھڑ گیا۔ ''یا اللہ رحم کر۔'' اس کے منہ سے نکلا۔

بلا کتنی نزدیک آگئی تھی۔ اب وہ بہتے ہوئے پانی کا شور سن رہا تھا اور دریا بیس پچیس گز دور تھا کہ سکندر نے اپنے جسم کی آخری قوت داؤ پر لگادی اور گھڑاپ سے یخ بستہ پانی میں کود گیا۔ ایک ثانیئے کے لئے اسے یوں لگا کہ جیسے وہ برف کے بھرے ہوئے کسی گہرے اور تاریک کنوئیں میں گرتا چلا گیا ہو۔ پانی اتنا تیز تھا کہ اس کو بڑی مشکل سے سنبھلنے کا موقع ملا۔ کسی زمانے میں وہ بہت عمدہ تیراک تھا۔ اگرچہ تیراکی کی مشق چھوڑے ہوئے خاص مدت ہوچکی تھی مگر بعض ضروری طریقے تیراکی کے نہ بھولا تھا۔

ایک گہرا غوطہ کھانے کے بعد اس نے اپنا چہرہ پانی کی سطح سے باہر نکالا اور پھیپھڑوں میں تازہ ہوا بھری۔

عین اسی لمحے اس کی نگاہیں غیر شعوری طور پر اس کنارے کی طرف اٹھ گئیں جدھر سے اس نے دریا میں چھلانگ لگائی تھی اس نے دیکھا کہ وہ خون آشام بھیڑیا کنارے پر نہایت اضطراب اور غصے سے چکر کاٹ رہا تھا کبھی وہ اپنی تھوتھنی اٹھا کر چاند کی طرف دیکھتا اور ہلکی آواز میں غراتا جیسے شکار کے نکل جانے کی شکایت کررہا ہو۔

دفعتاً بھیڑیا نے بھی سکندر کو دیکھا اور اپنا دایاں
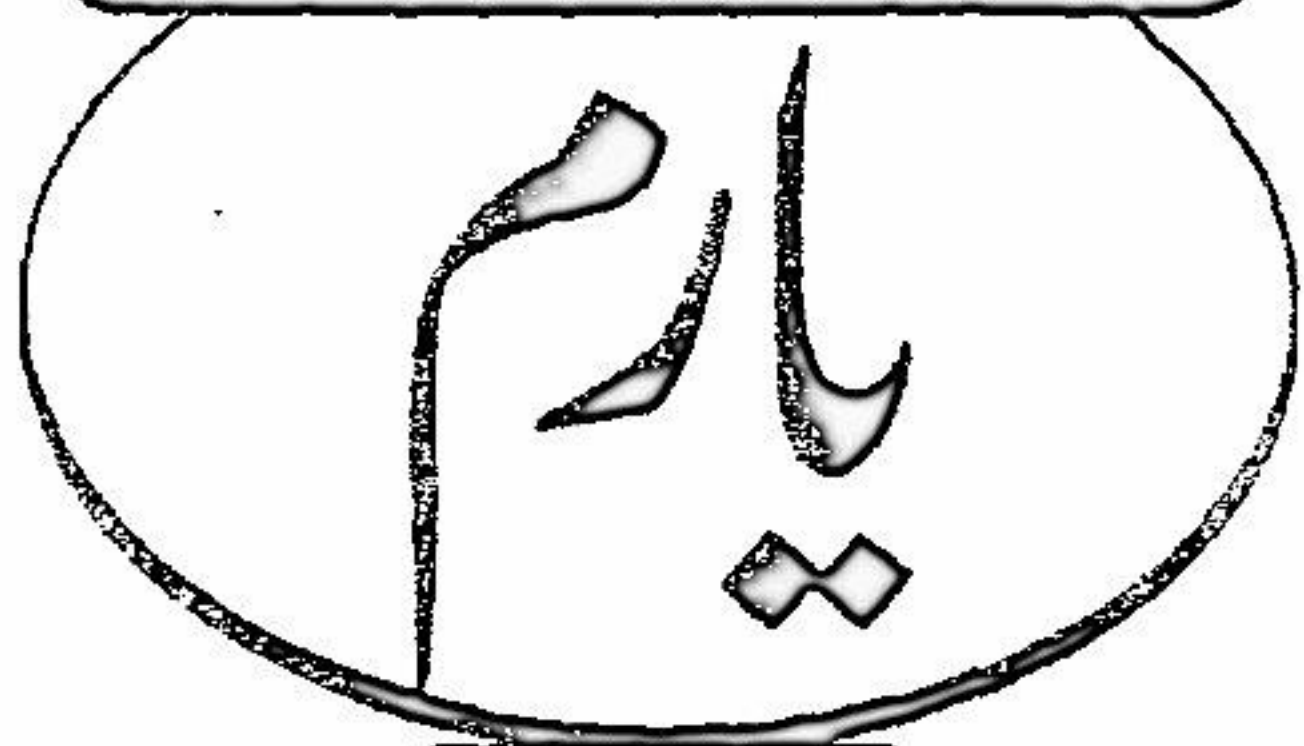
پنجہ پانی میں ڈال دیا مگر فوراً ہی اچھل کر یوں پیچھے ہٹ گیا گویا اسے بجلی کا کرنٹ لگا ہو پھر وہ بری طرح چیختا چلاتا جدھر سے آیا تھا ادھر بھاگ نکلا۔ دیر تک سکندر کے کانوں میں خون آشام بھیڑیا کی آواز آتی رہی پھر وہ آواز مدہم ہوتے ہوتے غائب ہوگئی۔

سکندر کے ہوش وحواس اب بھی غائب تھے۔ وہ پانی کے بہاؤ پر تیزی سے لڑھکتا بل کھاتا مڑتا ،قلابازیاں اور ڈبکیاں کھاتا برابر آگے جارہا تھا اس کے جسم میں مزاحمت کی بالکل ہمت نہ تھی، جوں جوں وہ آگے بڑھ رہا تھا پانی کی بہاؤ تیز سے تیز ہوتا جارہا تھا اور پھر اس نے آبشار کے گرنے کی آواز سن لی تو دہشت کی ایک نئی لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی۔

یاد آیا کہ کچھ فاصلے پر 70 فٹ کی گہرائی میں دریا کا پانی آبشار بناتا نیچے گرتا ہے اگر وہ جلد سے جلد کنارے میں نہ پہنچا تو دنیا کی کوئی طاقت اسے نیچے گرنے سے نہیں روک سکتی۔ پانی اس قدر یخ اور تیز رفتار تھا کہ کنارے تک پہنچنا ممکن ہی نہ تھا، پیروں اور ہاتھوں میں حرکت کرنے کی سکت نہ تھی اور اگر سکت ہوتی بھی تو اس بے پناہ بہاؤ کے سامنے اس کی کوئی حیثیت نہ تھی مگر اس کے سامنے بچاؤں کا کوئی راستہ نہ تھا۔ کنارہ کم ازکم چالیس فٹ دور تھا۔ آخر تھک ہار کر سکندر نے اپنے آپ کو لہروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

خون آشام بھیڑیا کی صورت اس کی آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگی۔

جب وہ آبشار کی لپیٹ میں آکر ایک دم نیچے گرا تو یوں لگا کہ وہ آسمان کی بلندیوں سے نیچے گرتا جارہا ہو پھر اسے ہوش نہ رہا، نہ جانے وہ کتنی دیر تک بے ہوش رہا۔

پھر اس کی آنکھیں خود بخود کھل گئیں اس کے اردگرد اندھیرا تھا۔ اور کانوں میں شائیں شائیں کی آوازیں مسلسل آرہی تھیں۔ وہ سوچنے لگا کہ ''کہیں وہ مر تو نہیں گیا۔'' کہ یکایک اس کو زور سے چھینک آئی اور اس کا پورا جسم حرکت میں آگیا، ابھی وہ اپنے زندہ ہونے کی خوشی منا رہا تھا کہ اسے اپنے قریب کسی ذی روح کا احساس ہوا، اس نے دیکھا ایک درندہ اسے سونگھ رہا تھا اس کے جسم پر لمبے لمبے سیاہ بال تھے وہ کافی قوی ہیکل تھا سکندر کو خیال آیا کہ یہ بھی خون آشام بھیڑیا تو ہے اس نے جلدی سے کمر میں چمڑے کی پیٹی سے بندھا ہوا شکاری چاقو نکالا اور درندے کی گردن میں پوری قوت سے گھونپ دیا گاڑھے گاڑھے خون کی گرم گرم دھار اس کے چہرے پر پڑی ،درندہ جو دراصل ریچھ تھا ایک خوفناک چیخ ماری اور اس کے اوپر ڈھیر ہوگیا، بھاری وزن سے اس کا دم گھٹنے لگا اس نے بمشکل تمام اپنے آپ کو ریچھ کے نیچے سے نکالا ریچھ ابھی تک زندہ تھا وہ پھر دیوانہ وار اس کے جسم میں چاقو گھونپنے لگا۔

خون آشام بھیڑیئے کا سارا غصہ اس نے جنگلی ریچھ پر اتار دیا، پھر وہ گھاس پر بے دم ہوکر گر پڑا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو سنہری دھوپ ہر سو پھیلی ہوئی تھی وہ دوبارہ اٹھا اور سیدھا دریا کی طرف گیا۔ دیر تک وہاں نہاتا رہا اور اپنا بدن صاف کرتا رہا۔ پھر وہاں سے دریا عبور کرکے آہستہ آہستہ چلا اسے معلوم تھا کہ کون سا راستہ قصبے کی طرف جاتا ہے۔ جہاں وارث کا قیام تھا۔

وارث کا کیبن لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ اور دور سے ہی دکھائی دے گیا بستی اور جنگل کی حدود میں بنا ہوا تھا کیبن کی چمنی سے دھواں بل کھاتا ہوا فضا میں اٹھ رہا تھا بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو سکندر کے نتھنوں میں آئی تو وہ بھوک سے بے قرار ہوگیا، گزشتہ سات آٹھ گھنٹوں میں اپنی مدافعت کے لے جو قوت صرف کرنا پڑی، جس نے اسے نڈھال کردیا تھا وہ لڑکھڑاتا ہوا کیبن کے دروازے کے تک پہنچا۔ اور ایک جھٹکے سے ڈھیر ہوگیا اس کے گرنے کی آواز سن کر گھر کا دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر کا نوجوان باہر آگیا یہ وارث تھا۔ اس نے حیرت سے سکندر کو دیکھا۔ ''خدا کے لئے مجھے بچاؤ وارث۔'' سکندر نے

نقاہت سے کہا۔ وارث اسے سہارا دے کر گھر کے اندر لے گیا اور آرام دہ بستر پر لیٹا دیا۔ وہ حیران تھا کہ سکندر کی یہ حالت کیونکر ہوئی، اس نے سوالیہ انداز میں اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز کردیں۔

سکندر نے دیکھا وارث کی آنکھوں کی چمک مدہم ہوچکی تھی وہ مدت سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ ایک دوسرے کو دیکھنے کے بعد اور گرم گرم قہوہ پینے کے بعد سکندر نے وارث کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے معاف کردینا وارث تم نے جو داستان کچھ مدت پہلے سنائی تھی وہ درست تھی اور اب مجھے کوئی شبہ نہیں رہا۔''

''تمہارے بھائی کو جس درندے نے ہلاک کیا وہ خون آشام بھیڑیا ہوگا۔''

''آخر کار تمہیں یقین آ گیا۔'' وارث نے کہا۔

''مجھے پورا واقعہ سناؤ۔''

سکندر نے شروع سے آخر تک سارا واقعہ سنایا، وارث سانس روکے سنتا رہا۔ اس کا چہرہ کبھی سرخ ہوجاتا اور کبھی سفید اس نے اپنی کانپتی ہوئی آواز میں سکندر سے پوچھا۔

''کیا تم نے میرے بھائی کو دیکھا، وہ بھیڑیا کے روپ میں تھا۔ تم نے اسے پہنچاننے میں غلطی تو نہ کی؟''

''ہرگز نہیں۔'' سکندر نے جواب دیا۔ ''میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ وہ تمہارا بھائی ہی تھا، وہی پیشانی و ہی آنکھیں، فرق صرف اتنا تھا کہ اس کے جسم پر لمبے لمبے بال تھے اور پاؤں بالکل بھیڑیا کے سے اور منہ تھوتھنی جیسا تھا۔

''میں نے اسے آنکھوں کے ذریعے سے پہچانا اگرچہ وہ پہلے زرد تھیں پھر سرخ ہوگئیں۔'' جب اس نے مجھے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی۔''

وارث اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ ''تم کہتے ہو کہ تم نے دو بار گولیاں چلائی تھیں اور دونوں مرتبہ گولیاں اسے لگیں مگر وہ نہیں مرا۔''

''ہاں یہ عجیب بات ہے۔ وارث تم جانتے ہی ہو کہ میرا نشانہ کبھی خطا نہیں گیا۔ اور پھر بارہ بور کے دونالی کے کارتوس جو میں نے بہت قریب سے چلائے تھے اگر اس کی جگہ کوئی ہاتھی ہوتا تو وہ بھی دوسرا سانس نہیں لیتا مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔''

وارث کے لبوں پر پراسرار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''یہ سیسے کے کارتوس، تلوار یا گولیاں اور خنجر اسے ہلاک نہیں کرسکتے، ایسی بلاؤں کو چاندی کے کارتوسوں سے مارا جاسکتا ہے، اس خون آشام کو جلد سے جلد فنا کردینا ہمارا فرض ہے ورنہ جتنے انسان اس کے شکار ہوں گے، وہ سب کے سب خون آشام بھیڑیا بنتے چلے جائیں گے اور یوں یہ سلسلہ بہت طویل ہوجائے گا پھر انہیں ختم کرنا ممکن نہ ہوگا۔ بولو کیا تم اس فرض کو پورا کرنے میں میرا ساتھ دو گے؟''

سکندر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہم ہمیشہ ایسی مہموں میں ایک دوسرے کے ساتھی رہے ہیں وارث۔ میں ہر مرحلے پر تمہارے ساتھ ہوں۔''

''بہت خوب مجھے تم سے یہی امید تھی۔ اب ہمیں اس مہم پر جانے کے لئے انتظامات کرلینے چاہئیں۔''

سکندر کو بخار ایسا چڑھا کہ اسے تن بدن کا ہوش نہ رہا اس دوران بے چارہ وارث اس کی تیمارداری کرتا رہا۔

اول تو سکندر کو رات کو نیند نہ آتی اگر چند منٹ کے لئے سوتا تو وہ فوراً بیدار ہوجاتا پھر اس کا جسم تھرتھرانے لگتا، خوف سے آنکھیں ابل آتیں اور وہ بے دم ہوجاتا، وارث اس صورت حال سے سخت پریشان تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جتنی جلدی ممکن ہوسکے جنگل میں جا کر اس خون آشام بھیڑیا کو فنا کردیا جائے۔

دو ہفتے بعد خدا خدا کرکے سکندر کی طبیعت سنبھلی۔ وارث نے اسے مرغن غذائیں کھلائیں اور بہت جلد اس کی صحت بحال ہوگئی۔

ایک روز سکندر بستر پر لیٹا تھا اور وارث ایک

کتاب پڑھنے میں مصروف تھا۔ کہ سکندر نے پوچھا۔ ''کیا پڑھ رہے ہو؟''

''ایک پرانی قلمی نسخہ ہے۔ میرے دادا کے ہاتھ کا لکھا ہوا۔'' وارث نے جواب دیا۔

''مجھے بھی تو سناؤ کہ کیا لکھا ہے تمہارے دادا نے یہ تو خاصا پرانا ہوگا۔''

''ہاں کم از کم سو سال تو اسے ہو ہی گئے ہیں۔''

وارث نے کہا۔'' اس میں انہوں نے عجیب عجیب واقعات لکھے ہیں، میں ایک خاص واقعہ غور کررہا ہوں۔''

''میں بھی سننا چاہتا ہوں۔'' سکندر نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

''تو سنو۔ دادا جان لکھتے ہیں کل رات چاند کی چودھویں تاریخ تھی چچا راشد سیر کے لئے جنگل میں گئے وہاں صنوبر کے ایک اونچے بڑے درخت کے پاس۔''

''خدا کی پناہ۔'' سکندر چلایا۔'' یہ کس تاریخ کا واقعہ ہے۔ وارث میں نے تمہارے دادا کے چچا راشد کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے وہ اپنے زمانے کے بہت بڑے شکاری تھے۔ اور بہت دلیر آدمی تھے۔ ٹھیک ہے نا۔ کیا..... ان کے زمانے میں بھی یہ جنگل ایسا تھا اور صنوبر کا وہ درخت! خدا رحم کرے۔ کیا انہوں نے بھی چاند کی چودھویں تاریخ کو خون آشام بھیڑیا دیکھا تھا۔''

''ہاں سکندر۔'' وارث نے سرد آہ بھر کر کہا۔'' ہمارے خاندان میں یہ بدعا اسی زمانے سے سوار ہے۔ راشد دراصل میرے دادا کے چچا تھے میری پیدائش سے بھی بہت پہلے ان کا انتقال ہوگیا، میں نے سنا ہے کہ وہ نہایت نڈر اور تجربہ کار شکاری تھے۔ ان کے کارنامے اکثر گردونواح میں بڑے بوڑھوں کی زبان پر ہوتے ہیں، جنوری کی 17 تاریخ تھی اور چاند کی چودھویں جب وہ جنگل میں گئے۔

''گویا آج سے ایک سو دس برس پہلے۔''

سکندر بولا۔

''ہاں ایک سو دس برس پہلے اور اتنی مدت گزر چکی کہ خون آشام بھیڑیئے کی شکل میں یہ بلا ہم پر مسلط ہے۔ اب تک ہمارے خاندان کے چار افراد اس کے حملے کا شکار ہو کر خون آشام بھیڑیا کا قالب اختیار کرچکے ہیں اور پانچواں میرا بھائی۔'' وارث کی آواز فرط غم سے بھرا گئی۔

وارث نے رومال نکال کر آنکھوں پر رکھ لیا۔ اور سسکیاں لینے لگا۔ سکندر کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔ اس نے اپنا ہاتھ وارث کے کندھے پر رکھ کر تسلی دی۔''فکر مت کرو دوست ہم دونوں جنگل میں چلیں گے اور اس بلا کو ختم کرڈالیں گے۔ اب آگے کے واقعات سناؤ کہ آگے کیا لکھا ہوا ہے؟''

وارث نے آنسو پونچھے اور ایک بار پھر ان اوراق پر نگاہیں جمادیں اور پڑھنے لگا۔ چچا راشد نے اس نے بلا کو صنوبر کے ایک اونچے اور بڑے درخت کے پاس لمبی گھاس میں دبکے ہوئے دیکھا۔ اس کا چہرہ انسانوں کا اور جسم بھیڑیا کا سا تھا، اگر میرے گلے میں جنگلی گلاب کے پھولوں کا ہار نہ پڑا ہوتا تو وہ مجھے چیر پھاڑ کررکھ دیتا۔ اور پھر میں اپنے پردادا کی مانند خون آشام بھیڑیا کا روپ دھار لیتا۔ میرے پردادا نے پہلے برس اس جنگل میں ایک جادوگر کو ہلاک کیا تھا وہ جادوگر کالے عالم کا ماہر تھا۔ مرتے مرتے میرے دادا سے بولا ''تجھے بھیڑیا کھائے گا۔ اور پھر تو بھی بھیڑیا بن کر اپنے ہی خاندان کے آدمی کو مارے گا اور اس طرح یہ سلسلہ کئی نسلوں تک چلتا رہے گا۔''

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

ہمیں ایک مذہبی آدمی نے اس بلا سے بچنے کی کئی تدبیر بتائی ہیں ایک یہ کہ جنگل میں جائیں تو جنگلی گلاب یا لہسن کے پھول کا ہار گلے میں ڈال لیں، خون آشام بھیڑیا جو ایک بدروح ہے ان خوشبو سے بھاگتا ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ایسے خنجر بنوائیں جائیں جن کے دستے چاندنی کے ہوں چاندی کے علاوہ کوئی

اور دھات خون آشام بھیڑیا پر اثر نہیں کرسکتی، جب پورا چاند آسمان پر ہو تو جنگل میں جائیں اور چودھویں کے بعد پندرہویں یا سولہویں تاریخ کو ادھر جانے کا قصد نہ کریں اگر اس دوران میں جانا پڑے تو جنگلی گلاب یا لہسن کے پھول کے ہار گلے میں ڈال کر جائیں۔ خون آشام بھیڑیا کا پنجہ ان پھولوں سے اگر چھو جائے تو وہ فوراً جل کر راکھ ہو جائے گا۔ اگر جنگلی پھول گلے میں ڈالنا یاد نہ رہے اور بھیڑیا حملہ آور ہو تو چاہئے کہ آدمی بہتے ہوئے پانی کی طرف دوڑ لگادے اور اس میں چھلانگ لگادے۔ بھیڑیا بہتے پانی کو عبور نہیں کرسکتا۔

''اوہ آخری ترکیب نے میری جان بچائی۔'' سکندر نے کہا۔ یہ اور بات ہے کہ مجھے اس ترکیب کے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا۔ میں نے بہت عرصہ پہلے صرف سنا تھا۔ کہ اگر ایسا ہو تو دریا میں کود کر جان بچائی جاسکتی ہے۔

''اچھا یہ بتاؤ کہ تمہارے پاس چاندی کی کتنی مقدار ہے؟'' وارث نے پوچھا۔

''چاندی۔'' سکندر نے ندامت سے کہا۔''بھلا میرے پاس چاندی کہاں سے آگئی۔''

''ہمیں ہر حال میں چاندی کہیں نہ کہیں سے حاصل کرنا ہوگی۔'' وارث نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''تم نے سن لیا کہ اس بلا کو صرف چاندی کے کارتوسوں سے ہی فنا کیا جاسکتا ہے۔ میرے پاس گھر میں پانچ ہزار روپے کی رقم محفوظ ہے۔ کہو تو وہ لادوں اگر اس رقم سے چاندی مل سکے تو۔'' سکندر نے کہا۔

''بہت خوب اتنی ہی رقم میرے پاس بھی موجود ہے۔ میرے خیال میں دس ہزار روپے میں ہم اپنا مقصد حاصل کرسکتے ہیں۔'' وارث بولا۔

اگلے تین چار دن انہوں نے اپنی تیاری پر لگائے۔

سکندر اپنی بارہ بور کی بندوق وہیں جنگل میں پھینک آیا تھا، خوش قسمتی سے وارث کے پاس ایک فالتو بندوق تھی وہ اس نے سکندر کو دے دی۔

اب انہیں چاند کی چودھویں تاریخ کا انتظار تھا انہوں نے جنگلی گلاب اور لہسن کے پھولوں کے بہت سے ہار بھی تیار کرلئے تھے۔ فرصت کے اوقات میں وہ اپنی اپنی بندوقوں سے نشانہ لگانے کی مشق کرتے۔

سکندر نے ایک روز اداس ہو کر کہا۔''مجھے اپنی بندوق کا ہمیشہ افسوس رہے گا۔ ایک مدت سے وہ میرے قبضے میں تھی اور اس نے بے شمار جانور ہلاک کئے ہیں۔''

''فکر نہ کرو دوست تمہاری بندوق ضرور وہیں کہیں جنگل میں پڑی مل جائے گی اور اگر نہ ملی تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں اس سے بھی زیادہ عمدہ بندوق دلواؤں گا۔'' وارث نے اس کی طرف محبت سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

چودھویں رات کا چاند مشرقی افق سے نکلا تو وہ دونوں اپنی خطرناک مہم پر جانے کے لئے بالکل تیار تھے دونوں نے ابھرتے ہوئے گول سنہری چاند کو ایک نظر دیکھا بندوق کندھوں پر اور جنگلی گلاب اور لہسن کے ہار اپنے گلے میں ڈالے اور دریا کی طرف روانہ ہوگئے۔ اب انہیں ایک جگہ سے دریا عبور کرکے کنارے سے دوسری جگہ جانا تھا، بہاؤ سے الٹے کافی دور جاکر وارث نے جھاڑیوں میں چھپی ہوئی ایک چھوٹی سی کشتی اور دو چپو برآمد کرلئے جب وہ کشتی میں سوار ہوکر دوسرے کنارے کی طرف بڑھ رہے تھے تو ان کے دل کی دھڑکنیں تیز سے تیز تر ہوتی جارہی تھیں۔

قرب وجوار اور جنگل میں ہیبت ناک سناٹا طاری تھا۔ وہ دونوں خاموش تھے دوسرے کنارے پر پہنچ کر وارث نے سکندر کی مدد سے کشتی گھسیٹ کر کنارے پر ایک درخت سے باندھی اس کے بعد دونوں آگے پیچھے جنگل کے اس حصے کی طرف بڑھے جہاں صنوبر کا وہ آسیبی درخت گزشتہ ایک سو سال بلکہ اس سے بھی پہلے کا سر اٹھائے کھڑا تھا۔

وارث آگے تھا سکندر پیچھے، جنگل میں کوئی ذی روح نہ تھی پرندے تک خاموش، یہ ایسی ہوش ربا

خاموشی تھی جو انسان کے اعصاب بہت جلد شکستہ کر دیا کرتی ہے۔

سکندر نے دل میں سوچا۔ ''کائنات کے راز کبھی نہیں پا سکتے۔ موت کیا ہے زندگی کیا ہے روح کیا ہے؟ پھر مرنے کے بعد ایک انسان کا درندے کے قالب میں نمودار ہونا کتنا عجیب لگتا ہے۔ انتقام، جادو، آسیب، یہ سب کیا ہے؟''

وہ دونوں دریا کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ وارث نے ایک مرتبہ بھی زبان نہ کھولی شاید وہ بھی کچھ سوچ رہا تھا جو سکندر کے دل میں تھا۔

دفعتاً آبشار کے گرنے سے جو شور پیدا ہو رہا تھا اس کی آواز سکندر کے کانوں میں آئی اور چند روز پیشتر کا حادثہ پوری شدت سے اس کے ذہن میں آ گیا تو اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔ جوں جوں وہ آگے بڑھ رہے تھے۔ آواز زیادہ تیز اور واضح ہوتی چلی جا رہی تھی۔ آخر وہ اس مقام پر پہنچ گئے۔ جہاں آبشار کے ستر اسی فٹ نیچے گرنے سے فضا میں دھند کا ایک بادل سا بن رہا تھا۔ یہاں اتنا شور تھا کہ وہ ایک دوسرے سے اشاروں میں بات کر سکتے تھے، دونوں کچھ منٹ تک وہاں گم صم کھڑے رہے۔

پھر وہاں سے پلٹے اور جنگل کے اندرونی حصے کی طرف بڑھے۔ چاندنی درختوں کی شاخوں اور پتوں میں سے چھن چھن کر باہر آ رہی تھی، عجیب وغریب سائے ادھر ادھر بکھرے ہوئے نظر آئے وارث بالکل خاموش تھا۔

سکندر کے ذہن میں ایک خیال آیا اور دہشت سے اس کے دل کی حرکت بند ہونے لگی اس نے بڑی مشکل سے یہ خیال اپنے ذہن سے جھٹکا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ۔ ''کیا خبر یہ وارث خود ہی خون آشام بھیڑیا نہ ہو۔'' اور دہشت سے اس کے دل کی دھڑکن بند ہونے لگی۔ اس نے بڑی مشکل سے یہ خیال اپنے ذہن سے جھٹکا۔

عین اسی لمحے وارث نے گھوم کر سکندر کی طرف دیکھا اور سکندر اچھل پڑا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ پھر اسے خیال آیا کہ ''اگر وارث خون آشام بھیڑیا ہوتا تو جنگلی گلاب اور لہسن کا ہار کبھی اپنے گلے میں نہ ڈالتا اور نہ چاندی کے کارتوس اپنی جیب میں رکھتا اور نہ بہتے ہوئے پانی کو عبور کرنے کے قابل ہوتا۔'' اپنے اس وہم پر سکندر کو خود ہنسی آ گئی۔

وارث نے اس ہنسی کا سبب پوچھنے کے لئے پہلی بار زبان کھولی۔ ''کیا بات ہے سکندر بہت خوش نظر آ رہے ہو؟'' اس نے عجیب سے انداز میں سکندر کو دیکھا یہ ہنسی بالکل بے موقع اور بے محل تھی۔

''میں سوچ رہا تھا کہ تم خود ہی خون آشام بھیڑیا تو نہیں۔''

''اوہ تو تم نے مجھے پہچان لیا۔'' وارث نے سنجیدگی سے کہا اور اسے گھورنے لگا، ایک لمحے کو سکندر کو یوں لگا کہ جیسے واقعی اس کے دل کی حرکت تھم گئی ہو دوسرے ہی لمحے وارث ہنسا اور بولا۔

''ان واہیات باتوں کو چھوڑ دو اور اب ہم واقعی خون آشام بھیڑیا کے پاس پہنچ گئے ہیں اپنی بندوق تیار رکھو۔ کسی بھی وقت ہمارا اس کا سامنا ہو سکتا ہے۔''

اب وہ درختوں کے اس جھنڈ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جہاں سکندر نے پہلی بار خون آشام بھیڑیا کو دیکھا تھا فاصلہ تھا کہ ختم ہونے کو ہی نہ آتا تھا، یوں بھی وہ آہٹ پیدا کئے بغیر چل رہے تھے۔

ٹھیک آدھی رات کا عمل تھا جب انہوں نے دور سے صنوبر کے درخت کو دیکھا جو ایک خوفناک دیو کی مانند کھڑا تھا۔ ان کے سروں پر چاند آ گیا تھا۔

اچانک ایک الو اپنی بھیانک آواز میں چیختے ہوئے فضا میں اڑا اور نہ جانے کس طرف چلا گیا، وہ بہت احتیاط سے درختوں کے جھنڈ میں داخل ہوئے یہاں کس قدر تاریکی تھی پہلے انہیں کچھ دکھائی نہ دیا وہ دم سادھے پاس پاس کھڑے رہے انہوں نے اپنی اپنی بندوقیں کندھوں سے اتار کر ہاتھوں میں لے لی تھیں ان کی انگلیاں لبلبی پر تھیں اور نگاہیں اپنے دشمن کو تلاش

کرنے میں۔

ایک ہلکی سی آہٹ گھاس میں سے آتی ہوئی انہیں سنائی دی وہ چوکنے ہوگئے اور ایک دوسرے کی پشت سے پشت ملا کر کھڑے ہوگئے ان کے دل بری طرح دھڑک رہے تھے انتظار کے یہ لمحات گویا صدیوں پر محیط تھے۔ اچانک تاریکی کا سینہ چیرتی ہوئی ایک ہولناک آواز جنگل میں گونجی تو ان دونوں کے دل لرز گئے، یہ خون آشام بھیڑیا کی چیخ تھی، شاید اس نے ان کی بو پالی تھی۔ چند ثانیے بعد انہوں نے ایک حرکت کرتا ہوا جسم کوئی پچاس فٹ کے فاصلے پر دیکھا یہ ایک قوی بھیڑیا تھا۔ جو گھاس میں دبکا ہوا آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھ رہا تھا، یہ ایک نوجوان لڑکے کا چہرہ تھا۔ ''یہ میرا بھائی ہے۔'' وارث کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

خون آشام بھیڑیا نے ایک دل دوز چیخ ماری غراتا ہوا گھاس میں سے نکلا اور سیدھا وارث کی طرف آیا۔ اس کا انداز جارحانہ تھا، سکندر نے جھرجھری لی۔ یہ وہی بھیڑیا تھا جو اس کے تعاقب میں آیا تھا۔

وارث نے نہایت سکون سے بندوق سیدھی کی نشانہ لیا اور لبلبی دبا دی۔ گولی بھیڑیا کی کھوپڑی میں لگی، وہ الٹ کر گرا اس کی چیخوں اور غراہٹوں سے جنگل میں گویا تہلکہ مچ گیا۔ فضا میں لاتعداد پرندے گھبرا کر چکر کاٹنے لگے۔ وارث نے دوسرا فائر کیا یہ گولی بھی نشانے پر لگی بھیڑیا ماہی بے آب کی طرح گھاس میں تڑپ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بے حس و حرکت ہوگیا۔

وارث اور سکندر دونوں لاش کی طرف دوڑے۔ ابھی وہ جھک کر اسے اچھی طرح دیکھنے بھی نہ پائے تھے کہ وہیں جھاڑیوں میں دبکا ہوا ایک اور خون آشام درندہ ان کی طرف لپکا، یہ بھی خون آشام بھیڑیا تھا لیکن اس کی شکل اور جسامت پہلے بھیڑیا سے کہیں زیادہ ڈراؤنی اور خوف ناک تھی۔

''سکندر فائر کرو۔'' وارث چلایا۔ بھیڑیا ان سے صرف چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ جونہی اس نے جست لگائی سکندر کی بندوق چلی اور گولی بھیڑیا کے دل میں لگی وہ الٹ کر گرا اور ایک ثانیے کے اندر اندر ٹھنڈا ہوگیا۔

''خدا کی پناہ مجھے اس کا خیال ہی نہ تھا۔'' وارث نے کہا۔ ''یہی وہ خبیث تھا جس نے میرے بھائی کو ہلاک کیا اور اسے اپنی جنس میں شامل کرلیا۔''

دونوں نے خون آشام بھیڑیوں کی لاشوں کو گھسیٹا اور چاندنی میں لے گئے۔ یہ ایک عجیب دہشت انگیز منظر تھا۔

''دیکھو دیکھو یہ کیا ہو رہا ہے؟'' سکندر خوف سے چیخا۔ کیونکہ اب بھیڑیوں کی لاشوں کے چہرے تبدیل ہو رہے تھے۔ پہلی لاش بھیڑیا کے بجائے نوجوان لڑکا کا چہرہ تھا جو کہ وارث کا بھائی تھا وہ اب پوری انسانی لاش تھی اور اس میں بھیڑیا کے کوئی آثار نظر نہ آرہے تھے۔

وارث کے دونوں رخساروں پر آنسوؤں کے قطرے ڈھلک رہے تھے پھر اس نے اپنے گلے سے جنگلی گلاب اور لہسن کے پھولوں کے ہار اتارے اور بھائی کے گلے میں ڈال دیئے، خون آشام بھیڑیا کی دوسری لاش بھی تھوڑی دیر بعد ایک انسانی لاش میں بدل گئی، یہ ایک بوڑھا اور کریہہ المنظر جنگلی شخص کا سیاہ جھریوں بھرا چہرہ تھا، ہاتھ سوکھے اور مڑے ہوئے تھے، وارث نے کہا کہ ''شاید یہ وہی شخص ہے جس نے مرتے وقت دادا کو بھیڑیا بننے کا کہا تھا۔'' ابھی وہ اس کی لاش پر نفرت کی نگاہیں ڈال ہی رہے تھے کہ لاش سیاہ راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہوگئی۔

وارث گھٹنوں کے بل جھکا اور دیر تک اپنے بھائی کے لئے مغفرت کی دعائیں مانگتا رہا، سکندر کی گردن بھی ادب سے جھکی ہوئی تھی۔ پھر وارث نے اپنے بھائی کی لاش اٹھائی اور جنگل سے دونوں نکل گئے۔

جب وہ دریا کے کنارے پہنچے اور کشتی پر سوار ہوئے تو صبح صادق کا اجالا مشرقی افق سے نظر آیا جو نیا دن طلوع ہونے کی خوشخبری دے رہا تھا۔

تارِ عنکبوت

ضرغام محمود۔ کراچی

ایک بد دعا نے خوش و خرم نوجوان کا ہنستا بستا گھر اجاڑ کر رکھ دیا، نوجوان حال سے بے حال ہوگیا، اس کی ساری خوشیاں ملیا میٹ ہوکر رہ گئیں اور پھر ایک وقت آیا جب ساری حقیقت کھل کر سامنے آئی تو......

سیانے کہتے ہیں کہ قبر بھی ایک عالم نامعلوم ہے، اس کا انکشاف کہانی پڑھ کر ہوگا

جیلر کے ہاتھ میں ہنٹر تھا جو بار بار فضا میں بلند ہوتا اور شڑاپ کی آواز کے ساتھ قیدی کے جسم پر قہر بن کر ٹوٹتا، ہر ضرب کے ساتھ قیدی کی اذیت بھری چیخ فضا میں گونجتی۔ جیلر شمریز خان رکے بغیر ایک کے بعد ایک ضرب لگاتے جارہے تھے اور قیدی کی اذیت بھری چیخیں اور دردناک آہ و فغاں جیل کی فضائیں دور دور تک سنائی دے رہی تھی، جیل کے دیگر قیدی سہم کر بیرکوں کی دیواروں سے لپٹے بیٹھے تھے۔ شمریز خان ایک اصول پسند جیلر ہے ویسے وہ کافی رحمدل واقع ہوئے ہیں لیکن اگر کوئی قیدی ان کے بنائے اصولوں کو توڑنے کی جرأت کرے تو جیلر شمریز خان اس قیدی پر قہر بن کے ٹوٹ پڑتے تھے اور آج۔ آج بھی ایک قیدی نے ان کے بنائے ہوئے اصولوں سے انحراف کرنے کی کوشش کی تھی لہٰذا وہ قیدی پر قہر بن کے ٹوٹ پڑے تھے شمریز خان جب قیدی کو مار مار کر تھک گئے اور قیدی بھی مار کھا کھا کر بے ہوش ہوگیا، قیدی کی ننگی پیٹھ پر ہنٹر کے واضح نشان نظر آرہے تھے جن سے خون رس رہا تھا قیدی تکلیف کی شدت سے بے ہوش ہو چکا تھا شمریز خان نے دیکھا کہ قیدی ضربوں کی تاب نہ لاکر بے ہوش ہو چکا ہے تو انہوں نے عملے کو اشارہ کیا عملہ تکلیف کے شدت سے بے ہوش قیدی کو اٹھا کر لے گیا اسی وقت ایک سنتری آگے بڑھا اور اس نے شیشے کے چمکدار گلاس میں ٹھنڈا پانی جیلر شمریز خان کو پیش کیا شمریز خان نے پانی پی کر گلاس سنتری کو واپس کیا۔ اتنے میں اسسٹنٹ جیلر آگے بڑھا اور مؤدب انداز میں کہنے لگا۔

''سر قتل کا مجرم پہنچ گیا ہے۔ دفتر میں آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔۔'' یہ سن کر شمریز خان نے میز پر رکھی اپنی کیپ اٹھائی اور اسے سر پر جمایا اور اپنی بید کو ہاتھ میں اٹھا کر اپنے دفتر کی جانب تیز تیز قدموں سے چل دیئے۔

''یہ کیا ہے؟'' اپنے دفتر کے دروازے پر کتابوں کا ڈھیر دیکھ کر انہوں نے ساتھ چلتے اپنے اسسٹنٹ سے پوچھا

''سر یہ قیدی کا سامان ہے۔۔''

''کتابیں۔۔'' شمریز خان نے حیرت سے دوبارہ پوچھا ان کی بائیس سالہ سروس میں کسی قیدی کا ایسا سامان انہوں نے نہیں دیکھا تھا

''جی سر۔۔۔ قیدی نے جیل میں رہتے ہوئے انگریزی لٹریچر میں ماسٹرز کیا ہے اور اس کا زیادہ وقت مطالعے میں گزرتا ہے'' اسسٹنٹ جیلر نے نہایت ادب سے جواب دیا۔ یہ سن کر شمریز خان کی آنکھوں میں

تحسین کے جذبات ابھرے۔

''کیا۔۔کیا تھا مجرم نے؟......'' شمریز خان کو آنے والے نئے قیدی سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔

''قیدی نے سولہ سال کی عمر میں اپنی آنٹی کو قتل کیا تھا، عدالت نے اسے عمر قید کی سزا سنائی ہے۔۔۔''

اسسٹنٹ جیلر نے جواب دیا تو شمریز خان سر ہلاتے ہوئے اپنے دفتر میں داخل ہوگئے۔

دفتر میں دو پولیس آفیسر کے ساتھ ایک بیس بائیس سال کا دبلا پتلا نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ نوجوان نے ہلکے رنگ کی جینز کی پینٹ اور ٹی شرٹ پہنا ہوا تھا اس کی آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگا ہوا تھا اس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی جسے وہ پڑھ رہا تھا، قتل کے مجرم کے تصور کے بالکل برعکس وہ کسی یونیورسٹی کا لاابالی ذہین نوجوان معلوم ہوتا تھا۔

''یہ قتل کا مجرم ہے!'' شمریز خان کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''مجھ پر قتل کا الزام لگایا گیا ہے۔۔'' میں نے کتاب بند کرکے اپنا چشمہ آنکھوں پر درست کرتے ہوئے کہا۔

''ہر مجرم یہی کہتا ہے۔۔ تمہیں عدالت نے قتل کا مجرم قرار دیا ہے......'' شمریز خان نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''کیا عدالت کا ہر فیصلہ درست ہوتا ہے؟ کیا تاریخ نے ثابت نہیں کیا کہ عدالت کے کچھ فیصلے بھی غلط ہوئے ہیں؟'' میں نے انتہائی رسانیت سے جواب دیا۔

''کیا ہسٹری ہے اس کی۔۔'' شمریز خان نے مجھے جواب دینے کے بجائے میرے ساتھ آنے والے پولیس آفیسروں سے پوچھا۔

''سر اسے عمر قید کی سزا ہوئی ہے چھ سال کی سزا یہ ادھر جیل میں کاٹ چکا ہے باقی کی سزا آپ کی جیل میں پوری کرے گا۔۔'' پولیس آفیسر نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے اس کے کاغذات کہاں ہیں۔''

شمریز خان نے پھر پوچھا تو اسسٹنٹ جیلر نے چند کاغذات شمریز خان کے سامنے رکھے۔ شمریز خان نے ان کاغذات پر سرسری نظر ڈالی اور پھر قلم نکال کر ان کاغذات پر دستخط کر دیئے۔ اسسٹنٹ جیلر نے وہ کاغذات میز پر سے اٹھا کر پولیس آفیسروں کے حوالے کئے پولیس آفیسروں نے کاغذات لیکر شمریز خان کو سیلوٹ کیا اور کمرے سے باہر چلے گئے۔

''اسے بیرک میں بند کردو۔۔'' جیلر شمریز خان نے میری جانب اشارہ کرکے اسسٹنٹ جیلر کو کہا۔

''سر۔۔ میری ایک درخواست ہے۔۔''

اسسٹنٹ جیلر نے جب مجھے کندھے سے پکڑا تو میں نے شمریز خان کو مخاطب کیا۔

''کہو۔۔'' شمریز خان نے اپنے ہاتھ میں پکڑے بید کو اپنے ہی دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر ہلکے سے مارتے ہوئے پوچھا۔

''سر۔۔۔ مجھے عادی مجرموں کی بیرک میں نہ رکھا جائے۔۔'' میں نے التجا کی۔

''ٹھیک ہے۔۔۔ اسے الگ بیرک میں بند کردو۔۔'' جیلر شمریز خان نے اپنے اسسٹنٹ کو حکم دیا تو اس نے سر ہلا دیا۔

☆......☆......☆

میں اپنی بیرک میں بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا جیل میں میرا زیادہ وقت مطالعے ہی میں صرف ہوتا تھا میں بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا کہ مجھے ایک آواز سنائی دی۔۔''اے۔۔۔ اے تمہارا نام کیا ہے۔۔؟''

میں نے نظر اٹھا کر دیکھا ایک سولہ سترہ سال کی دبلی پتلی لڑکی مجھے مخاطب کرنے کی کوشش کررہی تھی اس لڑکی کے دائیں بائیں دو پولیس والے اس کی حفاظت کے لئے مستعد کھڑے تھے وہ لڑکی میری بیرک کے دروازے کی سلاخوں سے تھوڑا فاصلے پر کھڑی تھی اس نے سفید رنگ کا کرتا پہنا ہوا تھا جس کی لمبائی اس کے گھٹنوں تک آرہی تھی اس نے گہرے نیلے رنگ کی جینز کی پینٹ پہنی ہوئی تھی اس کا دوپٹہ اس کے گلے میں مفلر کی طرح لٹکا ہوا تھا اس لڑکی کا رنگ سرخ وسفید تھا اور

نقوش بھی جاذب نظر تھے وہ مسلسل مجھے مخاطب کرنے کی کوشش کر رہی تھی میں نے چونک کر اس لڑکی کی جانب دیکھا اس لڑکی کو دیکھتے ہی میری آنکھوں کے سامنے ایک سفید پردہ سا آ گیا اور جیل اور جیل کے سپاہی میری نظروں کے سامنے سے غائب ہو گئے اور اس سفید پردے پر ایک منظر چلنے لگا اس منظر میں وہ دبلی پتلی لڑکی بڑی ہو گئی تھی ساتھ ہی اس کا دبلا پتلا جسم بھی بھر گیا تھا وہ لڑکی دلہن کے لباس میں اسٹیج پر بیٹھی تھی اس کے ساتھ دولھے کے لباس میں، میں بیٹھا تھا چاروں طرف خوشیوں کے شادیانے بج رہے تھے بہت بڑا شادی ہال تھا جہاں لوگ خوش گپیوں میں مصروف تھے یہ کسی شادی کا منظر تھا اسی وقت ایک شوخ لڑکی اسٹیج پر آئی اور دلہن کو گلے لگاتے ہوئے بولی۔۔ ''ماہم خان چپکے چپکے شادی کر رہی ہو؟''

''آفرین تو کب آئی جرمنی سے۔۔'' دلہن جس کا نام ماہم خان تھا آفرین کو گلے لگاتے ہوئے بولی۔

''آج ہی آئی ہو اور مجھے پتا چلا کہ میری پیاری دوست کی شادی ہے تو میں بن بلائے چلی آئی۔'' آفرین بولی۔

''یہ تو نے بہت اچھا کیا۔۔''

''یار تو نے تو خوب رونق لگا رکھی ہے۔۔''

آفرین نے شادی ہال میں موجود لوگوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

'' شمریز خان کی اکلوتی بیٹی ماہم خان کی شادی ہے کوئی مذاق نہیں۔۔۔'' ماہم نے کہا تو دونوں دوست کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

''جیجا جی۔۔۔ میں آپ کی سالی ہوں ماہم کو اکلوتا مت سمجھئے گا۔۔'' آفرین نے مجھے مخاطب کیا تو میں نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

اسی کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے سے سفید پردہ ہٹ گیا اور میں خواب کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں واپس آ گیا۔

''اے۔۔ میں تم سے تمہارا نام پوچھ رہی ہوں اور تم ٹکر ٹکر مجھے دیکھے جا رہے ہو۔۔'' اس لڑکی نے پھر مجھے مخاطب کیا۔

''اپنا نام تو ہر کوئی بتا سکتا ہے میں تمہارا نام بھی بتا سکتا ہوں تمہارا نام ماہم خان ہے۔۔'' میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

اپنا نام میرے منہ سے سن کر وہ لڑکی چونک پڑی۔۔ ''تمہیں ۔۔۔ تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا۔۔؟'' وہ لڑکی حیرانی سے بولی۔

''میں یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ تم جیلر شمریز خان کی اکلوتی بیٹی ہو۔۔'' میں نے ایک بار پھر مسکرا کر کہا تو وہ مزید حیرانی سے مجھے دیکھنے لگی۔

''تمہیں یہ سب کس نے بتایا۔۔'' وہ حیرانگی سے بولی۔

''کسی نے نہیں۔۔'' میں نے مختصر سا جواب دیا۔

''تم جھوٹ بولتے ہو؟'' وہ بولی پھر سپاہیوں کی جانب مڑی اور ان سے کہنے لگی۔'' آپ لوگوں نے اسے میرا نام بتایا تھا۔۔؟''

'' بے بی صاحب۔۔ ہمیں تو خود آپ کا نام ابھی معلوم ہوا ورنہ یہاں تو سب آپ کو سوئیٹی بی بی کے نام سے جانتے ہے۔۔''

''پھر۔۔۔ پھر اس قیدی کو میرا نام کیسے معلوم ہوا۔۔؟'' وہ بڑبڑاتے ہوئے اپنے آپ سے باتیں کرنے لگی۔

''تم میری ایک بات مانو گی۔۔'' میں نے اس لڑکی سے کہا جو جیلر شمریز خان کے بیٹی ماہم خان تھی۔

''تم نہیں مجھے آپ کہو۔۔'' ماہم نے سخت لہجے میں مجھ سے کہا۔

''اور اگر یہی بات میں کہوں کہ مجھے آپ کہہ کر مخاطب کرو تو۔۔۔''

'' میں جیلر شمریز خان کی بیٹی ہوں۔۔'' وہ دوبارہ سخت لہجے میں بولی

''بیٹی خواہ بادشاہ کی ہی کیوں نہ ہو اپنے ہونے والے شوہر کو آپ کہہ کر مخاطب کرتی ہے۔۔'' میں نے

پھر مسکرا کر جواب دیا۔

''کیا۔۔'' ماہم چیخ اٹھی۔۔ ''تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھ سے اس طرح کی بات کہنے کی۔۔''

''جو مستقبل ہے میں وہ بتا رہا ہوں مستقبل میں یہی حقیقت بننے والی ہے۔۔''

''ت۔۔۔تم نجومی ہو۔۔۔''

''میں نجومی نہیں ہوں۔۔مگر مستقبل دیکھ سکتا ہوں۔۔''

''ویری انٹرسٹنگ۔۔'' ماہم کا غصہ رفو چکر ہو چکا تھا ''اچھا بتاؤ ابھی میں نے انٹر کے پیپر دیئے ہیں میرا رزلٹ کیا آئے گا۔۔''

''میں نے کہا نا میں نجومی نہیں ہوں۔۔جو کچھ مجھے دِکھتا ہے وہ میں کہہ دیتا ہوں۔۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیا باتیں ہو رہی ہیں۔۔'' اچانک جیلر شمریز خان نے پیچھے سے آ کر اپنی بیٹی ماہم خان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''پپا۔۔۔اسے میرا نام معلوم ہے اس نے مجھے ماہم خان کہہ کر مخاطب کیا۔۔'' ماہم نے پیچھے گھومتے ہوئے جیلر شمریز خان سے کہا۔

''تو اس میں اچھنبے کی کیا بات ہے عملے میں سے کسی نے تمہارا نام اسے بتا دیا ہوگا۔۔'' جیلر شمریز خان نے اپنی بیٹی کو جواب دیا۔

''پپا عملے کو بھی میرا اصل نام نہیں معلوم ہے سب یہاں مجھے سوئیٹی کے نام سے جانتے ہیں۔۔'' ماہم بولی۔

''ہاں یہ بات تو ہے۔۔'' جیلر شمریز خان نے سر چتے ہوئے جواب دیا پھر وہ میری جانب متوجہ ہوئے اور بولے۔۔''نوجوان تمہارا نام کیا ہے۔۔؟''

''اسد الرحمان ولد عبدالرحمان۔۔'' میں نے مکمل تعارف کروایا۔

''تمہیں میری بیٹی کا نام کیسے معلوم ہوا۔۔؟'' جیلر شمریز خان نے دوسرا سوال کیا۔

''مجھے بہت سی باتوں کا علم قبل از وقت ہو جاتا ہے۔۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیا مطلب۔۔'' جیلر شمریز خان نے نہ سمجھنے والے انداز میں پوچھا۔

''ابھی میری آنکھوں کے سامنے ایک منظر آیا تھا جس میں آپ کی بیٹی دلہن بنی بیٹھی تھی اور ایک لڑکی جسے یہ آفرین کہہ کے پکار رہی تھیں اس نے ان کا نام ماہم خان لیا تھا۔۔'' میں نے تفصیل سے جواب دیا۔

''پپا آفرین کالج میں میری بیسٹ فرینڈ ہے۔۔'' ماہم جو اتنی دیر سے خاموش تھی بیچ میں بول اٹھی۔

''اس نوجوان کو میرے دفتر میں لیکر آؤ۔۔'' جیلر شمریز خان نے سپاہیوں سے کہا اور اپنی بیٹی کو لیکر اپنے دفتر کی جانب چل دیئے۔

شمریز خان کا حکم سن کر سپاہیوں نے بیرک کا بھاری لوہے کا دروازہ کھولا اور مجھے باہر نکالا۔تھوڑی دیر بعد میں جیلر شمریز خان کے آفس میں ان کے مقابل کھڑا تھا جیلر شمریز خان اپنی کرسی پر بیٹھے تھے ان کے ساتھ ان کی بیٹی ماہم کھڑی تھی جیلر شمریز خان کے ہاتھ میں ایک فائل تھی جس کی وہ ورق گردانی کر رہے تھے تھوڑی دیر فائل پڑھنے کے بعد انہوں نے اسے بند کیا میری جانب دیکھتے ہوئے اپنے سامنے رکھی کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولے ''بیٹھو۔'' پھر اپنی بیٹی کی جانب متوجہ ہوئے اور کہا۔۔''تم بھی بیٹھ جاؤ سوئیٹی بیٹا۔۔'' یہ سن کر ماہم نے ایک کرسی اپنی پپا کے برابر گھسیٹ کر رکھ لی اور اس پر بیٹھ گئی میں بھی جیلر شمریز خان کے سامنے رکھی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

''تمہارا نام اسد الرحمان ولد عبدالرحمان ہے۔۔'' میرے بیٹھنے کے بعد جیلر شمریز خان نے مجھے مخاطب کیا۔

''جی''

''اب تم یہ بتاؤ کہ تمہیں میری بیٹی کا نام کیسے معلوم ہوا؟''

''میں نے مستقبل کے پردے پر دیکھا ایک لڑکی انہیں ماہم خان کے نام سے پکار رہی تھی۔۔'' میں نے جواب دیا۔

''مطلب۔تم مستقبل دیکھ سکتے ہو'' شمریز خان نے بے یقینی سے پوچھا۔

''مجھے اندازہ ہے کہ میری اس بات پر کسی کا یقین کرنا بہت مشکل ہے میرے اپنے والدین بھی میری بات پر یقین نہیں کرتے تھے مگر۔۔مگر یہ حقیقت ہے کہ اکثر مستقبل میں آنے والے واقعات میری آنکھوں کے سامنے اس طرح چلتے ہیں جیسے کوئی عام شخص فلم دیکھ رہا ہو۔''

میں نے جواب دیا۔

''یعنی تم مستقبل کے واقعات اپنی آنکھوں سے وہ واقعات ہونے سے قبل دیکھ لیتے ہو۔۔'' جیلر شمریز خان نے پھر پوچھا۔

''جی ہاں۔۔'' میں نے جواب دیا۔

''ناقابل یقین۔۔'' جیلر شمریز خان نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''تمہیں کب محسوس ہوا تم مستقبل کے واقعات دیکھ سکتے ہو۔۔'' تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد جیلر شمریز خان نے ایک بار پھر مجھ سے پوچھا۔

''بچپن سے میں یہ دیکھتا تھا کہ جب بھی کوئی اہم واقعہ ہونے والا ہوتا تھا تو مجھے پیشگی علم ہو جاتا تھا۔۔'' میں نے جیلر شمریز خان کی میز کو گھورتے ہوئے کہا میں خیالوں میں اپنے ماضی کو کھوج رہا تھا۔

''مجھے یاد ہے میں پرائمری میں پڑھتا تھا ہمارے میتھ کے ماسٹر صاحب بہت سخت آدمی تھے ایک دفعہ انہوں نے چند سوالات یاد کرنے کو دیئے اور کہا کہ وہ اگلے دن ان سوالات کا ٹیسٹ لیں گے اتفاق سے میں اور میرے دوستوں نے ان سوالات کو یاد نہیں کیا رات کو جب سب آپس میں ملے تو یہی بات ہوئی کہ اب کل ٹیسٹ میں کیا ہوگا اگر ٹیسٹ خراب گیا تو مار پڑے گی ابھی ہم لوگ یہ باتیں کر رہے تھے کہ اچانک میری آنکھوں کے سامنے سفید پردہ سا آ گیا اور اس پردے پر ایک منظر چلنے لگا اس منظر میں ہمارے میتھ کے ماسٹر صاحب کا جنازہ مجھے نظر آیا یہ دیکھ کر میں نے دوستوں سے کہا کہ ماسٹر صاحب تو آج رات مر جائیں گے لہٰذا کل ٹیسٹ نہیں ہوگا اور واقعی اگلے دن جب ہم لوگ اسکول پہنچے تو معلوم ہوا کہ رات کو ماسٹر صاحب کو دل کا دورہ پڑا تھا جو جان لیوا ثابت ہوا۔اس طرح کے کئی واقعات میرے ساتھ پیش آئے مگر کسی نے ان پر زیادہ توجہ نہ دی ویسے بھی ہمارے معاشرے میں بچوں کی باتوں پر کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی۔'' اتنا کہہ کر میں خاموش ہو گیا جیلر شمریز خان اور ماہم خاموشی سے بیٹھے میری داستان سن رہے تھے تھوڑا توقف کرنے کے بعد میں پھر گویا ہوا۔

''میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں میرے پپا مجھ سے بہت پیار کرتے تھے وہ بہت بڑے بزنس میں تھے اس لئے بہت مصروف رہتے تھے مما اور پپا کی اکثر اس بات پر جھڑپ ہوتی تھی کہ پپا شادی کی تاریخ تک بھول جاتے تھے ایک دن جب مما پپا کی شادی کی سالگرہ تھی اور پپا آفس سے دیر تک گھر نہیں آئے تھے اور مما اپنے غصے کا اظہار مختلف طریقوں سے کر رہی تھیں تو اسی وقت میں نے اپنے ذہن کے پردے پر دیکھا کہ پپا مما کو ہیروں کا سیٹ گفٹ کر رہے ہیں انہیں سالگرہ کی مبارکباد دے رہے ہیں۔میں نے مما کا خراب موڈ صحیح کرنے کی لئے انہیں بتایا۔

''مما پپا آج آپ کو ہیروں کا سیٹ گفٹ کریں گے۔۔''

''تمہارے پپا اور مجھے ہیروں کا سیٹ گفٹ کریں۔۔۔۔انہیں آج کی تاریخ یاد رہ جائے تو بڑی بات ہے۔۔'' مما جل کر بولی۔

''مما میں نے خود دیکھا ہے کہ پپا آپ کو ہیروں کا سیٹ گفٹ کر رہے ہیں'' میں نے دوبارہ مما سے کہا۔

''تم آج دوپہر میں زیادہ سو گئے ہو اس لئے بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو چپ چاپ کھانا کھاؤ۔۔'' مما نے مجھے جواب دیا تو میں نے ان سے زیادہ بحث

کرنا مناسب نہیں سمجھا اور خاموشی کے کھانا کھانے لگا۔

لیکن رات کو جب پپا گھر آئے تو انہوں نے مما کو وش کرتے ہوئے انہیں ہیروں کا سیٹ پیش کیا۔

''آپ کو آج کی تاریخ یاد تھی۔۔''

''اس تاریخ کو میں کیسے بھول سکتا ہوں۔۔۔جب تم میری زندگی میں بہار بن کر آئی تھی۔۔۔''پپا رومانٹک لہجے میں بولے۔

مما خوش ہو گئیں اور اس خوشی میں یہ بات بھی بھول گئی کہ میں پہلے ہی انہیں یہ اطلاع دے چکا تھا کہ پپا آج انہیں ہیروں کا سیٹ گفٹ کریں گے۔

اس طرح کے کئی واقعات ہوئے مگر مما نے زیادہ توجہ نہ دی البتہ پپا میری بات غور سے سنتے تھے اور میری وجہ سے وہ پریشان بھی رہتے تھے مگر جیسا کہ پہلے میں نے بتایا کہ میرے پپا بہت بڑے بزنس مین تھے اس لئے ان کے پاس وقت بہت کم ہوتا تھا کہ وہ ٹھیک طرح سے میری بات سن سکیں اور اس پر توجہ دے سکیں۔

ایک دن میں نے اپنے ذہن کے پردے پر دیکھا کہ انکل زیدی کی اسکوٹر کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور انکل زیدی کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی انکل زیدی مما کے کزن تھے اور ان کا ہمارے گھر بہت آنا جانا تھا میں نے جب یہ خبر مما کو سنائی تو مما پریشان ہو گئیں اور انہوں نے انکل زیدی کو فون کیا کہ وہ محتاط رہیں مگر انکل زیدی نے میری بات کا مذاق اڑایا مگر شام کو خبر آئی کہ واقعی انکل زیدی کی اسکوٹر سلپ ہو کر ایک کار سے جا ٹکرائی اور اس ایکسیڈنٹ میں انکل زیدی کی ٹانگ میں فریکچر ہو گیا۔

اس دن پہلی بار مما نے میرے گال پر زور کا طمانچہ رسید کیا اور مجھے کالی زبان کا کہا بس اس دن سے مما کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ میں کالی زبان کا ہو ں جو کہتا ہوں وہ پورا ہو جاتا ہے اس واقعے کے بعد مما مجھ سے بات کرنے سے بھی ڈرنے لگیں اور اکثر دوسروں کے سامنے کہتیں کہ میری باتوں میں نحوست ہے میں کالی زبان کا مالک ہوں جو کہتا ہوں وہ پورا ہو جاتا ہے۔۔''اتنا کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔

''ویری انٹرسٹنگ۔۔۔کیا تم بتا سکتے ہو کہ ابھی تھوڑی دیر بعد کیا ہونے والا ہے۔۔۔'' ماہم نے میرے خاموش ہونے پر مجھ سے پوچھا۔

''نہیں۔۔''میں نے انکار میں سر ہلایا۔۔''میں اس طرح کی کوئی پیشن گوئی نہیں کر سکتا بس کبھی کبھی میری آنکھوں کے سامنے ایک سفید پردہ آ جاتا ہے اور اس پردے پر فلم کی اسکرین کی طرح منظر چلنے لگتا ہے جیسے آپ کو دیکھ کر میری آنکھوں کے سامنے پردہ چھا گیا تھا اور میں نے اس پردے پر چلنے والے منظر میں ماہم کو دلہن بنے دیکھا۔۔''میں نے جواب دیا تو ماہم جھینپ گئی اور اپنے باپ سے نظریں چرانے لگی۔

''لیکن تم پر قتل کا الزام کیسے آیا۔۔''جیلر شمریز خان نے مجھ سے پوچھا۔

''مجھ پر انکل زیدی کی بیوی آنٹی زینب کے قتل کا الزام لگا۔۔''میں نے جواب دیا پھر تھوڑا توقف کیا پھر گویا ہوا۔

''میں آپ کو ترتیب سے اپنی زندگی کی داستان سناتا ہوں۔۔''اتنا کہہ کر میں خاموش ہو گیا اور اپنے ذہن میں واقعات کو تازہ کرنے لگا۔

''ایک رات میں نے عجیب منظر دیکھا میری آنکھوں کے سامنے سفید پردہ سا آ گیا اور اس پردے پر چلنے والے منظر میں، میں نے دیکھا ماما روتے روتے اپنے ہاتھوں کی چوڑیاں توڑ رہی ہیں۔۔یہ منظر دیکھ کر میں گھبرا گیا اور اپنے کمرے سے بھاگتے ہوئے مما پپا کے کمرے کے سامنے پہنچا اور ان کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا جواب میں پپا نے دروازہ کھولا اور مجھے وہاں دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا۔

''کیا بات ہے اسد بیٹا۔۔تم ابھی تک تیار ہوئے نہیں۔۔۔''پپا نے مجھے دیکھ کر پوچھا۔

''پپا آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔۔''میں نے رازدارانہ انداز میں پپا سے پوچھا۔

''اسد تمہارے دماغ میں پھر کوئی کھچڑی پک رہی ہے۔۔؟''پپا نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"پپا چوڑیاں توڑنے کا کیا مطلب ہوتا ہے۔۔" میں بالآخر پوچھ ہی لیا۔

"چوڑیاں توڑنا کیا مطلب۔۔"

"مطلب اگر کوئی عورت اپنے ہاتھوں کی چوڑیاں توڑ رہی ہو تو اس بات کا کیا مطلب ہوتا ہے۔۔"

"بیٹے ویسے تو کوئی مطلب نہیں ہوتا۔۔مگر ہمارے معاشرے میں جس عورت کا شوہر مر جائے وہ عورت اپنے ہاتھوں کی چوڑیاں توڑتی ہے۔۔مگر تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو۔۔" پپا نے پوچھا۔

پپا کی بات سن کر میں فکرمند ہوگیا اور بے ساختہ پپا سے لپٹ گیا کیونکہ مجھے اپنے پپا بہت عزیز تھے پوری دنیا میں صرف وہ ہی میری باتوں کو سمجھتے تھے۔

"اسد سچ سچ بتاؤ تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟" پپا نے مجھے خود سے الگ کرتے ہوئے پوچھا تو میں نے انہیں سچ سچ بتا دیا میری بات سن کر پپا فکرمند ہوگئے اور تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولے۔

"اسد بیٹا یہ بات اپنی مما کو مت بتانا۔۔ورنہ تمہاری خیر نہیں۔۔یہ بات سن کر تمہاری مما تمہاری اچھی خاصی پٹائی کرسکتی ہیں۔" پپا کی بات سن کر میں نے اقرار میں سر ہلا دیا پھر پپا نے مجھے پیار کیا اور میں اپنے کمرے میں آگیا۔

میں نے مما کو کچھ نہیں بتایا مگر پپا کے منہ سے کسی دن باتوں باتوں میں یہ بات نکل گئی پپا کے منہ سے یہ بات سن کر مما کا بلڈ پریشر ہائی ہوگیا اور وہ مجھے کوسنے دینے لگیں اور برا بھلا کہنے لگیں انکل زیدی کو جب اس بات کا علم ہوا کہ میں نے اس طرح کی پیشن گوئی کی ہے تو انھوں نے مجھے نفسیاتی مریض قرار دے دیا اور کسی اچھے ماہر نفسیات کو مجھے دکھانے کا کہا انکل زیدی کا مشورہ مما کو پسند آیا اور مما مجھے ایک مشہور ماہر نفسیات کے پاس لیکر گئیں ماہر نفسیات نے مجھ سے مختلف قسم کے سوالات کیئے اور مما کو بھی کچھ مشورے دیئے۔ ماہر نفسیات ہی کے کہنے پر مما میری پیشن گوئیوں کو ایک ڈائری میں لکھنے لگیں۔

پھر ایک صبح جب میں بیدار ہو چکا تھا مگر بستر پر ہی لیٹا ہوا تھا کہ میری آنکھوں کے سامنے ایک منظر آیا جس میں پپا کار چلاتے ہوئے نظر آئے پھر ان کی کار کی زوردار ٹکر ایک ٹرک سے ہوگئی اور پپا بے جان ہوکر کار سے باہر آگرے۔یہ منظر دیکھ کر میں بری طرح گھبرا گیا اور جلدی سے بستر سے اٹھا اور پپا کے کمرے کی جانب بھاگا۔

"مما۔۔پپا کہاں ہیں۔؟" میں نے کمرے میں پپا کو نہ پا کر بے قراری سے مما سے پوچھا۔

"بیٹا۔۔آج تمہارے پپا کو بہت ضروری کام تھا لہٰذا وہ صبح صبح ہی دفتر چلے گئے۔۔" مما نے مجھے بتایا۔

"مما۔۔پپا کو فون کریں۔۔۔" میری بے چینی عروج پر تھی۔

"کیوں۔۔۔"؟ مما نے حیرانگی سے پوچھا تو میں نے انہیں ساری بات بتا دی میری بات سن کر مما بھی گھبرا گئیں اور انہوں نے جلدی سے دفتر کا نمبر ملایا اور بات کرنے لگیں بات ختم کر کے مما نے ریسیور رکھا اور میری جانب متوجہ ہوئیں اور کہنے لگیں۔"اسد ایسی باتیں نہ کیا کرو مجھے ڈر لگتا ہے۔۔تمہارے پپا خیریت سے دفتر پہنچ گئے ہیں۔"

"مما۔۔میں خود سے کوئی بات نہیں کہتا۔۔جو مجھے دکھتا ہے وہ میں کہتا ہوں۔۔" میں نے بھولپن سے جواب دیا تو مما مجھے لپٹا کر رونے لگیں میں حیران ہو رہا تھا کہ مما رو کیوں رہی ہیں۔

اسی شام جب میں اور مما بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی مما نے اٹھ کر فون کا ریسیور اٹھایا اور دوسری جانب کی بات سننے لگیں نہ جانے فون کے دوسری جانب کون تھا اور اس نے کیا بات کہی کہ ریسیور مما کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور مما زور زور سے رونے لگیں ان کی رونے کی آواز سن کر انکل زیدی اور زینب آنٹی جو ہمارے گھر آئے ہوئے تھے دوڑتے ہوئے آگئے۔

"کیا ہوا۔۔کیا ہوا؟" انکل زیدی نے پوچھا۔

"یہ کالی زبان کا منحوس لڑکا اپنے باپ کو کھا گیا۔۔" مما روتے روتے چیخیں۔

"کیا؟"

انکل زیدی نے گرا ہوا ریسور کان سے لگایا اور بات کرنے لگے بات ختم کرکے انکل زیدی نے ریسیور رکھا تو آنٹی زینب نے ان کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"رحمان بھائی کی کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور وہ موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے ہیں۔" انکل زیدی دھیمی آواز میں بولے۔

"اس نے قتل کیا انہیں۔۔۔ اس نے۔۔ یہ کالی زبان کا منحوس لڑکا ہے۔۔ لے جاؤ اسے میرے سامنے سے۔۔۔" مما مجھے دیکھ کر پھر چیخنے لگیں تو انکل زیدی نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے کمرے سے باہر لے گئے پھر انھوں نے مجھے اپنے کمرے میں جانے کا کہا اور کہا کہ میں اپنے کمرے ہی میں رہوں جب تک مما کی حالت سنبھل نہیں جاتی لہذا میں اپنے کمرے میں آ گیا مجھے بہت زور کا رونا آ رہا تھا لہذا میں اپنے کمرے میں بیٹھا آنسو بہاتا رہا۔

شام تک پپا کی لاش گھر آ گئی سارے خاندان والے جمع ہو گئے سب مجھے ایسی نظروں سے گھور رہے تھے جیسے میں اپنے پپا کا قاتل ہوں مجھے دیکھتے ہی مما کو دورہ سا پڑ جاتا اور وہ چیخنے لگتی تھیں "ہٹاؤ اس منحوس کو لے جاؤ میرے سامنے سے اس کالی زبان والے کو اس نے اپنے پپا کو قتل کیا ہے اس منحوس پر بدروح کا سایہ ہے۔۔ جو یہ کہتا ہے وہ سچ ہو جاتا ہے۔"

ایسے کٹھن وقت میں جب سب لوگ مما کی دل جوئی کر رہے تھے کسی کو میری فکر نہیں تھی میری تو دنیا اجڑ گئی تھی میرے پیار کرنے والے پپا مجھ سے بچھڑ گئے تھے میں رونا چاہتا تھا میں مما کی گود میں سر رکھ کر اپنے پیار کرنے والے پپا کا غم مٹانا چاہتا تھا مگر مما مجھے دیکھتے ہی نفرت سے چیخنے لگتیں تھیں ایسے کٹھن وقت میں آنٹی زینب نے میرے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھا اور میں نے ان کی گود میں سر رکھ کر آنسو بہانے لگا۔

"اوہ گاڈ۔۔ تمہارے ساتھ بہت ظلم ہوا؟" ماہم خان نے اپنے دونوں گالوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"تمہاری آپ بیتی بہت دلچسپ ہے۔۔ آگے کیا ہوا؟" جیلر شیر یز خان نے پوچھا۔

"میرے بہتے آنسو آنٹی زینب نے پونچھے میں اپنے کمرے تک محدود ہو کر رہ گیا تھا آنٹی زینب مجھے میرے کمرے میں آ کر ناشتہ کرواتیں اور اسکول کے لئے تیار ہونے میں مدد کرتیں اسکول سے واپس آ کر بھی میں اپنے کمرے ہی میں رہتا آنٹی زینب مجھے پڑھائی میں مدد کرتیں اسی طرح میری زندگی گزر رہی تھی۔

ایک دن جب میری سالگرہ تھی اور میں بہت اداس تھا کیوں کہ پپا میری سالگرہ بہت دھوم دھام سے مناتے تھے مگر یہ سالگرہ نہایت خاموشی سے گزر رہی تھی اس دن مہینوں بعد مما میرے کمرے میں آئیں ان کے ساتھ انکل زیدی بھی تھے مما نے کمرے میں داخل ہو کر مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا اور پیار کرنے لگیں میں بھی اپنی ماں کے پیار کا بھوکا تھا لہٰذا میں بھی مما سے لپٹ کر رونے لگا اسی وقت میری آنکھوں کے سامنے سفید پردہ سا آ گیا اور اس پردے پر میں نے دیکھا کہ مما دلہن بنی بیٹھی ہیں ان کے ہاتھوں میں مہندی لگی ہوئی ہے اور ان کی سونی کلائیوں میں ہاتھ بھر بھر کے سرخ چوڑیاں ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر میں خوشی سے تالیاں بجانے لگا مما حیران ہو گئیں اور تالیاں بجانے کا سبب پوچھنے لگیں مگر میں نے انکار کر دیا میں کچھ بھی بتانے کے لئے تیار نہیں تھا مگر مما زور دے کر مجھ سے تالیاں بجانے کا سبب پوچھنے لگیں تو میں نے تالیاں بجاتے ہوئے کہا۔ "مما آپ دلہن بنیں گی آپ سرخ جوڑا پہنیں گی اور آپ کی کلائیوں میں سرخ چوڑیاں ہونگی۔۔"

"کیا؟" مما چیخ اٹھیں۔ "کیا بکواس کر رہے ہو۔۔" ایسا کہتے ہوئے مما نے چور نظروں سے انکل زیدی کو دیکھا۔

"بیٹا۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ تمہاری مما دلہن

بنیں گی۔۔۔تمہاری مما ایک دفعہ تمہارے پپا کی دلہن بن چکی ہیں۔'' انکل زیدی نے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

''مم۔۔ مجھے نہیں پتا۔۔۔مگر ابھی ابھی میری آنکھوں کے سامنے ایک منظر آیا تھا جس میں مما دلہن بنی ہوئی تھی ان کے ساتھ ان کا دولھا بھی تھا مگر میں نے دولھے کا چہرہ نہیں دیکھا۔۔۔بعد میں اگر کوئی منظر مجھے نظر آیا تو میں دولھے کا چہرہ بھی دیکھ لونگا۔'' میں نے بوکھلا کر جواب دیا۔

میری بات سن کر مما اچھل پڑیں اور انہوں نے ایک زوردار تھپڑ میرے گال پر مارا اور بولیں۔ ''تیری زبان کھینچ لونگی کم بخت۔۔۔ اِدھر ہم کچھ سوچتے ہیں اور ادھر اسے معلوم ہو جاتا ہے۔۔اس پر بدروح کا سایہ ہے اسے پاگل خانے میں داخل کردو۔'' مما ہسٹریائی انداز میں چیخنے لگی تو انکل زیدی مما کو لیکر میرے کمرے سے چلے گئے۔

میری زندگی پہلے کی طرح گزرنے لگی میں اپنے کمرے تک محدود ہو کر رہ گیا آنٹی زینب کا آسرا تھا ورنہ میں گھر سے بھاگ جاتا ایسے ہی ایک دن میں نے اپنا خیال آنٹی زینب کو بتایا تو وہ مجھے گلے سے لگا کر رو پڑیں ان کے آنسوؤں نے میری شرٹ بھگو دی روتے روتے وہ کہنے لگیں۔

''اسد...... اب تم بچے نہیں رہے ہو۔ مگر ابھی اتنے بڑے بھی نہیں ہوئے کہ اس گھر میں ہونے والے گھناؤنے کھیل کو سمجھ سکو تمہاری امی اور تمہارے انکل زیدی یہاں جو کھیل کھیل رہے ہے وہ میں کس طرح برداشت کررہی ہوں یہ میرا دل ہی جانتا ہے تمہارے انکل کئی بار مجھے طلاق دینے کی دھمکی دے چکے ہیں۔بس میں اسی آسرے پر زندگی کے یہ کٹھن دن کاٹ رہی ہوں کہ کب تم بالغ ہوتے ہو اور اپنے باپ کی جائیداد سنبھالتے ہو۔ بس میرا انتظار اسی دن تک کا ہے جب ساری جائیداد اور کاروبار تمہارے ہاتھ میں آجائے۔''

آنٹی زینب یہ باتیں کر رہی تھیں کہ میری آنکھوں کے سامنے پھر پردہ سا چھا گیا اور اس پر ایک منظر چلنے لگا میں نے دیکھا کہ میں ایک کمرے میں بیٹھا ہوں میرے اردگرد خون پڑا ہوا ہے اور میرے ہاتھ میں ایک چھری ہے مجھ سے کچھ فاصلے پر ایک لاش اوندھے منہ پڑی ہوئی ہے اور میرے ہاتھ پیروں اور کپڑوں پر خون لگا ہوا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر میں ڈر گیا اور بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔

''کیا ہوا بیٹا۔'' آنٹی زینب مجھے اس طرح پریشان دیکھ کر پوچھنے لگیں تو میں نے انہیں سارا منظر من وعن بتا دیا انھوں نے مجھے تسلی دی مگر حقیقتاً وہ بھی میری بات سن کر پریشان ہو گئی تھیں اسی وقت مجھے دروازے پر کھٹکا محسوس ہوا میں نے جلدی سے دروازہ کھولا مگر وہاں کوئی نہیں تھا شائد کوئی میری اور آنٹی زینب کی باتیں چھپ کر سن رہا تھا۔

ایک رات جب مجھے نیند نہیں آرہی تھی اور میں بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا تو مجھے اپنے کمرے کے باہر کسی کے چلنے کی آواز آئی میں سمجھا مما مجھے دیکھنے آرہی ہے لہٰذا میں سوتا بن گیا پھر میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور قدموں کی چاپ میرے قریب آئی میں آنکھیں کھولنا ہی چاہتا تھا کہ کسی نے میرے منہ پر چادر ڈال دی اور سختی سے میرا منہ دبا دیا میں ہڑبڑا کر اٹھنا چاہتا تھا مگر اسی وقت مجھے اپنے بازو میں سوئی چبھنے کا احساس ہوا جیسے کسی نے مجھے انجیکشن لگایا ہو پھر میرے ذہن پر اندھیرا سا چھا گیا اور میں بے ہوش ہو گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں کسی کمرے کے فرش پر پڑا تھا کمرے میں مکمل اندھیرا تھا میں نے بوکھلا کر اِدھر اُدھر ہاتھ مارے تو میرا ہاتھ کسی چیز سے ٹکرایا میں نے اس چیز کو اٹھا لیا وہ ایک چاقو تھا اسی وقت کسی نے کمرے کی لائٹ جلائی اور کمرے میں اجالا ہو گیا اجالے میں، میں نے کمرے کی حالت دیکھی تو میں گھبرا گیا کمرے میں چاروں طرف خون پھیلا ہوا تھا اور مجھ سے کچھ فاصلے پر ایک لاش اوندھے منہ پڑی تھی میرے

تمام کپڑے اور ہاتھ پیروں میں خون لگا ہوا تھا۔ کمرے کی لائٹ جلانے والے انکل زیدی تھے انہوں نے لائٹ جلاتے ہی ایک زوردار چیخ ماری۔۔

''ہائے ظالم۔۔ مار دیا میری پیاری بیوی کو مار دیا ہائے زینب۔۔۔'' انکل زیدی کی آواز سن کر مما اور گھر کے تمام نوکر دوڑتے ہوئے کمرے میں آگئے۔

''دیکھو۔۔ اس نے میری پیاری بیوی کو مار دیا۔۔ ہائے ظالم تو نے یہ کیا کیا۔۔'' انکل زیدی کا واویلا جاری تھا۔

''نہیں ۔۔۔ نہیں میں نے نہیں مارا کسی کو۔۔۔'' میں نے بوکھلا کر چاقو اپنے ہاتھ سے پھینک دیا اور کمرے سے بھاگنا چاہا مگر گھر کے نوکروں نے مجھے قابو کرلیا تھوڑی دیر میں پولیس بھی پہنچ گئی اور مجھے آنٹی زینب کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا۔ میں لاکھ چیختا رہا مگر کسی نے میری بات نہ سنی حتی کہ مما بھی میری بات ماننے کے لئے تیار نہ تھیں میں عدالت میں بھی چیختا رہا مگر میری سنوائی نہ ہوئی صرف کم عمری کی وجہ سے مجھے پھانسی نہیں ہوئی ورنہ تمام شواہد میرے خلاف تھے مجھے آنٹی زینب کے قتل کے جرم میں عمر قید کی سزا سنادی گئی۔'' اتنا کہہ کر میں خاموش ہوگیا۔

''ویری سیڈ۔۔'' ماہم افسوس کرتے ہوئے بولی۔۔ ''تمہاری مما تم سے ملنے کبھی جیل آئیں۔؟'' تھوڑا توقف کرکے ماہم نے پوچھا۔

''ایک بار۔۔۔ مجھے سزا ہونے کے بعد ایک بار مما مجھ سے ملنے جیل آئیں تھیں۔'' میں نے جواب دیا پھر تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد میں نے پھر گویا ہوا۔۔ ''جب مما مجھ سے ملنے جیل آئیں تو میں نے انہیں بتایا کہ میں ان کے دولہا کو بھی دیکھ چکا ہوں انہوں نے انکل زیدی سے شادی کرلی ہے۔''

میری بات سن کر مما غصے میں آگئی اور اول فول بکنے لگی بس اس کے بعد مما کبھی مجھ سے ملنے جیل نہیں آئیں البتہ گھر کے نوکر کبھی کبھی مجھ سے ملنے جیل آتے تھے ان کی زبانی مجھے پتا چلا کہ مما نے انکل زیدی سے شادی نہیں کی ہے مگر میں مستقبل کے پردے پر دیکھ چکا ہوں کہ مما نے انکل زیدی سے شادی کرلی ہے۔۔'' اتنا کہہ کر میں خاموش ہوگیا۔

''انہوں نے شادی کرلی ہوگی مگر کسی خاص وجہ سے شادی کا اعلان نہیں کیا ہوگا۔۔'' جیلر شمریز خان سوچتے ہوئے بولے تو ماہم اثبات میں سر ہلانے لگی بات میری بھی سمجھ میں آئی۔

''میں نے تمہارے کیس کی فائل پڑھی ہے اس میں کافی پوائنٹ ایسے تھے جن کو اٹھا کر تمہیں رہائی دلوائی جاسکتی تھی مگر شائد تمہارا وکیل تمہیں ڈیفنس کرنے کے بجائے تمہارے خلاف کیس لڑ رہا تھا۔۔'' تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد جیلر شمریز خان سوچتے ہوئے بولے پھر تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہوگئے کمرے میں ایک دم سناٹا چھا گیا ہم تینوں کی سانسوں کی آوازوں کے سوا کمرے میں کوئی اور آواز سنائی نہ دے رہی تھی کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد جیلر شمریز خان نے اپنی بھاری آواز میں کہا۔

''میں وعدہ تو نہیں کرتا مگر میں تمہاری ہر ممکن مدد کرنے کے پوری کوشش کروں گا۔'' اتنا کہہ کر جیلر شمریز خان نے گھنٹی بجا کر سنتری کو بلایا اور مجھے واپس بیرک میں جانے کا کہا تو میں خاموشی سے سنتری کے ساتھ واپس بیرک میں آگیا۔

☆......☆......☆

دو دن بعد ایک بار پھر مجھے بیرک سے نکال کر جیلر شمریز خان کے آفس میں لایا گیا آفس میں جیلر شمریز خان کے علاوہ ایک اور شخص بھی موجود تھا سفید پینٹ اور کالے کوٹ میں بھاری جسم کا مالک وہ شخص وکیل لگ رہا تھا۔

''آؤ اسد الرحمان۔۔'' میں آفس میں داخل ہوا تو جیلر شمریز خان بولے ان کی آواز سن کر دوسرے شخص نے بھی گھوم کر میری جانب دیکھا۔

''ان سے ملو اسد۔۔۔۔ یہ ہمارے ملک کے مشہور بیرسٹر سلمان احمد ہیں۔'' جیلر شمریز خان نے اس

شخص کا تعارف مجھ سے کروایا میں نے آگے بڑھ کر بیرسٹر سمان احمد سے ہاتھ ملایا۔ جیلر شمریز خان نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو میں بیرسٹر سمان احمد کے برابر رکھی دوسری کرسی پر بیٹھ گیا میرے بیٹھتے ہی بیرسٹر سمان احمد بولنے لگے۔

''اسد الرحمان۔۔میں نے تمہارا کیس اسٹڈی کیا ہے اس میں کافی جھول ہے جس کا فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا۔۔'' سمان احمد بول رہے تھے اور میں سن رہا تھا۔

''نہ جانے تمہارے وکیل نے یہ پوائنٹ کیوں نہیں اٹھائے مگر اب میں تمہارا کیس ری اوپن کروانے کی درخواست عدالت میں لگا رہا ہوں تم ان کاغذات پر دستخط کردو۔۔'' اتنا کہہ کر بیرسٹر سمان احمد نے اپنے بیگ میں سے چند کاغذات نکالے اور مجھے دیئے میں ان کاغذات کی ورق گردانی کرنے لگا اسی وقت جیلر شمریز خان کی میز پر رکھا فون بول اٹھا جیلر شمریز خان نے ریسیور اٹھایا اور بات کرنے لگے۔

''سوئیٹی بیٹا۔۔اسد الرحمان کے کیس کے سلسلے میں ہی تمہارے سمان انکل یہاں آئے ہوئے ہیں۔'' جیلر شمریز خان نے فون پر دوسری جانب کی بات سن کر جواب دیا جس سے اندازہ ہوا کہ دوسری جانب ان کی بیٹی ماہم ہے۔

''اچھا۔۔اچھا تم اپنے انکل سے خود بات کرلو۔۔'' جیلر شمریز خان نے اتنا کہہ کے ریسیور بیرسٹر سمان احمد کی جانب بڑھا دیا بیرسٹر سمان احمد نے ریسیور پکڑا اور دوسری جانب کی بات سننے لگے۔

''سوئٹی بیٹا۔۔تم فکر نہ کرو اسد الرحمان بہت جلد رہا ہوجائے گا۔'' اتنا کہہ کر بیرسٹر سمان احمد نے ریسیور رکھ دیا۔

''سوئٹی۔۔اس کیس میں بہت دلچسپی لے رہی ہے۔۔'' ریسیور رکھ کر بیرسٹر سمان احمد نے جیلر شمریز خان سے کہا تو بے ساختہ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

میں نے کاغذات دستخط کرکے بیرسٹر سمان احمد کو واپس کیئے انہوں نے کاغذات اپنے بیگ میں رکھے اور کہنے لگے۔'' میں کل عدالت کھلتے ہی تمہاری درخواست عدالت میں لگا دونگا اور جیسے ہی کیس ری اوپن ہوا میں تمہاری ضمانت کی کوشش کرونگا۔''

''تھینک یو سر۔'' میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔

''اس کیس کے علاوہ تمہیں اس کی مما اور اس کے انکل زیدی کے ریلیشن کی بھی تحقیقات کرنی ہے۔۔'' جیلر شمریز خان بیرسٹر سمان احمد سے بولے۔

''بے فکر رہو۔۔میرا ایک بہت اچھا دوست پولیس انسپکٹر ہے میں نے اسے ان دونوں کے پیچھے لگا دیا ہے وہ ان کا نکاح نامہ پاتال سے بھی ڈھونڈ کر نکال لائے گا۔'' بیرسٹر سمان احمد نے جواب دیا تو جیلر شمریز خان سر ہلانے لگے بیرسٹر سمان احمد جیلر شمریز خان کو جواب دینے کے بعد میری جانب متوجہ ہوئے اور بولے۔

''اسد الرحمان۔میں تمہیں ایک اہم بات بتانا تو بھول ہی گیا۔۔تمہارے پپا نے وصیت کی تھی کہ اگر تمہاری مما دوسری شادی کریں گی تو انہیں ان کی جائیداد میں سے کچھ نہیں ملے گا اور ساری جائیداد کے مالک صرف تم ہوگے۔اسی لئے شائد تمہاری مما اور تمہارے انکل زیدی نے اپنی شادی کو دنیا سے چھپا کر رکھا ہے ورنہ وہ ساری جائیداد سے محروم ہوجائیں گے'' بیرسٹر سمان احمد کی بات سن کر میری سمجھ میں آیا کہ مما اپنی دوسری شادی کا ذکر میرے منہ سے سن کر کیوں بھڑک اٹھی تھیں۔

☆......☆......☆

ایک ہفتے تک میری بیرسٹر سمان احمد اور جیلر شمریز خان سے ملاقات نہ ہوئی ہاں ماہم روز مجھ سے ملنے آتی تھی نہ صرف وہ مجھ سے ملنے آتی تھی بلکہ وہ گھر کا پکا ہوا کھانا بھی ساتھ لاتی تھی وہ گھنٹوں مجھ سے باتیں کرتی ہم دونوں دنیا جہاں کی باتیں کرتے موسم کے حال سے لیکر اپنے ماضی کے قصے ایک دوسرے کو سناتے اور خوب ہنستے۔۔۔میں محسوس کررہا تھا کے ماہم کے دل میں میرے لئے جگہ بن رہی ہے ہم دونوں زبان سے

ایک دوسرے سے اقرار محبت نہیں کی مگر ہماری آنکھوں سے ہمارے دل کا حال صاف جھلکتا تھا۔

ایک ہفتے بعد بیرسٹر سلمان احمد جیل آئے اور مجھ سے ملاقات کی۔

''تمہارا کیس ری اوپن کرنے کی درخواست منظور ہوگئی ہے انشاءاللہ پہلی پیشی پر ہی میری کوشش ہوگی کہ تم ضمانت پر رہا ہو جاؤ۔۔'' بیرسٹر سلمان احمد مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا تو میں نے شکر گزار نظروں سے ان کی جانب دیکھا۔

بیرسٹر سلمان احمد نے اپنے بیگ سے چند کاغذات نکالے اور میری جانب بڑھاتے ہوئے بولے۔''ان کاغذات پر اپنے دستخط کردو''

''کیسے کاغذات ہیں یہ۔؟'' میرے پوچھنے سے پہلے ہی ماہم بول اٹھی۔

''ہم نے اسدالرحمان کی والدہ اور ان کے انکل کے نکاح نامے کی کاپی حاصل کرلی ہے اس لئے اب اسدالرحمان یہ دعوا دائر کر رہا ہے کہ اس کے چچا عبدالرحمان کی جائیداد سے اس کی مما کا کوئی تعلق نہیں رہا لہٰذا جائیداد کی کسٹڈی اسے دی جائے۔۔'' بیرسٹر سلمان احمد نے تفصیل بتائی۔ میں نے کاغذات پر دستخط کرکے انہیں واپس کئے تو بیرسٹر سلمان احمد نے کاغذات اپنے بیگ میں رکھے اور مجھے گڈ لک کہتے ہوئے چلے گئے بیرسٹر سلمان احمد کے جانے کے بعد ماہم نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''اسد۔تم رہا ہو جاؤ گے تو کہاں جاؤ گے۔۔''

''یہ میں نے نہیں سوچا کیونکہ میں اپنے گھر تو جا نہیں سکتا۔۔'' میں نے جواب دیا

''میں پپا سے بات کرتی ہوں تم رہا ہونے کے بعد ہمارے ساتھ ہمارے گھر میں رہنا۔۔'' ماہم نے تجویز دی۔

''میں۔۔۔میں آپ لوگوں پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔۔'' میں نے ممنون لہجے میں جواب دیا۔

''اب۔۔یہ غیروں جیسی باتیں مت کرو۔۔'' ماہم برا مانتے ہوئے بولی۔

''ارے۔۔ناراض مت ہو میں تو مذاق کر رہا تھا۔۔'' میں نے لہجہ خوشگوار بناتے ہوئے کہا تو ماہم بے ساختہ ہنس پڑی۔

ایک ہفتے بعد پہلی پیشی پر ہی مجھے شخصی ضمانت پر رہائی مل گئی میری ضمانت جیلر شمریز خان نے دی میں جیل سے رہا ہوا تو جیلر شمریز خان مجھے اپنے گھر لے آئے مجھے ماہم کے برابر والا کمرہ دیا گیا جیلر شمریز خان نے مجھ سے کہا کہ میں انہیں جیلر شمریز خان نہیں بلکہ انکل شمریز کہوں۔۔شائد اسی کو کہتے ہے اللہ جب بھی دیتا ہے چھپر پھاڑ کر دیتا ہے اللہ نے مجھے گھر جیسا ماحول دیا انکل شمریز جیسے شفیق بزرگ دیئے اور سب سے بڑھ کر ماہم کا پیار دیا۔

میرے گھر منتقل ہونے کے بعد ماہم میرا پورا پورا خیال رکھنے لگی وہ خانساماں سے کہہ کر میری پسند کے کھانے بنواتی مجھے میری پسند کے کپڑے بنوا کر دیئے میرے کمرے کی سیٹنگ میں میری پسند کا پورا پورا خیال کیا غرض یہ کہ اب میری زندگی نہایت آرام واطمینان سے گزر رہی تھی۔

ایک شام جب میں، ماہم، بیرسٹر سلمان احمد اور انکل شمریز لاونج میں بیٹھے چائے پی رہے تھے اور ساتھ ہی میرے کیس پر ڈسکس ہو رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی ماہم نے اٹھ کر ریسیور اٹھایا اور ہیلو کہہ کر دوسری طرف کی بات سننے لگی پھر ریسیور میز پر رکھتے ہوئے وہ میری جانب گھومی اور بولی ''اسد تمہاری مما کا فون ہے۔۔''

ماہم کی بات سن کر میں نے سوالیہ نظروں سے بیرسٹر سلمان احمد اور انکل شمریز کی جانب دیکھا تو انہوں نے مجھے آنکھ کے اشارے سے فون پر بات کرنے کا کہا میں اپنی جگہ سے اٹھا اور میں نے ریسیور کان سے لگایا۔

''ہیلو کون بات کر رہا ہے۔۔؟'' میں نے پوچھا۔

''بیٹا میں تمہاری مما بات کر رہی ہو۔۔'' دوسری جانب سے مما کے پیار بھرا آواز سنائی دی ان کی آواز سن

کر مجھے بے اختیار رونا آنے لگا مگر میں نے انتہائی ضبط سے کام لیا۔

''میں کیسے مان لوں کہ آپ میری مما بات کر رہی ہیں؟'' میں نے اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے جواب دیا۔

'' بیٹا میری آواز پہچانو میں تمہاری ماں ہوں۔۔'' دوسری طرف سے مما کی آواز ابھری ان کی آواز میں بےقراری تھی۔

''جو ماں اپنے بیٹے سے ملنے جیل نہ آ سکے اسے رہا ہوتے ہی بیٹے کیسے یاد آ گئی؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''بیٹا میں تم سے ملنا چاہتی تھی مگر۔۔مگر تمہاری زبان سے ڈر لگتا تھا بس اس لئے میں تم سے ملنے نہ آسکی۔''

''میری زبان تو اب بھی وہ ہی ہے مگر آپ ۔۔آپ انکل زیدی سے شادی کر کے پھنس چکی ہیں پپا کی وصیت کے مطابق اب ان کی جائیداد پر آپ کا کوئی حق نہیں۔۔اس لئے اب آپ کو بیٹے کی یاد آرہی ہے۔۔''

'' بیٹا مجھے دولت یا جائیداد نہیں چاہیئے ۔۔تم۔۔تم میرے جگر کے ٹکڑے ہو۔۔تم رہا ہو کر اپنے گھر نہیں آئے دوسروں کے گھر چلے گئے۔''

''ٹھیک ہے میں اپنے گھر آجاتا ہوں۔۔مگر یہ بتائیے انکل زیدی کس حیثیت سے اس گھر میں رہ رہے ہیں۔۔آپ انہیں نکالئے گھر سے تو میں گھر آجاؤں گا۔۔'' میں نے مما کو جواب دیا۔

''بیٹا اب وہ آپ کے پاپا ہیں میں نے ان سے شادی کی ہے کوئی گناہ تو نہیں کیا۔۔''

''آپ کو شادی کرنے کا پورا حق ہے مگر پلیز آپ انہیں میرے پپا کی جگہ نہ کھڑا کیجئے وہ۔۔وہ میرے پپا کے قاتل ہیں۔'' میں نے چیخ کر جواب دیا۔

''بیٹا یہ جھوٹ ہے میں نے تمہارے پپا کو قتل نہیں کیا۔۔'' دوسری جانب سے انکل زیدی کی آواز ابھری شائد مما اسپیکر کھول کر بات کر رہی تھیں۔

''انکل میں مستقبل کے پردے پر دیکھ چکا ہوں آپ نے پپا کی کار کے بریک میں گڑ بڑ کی تھی۔۔'' میں نے کہا۔

''نہیں بیٹا یہ غلط ہے۔۔'' انکل زیدی کی آواز ریسیور سے ابھری۔

'' انکل میں آپ سے بحث نہیں کرنا چاہتا ۔۔ویسے بھی میں مستقبل کے پردے پر دیکھ چکا ہوں کہ آپ کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔۔''

میں نے ڈرامائی لہجے میں کہا۔

'' کک۔۔کیا دیکھا تم نے۔۔'' مجھے مما کی ہکلاتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''تیز بارش ہو رہی ہے ایک کار جسے انکل زیدی ڈرائیو کر رہے ہیں اور آپ ان کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ہیں اس کار کے بریک میں کچھ خرابی ہو گئی ہے اور وہ کار گیلی سڑک پر سلپ ہوتے ہوئے ایک ٹرک سے ٹکرا گئی ہے انکل زیدی نے موقع پر ہی دم توڑ دیا اور۔۔اور۔۔آپ۔۔آپ شدید زخمی حالت میں چیخ رہی ہیں۔مگر کوئی آپ کی آواز نہیں سن رہا۔'' اتنا کہہ کر میں نے ریسیور رکھ دیا اور پلٹ کر انکل شمریز اور بیرسٹر سلمان احمد کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

''تم نے ہمیں بتایا نہیں کہ تم نے پھر کوئی خواب دیکھا ہے جس میں اپنے انکل اور مما کی موت دیکھی ہے۔'' انکل شمریز نے مجھ سے گلہ کیا۔

''میں نے کچھ نہیں دیکھا۔'' میں نے انکل شمریز کو جواب دیا۔

'' پھر تم نے اپنی مما کو کیوں کہا کہ تم نے ان کی موت کا منظر دیکھا ہے۔۔'' انکل شمریز نے حیرت سے مجھ سے پوچھا۔

''مما اور انکل زیدی کو میری پیشن گوئیوں کا بڑا تجربہ ہے وہ جانتے ہیں کہ میں جو کچھ دیکھتا ہوں وہ سچ ہو جاتا ہے لہذا اب ان کی جان سولی پر لٹکی رہے گی۔۔'' میں نے جواب دیا۔

''گڈ۔ اچھی چال ہے۔۔'' بیرسٹر سلمان احمد نے مجھے داد دی۔

''ویسے تمہیں مستقبل کا خواب کب نظر آتا ہے دو ہفتے چار ہفتے بعد یا مہینے دو مہینے بعد کب نظر آتا ہے؟'' تھوڑے توقف کے بعد بیرسٹر سلمان احمد نے مجھ سے پوچھا۔

''اس کا کوئی خاص وقت مقرر نہیں ہے کبھی دن میں دو دو بار نظر آجاتا ہے اور کبھی مہینوں کچھ بھی نہیں ہوتا۔۔'' میں نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے جواب دیا تو بیرسٹر سلمان احمد اپنا سر ہلانے لگے۔

☆......☆......☆

میں اب انکل شمریز کے گھر میں گھر کے ایک فرد کی طرح رہ رہا تھا اکثر میں ماہم کو پڑھائی میں مدد کرتا میں اور ماہم گھنٹوں باتیں کرتے ماہم اپنے اسکول اور کالج کے قصے سناتی اور میں اسے جیل کے قصے سناتا ۔جیل میں ہونے والی پہلی گفتگو کے متعلق ہمارے درمیان دوبارہ کبھی کوئی بات نہیں ہوئی مگر میں مطمئن تھا کیونکہ آج تک میں نے مستقبل کے بارے میں جو کچھ دیکھا تھا وہ سچ ہوا تھا لہذا مجھے یقین تھا کہ ماہم ہی میری جیون ساتھی بنے گی۔

ایک ہفتے بعد ایک شام جب موسم خوشگوار تھا ہلکی بارش ہو رہی تھی میں، انکل شمریز اور ماہم لان میں بیٹھے موسم انجوائے کر رہے تھے کہ بیرسٹر سلمان احمد وہاں آئے اور سلام دعا کے بعد بولے۔

''اسد تمہارے لئے ایک اچھی خبر ہے اور ایک بری خبر ہے پہلے کون سی خبر سننا چاہو گے۔۔؟''

''پہلے اچھی خبر۔۔'' میرے بولنے سے پہلے ہی ماہم بول اٹھی۔

''اچھی خبر یہ ہے کہ اسد کے پپا کی جائیداد اسد کو مل گئی ہے اب اسد جب چاہے اپنے پپا کی فیکٹری اور جائیداد کا انتظام سنبھال سکتا ہے۔۔'' بیرسٹر سلمان احمد بولے۔

''اور بری خبر؟'' میں نے آہستگی سے پوچھا میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا نہ جانے بری خبر کیا ہو۔

''تمہارے انکل زیدی نے ذہنی خلفشار سے تنگ آکر خودکشی کر لی ہے۔۔'' بیرسٹر سلمان احمد بولے۔

''اوہ۔۔'' میرے منہ سے نکلا۔

''اور تمہاری مما کو فراڈ کے کیس میں پولیس نے گرفتار کر لیا ہے اور وہ اس وقت حوالات میں ہیں۔'' بیرسٹر سلمان احمد نے دھیرے سے کہا۔

''فراڈ کیس۔۔۔'' میں نے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔

''اپنی شادی چھپا کر تمہارے والد کی جائیداد پر عیش کرنے کے فراڈ میں پولیس نے انہیں گرفتار کر لیا ہے۔۔'' بیرسٹر سلمان احمد نے تفصیل بتائی۔

''انکل زیدی نے خودکشی کیوں کی۔۔؟''

''جب تم نے انہیں ان کی موت کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ ایک ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہو جائیں گے اس وقت سے ان کی ذہنی حالت خراب ہونے لگی تھی ۔انہوں نے ڈر کے مارے گھر سے نکلنا بھی بند کر دیا تھا گھر میں بھی وہ ہر چیز سے ڈرنے لگے تھے وہ کسی شخص سے نہیں ملتے تھے گاڑیوں سے انہیں خوف آنے لگا تھا ان کی حالت دن بدن خراب ہوتی چلی گئی انہیں پاگل پن کے دورے پڑنے لگے تھے اور اسی پاگل پن میں انہوں نے خودکشی کر لی۔'' بیرسٹر سلمان احمد نے ایک بار پھر تفصیل سے ساری بات بتائی۔

''انکل۔۔ میں مما سے ملنا چاہتا ہوں۔۔'' میں نے انکل شمریز کو مخاطب کیا۔

''ہاں......ہاں ضرور...... اسد کی والدہ کون سے تھانے میں بند ہے'' انکل شمریز نے پہلے مجھے جواب دیا اور پھر بیرسٹر سلمان احمد سے پوچھا۔

''سٹی تھانے کی حوالات میں ہیں۔'' بیرسٹر سلمان احمد نے بتایا۔

''اوکے۔۔سٹی تھانے کا انچارج میرا دوست ہے۔۔ میں اسے فون کر دیتا ہوں تم اپنی والدہ سے مل آؤ۔۔'' انکل شمریز نے فون کی جانب بڑھتے ہوئے

مجھے جواب دیا تو میں بھی اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

''پپا۔۔ اسد کے ساتھ میں بھی جاؤں۔۔''

مجھے اپنے پیچھے ماہم کی آواز آئی۔

''ٹھیک ہے تم اسد کے ساتھ چلی جاؤ۔۔''

انکل شمریز نے اجازت دی تو ماہم لپک کر میرے پیچھے آئی۔

''اسد۔۔ میں بھی تمہارے ساتھ چل رہی ہوں۔۔'' ماہم میرے پاس آتے ہوئے بولی تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

تھوڑی دیر بعد میں اور ماہم کار میں بیٹھے سٹی تھانے کی جانب سفر کر رہے تھے تھانے کے سامنے پہنچ کر میں نے کار سڑک کنارے روکی اور دروازہ کھول کر نیچے اترا میرے ساتھ ہی ماہم نے بھی اپنی سائیڈ کا دروازہ کھولا اور کار سے اتری پھر ہم دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے سٹی تھانے میں داخل ہوئے اور انچارج کے کمرے میں پہنچے انکل شمریز کا فون انچارج کو آچکا تھا لہذا انچارج نے نہایت عزت سے ہمیں کرسیاں پیش کیں جب ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے تو انچارج بولا۔۔''

آپ لوگ کیا لیں گے ٹھنڈا یا گرم۔۔''

''جی نہیں شکریہ۔۔ ہمیں صرف ملاقات کرنی ہے۔۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں ملزمہ کو یہیں بلواتا ہوں۔۔'' انچارج نے اتنا کہہ کر گھنٹی بجائی تو ایک سپاہی کمرے میں آیا اس سے پہلے کہ انچارج سپاہی سے کوحکم دیتا میں بیچ میں بول اٹھا۔

''میں اکیلے میں ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔۔''

میری بات سن کر انچارج صاحب سوچ میں پڑ گئے پھر تھوڑا توقف کیا اور بولے۔۔ ''ٹھیک ہے آپ حوالات ہی میں ملزمہ سے مل لیجئے۔'' اتنا کہہ کر انچارج سپاہی کی جانب متوجہ ہوا اور اس سے کہنے لگا۔ ''فراڈ کی جونئی ملزمہ آئی ہے اس سے ملاقات کروادو۔''

میں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے ماہم کی جانب دیکھا تو ماہم نے مسکراتے ہوئے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر مجھے تسلی دی اور ساتھ ہی زیرِ لب بیسٹ آف لک بھی کہا۔ میں زخمی مسکراہٹ کے ساتھ سپاہی کے ساتھ مما سے ملنے حوالات کی جانب چل دیا۔ حوالات کے سامنے پہنچ کر سپاہی نے ایک بیرک کی جانب اشارہ کیا اور مجھے اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔ میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے مما کی بیرک کی جانب بڑھا بیرک کے سامنے پہنچ کر میں نے اندر دیکھا بیرک کے لوہے کے مضبوط دروازے کے اندر مما فرش پر بیٹھی تھیں مما کی آنکھیں بند تھیں ان کے بال بکھرے ہوئے تھے ان کے چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں ان کا لباس میلا اور گرد آلود ہو رہا تھا یہ سب دیکھ کر میرا دل دکھ سے بھر گیا میں نے مما کو ہمیشہ نک سک سے تیار دیکھا تھا وہ اپنی بہت کیئر کرتی تھی اور اپنے اوپر بہت توجہ دیتی تھیں اور......

اور آج اس حالت میں انہیں دیکھ کر میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے وہ جیسی بھی تھی۔

بہر حال میری ماں تھیں میں نے اپنے آنسو پونچھے اور انہیں پکارا میری آواز سن کر مما نے آنکھیں کھولیں وہ چند لمحے غائب دماغی کی حالت میں مجھے گھورتی رہیں پھر ان کی آنکھوں میں پہچان کی چمک ابھری وہ آہستہ سے اپنی جگہ سے اٹھیں اور سلاخوں کے پاس آئیں مما میرے سامنے کھڑی تھیں مگر ہم دونوں کے درمیان مضبوط سلاخوں کا دروازہ تھا۔

'' کیا دیکھنے آئے ہو۔۔'' مما کے ہونٹ ہلے۔۔'' کیا یہ دیکھنے آئے ہو کہ دوسری بار بیوہ ہو کر میں کیسی لگ رہی ہو۔۔؟'' مما کا لہجہ زہر میں ڈوبا ہوا تھا۔

'' آپ کو آپ کے اعمال کی سزا ملی ہے۔۔ جو بویا جاتا ہے وہ کاٹنا پڑتا ہے۔۔''

''کیا غلط کیا تھا میں نے۔۔'' مما چیخ اٹھیں۔

''شرع کے مطابق نکاح ہی تو کیا تھا۔۔''

'' نکاح کرنے میں کوئی برائی نہیں ہے۔۔ مگر نکاح کو چھپانا اور اس شخص سے نکاح کرنا جو قاتل ہو یقیناً غلط بات ہے۔'' میں نے تحمل کے ساتھ جواب دیا۔

''وہ قاتل نہیں ہے۔۔تو نے اپنے باپ کو قتل کیا ہے تو منحوس ہے۔۔کالی زبان کا ہے جو کہتا ہے وہ پورا ہو جاتا ہے۔۔'' مما مسلسل چیخ رہی تھیں۔

''میں صرف مستقبل میں ہونے والے واقعات دیکھتا ہوں۔۔جو سچ ہوتا ہے وہ مجھے دکھتا ہے۔۔'' میں نے جواب دیا۔

''تو۔تو نے تو پیشن گوئی کی تھی وہ اور میں کار ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہو جائیں گے مگر......مگر میں زندہ ہوں اور وہ بھی کار ایکسیڈنٹ میں نہیں مرے۔تیری یہ پیشن گوئی کیسے غلط ہو گئی۔'' مما نے اپنی آنکھوں میں آئے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا۔

''میری یہ پیشن گوئی اس لئے غلط ہوئی کہ میں نے آپ سے جھوٹ کہا تھا میں نے آپ لوگوں کے متعلق کوئی خواب نہیں دیکھا تھا۔۔'' میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

''کیا!!''

''ہاں۔وہ سب جھوٹ تھا میں نے صرف آپ لوگوں کو ڈرانے کی خاطر جھوٹ بولا تھا۔۔''

''اسد۔۔کیڑے پڑے تیرے منہ میں۔۔تو نے ہمیں ہیجان میں مبتلا کر کے رکھا۔۔۔وہ تیری پیشن گوئی سن کر پاگل ہو گئے تھے انہیں دیکھا نہیں جاتا تھا وہ ہر ایک شئے سے ڈرنے لگے تھے انہیں اپنے چاروں طرف موت ہی موت نظر آتی تھی انہیں کھانا بھی زبردستی کھلایا جاتا تھا وہ کھانا ایسے کھاتے تھے جیسے زہر کھا رہے ہو ان کی آنکھوں سے نیند اڑ گئی تھی وہ رات رات بھر جاگتے رہتے تھے انہیں دیکھ کر دل کٹتا تھا۔۔اسی پاگل پن میں انہوں نے اپنی جان دے دی۔۔اسد تو قاتل ہے تو ہتھیارا ہے۔۔۔'' مما ہسٹریائی انداز میں چیخنے لگیں۔

''یہ ان کے اعمال تھے جو ان کے سامنے آئے۔۔'' میں نے ٹھنڈے لہجے میں کہا تو مما نے چونک کر مجھے دیکھا اور پھر اپنی آنکھوں میں آئے آنسو پونچھے۔

''اسد تو نے ہمیں موت کے خوف میں مبتلا کیا ہماری زندگی عذاب کی......میں آج تک تجھے کوسنے دیتی تھی گالیاں دیتی تھی......مگر......آج میں تجھے بددعا دیتی ہوں۔۔جس طرح تو نے ہمیں جھوٹی پیشن گوئی کر کے خوف میں مبتلا کیا جس طرح تو نے ہمارے لئے عذاب کی دیوار کھڑی کی۔۔اللہ تجھے بھی اسی طرح مستقبل کے عذاب میں مبتلا کرے تیری بھی کوئی عزیز ہستی تیرے سامنے موت سے ہمکنار ہو......اور تو سب کچھ جانتے ہوئے بھی کچھ نہ کر سکے۔۔اسد الرحمان۔۔آج میں تجھے بددعا دیتی ہوں۔۔۔'' اتنا کہہ کر مما ہچکیوں سے رونے لگیں اور میری جانب پیٹھ کر کے کھڑی ہو گئیں رونے سے ان کا کمزور وجود بری طرح ہل رہا تھا ان کی ہچکیاں میرے دل پر ہتھوڑے کی طرح لگ رہی تھی میں یہاں مما کی دل جوئی کے لئے آیا تھا مگر بات چیت کسی اور رخ پر چلی گئی، میں بوجھل قدموں کے ساتھ وہاں سے واپس چل دیا جب میں واپس انچارج کے کمرے میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ ماہم میرا انتظار کر رہی تھی۔

''بات چیت ہوئی مما سے۔۔'' ماہم نے مجھے آتے دیکھا تو پوچھا میں نے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا پھر انچارج سے ہاتھ ملا کر اس کا شکریہ ادا کیا اور تھانے سے باہر کی جانب چل دیا میرے ساتھ ماہم بھی تھانے سے باہر آ گئی۔

''کیا ہوا اسد۔مما نے کیا کہا۔۔'' ماہم نے کار میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''انہوں نے مجھے بددعا دی۔۔۔'' میں نے آہستگی سے جواب دیا۔

''بددعا دی۔۔؟'' ماہم کے لہجے میں استفسار تھا۔

''ہاں۔۔انہوں نے مجھے بددعا دی۔۔'' میں نے دوبارہ جواب دیا۔

''تم بددعا پر یقین رکھتے ہو۔۔؟ ماہم نے پھر سوالیہ لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

''جب دعا ہوتی ہے اور قبول بھی ہوتی ہے تو بددعا بھی ہوتی ہوگی۔۔'' میں نے پریشان لہجے میں جواب دیا پھر تھوڑی دیر خاموش رہا پھر میں نے ماہم کو

مخاطب کیا۔

''کیا مما کی بددعا پوری ہوگی؟''

''اللہ بہتر کرے گا تم پریشان مت ہو۔'' ماہم نے جواب دیا اور میرے شانے پر اپنا سر رکھ دیا۔

☆......☆......☆

چند دنوں بعد عدالت کی جانب سے مجھے اپنے والد کی جائیداد کا اکلوتا وارث قرار دیا گیا اور تمام جائیداد کا اختیار مجھے مل گیا، جائیداد کا اختیار ملنے کے بعد میں نے سب سے پہلے فیکٹری کا دورہ کیا فیکٹری کی حالت بہت ناگفتہ بہ تھی بنکوں کا کافی قرضہ فیکٹری پر چڑھ گیا تھا لہٰذا سب سے پہلے میں نے فیکٹری کو سنبھالا دینے کا بیڑہ اٹھایا۔

انکل شمریز کے مشورے ہر دم میرے ساتھ تھے وہ کاروبار میں بھی میری کافی مدد کر رہے تھے فیکٹری کو سنبھالا دینے میں انکل شمریز کے تعلقات بھی کافی کام آئے فیکٹری سنبھالنے میں، میں اتنا مصروف ہو گیا کہ مجھے سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں ملتی تھی مگر اس کے باوجود ماہم سے میرا رابطہ رہتا تھا انکل شمریز کے گھر سے چند دنوں بعد ہی میں اپنے گھر شفٹ ہو گیا تھا اپنے گھر شفٹ ہونے اور اتنی زیادہ مصروفیت کے باوجود، میں ہر روز ماہم سے ملتا تھا ہم دونوں ایک دوسرے کا مزاج سمجھنے لگے تھے ہم دونوں دو جسم ایک قالب بنتے جا رہے تھے حالانکہ ہمارے درمیان کوئی عہد و پیماں نہیں ہوئے تھے مگر دل ہی دل میں ہم ایک دوسرے کو اپنا مان چکے تھے۔

پھر جب میں نے محسوس کیا کہ کاروبار اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا ہے اور اسی دوران ماہم کی تعلیم بھی مکمل ہو چکی تھی لہٰذا ایک دن میں نے انکل شمریز سے اپنے دل کی بات کہہ دی اور ماہم کے لئے دستِ سوال وا کر دیا۔ اس رشتے پر انکل شمریز کو بھی کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ آنٹی زینب کے قتل کے کیس سے بھی میں باعزت بری ہو چکا تھا اور میں نے اپنے پپا کا کاروبار بھی پوری طرح سنبھال لیا تھا لہٰذا انکل شمریز نے میری درخواست قبول کر لی اور مجھے اپنی فرزندی میں قبول کر لیا۔

میری اور ماہم کی شادی بلا کسی رکاوٹ کے ہو گئی۔ اس دن میں اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھ رہا تھا جب نکاح کے بعد دلہن بنی شرمائی شرمائی سی ماہم کو میرے پہلو میں لا کر بیٹھایا گیا ہر سو رنگ و نور کا سیلاب تھا ہر چہرے پر خوشی تھی۔ میں نے اپنے پہلو میں بیٹھی اپنی حسین دلہن کو دیکھا اور آہستہ سے اپنا ہاتھ ماہم کے حنائی ہاتھ پر رکھا تو ماہم شرما کر مزید سمٹ گئی۔ اسی وقت ایک لڑکی دھڑ دھڑ کرتی اسٹیج کی سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اسٹیج پر آئی اور ماہم کے قریب جا کر بولی۔

''ماہم خان۔۔ چپکے چپکے شادی کر رہی ہو۔۔''

''آفرین۔۔ تو کب آئی جرمنی سے۔۔'' ماہم اس لڑکی کو دیکھ کر بے ساختہ کھڑی ہو گئی اور اسے گلے سے لگا لیا۔

''آج ہی آئی ہوں۔۔ اور جب مجھے پتا چلا کہ میری پیاری سہیلی کی شادی ہو رہی ہے تو میں بن بلائے چلی آئی۔۔'' آفرین بولی

یہ وہی منظر تھا جو ماہم کو پہلی بار دیکھتے ہی میرے ذہن کے پردے پر ابھرا تھا اور آج۔۔ برسوں بعد اس منظر نے حقیقت کا روپ دھارا تھا میں نے محبت پاش نظروں سے ماہم کو دیکھا تو وہ بھی میری نظروں کا مطلب سمجھ گئی اور اس نے شرما کر گردن جھکا لی۔

میں ماہم کا ساتھ پا کر بہت خوش تھا ہم دونوں زندگی کے سفر میں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے خوشی سے فروزاں تھے اس دوران مجھے کبھی کوئی مستقبل کا منظر نظر نہیں آیا۔ میں اپنی زندگی سے نہایت مطمئن تھا زمانے نے میرے ساتھ جو زیادتیاں کی تھیں، زندگی نے مجھے اس کا بھرپور صلہ دیا، میں ماہم کی سنگت میں بہت مطمئن اور خوش تھا۔

شادی کے چھ مہینے بعد ایک دن جب میں گھر آیا تو ماہم بستر پر لیٹی تھی پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ماہم میرے دفتر سے آنے کے وقت اس طرح بستر پر لیٹی ہو وہ میرے آنے سے پہلے تیار ہو کر میرا پسندیدہ لباس

[illegible] اور میں دنیا کی ساری ٹینشن ماہم کو دیکھ کر بھول جاتا تھا مگر آج اس طرح ماہم کو بستر پر لیٹا دیکھ کر میں پریشان ہوگیا۔

''کیا ہوا ماہم۔۔؟'' میں نے اپنا بریف کیس سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے پوچھا اور بستر پر اس کے پاس بیٹھ گیا اور اس کا ماتھا چھو کر دیکھنے لگا۔

''کچھ نہیں۔۔طبیعت تھوڑی بھاری ہو رہی تھی۔۔'' ماہم نے آہستہ سے جواب دیا۔

''چلو۔۔پھر ڈاکٹر کو دکھاتے ہیں۔۔'' میں نے ماہم سے کہا۔

''میں نے ڈاکٹر در شہوار کو بلایا تھا وہ مجھے دیکھ کر گئی ہے۔۔انہوں نے کچھ دوائیاں بھی مجھے دی ہیں۔۔فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔۔'' ماہم نے مجھے جواب دیا اور پھر میرے ہاتھ کا سہارا لیکر مسہری کے سرہانے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی میں بھی اس کے قریب مسہری سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

''کیا بتایا ڈاکٹر در شہوار نے۔۔۔تمہیں کیا ہوا ہے؟ تم اپنی صحت کا بالکل خیال نہیں رکھتی۔۔'' میں نے پریشانی سے پوچھا۔

''فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔۔شادی کے بعد عورت کی طبیعت خراب ہو ہی جاتی ہے۔۔'' ماہم آہستہ سے بولی۔

''کیوں۔۔کیوں خراب ہو جاتی ہے طبیعت۔۔'' میں نے بھولپن سے پوچھا۔

''بدھو ہیں آپ۔۔'' ماہم کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''پہیلیاں مت بجھاؤ۔ صحیح صحیح بتاؤ تمہیں کیا ہوا ہے؟۔'' میں نے پھر پوچھا تو ماہم نے میرے سینے میں اپنا منہ چھپاتے ہوئے جواب دیا۔

''آپ۔۔آپ پاپا بننے والے ہے۔۔۔''

''میں پاپا بننے والا ہوں تو تم کیوں بیمار ہو۔۔'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا مگر جب میں نے ماہم کے جملے پر غور کیا تو میں اچھل پڑا۔

''سچ۔۔سچ۔۔تم سچ کہہ رہی ہو۔۔؟'' میں نے تصدیق چاہی تو ماہم نے گردن ہلا کر تصدیق کی۔

''ہرے۔۔۔'' میں نے نعرہ لگایا۔۔'' مجھے میرے جیسا خوبصورت اور ہینڈسم بیٹا چاہیے۔۔'' میں نے ماہم کی تھوڑی پر انگلی رکھ کر اس کا شرم سے جھکا چہرہ اوپر کیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔۔'' ماہم ہٹیلے لہجے میں بولی۔۔'' مجھے پہلے بیٹی چاہیئے۔۔''

''ٹھیک ہے۔۔'' میں نے ہار مانتے ہوئے جواب دیا۔۔'' پہلے ایک بیٹی پھر سات بیٹے''

''کیا۔۔سات بیٹے۔۔'' ماہم چیخ پڑی۔

''ہاں۔۔سات بیٹے اور ایک بیٹی کتنا پررونق گھر ہوگا ہمارا۔۔'' میں نے تصور میں مزے لیتے ہوئے جواب دیا اور ساتھ ہی کن انکھیوں سے ماہم کا ردعمل بھی دیکھنے لگا۔

''نہیں۔۔نہیں ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔۔۔بس۔۔'' ماہم جلدی سے بولی تو میری بے ساختہ ہنسی نکل گئی۔

''اچھا بابا۔۔تم جیتی میں ہارا۔۔ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔۔کم بچے خوشحال گھرانہ۔۔'' میں نے ماہم کے ماتھے کو چومتے ہوئے کہا تو ماہم شرما گئی۔

''اب تم مکمل ریسٹ کرو ماسی زرینہ کے ساتھ میں اور دو نوکرانیوں کا بندوبست کرتا ہوں۔۔'' تھوڑی دیر بعد میں نے ماہم سے کہا۔

''نہیں۔۔اس کی ضرورت نہیں ہے ماسی زرینہ نے گھر اچھے طریقے سے سنبھالا ہوا ہے اور پھر ڈاکٹر در شہوار نے کہا ہے کہ میں روزمرہ کے کام کرتی رہوں گی تو میری اور بچے کی صحت پر اچھا اثر پڑے گا۔۔'' ماہم بول رہی تھی اور میں خاموشی سے اس کی بات سن رہا تھا۔

''ڈاکٹر در شہوار نے کہا ہے کہ روزانہ واک میں لازمی کروں۔۔'' ماہم پھر بولی۔

''ٹھیک ہے۔۔میں فریش ہو جاؤں پھر واک پر چلتے ہیں۔۔'' میں ماہم کو جواب دیا اور بستر سے اٹھ کر

باتھ روم میں گھس گیا۔

☆......☆......☆

"ماہی۔۔۔ماہی۔۔۔" ایک صبح جب میں آفس جانے کے لئے تیار ہورہا تھا تو میں نے ماہم کو آواز لگائی شادی کے بعد سے میں ماہم کو ماہی کہنے لگا تھا۔

"آرہی ہوں۔۔" ماہم یہ کہتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔

"مجھے آفس کے لئے دیر ہورہی ہے تم کیا کر رہی تھی۔۔" میں نے پوچھا۔

"وہ۔۔وہ بچے کے کپڑے الماری میں رکھ رہی تھی؟" ماہم نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔

"یعنی صاحبزادے ابھی دنیا میں آئے نہیں اور آپ ہمیں بھول گئیں۔۔" میں نے ماہم کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی۔۔" ماہم بری طرح شرما گئی۔۔"میں آپ کو کبھی بھول سکتی ہوں۔۔آپ۔۔آپ میری زندگی ہیں۔"

ماہم کی بات سن کر میں نے بے اختیار ماہم کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا اور اس کے گالوں پر پیار کرنے لگا۔

"اب دیر نہیں ہورہی۔۔" ماہم مجھے پیچھے ہٹاتے ہوئے بولی۔

"ہاں۔۔دیر تو ہورہی ہے آج آفس میں بہت اہم میٹنگ ہے۔۔" میں نے جواب دیا تو ماہم نے سائیڈ ٹیبل رکھی ٹائی اٹھائی اور میرے گلے میں ڈال کر ٹائی باندھنے لگی۔

شادی کے بعد سے ٹائی باندھنا اور مجھے کوٹ پہنانا ماہم نے اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ٹائی باندھنے کے بعد ماہم نے مجھے کوٹ پہنایا اور کوٹ پہناتے ہوئے کہنے لگی۔۔"آج آفرین کے ساتھ میں مارکیٹ چلی جاؤں۔۔؟"

"اس حالت میں۔۔تم مارکیٹ جاؤ گی۔۔" میں نے اس کی توجہ اس کی صحت کی جانب دلائی۔

"زیادہ خریداری نہیں کرنی ہیں بس درزی کو کچھ کپڑے دینے ہیں یہ تمام کپڑے مجھے تنگ ہورہے ہیں۔۔" ماہم بولی حاملہ ہونے کے بعد ماہم کا جسم بھرنے لگا تھا اور اس کے موجودہ کپڑے اسے کافی تنگ ہورہے تھے۔

"ٹھیک ہے مگر زیادہ مارکیٹ میں پھرنا نہیں۔۔" میں نے اسے اجازت دی تو ماہم اقرار میں سر ہلانے لگی۔ میں ماہم کو پیار کرکے اپنے آفس کے لئے روانہ ہوا۔ میں اپنی زندگی سے نہایت مطمئن اور خوش تھا خوشیاں میرے چاروں طرف رقصاں تھیں۔

آفس میں غیر ملکی وفد سے میری اہم کاروباری میٹنگ تھی لہذا مجھے وقت گزرنے کا اندازہ ہی نہیں ہوا میری میٹنگ بہت کامیاب رہی مجھے ایک بہت بڑا آرڈر ملنے کی توقع تھی لہذا میٹنگ ختم ہوئی تو میں بہت خوش تھا میٹنگ ختم کرکے میں میٹنگ روم سے اٹھ کر اپنے آفس پہنچا آفس پہنچ کر میں نے گھڑی میں وقت دیکھا شام کے چار بج رہے تھے میرے چپراسی نے میری میز پر کھانا لگا دیا تھا میں نے ابھی تک دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا لہذا ہاتھ دھوکر میں کھانے کی لئے اپنی کرسی پر بیٹھا ابھی میں نے کھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ میری آنکھوں کے سامنے سفید پردہ آگیا اور اس پردے پر ایک منظر چلنے لگا۔ برسوں بعد مجھے مستقبل کا کوئی منظر نظر آرہا تھا میری مکمل توجہ اس منظر پر تھی۔

پردے پر چلنے والے منظر میں مجھے کئی گاڑیاں نظر آرہی تھیں جو سڑک پر رینگ رینگ کر چل رہی تھیں بہت سے لوگ فٹ پاتھ پر چل پھر رہے تھے انہیں لوگوں کے درمیان میں۔۔۔جی ہاں میں اندھا دھند بھاگ رہا تھا میں پاگلوں دیوانوں کی طرح بھاگ رہا تھا بھاگتے بھاگتے میں نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا شام کے پانچ بجنے والے تھے میں نے اپنی رفتار مزید تیز کردی اردگرد کے لوگ حیران نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے ایک ایک سوٹڈ بوٹڈ شخص پاگلوں کی طرح کیوں بھاگ رہا ہے بھاگتے بھاگتے میں نے

ایک دکان کی جانب دیکھا دکان پر گلابی کپڑوں میں ایک لڑکی کھڑی تھی میں نے رک کر اس لڑکی کو ماہی کہہ کر پکارا مگر۔۔مگر مارکیٹ کے شور میں میری آواز اس تک نہ پہنچ سکی میں نے دوبارہ زور سے چیخ کر ماہی کہا تو وہ گلابی کپڑوں والی لڑکی نے میری جانب دیکھا۔

وہ لڑکی ماہم تھی ماہم کے چہرے پر مجھے وہاں دیکھ کر حیرت کے آثار نمودار ہوئے اور وہ میری جانب بڑھی میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے کچھ کہا مگر ماہم میرا اشارہ نہ سمجھ سکی میں تیزی کے ساتھ ماہم کی جانب بڑھا اسی وقت اچانک ہمارے درمیان ایک نوجوان آ گیا وہ بارلیش نوجوان تھا اور وہ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہا تھا اس نے اس گرمی کے موسم میں ایک موٹی جیکٹ پہن رکھی تھی اس نوجوان نے ایک نظر مجھ پر ڈالی اور دوسری نظر ماہم پر ڈالی پھر اس نوجوان نے اپنا ہاتھ اپنی جیب سے نکالا اس کے ہاتھ میں ایک سوئچ تھا اس نوجوان نے ایک نعرہ لگایا اور سوئچ کا بٹن دبا دیا بٹن دبتے ہی ایک زور دار دھماکہ ہوا اور میں اڑتا ہوا دور جا گرا چند لمحوں کے لئے میں اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھا مجھے بہت زور کی چوٹ لگی تھی میرے منہ سے ایک تیز چیخ نکل گئی اچانک مجھے ماہم کا خیال آیا ماہم کا خیال آتے ہی میں اپنی تکلیف بھول گیا اور اٹھ کر ماہم کو آوازیں دینے لگا اور جلدی سے اس جگہ پہنچا جہاں ماہم کھڑی تھی ماہم اسی جگہ اوندھے منہ زمین پر پڑی تھی میں نے چیختے ہوئے ماہم کو سیدھا کیا، ماہم اپنے خون میں نہائی ہوئی تھی اس نے ڈوبتی آنکھوں سے مجھے دیکھا ماہم نے اپنا ایک ہاتھ اپنے پیٹ پر رکھا ہوا تھا جہاں ہمارا بچہ تھا اس نے اپنا دوسرا خون آلود ہاتھ اٹھا کر میرے چہرے کو چھونا چاہا مگر۔۔۔مگر اس کا ہاتھ بے جان ہو کر پڑا اس کی روشن آنکھیں بے نور ہو گئیں میں چیخ چیخ کر رونے لگا۔

اس کے ساتھ ہی میری آنکھوں کے سامنے سے منظر غائب ہو گیا اور میں حقیقت کی دنیا میں آ گیا۔

''ن۔نہیں یہ سچ نہیں ہے۔۔۔میں۔۔میں اس منظر کو حقیقت نہیں بننے دونگا۔۔'' میں بوکھلا گیا میرے جسم کے تمام رونگٹے کھڑے ہو گئے میرے مساموں سے پسینہ پھوٹ پڑا۔

''مجھے۔۔مجھے اس منظر کو حقیقت بننے سے روکنا ہوگا۔۔'' میں بڑبڑایا ''ماہم آج مارکیٹ جانے والی ہے مجھے۔۔مجھے اسے روکنا ہوگا''

میں نے جلدی سے گھڑی دیکھی چار بج رہے تھے۔۔'' بلاسٹ پانچ بجے ہوگا مجھے ماہم کو روکنا چاہئے۔۔'' میں پھر بڑبڑایا اور میں نے جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا موبائل نکالا اور ماہم کو کال کرنے لگا مگر ماہم کو کال نہیں ملی میں نے جھنجھلا کر موبائل پر نظر دوڑائی۔

''اوہ۔۔آج تو موبائل کا سگنل بند ہے۔۔''

میں نے موبائل میز پر پھینکا اور دفتر کے فون سے گھر کا نمبر ملایا۔

''ہیلو کون۔۔'' دوسری جانب سے زرینہ ماسی کی آواز آئی۔

''ہیلو میں اسد بول رہا ہوں۔۔جلدی سے فون ماہم بی بی کو دو۔۔'' میں نے بے قراری سے کہا۔

''صاحب بی بی جی تو اپنی سہیلی کے ساتھ مارکیٹ گئی ہیں۔'' زرینہ ماسی نے مجھے بتایا۔

''کب۔۔کب نکلی ماہم گھر سے۔۔۔'' میں نے بے چینی سے پوچھا۔

''آدھا گھنٹہ ہو گیا۔۔'' زرینہ ماسی نے بتایا تو میں نے فون کا ریسیور کریڈل پر پھینکا اور میز پر رکھی اپنی کار کی چابی اٹھائی اور اپنے آفس سے باہر کی جانب دوڑ لگا دی مجھے اس طرح بھاگتے دیکھ کر میرے دفتر کے تمام لوگ حیران نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

میں نے بھاگتے بھاگتے گھڑی دیکھی چار بج رہے تھے بم بلاسٹ کا جو منظر میں نے دیکھا تھا وہ پانچ بجے کا تھا ابھی میرے پاس ایک گھنٹہ تھا میرے آفس سے مارکیٹ کا راستہ آدھے گھنٹے کا تھا لہٰذا میں تیزی سے بھاگتے ہوئے پارکنگ میں پہنچا اور اپنی کار میں بیٹھ کر جلدی سے کار پارکنگ سے نکالی اور انتہائی تیز

رفتاری سے مارکیٹ کی جانب کار دوڑا دی، میں انتہائی تیز رفتاری کا مظاہرہ کر رہا تھا کئی جگہ میری کار دوسری گاڑیوں سے ٹکراتے ہوئے بچی مجھے اپنے پیچھے کئی گاڑیوں کے ڈرائیوروں کی گالیاں سنائی دیں جو مجھے دے رہے تھے مگر اس وقت میرے اوپر صرف ایک دھن سوار تھی میں ہر حالت میں پانچ بجے سے پہلے ماہم کو مارکیٹ سے نکال لے جانا چاہتا تھا مارکیٹ سے پہلے ایک جگہ ٹریفک جام تھا مجبوراً مجھے بھی رکنا پڑا میں نے انتہائی بے چینی سے گھڑی دیکھی سوا چار بج چکے تھے صرف پون گھنٹہ رہ گیا تھا، میری بے چینی عروج پر تھی مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی میرے دل کو اپنی مٹھی میں لیکر مسل رہا ہو۔۔۔ چند منٹ کا انتظار میرے لئے قیامت بن گیا تھا، میں نے اپنی کار کا دروازہ کھول کر باہر نکلنا چاہا مگر اسی وقت ایک گاڑی میری کار کے ساتھ آ لگی اب میرے لئے دروازہ کھولنا ممکن نہ تھا میں نے دروازے کا شیشہ نیچے کیا اور دوسری گاڑی والے سے پوچھا ”یہ ٹریفک کیوں جام ہے۔۔؟“

”وی آئی پی موومنٹ ہے کوئی حکومتی عہدیدار آ رہا ہے۔۔“ وہ شخص جل کر بولا۔

”اوہ۔“ میرے منہ سے نکلا مجھے کسی حالت چین نہیں آ رہا تھا میرا بس چلتا تو میں اڑ کر ماہم تک پہنچ جاتا میری آنکھوں میں بار بار آنسو آ رہے تھے میں اس وقت انتہائی بے بسی محسوس کر رہا تھا۔

آخر کار خدا خدا کر کے ہوٹر بجاتی ہوئی گاڑیاں گزریں تو ان گاڑیوں کے گزرنے کے بعد ٹریفک بھی رواں ہوا، میں نے جلدی سے اپنی کار ٹریفک کے بہاؤ سے نکالی اور مارکیٹ والے روڈ پر کار دوڑانے لگا مارکیٹ کے قریب پہنچ کر ایک بار پھر ٹریفک جام ہو گیا چاروں طرف گاڑیوں کی قطاریں لگ گئیں گاڑیوں کے ہارن اور لوگوں کا شور فضا کو بوجھل کر رہا تھا۔

میں نے گھڑی میں وقت دیکھا پانچ بجنے والے تھے اس سے پہلے کے کوئی گاڑی میری کار کے برابر آ کر لگتی اور میری کار کا دروازہ بند ہو جاتا میں نے جلدی سے اپنی کار کا دروازہ کھولا اور کار سے باہر چھلانگ لگا دی کار سے باہر نکلتے ہی میں بگٹٹ مارکیٹ کی جانب دوڑا مجھے کسی بات کا ہوش نہ تھا میں دیوانہ وار بھاگا جا رہا تھا لوگ حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے مگر مجھے کسی کی پرواہ نہ تھی میں جلد از جلد درزی کی دکان پر پہنچنا چاہتا تھا جہاں ماہم کھڑی تھی میں بے تحاشہ بھاگ رہا تھا میرا کوٹ اور میری ٹائی میرے بھاگنے کی وجہ سے عجیب انداز سے اڑ رہے تھے میں عجیب مضحکہ خیز لگ رہا تھا مگر مجھے کوئی پرواہ نہ تھی۔

میں بھاگتے بھاگتے درزی کی دکان کے سامنے پہنچا درزی کی دکان پر گلابی کپڑوں میں ماہم کھڑی تھی وہ درزی سے بات کر رہی تھی، میں نے زور سے ماہم کو پکارا مگر ٹریفک اور لوگوں کے شور میں میری آواز دب گئی، میں نے اپنے پھیپھڑوں کی پوری طاقت استعمال کر کے ماہم کو پکارا۔ اب میری آواز ماہم تک پہنچ گئی، میری آواز سن کر ماہم نے مڑ کر میری جانب دیکھا اس کے چہرے پر مجھے وہاں دیکھ کر حیرت کے آثار نمودار ہوئے وہ میری جانب بڑھی میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے دکان سے دور جانے کا کہا مگر۔۔ مگر وہ میرا اشارہ نہ سمجھی تو میں تیزی کے ساتھ ماہم کی جانب لپکا ماہم بھی میری جانب بڑھی ٹھیک اسی وقت میں نے ایک باریش نوجوان کو دیکھا جو تیزی کے ساتھ ہماری جانب بڑھ رہا تھا اس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی اور دوسری نظر ماہم پر ڈالی۔ ”یہ۔۔ یہ ہی خودکش بمبار ہے۔“

میرے دماغ نے مجھے متنبہ کیا اسی وقت نوجوان نے ایک نعرہ بلند کیا میں نے نعرہ سنتے ہی ایک لمبی چھلانگ لگائی تا کہ ماہم تک پہنچ سکوں مگر۔۔ مگر یہ ہو نہ سکا ایک زوردار دھماکے کی آواز بلند ہوئی اور میں اچھل کر دور روڈ پر جا گرا، میرا سر پوری قوت سے پکے روڈ سے ٹکرایا مجھے ایسا لگا جیسے میرے سر کے ہزاروں ٹکڑے ہو گئے ہوں، میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا مجھے ایسا لگا جیسے زندگی نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہو

میرا ذہن اندھیروں میں ڈوب گیا مجھے ایسا لگا جیسے میں زندہ ہی قبر میں اتار دیا گیا ہوں۔۔مگر۔۔۔

پھر میری واپسی ہوش کی دنیا میں ہوئی میں جلدی سے اٹھا میرے سر میں درد کے دھماکے ہو رہے تھے میرا چہرہ میرے اپنے خون سے تر تھا مگر مجھے کسی چیز کی پرواہ نہیں تھی میں جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور ماہم کی جانب لپکا، ماہم اوندھے منہ فٹ پاتھ پر پڑی تھی چاروں جانب سے آہ و بکا کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں ایمبولیس کا سائرن بھی چیخ رہا تھا ہر طرف ایک افراتفری کا عالم تھا سینکڑوں زخمی درد سے کراہ رہے تھے روڈ پر ہر طرف لاشیں اور خون پھیلا ہوا تھا میں اٹھ کر تیزی کے ساتھ ماہم کی جانب بڑھا اور ماہم کے پاس بیٹھ کر میں نے ماہم کو سیدھا کیا اور اس کا سر اپنی گود میں رکھا، ماہم کا چہرہ اور کپڑے اس کے اپنے خون سے سرخ ہو رہے تھے، اس کا ایک ہاتھ اس کے اپنے پیٹ پر تھا جہاں۔

ہمارا بچہ تھا وہ بچہ جس نے ابھی دنیا میں آنکھ کھولنی تھی جس نے اپنی ہنسی سے اس دنیا کو خوبصورت بنانا تھا۔۔۔ماہم نے ڈوبتی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور اپنا دوسرا خون آلود ہاتھ اٹھا کر میرے چہرے کو چھونا چاہا مگر۔۔۔

مگر موت کے فرشتے نے اسے اتنی مہلت نہ دی اس کا ہاتھ بے جان ہو کر نیچے گر پڑا اس کی آنکھوں سے زندگی کی رمق ختم ہوگئی اس کی بے نور آنکھیں مجھ پر جمی تھیں جیسے شکوہ کر رہی ہو کہ تمہیں تو سب کچھ معلوم ہو گیا تھا پھر۔۔پھر تم مجھے اور میرے بچے کو کیوں نہیں بچا سکے۔۔۔

آہ۔۔قسمت کے سامنے سب بے بس ہے۔ میں بھی ایک مجبور انسان ثابت ہوا حالانکہ میں نے یہ منظر ایک گھنٹہ قبل دیکھ لیا تھا۔ مگر میں کچھ نہیں کر سکا، قدرت کے سامنے ہم سب بے بس اور مجبور ہیں جو قدرت نے ہماری قسمت میں لکھ دیا ہے وہ ہر حالت میں پورا ہوگا پچھلا ایک گھنٹہ میں نے کتنی اذیت میں گزارا اس کا حال کوئی میرے دل سے پوچھے۔

مستقبل کے دردناک واقعات کا پہلے سے معلوم ہو جانا کتنا اذیت ناک ہوتا ہے، آج مجھے اس کا صحیح اندازہ ہوا۔آج مجھے اندازہ ہوا کہ مما کو میری پیشنگوئیوں سے کتنی تکلیف ہوتی ہوں گی۔آہ مما کی بددعا نے مجھ سے بدلہ لے لیا۔۔۔اے کاش۔۔۔میں بھی ایک عام انسان ہوتا جسے اگلے لمحے کا بھی پتا نہیں ہوتا۔۔میرے منہ سے وحشیانہ چیخیں نکلنے لگیں میں فٹ پاتھ پر پچھاڑیں کھانے لگا ماہم کا بے جان وجود میری گود میں تھا...... ماہم۔۔۔میری زندگی۔۔۔میری بیوی۔۔۔میرے ہونے والے بچے کی ماں۔۔۔میری جان نے میرے ہاتھوں میں دم توڑا اور میں۔۔۔۔میں کچھ نہیں کر سکا۔۔۔میں نے زور سے ماہم کو پکارا اور پھر بے ہوش ہو کر ماہم کے برابر گر پڑا۔

پتا نہیں کتنے مہینے کتنے سال گزر گئے میں زندہ ہوں مگر۔۔زندوں میں نہیں ہوں۔کبھی عالمِ ہوش میں ہوتا ہوں تو سب کچھ سمجھ آتی ہے اور جب عالمِ دیوانگی میں چلا جاتا ہوں تو قدرت کے اسرار کے سارے حجابات اٹھ جاتے ہیں، مستقبل میرے سامنے آجاتا ہے۔مگر اب میری زبان بندی کر دی گئی ہے میں کسی کو کچھ بتانے سے قاصر ہوں سب میری باتوں کو دیوانے کی بڑ سمجھتے ہیں۔

آہ۔۔میری زندگی عالمِ ہوش اور۔۔عالمِ دیوانگی میں سفر کر رہی ہے، ہوش میں ہوتا ہوں تو اس دنیا میں ہوتا ہوں اور دیوانگی کی حالت میں ہوتا ہوں تو ایک عالمِ نامعلوم میں چلا جاتا ہوں۔

سیانے کہتے ہیں کہ قبر بھی ایک عالم نامعلوم ہے لہٰذا میرا قبر میں آنے جانے کا سلسلہ جاری ہے، میں عنکبوت کے ایسے جال میں پھنس گیا ہوں جہاں نہ زندگی ہے اور نہ ہی وہاں موت آتی ہے۔۔نہ جانے مجھے یہ سزا کب تک بھگتنی ہوگی۔۔اور۔۔۔